

WWW.PAKSOCIETY.COM

روشن اندھیرے

امجد جاوید

WWW.PAKSOCIETY.COM

روشن اندھیرے۔ معاشرے میں موجود اُن اندھیروں کی داستان ہے جو ہمارے سامنے روشن تو ہیں، لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں پاتے

روشن اندھیرے

امجد جاوید

ڈاٹ کام

نوٹ:

اس ناول کے جملہ حقوق بحق مصنف (امجد جاوید) اور پبلشرز (علم و عرفان پبلشرز) محفوظ ہیں۔ ادارہ علم و عرفان پبلشرز نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

اقتساب!

اُن نوجوانوں کے نام
جو اندھیروں کو روشنی میں بدل رہے ہیں
مگر خود گمنامی میں رہتے ہیں۔

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کپی ہو تو (ان بیچ قائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو نوٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک نوٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

امجد جاوید کا صنم خانہ

”روشن اندھیرے۔“ معاشرے میں موجود ان اندھیروں کی داستان ہے جو ہمارے سامنے روشن تو ہیں، لیکن ہم انہیں دیکھ نہیں پاتے۔ یا پھر دیکھتے ہوئے انہیں نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جیسے یہ ہمارے لیے کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے۔ یہ اندھیرے ہمارے معاشرتی نظام میں بھی ہیں، معاشرے کے افراد میں بھی اور ان تضام قوتوں کے درمیان بھی جو کسی نہ کسی حوالے سے بھی اپنا تسلط برقرار رکھنا چاہتی ہیں۔ اسی کشمکش میں سے پیدا ہونے والے حالات و واقعات ہی اس داستان میں پیش کیے گئے ہیں۔ جوان کرداروں کا رویہ اور ان کا اظہار ہے۔ جس سے معاشرہ اور افراد کے تعلق کو بہت حد تک سمجھا جاسکتا ہے۔ یوں معاشرتی نظام، کردار اور تضام قوتوں جیسی ٹھوس حقیقتوں کے تقاطع میں لکھی گئی کہانی اپنے تاثر میں ایک سنگ میل کی سی حیثیت رکھتی ہے۔

جناب امجد جاوید کی زیر نظر کہانی ”روشن اندھیرے“ اپنے نچوڑ میں حیرت انگیز ہے کہ ان کے نزدیک اس کہانی میں حالات و واقعات کے ساتھ ساتھ مقصدیت پر زیادہ دھیان دیا گیا ہے۔ امجد جاوید ایک عام سے کردار کے گرد اپنی کہانی کی بنیاد ایسے کرتے ہیں کہ نہ صرف وہ کردار اہمیت اختیار کر جاتا ہے بلکہ ہمارے ارد گرد ہونے والے واقعات ہی سے وہ کہانی جنم لے کر اپنے منطقی انجام تک جا پہنچتی ہے۔ اس طرح وہ اپنا پیغام بھی دے جاتے ہیں اور تمام تر خوبیوں کے ساتھ کہانی بھی بیان کر جاتے ہیں۔ روشن اندھیرے میں یہ خوبی پوری طرح موجود ہے۔

”روشن اندھیرے“ کا کردار جناب امجد جاوید کا صنم خانہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہانی کے حالات و واقعات کے تسلسل میں کچھ کردار تو مستقل ہیں اور کچھ کردار کہانی میں جلوہ گر ہو کر پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔ ہر کردار اپنے ساتھ ایک پوری کہانی رکھتا ہے۔ کہانی ختم کرتے ہی قاری کے ذہن میں امجد جاوید کا صنم خانہ جلوہ گر ہو جاتا ہے۔ یہ کردار اپنی پوری جہالتوں کے ساتھ ذہن پر اپنی شبیہ چھوڑ جاتے ہیں اور قاری ان کرداروں کو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ کردار نہ صرف ہمارے ارد گرد ہیں بلکہ یوں محسوس بھی ہوتا ہے کہ جیسے ہم روز اندھیرے سے ملے ہیں، انہیں محسوس کرتے ہیں اور انہیں دیکھتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ ماننا پڑتا ہے کہ کردار نگاری میں مصنف کو ایک خاص طرح کی مہارت حاصل ہے، جیسے گفتگوں میں کفایت کے ساتھ بھرپور کردار کی تشکیل، بہر حال سائنس طلب صلاحیت ہے۔ اس کہانی کے مطالعے سے مجھے یہ بھی احساس ہوا کہ جیسے جناب امجد جاوید کا صنم خانہ اندھیرے میں پڑا ہوا ہے۔ جہاں بے شمار کردار اس انتظار میں پڑے ہوئے ہیں کہ انہیں ظاہر کیا جائے۔ وہ جس کردار کو دکھانا چاہتے ہیں، اس پر اپنی نگاہ کی روشنی ڈال دیتے ہیں اور وہ پوری طرح ظاہر ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جب نئے کردار پر روشنی پڑتی ہے تو پہلا کردار اندھیرے میں ہونے کے باوجود اپنا احساس ضرور رکھتا ہے۔

”رُوشن اندھیرے“! عام سے کرداروں اور عام سے حالات واقعات کے ساتھ ایک خاص کہانی کا درجہ رکھتی ہے۔ وہ پیغام جو جناب امجد جاوید اپنے قارئین تک پہنچانا چاہتے ہیں اس کا پوری طرح ابلاغ ہو جاتا ہے۔ اس داستان میں بہت سے ایسے مقامات بھی ہیں جہاں پر آکر وہ چاہتے تو ”لذت“ کے لیے صفحات کے صفحات بھردیتے مگر ان کا یہ مزاج نہیں ہے اور نہ ہی وہ لذت کے لیے کہانی لکھتے ہیں۔

مندرجہ بالا میری تمام تر معروضات آپ پر اس وقت عیاں ہوں گی جب آپ یہ داستان پڑھ لیں گے۔ سو میں انہی لفظوں کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

مکمل فرازا امجد

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو معظنین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیتے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

- ۱۔ <http://kitaabghar.com> کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔
- ۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کپی ہوگی (ان پیس فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔
- ۳۔ کتاب گھر پر لگے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے پائرسز کو نوٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک نوٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

109 اچھے ہوئے موسم کی توقع تھی ہوئی دو پہر تھی، جب میں اپنے دفتر کے استقبالیہ پر پہنچا اور وہیں مجھے استقبالیہ ٹھکرک نے یہ اطلاع دی کہ سلیم فارانی ایئر ٹرین گیا ہے۔ اگرچہ اخباری دنیا میں کہیں بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے، تاہم آنے والے وقت کے لیے تھوڑے بہت اندازے ضرور ہوتے ہیں۔ اس لیے جب اندازے غلط ہو جائیں تو حیرت ضرور ہوتی ہے۔ یہ خبر جہاں میرے لیے حیرانگی کا باعث بنی، وہاں غلط ہو جانے کا الارم بھی میرے ذہن میں بج گیا۔ انہی لمحات میں اک بے نام سی ایجنٹ نے مجھے گھیر لیا جیسے وہ یا میں اچانک کسی طرف سے کوئی سینئر آجائے اور اپنے ساتھ لہروں کا شور مچاتا ہوا دور نکل جائے یا پھر بہت سارے پرندوں کے اچانک اڑنے سے پیدا ہو جانے والی پھڑ پھڑ کی دیر تک رہنے والی گونج ہو۔

میں اُلجھا ہوا استقبالیہ سے رپورٹنگ سیکشن تک آیا۔ وہاں کا ماحول قدرے کمر دراز ہو چکا تھا، میرے آنے سے پہلے ہی وہاں یہ بحث ہو چکی تھی کہ اب میرا اور حسن کا اس اخبار میں کام کرنے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہو جائے گا۔ یہ اندازہ بھیداز قیاس نہیں تھا۔ سلیم فارانی کی یہ کوشش ہو سکتی تھی کہ وہ ہم دونوں کو اخبار ہی میں نہیں، اس شہر ہی میں نہ رہنے دے۔ ہمارے لیے کسی دوسرے اخبار میں چلے جانا معمولی سی بات تھی۔ حسن نے تو اسی وقت سے سوچنا شروع کر دی تھا جب ہمدانی صاحب کو اچانک امریکہ جانا پڑا تھا۔ وہ کافی عرصے سے بیمار چلے آ رہے تھے۔ ان کی بیٹی وہاں تھی۔ وہ آئی اور ضد کر کے انہیں اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ یہ سب آنا ٹانا ہوا تھا۔ ہمدانی صاحب کے امریکہ جانے اور سلیم فارانی کے ایئر ٹرین جانے میں صرف دو دن کا وقفہ تھا۔ بہت سارے نام سامنے تھے۔ لیکن فارانی کا نام کہیں بھی نہیں تھا۔ میرے یہ دونوں ہمدانی صاحب کے ساتھ گزر گئے تھے۔ انہیں ایئر پورٹ سے سی آف کر کے میں گھر چلا گیا تھا۔ انہی دو دنوں میں یہ تبدیلی آگئی تھی۔ حسن کے ذہن میں تھا کہ اگر کوئی ایسا بندہ ایئر ٹرین بن جائے، جس سے ہماری نہ نہہ سکے تو اس صورت میں ہمیں کیا کرنا ہوگا؟

رپورٹنگ سیکشن میں آنے کے تھوڑی دیر بعد سلیم فارانی کی طرف سے پیغام آ گیا کہ میں اسے اس کے آفس میں ملوں۔ مجھے ایک دم کھٹ کا احساس ہوا۔ یہ میرے اندر کا فطری رد عمل تھا۔ میں نے چیف رپورٹر کی جانب دیکھا، وہ ایک لمبی سانس لے کر خاموش ہو گیا۔ تجھی حسن نے مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا پھر موجودہ صورت حال سے آگاہ کرتے ہوئے بولا۔

”وہ اگر کوئی فضول بکواس کرے تو ٹھوک دینا جاناجی۔“ اس نے کچھ ایسے انداز میں کہا کہ میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ تب میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

”دماغ کو ٹھنڈا رکھو حسن۔ اس کی یہ بہت نہیں ہو سکے گی کہ میرے دو بدو مجھے کوئی غلط بات کہہ سکے۔ وہ ایک منافق شخص ہے، اتنی جرأت نہیں رکھتا۔ تم پر سکون رہو۔ میں سب سنبھال لوں گا۔“

”ٹھیک ہے“ اس نے ایک دم سے کہا اور مسکرا دیا اور میں سلیم فارانی کے آفس کی جانب چل دیا۔

ایئر کنڈیشنر سے کمرے کا ماحول خاص بخ ہو رہا تھا۔ میں سلام میں کھل کر ہوا اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”فرمائیے۔!“

ابھی اس نے کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ اس نے دوسری گھنٹی بجنے سے پہلے ہی ریسیور اٹھالیا۔ جب مجھے یہ احساس ہوا کہ فون کی گھنٹی نے اسے سمجھل جانے کا موقع دے دیا ہے وہ فون پر دھیرے دھیرے ہاتھ کرنے لگا۔ اور میں ذہن میں اٹھنے والی لاتعداد سوچوں کی لگام تھامے بظاہر پرسکون تھا۔

سلیم فارانی۔ امیری توقع کے برعکس ایڈیٹر بنا تھا۔ بلاشبہ وہ کرائم رپورٹنگ میں کامیاب تھا مگر ہم سب کے درمیان اس کی حیثیت کم درجے کی رہی تھی۔ اس میں دیگر وجوہات کے علاوہ اس کا اپنا ذاتی کردار بھی تھا۔ حسد اور چھچھورا پن اس میں کینٹینی کی حد تک تھا۔ مجھے اس سے کوئی ذاتی پر خاش نہیں تھی۔ لیکن اس نے آتے ہی نہ صرف ایک لابی بنالی بلکہ ہم چند دوستوں کے خلاف محاذ بنالیا۔ یوں ہوتا ہے کہ جب بندہ دوسرے کی کارکردگی سے آگے نہ بڑھ پائے تو وہ اوجھی حرکتوں پر اتر آتا ہے۔ اس نے بھی کچھ ایسا ہی کیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بہت سوں کو بچھے چھوڑتے ہوئے، اپنے مخصوص جھکنڈے آزما کر ایڈیٹر بن گیا تھا۔ میں فطری طور پر اپنے کام میں بہت محنت کرتا تھا۔ لیکن جب ایک مخالف گروپ تشکیل پا گیا تو میرا کام اور گھبر گیا۔ ہمدانی صاحب مجھ سے بہت خوش تھے۔ میرا ان سے ایک روحانی تعلق بن گیا تھا۔ چونکہ میرا مقصد دولت کمانا نہیں بلکہ ایک اچھا صحافی بننا تھا اس لیے ہمدانی صاحب میری ہر طرح سے رہنمائی کرتے تھے۔ یوں ان کی سرپرستی اور میری محنت کے باعث اخباری حلقوں میں میرا نام اہمیت اختیار کر گیا تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ جہاں مخلص اور پیارے دوست مل جائیں، وہاں پر منافق اور حاسد بھی خواہ مخواہ پیدا ہو جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ کسی خاص پلاننگ سے نہیں ہوتا بلکہ خود بخود فطری طور پر یومی ماحول بن جاتا ہے۔ جہاں آگے بڑھنے کی دوڑ ہو، اپنی اہمیت بنانے کی جستجو ہو اور مقصد کا حصول سامنے ہو تو ایسا ہونا خلاف توقع نہیں ہوتا۔ ایسا ہونا کبھی مجبوری بن جاتا ہے اور کبھی ضرورت، غلط فہمیاں، ارد گرد لوگوں کے مفاد، اپنے اندر کا لالچ، دوستوں کی مدد اور اپنے وقار و معیار کو برقرار رکھنا، ایسا ماحول پیدا کر دیتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب تک مخالف کا اندریشہ نہ ہو، کام میں تنہید نہ ہو، حوصلہ شکنی کا ذرہ نہ ہو تو کام کے معیار پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا۔ جب مخالفت، تنہید اور حوصلہ شکنی کا ماحول کھلا ہو تو بندہ ایک عزم سے کام کرتا ہے۔ جس سے کام کا معیار بلند ہو جاتا ہے۔ مگر سب کچھ اس وقت ہو پاتا ہے جب سوچ مثبت ہو۔ میرے سامنے بیٹھا سلیم فارانی بھی میرے انہی جی خواہوں میں تھا۔ جنہیں میرا وجود برداشت نہیں ہوتا تھا۔ اور یہ حقیقت تھی کہ میں نے بھی اس کے ساتھ کبھی مصلحت آبیرو یا نرم رویہ نہیں رکھا تھا۔ یوں ہمارے درمیان اک بے نام سی کشمکش ضرور تھی۔ اب وہ کئی لوگوں کو بچھاڑتا ہوا ایڈیٹر کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ میری سوچیں فلانچیں بھرتے ہوئے نبھانے کہاں سے کدھر نکل گئی تھیں۔ میں چونکا اس وقت جب اس نے ریسیور کھا۔ اس نے مجھے نظر انداز کرتے ہوئے سگریٹ نکالا۔ پھر سکون سے لائٹر چلا کر سگالی اور میری طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر کسی بھی قسم کا کوئی تاثر نہیں تھا۔ اس نے سگریٹ کا بھر پور کش لیا اور اپنی گھنٹی آنکھوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔ ہمارے درمیان میں سگریٹ کا وہ دھواں تھا جس کے مرغولوں میں سے وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ دھواں تحلیل ہونے میں چند لمحوں لگے۔ تبھی اس نے لیکن شو میں سے ابھرے ہوئے کالے اور مونے ہونٹوں کو چنٹش دی۔

”میں تمہاری بیٹ بدل رہا ہوں۔ اب تم سیاست کی بجائے شو بیز کرو گے۔“ وہ چند لمبے زکاتا کہ میرا رد عمل دیکھ سکے۔ میں اپنے چہرے کو جذبات کے معاملے میں مخ کر چکا تھا۔ اس لیے میرے چہرے پر سے کوئی تاثر نہ پا کر بولا۔ ”اس بارے کوئی سوال؟“

میرے ذہن میں ایک دم سے غصے میں لپنے ہوئے بے شمار سوال ابھرے، جن کا منطقی نتیجہ نرانی کیفیت تھی اور میرے خیال میں وہ یہی چاہتا تھا کہ ایسی ہی کوئی بحث چمڑ جائے۔ سو میں نے کسی تاثر یا رد عمل کے بغیر کہا۔

”اوکے۔! میں شو بیز دیکھ لوں گا۔ کچھ مزید کہتا ہے۔“

”نہیں۔! اس نے بنگارا بھرتے ہوئے کہا، پھر عجیب سے لہجے میں بولا، ”وش یو گنڈ لگ۔“ شاید اسے میرے اس طرح کے رویے کی توقع نہیں تھی۔ ماحول کمر درا ہو چکا اس لیے میں نے اٹھتے اس سے ہاتھ نہیں ملایا بس اٹھ کر دفتر سے باہر آ گیا۔ میں سمجھ چکا تھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ اس لیے میں بہت پرسکون ہو گیا تھا۔ رپورٹنگ سیکشن تک پہنچنے ہوئے میں اپنے دماغ کو ضبط کر چکا تھا۔

اصل میں وہ مجھے نزع کرنا چاہتا تھا کہ میں بھڑک اٹھوں اور اسے میرے بارے میں افواہیں پھیلانے کا موقع مل جائے۔ اس وقت میں نے یہی سمجھا تھا اور میں نے وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس کے رویے کو برداشت کر لیا تھا۔ میرے ذہن میں بہت کچھ تھا لیکن یہ نہیں تھا کہ وہ میری بیٹ (ڈائریہ کار) تبدیل کر دے گا۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر مجھے وہ بیٹ دے دی تھی جس کا مجھے تجربہ نہیں تھا۔ میں اس معاملے میں اتنا زنی تھا۔ کیونکہ اس شعبے سے میرے کبھی بھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ میں فلمیں نہیں دیکھتا تھا یا پھر مجھے اس شعبے میں کام کرنا نہیں آتا تھا۔ اصل میں ہوتا یوں ہے کہ جب کوئی صحافی اپنی بیٹ میں کام کر رہا ہوتا ہے تو اس میں نہ صرف اس کا تجربہ بہت زیادہ ہو جاتا ہے بلکہ وہ اندر کی خبروں تک سے بھی واقف ہو جاتا ہے۔ جس سے کارکردگی اور معیار بڑھتا جاتا ہے۔ میں اپنے شعبے میں بہت آگے تک چلا گیا تھا۔ سلیم فارانی مجھے چانک اس راستے پر سے روک کر ایک نئی راہ پر لگانا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھے اپنے کیریئر میں دوبارہ سفر پر لانا چاہتا تھا۔ فلمی دنیا یا شو بیز کے بارے میں اخباری تبصرے بھی دیکھتا تھا۔ یہ ست اور شو بیز کے درمیان ربط کے بارے میں بھی واقفیت رکھتا تھا۔ کسی بھی شعبے کا اپنا ماحول ہوتا ہے اور اس ماحول میں ”خبری ذرائع“ بھی مختلف ہوتے ہیں۔ شو بیز سے متعلق میری دلچسپی عام لوگوں کی طرح ہونے کی وجہ سے سلیم فارانی نے اسے میری کمزوری سمجھا اور اپنی طرف سے بھرپور وار کرنے کی کوشش کی۔ مجھے یہ ماننا پڑا کہ وہ ذہین اور زبردست قوت کے مشاہدہ رکھنے والا بندہ ہے۔ وہ معاملات کو اپنی مرضی کے مطابق لانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ چونکہ ذہین دشمن کی قدر کرنا میرا طیرہ رہا ہے، اس لیے میں نے یہ اعتراف کرنے میں ڈرا سا بھی نکل سے کام نہیں کیا کہ وہ بہر حال ایک ذہین دشمن ثابت ہوا ہے جو میرے کیریئر کو واؤ پر لگا چکا ہے۔ وہ مجھے اس نزع پر لے آیا کہ یا تو میں اخبار چھوڑ کر چلا جاؤں یا پھر اس کی مرضی کے مطابق چلوں۔ میرے سامنے یکدم ”روڈ بلاک“ کا بورڈ آویزاں کر کے اپنی مرضی کی راہ پر لانے کی کوشش اس نے کر لی تھی۔ وہ میری محنت کو لٹھوں میں ضائع کر دینا چاہتا تھا۔ میں ان ساری باتوں کو سمجھتا ہوا مسکرا دیا اور بڑے اعتماد کے ساتھ رپورٹنگ سیکشن میں چلا گیا۔ میں جیسے ہی اندر گیا، میری نظر سامنے بیٹھی مار یہ عمران پر پڑی جو مجھے دیکھتے ہی مسکرا دی تھی۔ تبھی حسن نے جلدی سے پوچھا۔

”جان جی۔! کیا جھک ماری ہے اس نے؟“ حسن نے اپنے مخصوص ٹکیہ کلام کے ساتھ بڑے تجسس سے پوچھا تو میں نے سکون سے پینٹے

ہوئے دھیرے سے کہا۔

”اس نے کہا ہے کہ میں شو بیز کروں۔“

”اوہ۔!“ چیف رپورٹر کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ ”یہ کیا کیا اس نے؟“

”دکھا دی نا خباث اس نے جان جی۔“ حسن نے انتہائی نفرت سے کہا، پھر اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں چھوڑا۔ اگلے یہاں سے، میں نے

بات کر لی ہے۔“

”بیٹھ۔ اہم نے کہیں نہیں جانا۔“ میں نے تجھ سے کہا تو وہ چمکتے ہوئے بولا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے میری جان کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے، کیا وہی کچھ ہونے دیا جائے“

”تم کیا چاہتے ہو جان جی؟“ وہ تجھ سے بولا۔

”ہم یہیں اسی اخبار میں رہیں گے اور میں شو بیز کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو ماریہ عمران قہقہہ لگاتے ہوئے انتہائی طنز پر

لہجے میں بولی۔

”تو اب آپ میرا اور میری سوتوں کی شان میں قصیدے لکھا کریں گے، کس قدر اعلیٰ جا ب طلب ہے، اپنے شجاع الرحمن صاحب کو“

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ چیف رپورٹر نے ناگواری سے کہا۔

”ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ اس کے مطلب کا کام ہے، خوب دل جمعی سے کام کریں گے، موقع ملا تو کہیں اداکاری بھی کر لیں گے۔“ وہ

نفرت بھرے لہجے میں بولی۔

”ماریہ جی، آپ اپنا منہ بند رکھو۔“ حسن نے چپتے ہوئے کہا۔

”گہی بات ہے نا، میری تو لگے گی۔“ ماریہ مصنوعی ہنسی بٹپتے ہوئے بولی۔ وہ صرف میرے ساتھ ایسا رو بہ کتھی تھی کہ وہ کوئی ایسا موقعہ ضائع

نہیں کرتی تھی جب مجھ پر وہ طنز پر جملوں، ہنک آمیز فقروں اور تھیک والی باتیں نہ کرے۔ وہ بے چاری مجبور تھی اور مجھے اس پر ترس آیا کرتا تھا۔ وہ

اس وقت مخالف یکپ میں تھی اور اپنی طرف سے میری تھیک کر رہی تھی۔

”بات گہی ہے یا جموٹی، آپ کو بہر حال دخل نہیں دینا چاہیے“ چیف رپورٹر نے برمانتے ہوئے کہا تو وہ بڑی دلیری سے بولی۔

”اقبال صاحب! آخر یہ ہمارے کوئی گے ہیں، اس پر ہم تبصرہ نہیں کریں گے تو کون کرے گا؟..... آپ مجھے نہیں روک سکتے۔“

”کل اگر آپ کو شو بیز رپورٹنگ کرنے کے لیے کہہ دیا گیا تو ہلکا.....؟“ وہ تیزی سے بولا۔

”تو کوئی بات نہیں۔ میں جا ب چھوڑ دوں گی لیکن اسے انا کا مسئلہ نہیں بتاؤں گی جیسا کہ یہ اس وقت بنائے بیٹھے ہیں۔“

”پھر کیا ہونا چاہیے، ماریہ جی.....؟“ حسن نے جلدی سے کہا۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”اگر ان میں جاننا ہے تو یہ اپنی سیاست والی سیٹ ہی لیس ورنہ کسی اور اخبار میں چلے جائیں اور اگر کہیں اور جگہ نہیں ملتی تو مجھ سے کہیں، انہیں نوکری دلوادوں گی۔“ آخری لفظ کہتے ہوئے اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ میرے لبوں تک چند لفظ سررائے لیکن میں نے انہیں وہیں دفن کر دیا اور کچھ نہیں بولا۔ چیف رپورٹر نے اس کی بات کو نظر انداز کیا اور میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”ایک قائل کا مرس رپورٹر کو ضائع کرنے پر مجھے افسوس ہو رہا ہے لیکن اب جو سلیم نے کہہ دیا ہے وہ قائل تو نہیں، میں مالکان سے بات کروں گا۔“

”کوئی ضرورت نہیں، وہ اگر اپنی پلاننگ سے مجھے شوہر کی طرف لے آنا چاہتا ہے تو میں اسے مجبور کروں گا کہ وہ مجھ سے درخواست کرے کہ میں اپنی سیٹ کی طرف آ جاؤں اور۔۔۔“

”تب تک مواضع اور میراجوں کے قصیدے لکھوں گا۔“ ماریہ میری بات کا سٹے ہوئے زور سے ہنس کر بولی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

”ماریہ اود لوگ بھی فنکار ہیں، فنکار کی حوصلہ افزائی کرنے کا مقصد فن کی قدر افزائی ہوتی ہے، تم بھی فنکار ہو۔“

”میرے اور ان کے فن میں بہت فرق ہے۔ یہ آپ کی گھنیا سوچ ہے جو آپ نے میرے فن کو ان کے فن کے ساتھ لا کڑا کیا ہے۔ میں جسم اور ادا نہیں چھٹی، قلم مزدوری کرتی ہوں۔ آپ جنہیں فنکار کہہ رہے ہیں، ہمارے معاشرے میں یا ہماری معاشرتی اقدار میں ان کی حیثیت شوہنیں جیسی ہی ہے۔ کوئی بھی ایڈیشن اٹھا کر دیکھ لو، کیا اس میں فن زیر بحث ہوتی ہے؟“

”میں تم سے بحث نہیں کرنا چاہتا، ماریہ! لیکن ایک بات ضرور کہوں گا۔ تمہاری مخالفت مجھے حوصلہ دیتی ہے۔ تم مخالفت کرتی رہنا ورنہ میں سمجھوں گا تمہاری ساری صلاحیتیں سلب ہو گئیں ہیں۔“ یہ کہہ کر میں رک گیا۔ اس کا چہرہ سن ہو گیا تھا۔ وہ ایک تک میری طرف دیکھتی چلی جا رہی تھی۔ پہلی بار میں نے اس سے سخت لہجے میں بات کی تھی اسے یقین ہی نہیں آ رہا تھا کہ میں یوں بھی، اس لہجے میں ڈانٹ سکتا ہوں۔ تبھی میں نے ذرا سے سخت لہجے میں کہا۔ ”اب اٹھو اور اپنی سیٹ پر جاؤ، ہمیں بات کرنے دو۔“

وہ چند لمبے اسی طرح میری طرف دیکھتی رہی، پھر اپنا پرس اور موبائل فون اٹھا کر اپنی سیٹ پر جا بیٹھی۔ ماحول قدرے جھنجھٹا سا گیا تھا۔ میں چند لمبے خود کو معمول پر لانے کے لیے خاموش رہا تبھی حسن اٹھتے ہوئے بولا۔

”چلو پرس کلب چلتے ہیں، وہاں آرام سے بات ہوگی۔“

”ڈونٹ وری، شجاع! میں دیکھتا ہوں۔“ چیف نے میری دیکھ کر کہا۔

”لیکن جو میں نے کہا ہے، ویسے آپ گواہ رہنا کہ شروعات آپ کے ایڈیٹر کی طرف سے ہوئیں ہیں۔“

”ہاں، یہ تو ہے، میں نثار شاہ سے کہہ دوں گا کہ وہ تمہاری مدد۔۔۔“

”نہیں، مجھے مدد نہیں چاہیے، میں خود دیکھ لوں گا۔ آپ کی آفر کا بہت شکریہ۔“ میں نے کہا اور رپورٹنگ سیکشن سے اٹھ آیا اور پھر ہم دفتر

سے باہر آگے۔

”بہت سوچ کر اس نے پلاننگ کی ہے۔“ حسن کے ساتھ گاڑی میں بیٹھتے ہوئے میں نے کہا۔

”وہ تو ہے لیکن کچھ کچھ تو کرنا ہی تھا اس نے۔۔۔“ حسن بولا۔

”مگر اس طرح کی توقع نہیں تھی، لگتا ہے، اس کے ذہن میں پہلے سے ہی تھا۔“ میں نے اپنی رائے دی۔

”پہلے سے تو شاید نہ ہو۔“ اس نے سوچتے ہوئے لہجے میں کہا، پھر چیزی سے بولا۔ ”اس کے اس سیٹ پر ہونے کی بھی تو توقع نہیں تھی۔

مجھے کچھ معاملہ ہی اور لگتا ہے، خیر دیکھا جائے گا جو بھی ہوگا، جان ہی۔!“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں بھی ذہن پر چھائی مکدر رخسار کو جتانے لگا۔

گاڑی مال روڈ پر آگئی تھی۔ حسن نے ٹیپ کا بنی آن کر دیا تو ہلکی موسیقی گاڑی میں پھیل گئی۔ چند لمبے ہم میں خاموشی رہی، جس میں مجھے یاد آیا تو میں نے

پوچھا۔ یونہی باتیں کرتے ہم پریس کلب پہنچ گئے۔ ہم آگے پیچھے سیزیاں اتر رہے تھے کہ صین سامنے کی سیٹ پر جاہد کو نڈل قہقہہ لگا تاہو، نظر آیا، اسی

لمبے حسن نے ہلٹ کر میری طرف دیکھا اور انتہائی خوشگوار لہجے میں بولا۔

”ہو، جان جی اتھاری مشکل حل ہوگئی، کونڈل کو دیکھ رہے ہو؟“

”میرے ذہن میں بھی یہی آیا ہے۔ خیر، چلو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور اگلی سیزمی اتر گیا۔

کونڈل چند سال پہلے ہی اخباری دنیا میں آیا تھا۔ یونیورسٹی سے اردو میں ماسٹر ڈگری لی ہوئی تھی، بہت ذہین اور باصلاحیت شخص تھا۔ وہ

آتے ہی شوہر کی طرف چلا گیا اور وہاں کچھ ایسا کھویا کہ پھر اس نے ادھر ادھر نہیں دیکھا۔ شوہر کے حوالے سے صحافتی دنیا میں اس کا ایک نام تھا اور وہ

ہمارے بڑے اچھے دوستوں میں شمار ہوتا تھا۔ کچھ دیر پہلے کی گرم دماغی میں اس کا نام ذہن میں آیا ہی نہیں تھا۔ شاید شہنشاہی سے دماغ سے سوچنے پر اسی کا

نام سب سے پہلے میرے ذہن میں آتا، ہمیں دیکھتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اور خالص لاہوری انداز میں بڑی گرمجوشی سے ملا۔ ”او، آئیے صاحب جی!

کہاں تم ہو گئے ہو، میں نے تو سنا ہے کہ ملک کا نظام تم ہی چلا رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں خوشگوار مزاح تھا۔

”بس یار وہ بھائی صاحب کی وجہ سے مصروف ہو گیا تھا یار۔“ میں نے مسکراتے ہوئے بتایا اور ساتھ ہی صوفے پر بیٹھ گیا، حسن اس کی

دوسری جانب جا بیٹھا۔ کچھ دیر ہم میں یونہی گپ شپ چلتی رہی، پھر حسن نے ہی کونڈل سے کہا۔

”اوائے، کونڈل اپنا شہنشاہ بھی اب شوہر کرے گا۔“

”ہائیں، وہ کیوں بھئی، تمہیں کیا ضرورت ہے خواہ تو واہ ادھر گنڈ۔۔۔“

”بات یہ نہیں ہے۔“ میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا اور پھر مختصر سے انداز میں سلیم فارانی کے رویے اور منافقت کے بارے میں اسے بتا

دیا۔ وہ حیران رہ گیا۔

”کمال ہے، یار اسے تو تم سے دوستی رکھنا چاہیے۔“ وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولا۔ پھر سر جھٹک کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کوئی مسئلہ

نہیں، ڈوٹ ڈری۔ تم جیسا با اعتماد اور ذہین شخص ہمتوں میں نہیں، دونوں میں سب کچھ سمجھ جائے گا۔ کہو تو میں سب کچھ تمہارے لیے کر دیا کروں گا، سب

لوگوں سے بھی طواووں گا اور۔۔۔" وہ پر ہوش تھا، میں نے نوکتے ہوئے کہا۔

"گوندل! مسئلہ شوہر کو فقط سمجھنا اس کی رپورٹنگ ہی نہیں اور نہ ہی یہ کہ میری فلم کے لوگوں سے جان بچان نہیں ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ سلیم یہ نہ سمجھے کہ میں کچھ نہیں کر سکا۔ میں دھانسو کا کام چاہتا ہوں۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں اس شعبہ میں رہوں گا نہیں لیکن وہ جسے میری کمزوری سمجھ رہا ہے، میں اسی سے ہی اسے پریشان کر دینا چاہتا ہوں۔"

"یہ ہوئی نا، بات، مجھے بھی کئی لوگوں سے خار ہے۔" وہ آنکھ مارتے ہوئے بولا۔ "میری مجبوری ہے کہ میں ادھر ہوں، مصطلحتیں آڑے آ جاتی ہیں۔ اب مزا آئے گا۔"

"جان جی! کام واقعی دھانسو ہونا چاہیے۔" حسن نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"میں نے کہا نا، کوئی مسئلہ نہیں، زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ، میری جان اٹھل ایک ہفتہ، تم سب سمجھ جاؤ گے۔ میں ہوں نا، بس ایک ہفتہ برداشت کرو۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ پھر شوخ انداز میں بولا۔ "تم میں ایک اضافی خوبی ایسی ہے جس سے تم بڑا کام لے سکتے ہو۔"

"وہ کیا؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"سو بنے منڈے ہونا، بڑی نیکیں گی تم پر، سنبھل کر رہنا۔" اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا

"اس معاملے میں یہ رویش ہے۔" حسن نے اونچے سر میں قہقہہ لگایا تو میں بھی ہنس دیا۔

"اچھا چلو، چھوڑو، کچھ کھانی لیا جائے۔" میں نے دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

"کافی یا چائے بنتی ہے تو پی لو۔ آج پہلے دن ہی میں تمہیں ایک ایسی خاتون سے ملواؤں گا جس کی جڑیں فلم انڈسٹری میں بڑی مضبوط ہیں، کھانا وہ ہیں کھائیں گے۔" گوندل نے کہا تو حسن مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

"بات سن اوئے، جان جی، بندہ بڑا صاف ستھرا ہے، خیال رکھنا۔"

"اب اس کے خیال کرنے والے بہت ہو جائیں گے، جان جی۔" گوندل نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا تو میں ہنستے ہوئے کہا دیا

"کھانا کیا وہاں ضروری ہے، ہم کیوں؟"

"ارے، درویش صاحب! ہارٹس میں لکھو گے تو بھیگنا پڑے گا۔ وہ کہتے ہیں ناک یا تو ماحول کو اپنی پسند کے مطابق کر لیا پھر ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر لو جیسی کامیابی ممکن ہے۔ اس دنیا کے انداز بڑے نرالے ہیں، آگے دیکھو گے تو بڑے انکشاف ہوں گے۔ مضمونی سی شناسائی کبھی بڑا فائدہ دے جاتی ہے اور کبھی بہترین جاننے والے جڑیں تک کاٹ دیتے ہیں۔ یہ اندھیروں کی دنیا ہے۔ کب، کس وقت، کون کیا کر دے، کچھ معلوم نہیں ہوتا۔" گوندل واقعی پوری سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، سچی حسن نے کہا۔

"چل اٹھ، کافی ڈانٹنگ ہال میں جا کر پیٹے ہیں۔"

گوندل کے ملنے سے میرے دماغ میں جو جھگڑا چل رہے تھے، یکدم پرسکون ہو گئے۔ اس کا اندازہ بالکل صحیح تھا کہ مجھے محض ایک ہفتہ

چاہیے تھا۔ کافی کا آرڈر دینے سے پہلے اس نے اسی خاتون کو فون کر کے بتا دیا کہ وہ آرہا ہے اور پھر ہم آئے سامنے بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔ انہی باتوں کے دوران میرے ذہن میں ایک ایسا خاکہ ابھر آیا جس سے میں سلیم کو بہت بہتر انداز میں جواب دے سکتا تھا۔ میں نے اس ابتدائی خاکے کو اپنے ذہن کے نہاں خانوں میں محفوظ کر لیا تاکہ بعد میں پورے سکون سے اس پر سوچ سکوں۔

”میں چلتا ہوں، یار۔“ کافی پیتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

”دیکھو اب دماغ کو ذرا مضطر ہی رکھنا، جیسے ا“ میں نے اسے سمجھایا۔

”فکر نہیں کرو، جان جی! اللہ حافظ۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم بھی مل دے کر باہر آگئے۔ میرے

پاس بائیک نہیں تھی، وہ وہیں دفتر کی پارکنگ میں تھی۔

”اب کیا پروگرام ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نیلیم کی طرف چلتے ہیں۔ میں نے اسے کہہ دیا ہے کہ ہم آرہے ہیں۔“ گوئدل نے کہا۔

”تو چلو پھر۔۔۔“ میں نے کہا تو وہ پارکنگ سے اپنی گاڑی نکالنے چل دیا۔ پھر ہم دونوں نیلیم کے گھر کی طرف چل دیے۔ ہمارا سفر ماڈل

ٹاؤن کی ایک بڑی سے کوشی کے سامنے جا کر ختم ہوا۔ چونکہ ایشیا گوئدل کو جانتا تھا اس لیے کسی تکلف کے بغیر ہم اندر چلے گئے ایک بڑے سے خوبصورت بچے ہوئے ڈرائنگ روم میں بیٹھتے ہی میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”یار! یہ نیلیم وہی ہے نا، جو ماضی کی ایک مقبول اداکارہ رہی ہے اور اس کا بیٹا آج کل فلموں میں ہیرو آرہا ہے؟“

”ہاں، بالکل وہی ہے۔“ گوئدل نے تصدیق کر دی۔ میں شاید اور بات کرتا مگر اسی لمحے ایک سوئی سی، سانولے رنگ کی خاتون مسکراتی

ہوئی ڈرائنگ روم میں آگئی۔ اس کے انداز میں اک و قار تھا۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں اب بھی زندگی کے وہ رنگ ابھرا رہے تھے جنہیں ماضی کا پر تو کہا جاسکتا تھا۔ وہ آتے ہی بولی۔

”آئیے، گوئدل صاحب! کیسے یاد کر لیا نہیں؟“ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور پھر سامنے صوفے پر بیٹھتے ہوئے غور سے میری جانب

دیکھا۔ میں نے واضح طور پر اس کی آنکھوں میں چمک دیکھی جو عموماً مجھ کو کچھ کرایک خاص قسم کی عورتوں کی آنکھ میں آجاتی ہے۔ نیلیم تو پھر ایک ایسی دنیا سے تعلق رکھتی تھی جہاں عورت عکرائی کے خواب دیکھا کرتی ہے۔ یہ عکرائی دلوں پر ہی نہیں، اعصاب پر بھی ہوتی ہے۔ اگرچہ اس نے مجھے نظر انداز

کیا تھا لیکن اس کی آنکھیں مجھ میں دلچسپی کے راز کھول گئی تھیں، اس کی شدت کا اندازہ میں نے اس بات سے لگایا کہ وہ یہ بات چھپا نہیں پائی تھی۔ گوئدل اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگا۔ ان باتوں کو محض چند منٹ گزرے ہوں گے کہ نیلیم نے پہلو بدلا اور میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”میرا

خیال ہے، یہ صاحب کبلی ہارٹشریف لائے ہیں؟“

”جی، آپ کا خیال بالکل ٹھیک ہے، آپ شجاع ہیں۔ حضرت اچھے خاصے صحافی ہیں لیکن اب ان پر عقاب یہ ہے کہ آپ شو بزد کریں گے۔“

”او تو آپ صحافی ہیں؟“ نیلیم نے قدرے حیرانگی سے کہا، پھر جلدی سے بولی۔ ”یہ عقاب کیوں؟“ میری توقع کے عین مطابق اس نے

سوال کر دیا تھا۔ کہیں گوندل اسے زود ادھی نہ سنانے لگ پڑے۔

”جی، میں صحافی ہی ہوں۔ آپ نے کیا سمجھا تھا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میں سمجھی کہ شاید اداکاری کا شوق رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں ہی آپ مجھ سے ملنا چاہ رہے ہیں۔ اکثر ہوتا ہے کہ ایسے لڑکے لڑکیاں کسی

حوالے سے آجاتے ہیں اور پھر ماشا اللہ آپ ویل ڈریسنگ ویجیہ۔۔۔“

”۔۔۔ اور باقی رہی شوہر کے حجاب والی بات تو بس ایسے ہی دماغ میں آگیا کہ یہ تجربہ بھی کر دیکھیں۔ بندے کو ورطائل ہونا چاہیے۔“

”ہاں، یہ تو ہے۔“ نیلم نے کہا۔ پھر بولی۔ ”کافی پڑھے لکھے معلوم ہوتے ہیں آپ۔۔۔؟“

گوندل ہنستے ہوئے بولا۔ ”یہ صحافی نہ ہوتا تو کسی یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوتا، پتہ نہیں، کس نے اسے مشورہ دیا کہ یہ اخباری لائن میں

آجائے۔“

”خیر، صحافت کوئی ایسا پیشہ تو نہیں جسے کم درجے کا شمار کیا جائے۔ میں تو کہتی ہوں کہ بیٹرو، بے باک اور لیرو لوگوں کا پیشہ ہے۔ گوئی جب

چلتی ہے تو پکڑ لوں ہوا پناہ جو کھوٹھکتی ہے، کھنے والوں کے لفظ تو تاریخی اعتبار سے بھی عبرت ہو جاتے ہیں“ وہ چند لمحوں جیسے، ہنسی میں جھانکتی رہی،

پھر اچانک بولی۔ ”جی، یہ اس طرف آئے ہیں تو خوشی ہے کہ پڑھے لکھے لوگ ادھر آئے، ویسے شوہر اتنا وسیع یا پھیلا ہوا شعبہ نہیں جس میں بندو

بہت آگے نکل جائے۔“ نیلم نے گویا معلومات دیں۔

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں اور پھر خصوصاً اپنے ملک کا شوہر تو اور بھی محدود ہے۔“ گوندل نے کہا۔

”ہاں، ایسا ہی ہے۔“ نیلم نے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ ہم سے جو بھی خدمت بین پڑی،

ضرور کریں گے۔“

”بہت شکریہ، میڈم۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ سچی ایک تو فیزی لڑکی ہاتھوں میں ٹرے قہارے ڈرائنگ روم میں آئی، ٹائمنس کے

ساتھ سیلو لیس بلاؤز پہنے ہوئے تھی۔ لمبے بال شانوں پر پھیلائے ہوئے اور پاؤں میں نہایت سبک سلپہر تھے۔ ایک انجان سی مسکراہٹ اس کے

ہونٹوں پر کھیل رہی تھی۔ اس نے بڑی ادا سے ٹرے گوندل کے سامنے رکھ دی اور اسی سبک خرامی سے واپس چلی گئی۔

”اسکی بہت ساری“ چیزیں“ یہاں ہوتی ہیں“ نیلم نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے جھینپ سا گیا، اس نے میری نظروں کا تعاقب کر لیا تھا،

پتہ نہیں، وہ کیا سمجھی اور میری نگاہوں کا اس نے کیا مطلب اخذ کیا تھا؟ گلاسوں میں سوڈا تھا، گوندل نے اٹھایا تو میں نے بھی گلاس تمام لیا۔ پھر بات

انہی لڑکیوں سے شروع ہوئی اور فلم انڈسٹری تک جا پہنچی۔ ڈیجیٹل ساری باتیں ہوئیں۔ اس دوران دو پہر کا کھانا بھی کھا لیا گیا۔ جب ہم وہاں سے

رخصت ہونے لگے تو نیلم نے کہا۔ ”شماغ! پھر کہوں گی کہ آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی اور اچھا ہوا، آپ آج میرے ہاں تشریف لے آئے۔ کل ہی

میرے ایک محد دوستی پارٹی ہے۔ آپ بھی ضرور آئے گا، گوندل تو ہوا گا۔۔۔“

”جی، میں ضرور آؤں گا۔ اب اجازت۔۔۔“ میں نے کہا۔

”او کے خدا حافظ!“ اس نے کہا تو ہم وہاں سے نکل آئے

نیلم کی باتوں سے مجھے ایسی بہت ساری باتیں معلوم ہوئی تھیں جن کا اگر میں تعاقب کرتا اور ان پر تھوڑی محنت کر لیتا تو اپنے مطلب کے کام کی شروعات کرنے میں کوئی مشکل نہیں تھی۔ نیلم نے بہت اچھا رسپانس دیا تھا اور انہی باتوں کے باعث میں پراحتاً وہی ہو گیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میں بہت جلد اس ماحول سے نہ صرف مانوس ہو جاؤں گا بلکہ سب کچھ کر سکوں گا جو میرے ذہن میں تھا۔ گونڈل مجھے دفتر چھوڑ کر چلا گیا۔ اس نے مجھے رات سنوڈیو آنے کو کہا، وقت اور جگہ بھی بتائی جہاں وہ آسانی سے مجھے دستیاب ہو سکتا تھا۔

میں اپنے فلیٹ سے سنوڈیو کے لیے نکلا تو رات کا اندھیرا ٹھیک چکا تھا۔ میرے پاس وقت بہت تھا۔ میں کم رفتار سے گاڑی چلاتا اور دھیمے سر میں کوئی گیت گنگنا تا اس سنوڈیو کی جانب چل پڑا جہاں مجھے گونڈل نے ملنا تھا۔ میں پہلی بار وہاں جا رہا تھا اس لیے اک ذرا سی جھجک بھی میرے اندر تھی۔ اسی جھجک کو دور کرنے کے لیے میں نے انہی سے متعلق ایک وزیر کا فون سنوڈیو کے مالک کو کروا دیا۔ تاکہ اگر گونڈل مجھے نہ بھی مل سکے تو کم از کم میں اپنے طور پر کام کا آغاز کر سکوں۔

میں اسی آہستہ روی سے سنوڈیو کا گیت پاد کر گیا۔ سامنے ہی پارکنگ میں مجھے گونڈل کی گاڑی کمزری نظر آئی، اس کے ہونے کے احساس سے میں پرسکون ہو گیا کیونکہ ایک وہی تھا جو وہاں پر مجھے جانتا تھا اور نہ وہاں سب میرے لیے انتہائی تھے۔ میں نے پارکنگ میں گاڑی لاک کی اور عمارت کے اندر چلا گیا۔ وہ عین سامنے چہترے پر کچھ لوگوں کے ساتھ کمزرا گیت کی طرف ہی دیکھ رہا تھا، مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ مطمئن سا دکھائی دینے لگا۔ میں آہستہ قدموں سے چلتا ہوا اس کے پاس جا پہنچا۔ وہاں کبھی شو بزرگ پورٹرز تھے اور ان کا تعلق مختلف اخباروں، رسالوں اور ٹیوزا مجینوں سے تھا۔ اپنے اپنے انداز سے ہر کوئی ملا۔ اس تعارف کے بعد ایک خوشگوار فضا ہمارے درمیان بن گئی تھی۔

”زیادہ دیر تو نہیں ہوئی مجھے آنے میں؟“ میں نے گونڈل سے کہا۔

”نہیں، بس ابھی کچھ دیر پہلے ہی آیا ہوں اور شکر ہے کہ تم وقت پر آ گئے ورنہ ہمیں ایک دوسرے کو تلاش کرنا پڑتا“

”یہ کون سا ہالی وڈ ہے جہاں۔۔۔“ ایک چہرے بدن کے لڑکے نے مسکرتہ انداز میں فقرہ ادا کرنا چھوڑ دیا جس پر سبکی ہنس دیئے۔ اس لڑکے کا نام ندیم تھا، تعارف کے دوران ہی وہ مجھے اپنے پہلے تاثر میں سب سا لگا تھا۔ کاپی نظر میں یوں گمان ہوتا تھا جیسے وہ بگ بگ دہنسی ہو۔ پھر کچھ ایسی ہی باتوں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ اس دوران ایک رپورٹرز شیدول دیکھا آیا کہ کس ہال میں فلم کی شوٹنگ ہونا ہے۔ اس رات صرف ایک سیٹ پر شوٹنگ تھی۔ سب ہی کا خیال تھا کہ وہ خاصی دیر سے شروع ہوگی۔

”آؤ، شجاع! تمہیں سنوڈیو کے مالک سے ملوؤں“ گونڈل نے میری خواہش پر کہا اور چہترے سے اترنے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ ان میں صرف ندیم ہمارے ساتھ آیا، باقی سب ادھر ادھر بکھر گئے۔ سنوڈیو کے مالک کے دفتر تک پہنچے تو گونڈل آگے تھا، وہ بلا جھجک بغیر دستک دیئے اس کے آفس میں جا گھسا۔ وہ اکیلا نہ تھا، اس کے ارد گرد چند لوگ بیٹھے ہوئے تھے جن میں دو چار خواتین بھی تھیں اور خواتین میں اس دور کی سب سے مقبول ترین ہیروئن ماہی موجود تھی۔

”آئیے، گونڈل صاحب!“ سٹوڈیو کے مالک نے کمرے ہو کر ہمارا استقبال کیا، پھر باری باری ہم سے ہاتھ ملاتے ہوئے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میری جانب دیکھ کر مسکرایا تھا۔ جس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ وزیر کا فون کارآمد ثابت ہوا ہے۔ سٹوڈیو کا مالک خاصا خوش لباس اور خوش اخلاق لگ رہا تھا، فریج کٹ واڈھی اس کے چہرے پر خوب بچ رہی تھی۔ ہمارے آنے سے پہلے شاید وہ لوگ بھی عام سی گفتگو ہی کر رہے تھے کیونکہ کسی کے چہرے پر بھی کوئی تاؤ نہیں تھا اور نہ ہی کوئی گفتگو شروع ہوئی بلکہ میرے تعارف کے بعد یونیورسٹی کی باتیں شروع ہو گئیں اور پھر فلم انڈسٹری کے بحران اور مشکلات کا ذکر چل پڑا۔ ہر کوئی اپنے طور پر اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ اس سے نفا خاصا بے تکلف ہو گئی اور گفتگو میں مزہ آنے لگا۔ میں ان سب کی سنتا رہا، وہ ہیں مجھے احساس ہوا ہوا اپنی بات انگریزی میں ہی کر رہی تھی۔ میں نے ہا کے لہجے اور انگریزی بولنے کے انداز پر غور کیا تو تجھ نے کیوں مجھے یہ احساس ہوا کہ وہ محض فیشن کے طور پر یا پھر مرحوب کرنے کی خاطر ہی انگریزی بول رہی ہے۔ اب تک چونکہ وہی لوگ بول رہے تھے اور میں چپ تھا اس لیے محض سوچ کر رہ گیا کہ ان دنوں اک فیشن چل نکلا تھا کہ فلمیں دوسرے ممالک میں جا کر بنائی جائیں۔ اس بارے میں بہت سی باتیں سننے کو ملی تھیں کہ فلمیں غیر ممالک میں بنانے سے فلم ساز کو کیسا اور کس قدر فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ چونکہ میری دلچسپی نہیں تھی اس لیے کبھی میں نے اس پر دھیان نہیں دیا تھا۔ ہا کی انگریزی سے مجھے لگا جیسے اس نے باقاعدہ سیکھی ہو کیونکہ اس کی گفتگو کے پیچھے کوئی علیحدت یا قابلیت نظر آ رہی تھی جو کم از کم مجھے کھلے کھلے رسی تھی۔ انگریزی بولنے کی ایسی بھی کیا مجبوری؟ میں یہ سب سوچ رہا تھا کہ سٹوڈیو کے مالک نے پوچھا۔

”شجاع صاحب! آپ بتائیں، آپ اس پر کیا کہتے ہیں؟“

مجھے اس وقت ذرا بھی اندازہ نہیں ہوا کہ یہ سوال اس نے کس مقصد کے تحت کیا تھا۔ وہ واقعی فلموں کے بارے میں میری رائے جاننا چاہ رہا تھا یا پھر یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ میں شو بیز میں وارد تو ہو گیا ہوں، کوئی شد بد بھی ہے اس معاملے میں؟ میرے ذہن میں فوراً جو بے لاگ تبصرہ آیا تھا، اس سے یا جو بھی میں کہتا، اس سے وہ صراحت متعین کر سکتے تھے اس لیے میں نے کسی بھی طرح کی رائے دینے سے احتراز کیا، بس یونیورسٹی مولیٰ ہی چند باتیں کہہ دیں جس میں فلم کے ہر پہلو کو بہتر بنانے اور خصوصاً اداکاری کے معیار کو بلند کر کے نئے چہروں کو متعارف کرانے کی بابت ذکر کیا۔ پڑھے لکھے تکنیک کاروں اور دیگر شعبوں میں تسلیم یافتہ لوگوں کی ضرورت کو محسوس کیا۔ میرا خیال تھا کہ یہ ایک آرٹ ہے اور اسے اسی حوالے سے ہی پیش کرنا چاہیے، محض پیسہ کما ہی مقصد نہیں ہونا چاہیے۔ اس وقت میں نے کچھ اور باتیں بھی کہیں۔ میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ ہا نے منہ بناتے ہوئے قدرے قہقہے آمیز لہجے میں انگریزی زبان میں ہی کہا۔

”آرٹ ایک الگ چیز ہے اور پڑھا لکھا ہونا ایک الگ خصوصیت۔۔۔ فنکار نے تو وہی کرنا ہوتا ہے جو اس سے کہا جائے۔ پھر آپ صحافی حضرات ہی تو اسے فن کی بلندیوں کا نام دے دیتے ہیں۔ آپ لوگ بھی تو بے جا تعریف اور بے جا تنقید کرتے ہیں۔ معاف کیجیے گا، آپ لوگ بھی اس فن سے واقف نہیں ورنہ یونیورسٹی انٹرویو نہیں لکھا جاتا ہے۔ پہلے آپ تو سیکھیں اور جائیں کہ فن ہوتا کیا ہے؟“

میں اس کی بات سن کر مسکرایا۔ میں اب تک اردو میں ہی بات کر رہا تھا لیکن ہا کو جواب دینے کے لیے میں نے انگریزی میں کہا۔

”میڈم! میں جانتا ہوں کہ فن کیا ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر مجھے ان پر عبور نہیں تو ہرن فن کے بارے میں معلومات ضرور رکھتا ہوں۔ میں

نے آپ کی بھی دو ایک قسمیں دکھائی ہوئی ہیں۔ اگر میں انہیں فن کے اسی معیار پر رکھوں تو آپ صفر بھی نہیں ہیں۔ اداکاری کیا ہوتی ہے، اس بارے میں آپ کچھ نہیں جانتیں۔ مردوں کو لکھنا، ڈانس کے نام پر اچھل کود اور اداکاری، سب مختلف چیزیں ہیں۔“

”عوام کیا چاہتی ہے، ان کا معیار کیا ہے، ہم اس پر پورا اتر رہے ہیں۔ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں اور میرے نام پر فلم بھی ہے۔ میری اس کامیابی کو آپ کس کھاتے میں ڈالیں گے؟“

”کیا آپ یقین سے کہہ سکتی ہیں کہ آپ محض اداکاری کے بل بوتے پر ہی یہ کامیابی حاصل کر پائی ہیں یا اور بہت ساری دیگر وجوہ کی بنا پر؟“

”یہ حقیقت ہے کہ میں کامیاب ہوں، میری تعریف کرنا تم صحافی لوگوں کی بھجوری ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟“ ہانے کہا اور میں اس کا جواب دینا ہی چاہتا تھا کہ چائے لا کر رکھ دی گئی۔ اک ذرا سی پلٹل پیدا ہوئی تو وہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ میرے سامنے کپ رکھا گیا تو سٹوڈیو کے مالک نے بندے نہیں انداز میں کہا۔

”پلیز، لیجیے۔۔۔“

”شکریہ۔۔۔“ میں نے کہا اور چائے کاسپ لے لیا، جی سٹوڈیو کا مالک بولا۔

”مجھے خوشی ہے کہ آپ بہت اچھی لکھنو کر رہے ہیں۔ آپ کی باتوں سے بہت سارے سوال میرے ذہن میں پیدا ہو گئے ہیں۔“

”کہیں۔۔۔؟“ میں نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”وہی سوال کہ آپ کے نزدیک فلم کیا ہے یا آپ اسے کس انداز سے لیتے ہیں؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

”دیکھیں، فلم مختلف فنکاروں کے باہمی اشتراک سے تخلیق کیا جانے والا ایسا عمل ہے جس میں فن کے تمام وسیلوں کو یکجا کر دیا جاتا ہے۔ اصولاً اسے موثر، طاقتور اور حقیقت پر مبنی ہونا چاہیے اس فن کی نسبت جس میں محض ایک وسیلہ پر بھروسہ کیا جاتا ہے، ایسا فلم کے اس میڈیم کو طاقتور ہونا چاہیے اور ہوتا بھی ہے لیکن جہاں عمل اور شعور سے کام لیا گیا ہو جبکہ ہمارے ہاں ایسی صورت حال نہیں ہے۔“ میں نے آہستہ اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔

”مجھے یہ کچھ نہیں آیا کہ آپ فن کو کس طرح لیتے ہیں؟“

”فن، حقیقت کا عکاس ہوتا ہے۔ اب حقیقت تلخ ہے یا شیریں، بحث اس سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہے۔ حقیقت کو اس انداز سے پیش کرنا کہ وہ اثر رکھتی ہو“

”آپ حقیقت سے کیا مراد لیتے ہیں؟“ ایک اور مولے سے شخص نے پوچھا۔

”میری ہماری چلتی ہوئی زندگی۔۔۔ فنکار اسی زندگی کی نمونوں اور کھردری حقیقتوں کو اپنے تصور اور تخیل کے سانچوں میں یوں ڈھالتا ہے کہ حقیقت مسخ بھی نہ ہو اور پورا پورا اظہار ہو جائے۔ اب وہی فن سب سے زیادہ موثر یا عقیم ہوگا جو زندگی کے قریب ترین ہوگا۔ میرے نزدیک فن زندگی سے بحث کرتا ہے۔“

”ہمارے ملک کی فلمیں آپ کے معیار فن پر تو پورا نہیں اترتیں؟“

”بالکل نہیں، وہی ایک روایتی انداز۔ ہیرو، ہیروئن اور ولن اور اس کا ماحول ہماری جیتی جاگتی زندگی سے ذرا بھی تعلق نہیں رکھتا۔ سبھی فلمیں محض تخیلاتی دنیاؤں پر بنائی جاتی ہیں، ان کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا سو فی فن کی گھٹیا ترین صورت ہے۔“

”یہاں میں آپ سے اختلاف کرتا ہوں۔“ اسی موٹے شخص نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا، پھر بولا۔ ”ہالی وڈ میں تخیلاتی فلمیں بنتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں اور آپ کے کہنے کے مطابق بڑی موثر بھی ہوتی ہیں۔ اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟“

”آپ بات کو اپنے دیس کی فلموں سے باہر لے جا رہے ہیں۔ اس کی نوعیت کچھ اور ہے آپ ہی مجھے بتائیں کیا ہماری فلمیں عالمی لیول کی ہیں؟ اگر ایسا ہے تو ہم اس تناظر میں بات کرتے ہیں، ورنہ موضوع کو اپنے دیس کی فلموں تک ہی محدود رکھنا ہوگا۔“

”چلیں اپنے دیس کی فلمیں گھٹیا فن تخلیق کر رہی ہیں، وہ کیوں؟“

”وہ اس لیے کہ یہاں کا فنکار ایک خاص سرمایہ دارانہ ذہن رکھنے والے نولے کے ہاتھوں بلیک میل ہے جس کا لازمی اثر تخلیق فن پر پڑتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں کہ پھر لوگ ہماری فلمیں کیوں دیکھتے ہیں، کامیاب کیوں ہوتی ہیں؟“ ہانے انتہائی نخوت سے کہا۔

”کتنی کامیاب ہوتی ہیں؟“ میں نے کہا اور کوئی جواب سنے بغیر بولا۔ ”جس طبقے کے لیے آپ فلم بنا رہے ہیں اس کے پاس تفریح کا اور کوئی ذریعہ نہیں۔ وہ طبقہ مزدوروں اور کسانوں کا ہے، وہ مجبور ہے اور بظاہر مطمئن بھی۔ آپ اس کا شعور نہیں بڑھا پارہے اور آہستہ آہستہ وہ طبقہ بھی آپ کھو دیں گے۔“

”وہ کیسے کھو دیں گے؟“ شوڈیو کے مالک نے کہا۔

”وہ طبقہ یا تو ختم ہو جائے گا یا پھر پاشور ہو جائے گا۔ وہ آپ کی فلم نہیں بلکہ مارکیٹ میں موجود اور تفریح کی طرف چلا جائے گا۔ آپ کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ آپ نے انتہائی موثر ترین میڈیم کو یوں ضائع کر دیا۔“

”اچھا چھوڑیں گی اس فضول بحث کو۔۔۔“ ہانے آگتاتے ہوئے کہا۔

”ہاں! یہ بحث فضول نہیں ہے، بڑی۔۔۔“ شوڈیو کے مالک نے کہنا چاہا تو اس نے ہات کاٹ دی۔

”لیکن مجھے سمجھ نہیں آ رہی ہیں۔“ وہ نخوت سے بولی۔

”ظاہر ہے، تمہیں کیا سمجھ آئیں گی“ یکلفت اندیم بول اٹھا۔

”کیا مطلب؟“ وہ تنک کر بولی۔

”مطلب یہ ہے کہ تمہیں صرف وہی باتیں سمجھ میں آئیں گی جو نوت کی زبان میں ہوں کیونکہ تم وہی سمجھ سکتی ہو۔ اس کے لیے تمہیں جو کرنا پڑے تم کر گزرو گی۔“ اندیم نے کہا۔

”تم لوگ، دو نکلے کے صفائی مجھے ایسا کہو گے؟“ وہ دانت پچتے ہوئے بولی۔

”اے، بی بی ارہان سنبھال کر۔“ ندیم جیسے یکدم ٹھسے میں آ گیا۔

”ہاں، ہاں تمہیں زبان پر قابو رکھنا چاہیے۔“ گوندل نے بڑے قفل سے کہا۔

”مجھے کہہ رہے ہو، مجھے؟ تمہارے جیسے کئی لٹ پونچنے میرے سامنے ہاتھ پھیلائے رہتے ہیں۔“ پھر ذرا رک کر بولی۔ ”یولو، گوندل اتم

لیتے نہیں مجھ سے پیسے؟“

”لیتا ہوگا یہ پیسے۔۔۔ مگر سوال یہ ہے کہ آپ کیوں دیتی ہیں یہ پیسے؟“ میں نے جلدی سے ہات سنبھالی۔ پھر بڑے قفل سے کہا۔ ”لیکن

اب کم از کم میرے ساتھ تمہیں بہت سوچ سمجھ کر بات کرنا ہوگی۔“

”تم۔۔۔“ ہانے نخوت زدو حیرت سے کہا۔ ”تمہارے جیسے کئی آئے اور گئے اور اگر میں چاہوں تو تم خود شوہر چھوڑنے پر مجبور ہو

جاؤ۔“ اس نے گویا مجھے دھمکی دے دی جس پر بجائے مجھے غصہ آنے کے نفی آگئی۔

”مجھے پتہ ہے کہ تم کیا ہو اور تمہیں کیا ہونا چاہیے۔ میرے یہ شایان شان نہیں کہ تم جیسی عورت کے من لگوں، تاہم میرا یہ خیال ہے کہ تم

دی رہو جو ہو، جاؤ۔ کم از کم مجھ سے بات کرنے کے لیے اپنی انگریزی ٹھیک کر لو پہلے، پھر بعد میں جو چاہے سو کرنا۔“

”چھوڑیں، شجاع صاحب! ختم کریں“ سٹوڈیو کے مالک نے کہا کیونکہ اس گفتی میں فضا خاصی ٹکڑ ہو گئی تھی مگر ہاتھ بھرنے لگی تھی۔ وہاں پر بیٹھے

اس کے حاشیہ بردار یکدم ہی بولنا شروع ہو گئے تھے جس پر ہا اور ہبہ پکڑی تھی۔ گوندل چپ بیٹھا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا جبکہ ندیم پوری طرح ہر بات کا

جواب دینے کی کوشش کرتا رہا۔ چند لمحوں کے لیے تو وہ دفتر چھٹی منڈی بن گیا۔ کون کیا کہہ رہا ہے، کچھ نہیں آ رہا تھا۔ یہ طوفان بدتمیزی کم ہوا تو سٹوڈیو

کے مالک نے کہا۔

”ہا جان! آپ جاؤ پلیز“

”نہیں، پہلے اس کو نکالو یہاں سے“ اس نے میری طرف اٹلی سے اشارہ کرتے ہوئے نہایت ٹھسے میں کہا تو ندیم تڑخ کر بولا۔ ”نہانے وہ

کب سے اس پر خار کھائے بیٹھا تھا۔

”تمہارا ہاپ بھی ہمیں یہاں سے نہیں نکال سکتا۔ اگر صحت ہے تو بلا لو، جس کو بھی بلانا ہے۔ تم نے ہمیں سمجھا کیا ہے؟“

اس دوران سٹوڈیو کے مالک نے اپنے کچھ لوگوں کو اشارہ کر دیا کہ ہا وغیرہ کو باہر لے جائیں۔ انہوں نے کوشش کی تو ہانے دروازے میں

کھڑے ہو کر ٹھسے میں کا پتے ہوئے کہا۔

”نہیں چھوڑوں گی تمہیں“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ منہ پھیر کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔ ماحول پر سکون ہوا تو اسٹوڈیو کا مالک بولا۔

”سوری۔۔۔ آپ پہلے دن میرے آفس میں آئے اور یہ“

”کوئی بات نہیں، بھول جائیں۔ میں اسے محسوس نہیں کروں گا۔“ میں نے آرام سے کہا۔

”میرا خیال ہے کہ چائے کا ایک دور اور ہو جائے“ اس نے ندیم اور گوئل کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میرا خیال ہے کہ اب ہم چلتے ہیں“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”اب تو آنا جانا لگا رہے گا اور ہم آپ سے چائے بھی پیتے رہیں گے۔“

میرے ساتھ دوسرے لوگ بھی اٹھ گئے۔ ہم نے ہاتھ ملایا اور وہاں سے آگے۔ گوئل خاموش تھا، میں نے بھی اس سے کوئی بات نہیں کی جبکہ ندیم بڑبڑاتا رہا تھا۔ دفتر میں ہونے والی تلخ کلامی کی خبر سنوڈیو میں گردش کر گئی تھی، اس کا اندازہ مجھے سیٹ پر جا کر ہوا۔ دوسرے صحافی دوست پوری بات جاننے کے لیے بڑے لگرمند نظر آ رہے تھے۔ انہوں نے کئی سوال کر ڈالے۔ میں اس معاملے میں نہیں بولا، ساری تفصیل ندیم اور گوئل نے دی۔ سیٹ پر کوئی کانٹا فلکھایا جانے والا تھا۔ چند عورتیں اور لڑکے رہبر سل کر رہے تھے۔ میں نے غصوں کیا کہ کئی نظریں مجھے حصار میں لیے ہوئے ہیں۔ میں کچھ نہ پایا کیا یا ہم سے پہلے کھینچنے والی خبر ہے یا پھر میری ذات کی وجہ سے ہے۔ میں اور گوئل بدایت کار سے تعارف کے بعد باتیں کر رہے تھے کہ چند لوگ بڑی تیزی سے ہماری طرف بڑھے، کبھی شکل سے غصے لگ رہے تھے۔ ہمارے قریب آتے ہی ان میں سے ایک بڑے ہی گندے انداز میں بولا۔

”ہماری کے ساتھ کس نے بد تمیزی کی ہے....؟“

سب کو جیسے سانپ سگھ گیا۔ میں توقع نہیں کر رہا تھا کہ اتنی جلدی اس کاری ایکشن سامنے آ جائے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ دوبارہ پوچھتا، میں نے بلائے قتل سے کہا۔

”میں نے کی ہے بد تمیزی۔۔۔ بولو، کیا کہنا ہے؟“ میرے لہجے میں کچھ تھا جس سے وہ ایک لمحہ کو جھک گیا۔ پھر جلد ہی سنبھل کر دمکی آمیز لہجے میں بولا۔

”تمہیں جرات کیسے ہوئی اُوئے“ اس نے اپنی بات ایک گندی گالی پر ختم کی تو مجھ سے نہیں رہا گیا۔ اس کے لفظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ میں نے زنانے کا تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔ شاید یہ اس کے لیے انتہائی غیر متوقع بات تھی، اس کی آنکھوں سے حیرت اُبل پڑی۔ میں لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا اور شاید میں اگلے لمحے اس پر حملہ کر دیتا کہ سنوڈیو کا مالک آن پہنچا، وہ تیزی سے تقریباً بھاگتا ہوا آیا تھا اور باپ رہا تھا۔

”کیا۔۔۔ کیا ہو رہا ہے یہ۔۔۔؟“ اس کے منہ سے بمشکل لفظ نکلے۔

”اس۔۔۔ نے۔۔۔“ اس غصے نے کہنا چاہا تو وہ بولا۔

”شٹ اپ۔۔۔ اور دفع ہو جاؤ یہاں سے۔۔۔ جانتے ہو، یہ کون لوگ ہیں؟“

”دیکھ لوں گا میں، یہ کون ہیں۔۔۔“ غصے نے قہر آلود نظریں مجھ پر ڈالیں۔

”سمجھاؤ اپنی میڈم کو کہ وہ اپنے آپ میں رہے، میں ایسے ڈرامے برداشت نہیں کر سکتا۔۔۔“ سنوڈیو کے مالک نے کہا اور پھر میری

طرف مڑ کر بولا۔ ”ویری سوری۔۔۔ مجھے میرے ملازموں نے بتایا لیکن خیر، میں وقت پر پہنچ گیا۔“

”کوئی بات نہیں، آپ مت گھبرائیں۔۔۔ ویسے آپ کا بہت شکر ہے۔“ میں نے کہا۔

”اوکے، میں چلتا ہوں۔ آپ اپنا خیال رکھئے گا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑ گیا۔ اس وقت تک میں خود پر قابو پا چکا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمارا معاملہ کواپنی انا کا مسئلہ بنائے گی۔ میں ایسی ہی سوچوں میں کھوم گیا کہ ندیم کی آواز نے چونکا دیا۔

”بڑی بات ہے، یارا پہلے ہی دن ہیرو جیسی انٹری۔۔۔“

”یہ سب اچھا نہیں ہوا۔ اس کے اثرات۔۔۔“ گوندل نے خواب ناک سے انداز میں کچھ کہتے کہتے فخر و ادھر اچھوڑ دیا۔

”کیا مطلب۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نہیں جانتے، تمہیں احساس نہیں۔۔۔ خیر، آؤ چلیں۔۔۔“ گوندل کا لہجہ افسردہ تھا۔

”بہول جاؤ کہ کیا ہوا تھا اور کل کیا ہوگا۔ اس سے پریشان نہیں ہونا۔ میں دیکھ لوں گا سب۔۔۔ چلو، اب چلتے ہیں۔“ میں نے اس کا کاندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

”مگر کھانا کھا کے میری طرف سے۔۔۔“ ندیم نے ہلدی سے کہا تو میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلی ہی نظر میں مجھے اچھا لگا تھا اور وہ بڑے غلوں سے آفر کر رہا تھا۔

”چلو۔۔۔“ میرا ہنسیہ پاتے ہی وہ خوش ہو گیا۔ وہ ہمیں فلم کے ایک دفتر میں لے گیا، وہیں کھانا منگوا دیا اور کھایا گیا۔ اس دوران بہت ساری باتیں چلتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ ندیم کے لہجے میں اک احتجاج سا ہے۔ گوندل اس دوران معاملے کے اثرات پر بہت کچھ کہتا رہا۔ میں نے سب کی سنی لیکن کوئی رائے نہیں دی۔ میں قس از وقت اپنا دماغ خراب نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ان کی باتوں سے میں متاثر ضرور ہو گیا تھا۔

میں دفتر وقت پر پہنچ گیا لیکن رات گئے گھر لوٹنے اور معمول میں انتہائی دلچسپی کی تہذیبی آجائے کی وجہ سے دماغ بہت بوجھل تھا طبیعت میں خاصی کسلندی تھی اور ہمارے ہونے والی بیچ کا لاشعوری اثر بھی تھا۔ میں رو پر تھک سیکشن میں آیا تو اگلے ہی لمحے سلیم فارانی بھی آ گیا۔ نہ اس نے مجھ سے کوئی بات کی اور نہ ہی میں نے کوئی بات کرنا مناسب سمجھی۔ یوں سٹیٹ ختم ہو گئی اور وہ چلا گیا۔ حسن میرے ساتھ والی سیٹ پر ہی بیٹھتا تھا، اس نے میری طرف دیکھا اور ہنس دیا۔

”کیا بات ہے، حسن۔۔۔؟“ میں نے اس کا مطلب سمجھنے کے باوجود پوچھا۔

”یہ تیرے سائیڈ ٹیٹر کا دماغ، جان ہی۔۔۔!“ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔

”چھوڑو اسے۔۔۔“ میں نے آرام سے کہا۔ ”تم ایک اچھی ہی جائے خواہ میرے لیے۔۔۔“

”ٹھیک ہے، میری جان۔۔۔!“ اس نے میرا موڈ دیکھتے ہوئے بیون کو چائے لانے کا کہا تو میں نے نظر دوڑائی کہ فون سیٹ کدھر پڑا ہے۔ تبھی میری نظر مار یہ پر پڑی وہ ایک تک میری طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس کی نگاہوں میں کیا کچھ تھا، میں سمجھتے ہوئے بھی سمجھتا نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے جیسے ہی اس سے لگا ہوں پھیریں تو وہ کہہ اٹھی۔

”ہیلو۔۔۔!“ میں نے کہا

”اوئے کدھر ہو پارتم۔۔۔ کوئی فون نہیں اور نہ ہی اپنے دفتر آنے کی اطلاع دی ہے؟“

”وہ پار آتے ہی بس ڈسٹرب ہو گیا۔۔۔ میں آج تمہیں فون کرنے والا تھا۔“

”خیریت۔۔۔ کیا اسٹریس ہے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اب میں شوہز۔۔۔“ میں نے کہا چاہتا لیکن بات ادھوری چھوڑ دی۔

”مجھے معلوم ہے لیکن یہ کوئی اتنی بھی مصروفیت والی جاب نہیں۔۔۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا۔۔۔؟“ میں حیران تھا۔

”یار اہم دوستوں کی خبر رکھتے ہیں۔۔۔ خیر، آج شام کیا کر رہے ہو؟“

”خیریت۔۔۔؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک چھوٹی سی پارٹی ہے، وی وی آئی پی قسم کے لوگوں کی فلم کے مگر۔۔۔“ اس نے بتایا تو مجھے یکدم یاد آیا، نیلم نے تو مجھے بھی دعوت

دی تھی۔ کیا اس نے عامر کو بتا دیا ہے کہ مجھے بھی دعوت دی گئی ہے یا یہ اپنے طور پر ہی مجھے بلا رہا ہے۔ میں نے اسے ٹھاننا چاہا۔

”انہوں نے مجھے۔۔۔“ میرا الجھنا دکھا۔

”میں کہہ رہا ہوں نا! میں شاید تمہیں نہ بتاتا لیکن اب میں چاہوں گا کہ تمہارا تعارف اس سے ہو جائے۔ وہ شوہز کی دنیا میں بڑی پہنچی

ہوئی چیز ہے“ اس نے تیزی سے کہا تو مجھے احساس ہو گیا کہ یہ اپنے طور پر ہی مجھے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ تب میں نے کہہ دیا۔

”ٹھیک ہے“

”تم تیار رہنا، تمہیں کال کر کے پک کر لوں گا، اوکے؟“

”ہائے“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ عامر کی اس فون کال سے میں مطمئن نہیں ہوا تھا۔ مجھ نے کیوں، مجھے اس کا لہجہ پریشان کر گیا۔

میں نے خود سے اس کی وجہ معلوم کرنا چاہی تو مجھے سمجھ نہیں آیا۔ کافی دیر خود سے الجھتے رہنے کے بعد میں نے یہی گمان کیا کہ کسٹلندی اور تھوڑی دیر پہلے

کی مکدر لفظ کے باعث مجھے عامر کا لہجہ بھی عجیب لگا۔ میں نے اپنے طور پر خود کو یقین دے کر مطمئن کر لیا۔ میں نے محسوس کیا کہ اگر میں زیادہ دیر

یہاں بیٹھا رہا تو مزید الجھتا رہا ہوں گا سو میں پریس کلب جانے کے لیے اٹھ گیا۔

”کدھر، جان جی؟“ حسن نے پوچھا۔

”پریس کلب، چلنا ہے؟“ میں نے جواب دیتے ہوئے اس سے پوچھا۔

”تم چلو، میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں“ اس نے کہا تو میں نے کوئی جواب نہیں دیا اور رپورٹنگ روم سے باہر آ گیا۔ میں ابھی چند قدم ہی چلا

تھا کہ مار یہ میرے سامنے آگئی۔ وہ ایک کمرے سے نکلی تھی اور شاید میرے باہر نکلنے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔ اب وہ میرے سامنے کھڑی مجھے گھور رہی

تھی۔ اس کی آنکھوں میں تیرتی ہوئی نظرت سے میں بخوبی واقف تھا۔ میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ مجھے پورا یقین تھا کہ وہ کوئی زہریلی بات ہی کرے گی اس لیے اس کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ وہ چند لمبے مجھے دیکھتی رہی، پھر زہر خند لہجے میں بولی۔

”تمہیں رنج و برہم رہنے کا بہت شوق ہے، چھوڑ کیوں نہیں دیتے یہ؟ ہاں جیسی تھراؤ کا اس عورت میں تمہارے منہ کو آ رہی ہیں۔“ اس نے کہا تو میں حیران رہ گیا۔

”تمہیں کیسے پتہ؟“

”میں۔۔۔ میں تمہارے بارے میں خبر نہ رکھوں، کیا ایسا ممکن ہے؟“

”اوہ تو اس کا مطلب ہے؟“

”کچھ بھی مطلب ہو لیکن یہ تمہارے شایان شان نہیں۔۔۔ فوراً شوہر چھوڑ دو۔ کوئی اور اخبار نہیں ملتا تو مجھے کہو، میں تمہارے لیے اچھی سے اچھی ملازمت کا بندوبست کر دوں گی۔“

”تم پاگل ہو گئی ہو۔۔۔ میں تمہارا چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا اور تم مجھے ملازمت کی آفر دے رہی ہو؟ میرا مشورہ یہی ہے کہ تم میرے راستے میں مت آیا کرو۔“

”کیا کرو گے میرا، بولو؟“

”یہی تو بات ہے کہ عورت ذات سے انتقام لینے کی بات میں سوچ بھی نہیں سکتا۔“

”یہی تمہاری سب سے بڑی کمزوری ہے۔“

”تم سمجھتی ہو تو سمجھتی رہو پر میں تمہیں جو سمجھا رہا ہوں، اسے سمجھو۔“

”شہاج! تمہیں پتہ ہے کہ جو کھلونا مجھے پسند آ جاتا ہے، اسے حاصل کرنے کی آخری حد تک کوشش کرتی ہوں ورنہ اسے توڑ دیتی ہوں، اس نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”سمجھو کہ میں تمہارے لیے نوٹ گیا،“ میں نے دھیرے سے کہہ دیا۔

”شہاج! سوچ لو۔۔۔!“ اس نے تقریباً چیخنے ہوئے کہا۔

”مزید کواں مت کرنا۔۔۔ مجھے تم سے شدید نفرت ہے، ناؤ یو گٹ لاسٹ۔“ میں نے اپنے اندر کی تلخی کو دہاتے ہوئے دھیرے سے کہا اور اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔ میرا داغ سلگ اٹھا تھا، خود کو پرسکون کرنے اور مار یہ کوڑا ہن سے نکالتے ہوئے میں پریس کلب جا پہنچا۔ خلاف معمول ندیم کو وہاں دیکھ کر میں خوش ہو گیا، رسی ہاتوں کے بعد اس نے کہا۔

”میرا معمول تو نہیں کہ میں یہاں آؤں پر آج آ گیا۔“

”گوئیل نہیں آیا ابھی تک؟“ میں نے پوچھا۔

”میں نے نہیں دیکھا۔۔۔ آجائے گا۔“ نذیم نے لاپرواہی سے کہا اور پھر ہم شوہر کی دنیا سے متعلق باتوں میں کھو گئے۔ میں زیادہ سے زیادہ باتیں سنتا جا رہا تھا اور وہ بتاتا جا رہا تھا۔ یوں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ اسے میں گوندل بھی آ گیا، یوں دوپہر کا کھانا کھا کر بھی باتوں میں گمن رہے۔ سہ پہر کے بعد ہم وہاں سے نکلے۔ میں دفتر گیا اور وہاں پر خبریں لکھنے اور فائل کرنے میں خاصا وقت لگ گیا۔ میں اب اپنے فلیٹ پر جا کر فریٹس ہونا چاہتا تھا سو دفتر سے نکل گیا۔ رستے میں مجھے عامر کا فون ملا تو میں نے اسے دفتر آنے کی بجائے فلیٹ پر آنے کا کہہ دیا، یہ اچھا ہوا، ورنہ گوندل نہیں آ رہا تھا۔ میں تیار ہو چکا تھا جب وہ آیا۔ اس نے نیچے گاڑی میں بیٹھے ہی فون کر کے متوجہ کر لیا۔ پھر کچھ دیر بعد ہی ہم فلیٹ کے گھر کی طرف جا رہے تھے۔ فلیٹ نے ہمارا استقبال بڑی گرمجوشی سے کیا۔ وہ اپنے وسیع لان میں تھی جہاں چند اور مہمان بھی تھے جو ذرا فاصلے پر بڑی کرسیوں پر بیٹھے باتوں میں مصروف تھے۔ میں نے محسوس کیا کہ فلیٹ کی جیٹا نظر جب ہم دونوں پر پڑی تھی تو اس کی نگاہوں میں ایک لمحہ کو حیرت ضرور اتاری تھی مگر چونکہ وہ بہت اچھی اداکارہ رہی تھی اس لیے اگلے لمحے ہی اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ فلیٹ کی آنکھوں میں موجود ایک لمحے کی حیرت میرے ذہن میں کھب گئی۔ اس نے پہلے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”آپ کو عامر کے ساتھ دیکھ کر خوشی ہوئی۔ آپ کو اپنے گھر پر خوش آمدیہ کہتی ہوں۔“

”بہت شکریہ۔۔۔ عامر میرا دوست ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”او، بڑی بات۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے عامر سے ہاتھ ملایا اور بولی۔ ”خوش آمدیہ، آپ کا دوست بہت پیارا ہے۔“

”نذیم جی! یہ میرا دوست ہے، اس لیے پیارا ہے“

”مگر میں یہ کہوں گی کہ یہ پیارا ہے اس لیے آپ کا دوست ہے“ اس کے ساتھ اس نے قہقہہ لگایا اور عامر کو جواب کا موقع نہ دیتے ہوئے کرسیوں کی جانب اشارہ کر دیا، شاید اسے اور مہمانوں کا انتظار تھا۔ ہم دونوں ایک خالی میز کے گرد جا بیٹھے تو ایک دوسرے سے ہاتھ ملانے کو لگاؤ ڈکس رکھ گیا۔ ہم دونوں ہی اس ماحول کو دیکھ رہے تھے جو پر سکون سی شام میں قدرے خاموش تھا۔ وہ اکتوبر کے اوّل دن تھے، خشکی بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ مدہم روشنی میں قہقہے اور باتوں کی آوازیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ ہم سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بوڑھا سا آدمی، ایک جوان لڑکی کے ساتھ بیٹھا ہاتھیں کر رہا تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر ایک اوجیز عمر خاتون دلوڑکیوں کے ساتھ بیٹھی تیز تیز انداز میں ہاتھیں کر رہی تھیں، ایک طرف دو شخص سرگوشیوں کے انداز میں جھومنگو تھے۔ نذیم نے کہا تھا کہ یہ پارٹی بڑی عمدہ دہی ہوئی اور اس میں جو مہمان آنے والے ہیں، وہ اپنے شہے میں مہمان حیثیت رکھتے تھے۔ مجھے تجسس ہی تھا کہ میں ان سے ملوں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ ایک مہنگی گاڑی پورچ میں رہی اور اس میں سے جو شخص نکلا اسے دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ وہ سیٹھا افراسیاب تھا، شہر کا سب سے بڑا صنعت کار۔۔۔ اس کے ساتھ ایک نو فیزی لڑکی اور ایک اوجیز عمر شخص تھا۔ نذیم کی گرمجوشی دیدنی تھی۔ اس نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ سیٹھا افراسیاب کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ چند لمحے سرگوشی نما باتوں کے بعد وہ لان میں آ گئے۔ کچھ دیر نذیم اور افراسیاب ٹھلے ہوئے ہاتھیں کرتے رہے پھر وہ اندر ڈرائنگ روم کی طرف بڑھ گئے تو نذیم فردا فردا سب مہمانوں سے ڈرائنگ روم میں آنے کو کہتی رہی۔ میں وہاں پہلے بھی آچکا تھا لیکن اس وقت وہ ڈرائنگ روم نہیں، ہال نما لگ رہا تھا جس میں چند میزیں اور ان کے ارد گرد کرسیاں دھری ہوئی تھیں، بلکہ

ہلکا میوزک فضا میں تیر رہا تھا۔ میں اور عامر بشر ایک میز پر جا بیٹھے۔ کچھ ہی دیر بعد میوزک بند ہو گیا اور فلم کی ادنیٰ اور بھرپور آواز گونجی۔

”خواتین و حضرات! یو آر ویلم۔۔۔ آپ میں میرے چند مہمان ایسے بھی ہیں جو پہلے ایک دوسرے سے متعارف نہیں، میں فرد افراد کا تعارف کرائے دیتی ہوں“ یہ کہہ کر وہ میزوں کے قریب جاتی رہی اور وہاں پر موجود لوگوں کا تعارف کرواتی رہی۔ وہاں پر دو سیاست دان تھے جن میں ایک رکن اسمبلی بھی تھا، وہی پور کرینٹ تھے اور ان میں ایک سینٹھ افراسیاب کے ساتھ آیا تھا۔ ایک فلمی ہیرو جس کی فلمیں تو ابھی ریلیز نہیں ہوئی تھیں لیکن چند فلمیں ایسی تھیں جو یا تو ذریعہ تھیں یا پھر سنسر کے بعد نمائش کے لیے تیار تھیں۔ فلمی صحتے اس کے بارے میں ابھی توقع کر رہے تھے۔ سینٹھ افراسیاب کے بعد عامر بشر تھا جنہیں انڈسٹریلسٹ کہا جا سکتا تھا۔ میں ایک ہی وہاں پر مصافی تھا۔ تقریباً پانچ ماڈل گرو تھیں جن میں چند پرانے چہرے اور کچھ نئے تھے۔ ایک ڈریس ڈیزائنر تھی جس کا تعارف ہو رہا تھا عامر نے سرگوشی میں اس کے اصل کاروبار کے بارے میں بتایا۔ ایک عظیم شہوانی تھی۔ چند فلمیں کیوں، میں اس کا نام سن کر چونک گیا تھا۔ اگرچہ اس کا شمار ٹیکنی اورنز میں ہوتا تھا لیکن اصل میں وہ کیا تھی، میں یہ کبھی بھی نہیں جان پایا تھا۔ میری پہلے بھی اس سے ملاقات ہو چکی تھی لیکن منگھو ہمارے درمیان نہیں ہوئی تھی۔ تعارف کا سلسلہ ختم ہوا تو ٹیلم نے ایک کونے میں پڑی بوتلوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہہ دیا جس کا جتنا جی چاہے اور جس برانڈ کی چاہے، پی سکتا ہے۔ وہ یہ کہہ کر سینٹھ افراسیاب کے پاس جا کر بیٹھ گئی، تب میوزک پھر سے ہال میں تیرنے لگا۔

”ہاں بھئی، کیا خیال ہے۔ پھر ہو جائے ایک آدھ پیگ؟“ عامر نے مجھے آنکھ مارتے ہوئے پوچھا۔

”نو، نخور، میں نہیں پیتا، تمہیں تو پتہ ہے۔“ میں نے ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آج سے شروع کر لو، ابھی تو ان میں ایک پری بھی۔۔۔“ اس نے پھر آنکھ مارتے ہوئے ادبیات انداز میں اشارہ کیا تو نہ جانے کیوں

وہ مجھے گھنٹیا ساگا۔ تب مجھ سے گئی نہ پہچانی گئی، میں نے تقریباً چلتے ہوئے کہا۔

”تم چاہے جو کرو، میں نہیں روکوں گا۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو۔“

”اوکے، جیسے تمہاری مرضی۔“ وہ کندھے اچکا تے ہوئے بولا اور اٹھ گیا۔ میں نے دیکھا، تقریباً سبھی ہاتھوں میں گلاس لے چکے تھے۔

میں اپنی میز پر بیٹھا رہا۔ ٹیلم کچھ دیر بعد میرے پاس آگئی، میرے ہاتھ میں جلتا ہوا سگریٹ تھا۔

”شہاج! بھئی آپ کیوں نہیں لیتے ڈرنک؟“ اس کے چہرے پر حیرت بھری مسکراہٹ تھی۔

”میں پیتا نہیں ہوں، بس سوٹ ڈرنک اور یہ“ میں نے ہاتھ میں پکڑے سگریٹ کی طرف اشارہ کیا تو وہ ہنس دی۔

”اوکے، چلو سوٹ ڈرنک ہی لے لو، آؤ تو کسی“ اس نے بڑے نرم انداز میں میرا ہاؤڈ پکڑا اور اٹھا لیا۔ پھر اس نے میرے ہاؤڈ میں ہاتھ

ڈال کر بڑے سول رہا لہجے میں کہا۔ ”پیتے کیوں نہیں ہو، محال!“

”بس نہیں پیتا“ میں نے انتہائی مختصر جواب دیا۔ اتنے میں ہم اس کو نے تک پہنچ گئے۔ ایک طرف سینٹھ افراسیاب کھڑا تھا۔ ٹیلم نے مجھے

گلاس تھا کہ اس میں سوٹ ڈرنک ڈال دیا، میرا سینٹھ افراسیاب سے آنا سامنا ہوا تو میں نے سلام میں جھک کر دی۔ اس نے مصافحہ کے لیے ہاتھ

بڑھا دیا۔ رکی باتوں کے بعد چاک اس نے ایسی بات کہی جس سے میں چونک گیا۔ اس نے بڑے نرم لہجے میں کہا۔

”کیوتر کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے۔۔۔ بتانا بھی اونچا اڑ لے، آخر ہار کے ہاتھوں مر جاتا ہے اس لیے کیوتر کو کیوتر بنانا چاہیے نا؟“

”سیٹھ صاحب! ظاہر ہے کہ کیوتر تو کیوتر ہی ہوتا ہے، وہ ہانڈنیں بن سکتا۔“

”اس میں ہانڈ کی فطرت آ بھی نہیں سکتی“ وہ دھیرے سے بولا

”جی، بالکل“ میں نے کہا۔

”تو پھر اسے کیوتر بنانا چاہیے۔“ وہ تیزی سے بولا۔

”وہ کیوتر ہے گا، سیٹھ صاحب! اس لیے کہ وہ کیوتر ہے۔“

”بس سبکی بات میں تمہیں سمجھانا چاہ رہا ہوں“ اس نے کچھ اس انداز اور لہجے میں کہا کہ میں چونک گیا۔ بظاہر وہ ایسی ہی بات کر رہا تھا کہ

وہ کچھ اور کہنا چاہ رہا ہے۔ میں خاموش رہا تو وہ پھر بولا۔ ”چڑیا بھی چڑیا ہی ہوتی ہے اور کوا صرف کوا۔۔۔ یہ سب ہانڈنیں بن سکتے۔ میری بات سمجھ

رہے ہو نا؟“

”جی بالکل، سیٹھ صاحب! نہ سمجھا تو سمجھ جانے کی کوشش ضرور کروں گا۔“

”ویری گنڈ، میرا خیال ہے کہ کچھ جاؤ تو زیادہ بہتر ہے۔ کیوتر کو بلی بھی بکڑ لیتی ہے اور۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے اس کی بات کاٹنے

ہوئے کہا۔ ”کنا بھی۔“

”اب آئی نا، بات سمجھ میں۔ چلو اس خوشی میں“ یہ کہہ کر اس نے اپنا گلاس میرے گلاس سے ٹکرانے کے لیے آگے بڑھا دیا لیکن اگلے ہی

لمحے رک گیا۔ ”ایک یہ فرق بھی دیکھ لو، تمہارے ہاتھ میں مٹھی سو فٹ اور میرے ہاتھ میں ہارڈ۔ اب یہ گلاس کس طرح۔۔۔ چلو پھر بھی“ یہ کہہ کر اس

نے گلاس بکرا دیے اور کوئی بات کہے بنا آگے بڑھ گیا۔ میں اس کی باتوں کو ذہن میں دہرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ عامر نے آکر پوچھا۔

”کیا کہہ رہا تھا، سیٹھ؟“ جب میں نے اس کی ساری مہمل گفتگو اسے سنادی۔ جب تک وہ میری بات سناتا رہا، اس کے چہرے پر اہمائی

درجہ کی شجیدگی تھی۔ بات مکمل ہوتے ہی گویا اس نے اطمینان کا سانس لیا اور ہنس کر بولا۔ ”بڑھاٹھیا گیا ہے، اوپر سے یہ پریاں اسے پاگل کر رہی

ہیں، بھول جاؤ کہ کیا بکواس کر رہا تھا۔“

”تم اتنا کیوں خصر کر رہے ہو؟“ میں نے عام سے انداز میں کہا۔

”بس یونہی، تمہیں سمجھا رہا ہوں۔“

”بڑی مہربانی۔“ میں شاید کچھ اور کہتا کہ یکدم میوزک بدل گیا، اس کی آواز تیز ہو گئی اور روشنی مدہم کر دی گئی۔ جیسی ایک طرف سے کافی

ساری لڑکیاں بیچان خیز لباس میں آن وارد ہوئیں۔ وہ میوزک کے ساتھ تھرک رہی تھیں۔ ماحول یکدم ہی بدل گیا۔ عامر کی شاید کسی ماڈل سے دوستی

چل رہی تھی، وہ اس کی طرف بڑھ گیا اور میں اپنی میز پر جا بیٹھا۔ میرے سامنے کئی تھرکتے ہوئے بدن تھے اور میں اک نئے قسم کے ماحول کو سمجھنے کی

کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے محسوس کیا کہ میرے علاوہ صرف بیگم شہوانی ایسی خاتون تھی جو اپنی میز پر اکیلی بیٹھی سب کو دیکھ رہی تھی۔ مدہم روشنی کے باعث میں اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں نے سینہ افراسیاب کو دیکھا کہ وہ اس بڑھاپے میں بھی اپنے ساتھ لائی توخیز سیڑھی کے ساتھ لپک رہا تھا۔ مجھے اس جوڑے پر ہنسی آگئی، تبھی فیلم بھر میری طرف بڑھ آئی اور بڑی حیرت سے بولی۔

”شہاج! بھئی کیوں جھجک رہے ہو، اپنے کپل کے لیے کوئی ایک بھی جن لو۔“ پھر چند لمبے کورک گئی اور مسکراتے ہوئے بولی۔ ”چلو آؤ میں تعارف کروائے دیتی ہوں۔“

”نو میڈم ای مجھے ناچنا نہیں آتا اور میں انہیں دیکھ کر زیادہ انجوائے کر رہا ہوں“ میں نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے لیکن جب دل چاہے تو شراب نامت، او کے ا“ اس نے میرے بال بگاڑ دیے اور چلی گئی۔ میں ان سب کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ دھن دھن ہو گئی تو اور شروع ہو گئی۔ میرے دل میں خواہش نہیں ابھری سو میں اپنی میز پر ہی بیٹھا رہا۔ ذرا دیر بعد بیگم شہوانی اٹھی اور نیا پیگ لینے کو نکل گئی۔ وہ پیگ لے کر واپس مزی تو اس کی نظر مجھ پر پڑی، مجھے دیکھ کر وہ مسکرا دی اور میری طرف ہی بڑھ آئی، میرے قریب آ کر اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ہلو، بیگ میں اکیا میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں؟“

”کیوں نہیں۔ آئیے، تشریف رکھیں“ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور محسوس کیا کہ اگر میں اسے نہ بھی بیٹھنے کو کہتا تو بڑے سکون سے بیٹھ جاتی۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ فطری طور پر میں نے اس کا ہر پور جائزہ لے لیا۔ زیادہ سے زیادہ وہ پختہ سال کی لگ رہی ہوگی۔ اس کی شفاف گوری جلد بچوں کی جلد کی طرح لگ رہی تھی۔ شانوں تک کئے بال، گول چہرہ، پتلے ہونٹ، ڈرائیگیسی اور خندیدہ ہی ناک، آنکھیں کبھی بہت خوبصورت رہی ہوں لیکن اس وقت ان کے گرد سیاہ حلقے تھے۔ کھلے گریبان کے ساتھ تنگ کپڑوں میں وہ جس قبیل کی لگ رہی تھی اس کا مجھے اندازہ ہو گیا تھا۔ میں نے پہلی ملاقات میں اسے اتنے غور سے دیکھا تھا۔ یقیناً وہ بھی مجھے بخور دیکھ رہی تھی۔ وہ چند لمبے یونگی خاموش رہی، پھر دھیرے سے بولی۔

”قابلاً آپ کا نام شہاج بتایا تھا نیلم نے؟“

”ہی، مجھے شہاج ہی کہتے ہیں۔“

”اوہ ٹائس، میں بیگم شہوانی۔ بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کے۔۔۔“ اس نے دوبارہ ہاتھ بڑھا دیا، میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ پھر ہماری ہاتس میرے نہ پینے سے شروع ہو کر نجانے کدھر سے کدھر نکل گئیں۔ جب تک وہ میرے حساب سے چار پیگ لے چکی تھی لیکن پھر بھی ہوش و حواس میں ہاتس کر رہی تھی۔ کافی دیر بعد ان سب کا ناچ ختم ہوا تو سب لان میں چلے آئے۔ عامر اپنی دوست کے ساتھ مصروف تھا اور میں بیگم شہوانی کی ہاتس سن رہا تھا۔ پھر کھانے کے دوران کئی لوگوں سے ہاتس ہوئی، یوں رات گئے یہ پارٹی ختم ہو گئی۔ ان میں کئی مدہوش ہو چکے تھے، میں نیلم سے رخصت ہو کر عامر کو دیکھنے لگا تو وہ قانع قانع تھا مگر اس کی گاڑی کھڑی تھی۔ میں سکون سے ایک طرف بیٹھ گیا کہ وہ آئے تو ہم چلیں۔ میں انتظار کر رہا تھا

کہ بیگم شہوانی آگئی۔

”آپ مجھے نہیں ابھی تک۔۔۔؟“ اس کا لہجہ لڑکھڑا رہا تھا۔

”میں اپنے دوست کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ چند منٹیں کدھر ہے؟“

”آپ کی اپنی گاڑی؟“

”میں اس کے ساتھ ہی آیا تھا“ میں نے جلدی سے کہا۔

”چلیں، میں آپ کو ڈراپ کر دوں گی۔“ اس نے عالم مدہوشی میں کہا۔

”بہت شکریہ وہ آجائے تو۔“ لفظ میرے منہ میں ہی تھے کہ عامر اپنی دوست کے ساتھ آتا نظر آیا۔ ان کی حالت اچھی نہیں تھی، لڑکی نے اپنا سر اس کے کندھے کے ساتھ رکھا یا ہوا تھا۔ بیگم شہوانی نے اس کی طرف دیکھا اور ہلکے سے مسکرائی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔

”شجاع اکم آن، انہیں جانے دو۔“ میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عامر پورچ کے قریب آ کر رک گیا اور متلاشی نظروں سے احرار ادھر دیکھنے لگا۔ میں نے بیگم شہوانی کو بانے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ مجھے دیکھ کر وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے تھے۔ میرے پیچھے ہی اس کی دوست لڑکی نے برا سامنا بناتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی ساتھ جائیں گے؟“

”ہاں ہنسی! تمہیں پتہ نہیں، یہ میرا بہت پیارا دوست ہے۔“

”اوہ۔۔۔!“ اس نے برا سامنا بنایا تو مجھے بڑا دھچکا لگا۔ ایک معمولی سی کال کر ل کر میرے وجود کو گراں بگھڑی ہے۔ مجھے کچھ اور سمجھ نہ آیا تو میں نے بہانہ بنایا۔

”عامر! مجھے نلیم سے ایک ضروری کام ہے، تم چلو، میں اپنے گھر پہنچ جاؤں گا۔“

”اوکے، ڈیئر! ہوا آسوٹ۔۔۔“ عامر سے پہلے ہی وہ بڑکی بولی۔ میں کچھ بھی مزید سننے کی بجائے گاڑی سے اتر گیا، سامنے ہی بیگم شہوانی لڑھکتی ہوئی آ رہی تھی۔

”یہی نلیم میرے ساتھ جانا پسند کرو گے۔۔۔ آؤ۔۔۔“ اس نے آگے بڑھ کر میرا بازو تھام لیا اور اپنی گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ اس کا شو فر

گاڑی کے قریب ہی تھا، اس نے جلدی سے پچھلا دروازہ کھولا اور ہم بیٹھ گئے تو چند لمحوں بعد شو فر نے گاڑی بڑھا دی۔ بیگم شہوانی میرے ساتھ لگ کر بیٹھی ہوئی تھی اور مجھے اس سے الجھن ہو رہی تھی۔ گاڑی اب مین روڈ پر چڑھ چکی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب ٹریفک بہت کم ہو جاتی ہے۔ بیگم شہوانی مسلسل باتیں کرتی چلی جا رہی تھی۔ میں شو فر کو بتانا چاہ رہا تھا کہ وہ مجھے کہاں ڈراپ کرے۔ تجھی پیچھے سے ایک گاڑی بڑی تیزی سے آئی، اس نے ہمیں کراس کیا اور پھر چند گز کے فاصلے پر جاتے ہی اس کے دونوں طرف سے گھنٹی بڑا آہوئی۔ میری اچانک ہی نظر پڑی تھی۔ میں بیگم شہوانی کو لیے چھوٹے دبک گیا، اسی لمحے گولیوں کی تڑتڑ سے ماحول گونج گیا۔ ان کا نشانہ ہماری گاڑی ہی کی طرف تھا۔ جو نیچی فائرنگ ہوئی، ڈرائیور نے بریک لگا

دیے۔ جس سے نازوں کی شدید چڑھاہٹ پیدا ہوئی، اس کے ساتھ ہی وہ سکرین کا شیشہ چمتا کے سے ٹوٹ گیا۔ گاڑی کی رفتار تیز نہیں تھی لیکن اچانک بریک لگانے سے گاڑی بے قابو ہو گئی، تھپی مجھے ڈرائیور کی ٹھکراہٹ ہو گئی کہ کہیں کوئی گولی اسے تو نہیں لگ گئی؟ بیگم شہوانی خوفزدہ ہو گئی تھی، میں نے ہی اسے دیوبچ کر فوراً نیچے کر لیا تھا اور وہ اپنی پوری قوت سے میرے ساتھ چلتی ہوئی تھی۔ میں نے ایک لمحہ کو اسے دیکھا، اس کی آنکھیں بند تھیں۔ میں نے اسے خود سے جدا کیا اور ڈرائیور کی طرف بڑھاتا کہ اسے دیکھوں۔ گاڑی ڈنگا رہی تھی، میں نے سامنے دیکھا تو وہ گاڑی دور جاتی نظر آئی جس سے فائرنگ ہوئی تھی۔ میں نے اس کی نمبر پلیٹ دیکھنے کی کوشش کی مگر کچھ پتہ نہ چلا، شاید اس کی نمبر پلیٹ تھی ہی نہیں۔ میں نے ڈرائیور کو دیکھا، وہ پوری توجہ سے گاڑی سنبھالنے کی فکر میں تھا۔ میں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ گاڑی سڑک کے ایک طرف نیچے اتر گئی اور پھر رک گئی۔ میں نے سکون کا سانس لیا اور ڈرائیور سے پوچھا کہ تم ٹھیک ہو؟

”جی صاحب جی! میں ٹھیک ہوں، بیگم صاحبہ کیسی ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں، ارشد۔۔۔ ا۔۔۔ بیگم نے سرسراہٹ ہوئی آواز میں کہا۔

میں باہر نکلا تو بیگم شہوانی بھی اتر آئی، تھپی کئی لوگ ہمارے ارد گرد رک گئے۔ میں نے گاڑی کا جائزہ لیا تو وہ سکرین کے علاوہ یونٹ میں بھی کوئی ٹھس مٹی تھی، اس کے علاوہ کہیں نشان نہیں تھا۔ کیا حملہ آوروں کا ارادہ ہم دونوں میں سے کسی کو تلک کرنے کا نہیں محض دھمکانا تھا؟ گاڑی کا جائزہ لینے کے بعد پہلی سوچ میرے ذہن میں یہی آئی تھی۔ اس وقت بیگم شہوانی نئے میں تھی اور ہمارے ارد گرد لوگ جمع ہو گئے تھے۔ میں نے بڑی مشکل سے بیگم کو گاڑی میں بٹھایا اور وہاں موجود لوگوں کو یہی تاثر دیا کہ وہ اس اچانک حادثے کی وجہ سے خوف زدہ ہو گئی ہے۔ حملہ آور کون تھے؟ اس وقت اگرچہ یہی بات سوچنے کی تھی لیکن لوگوں کے اکٹھا ہوجانے کے باعث وہاں سے لکھنا ہی سب سے پہلا مسئلہ تھا جو درپیش تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ فوراً گاڑی نکالے۔ اس نے کوشش کی لیکن شاید انجن میں خرابی ہو جانے کی وجہ سے گاڑی سٹارٹ نہیں ہو پارہی تھی، انجن ڈراما سا جاتا لیکن جلد ہی خاموش ہو جاتا۔ میں گھوملا گیا۔ مجھے ڈر یہ تھا کہ کوئی پولیس موپاٹس اور حد نہ نکل آئے ورنہ خواہ مخواہ اکٹھی صورت حال پیدا ہو جانا لازمی تھا۔۔۔۔۔ کچھ دیر کوشش کے باوجود جب گاڑی سٹارٹ کرنے میں ناکامی ہوئی تو لوگ اسے دھمکانے لگے۔ اس وقت انہی لوگوں کے باعث میں دوہری کیفیت میں مبتلا تھا۔ مجھے کوفت ہو رہی تھی کہ کوئی نیا ہنگامہ جنم نہ لے لے اور خوشی تھی کہ ابھی ہم میں اتنی اخلاقی جرأت ہے کہ سڑک پر حادثہ ہوجانے کے باعث سارے نہیں تو کچھ لوگ مدد کے لیے آتے ہیں۔ تھپی بیگم شہوانی گاڑی سے باہر نکل آئی۔

”شہار! چھوڑو اسے، مگر سے دوسری گاڑی منگوا لو یا پھر تھپی دیکھ لو“ اس نے غمراہ آواز میں کہا۔

”بیگم صاحبہ! آپ بیگم شہوانی میں سٹارٹ ہو جائے گی یہ“ میں نے اسے تسلی دی۔

”نہیں، مگر فون کرو میرے“ وہ تیز لہجہ میں بولی۔

”ڈونٹ وری۔۔۔ آپ بیگم شہوانی میں فون کرتا ہوں۔“ میں آرام سے بولا۔

”ابھی کرو۔۔۔“ اس نے انتہائی حکمانہ لہجہ میں کہا۔ میں نے سیل نکالا اور کہا۔

”ٹھیک ہے، بتائیں نمبر۔۔۔؟“ میں نے نمبر پوچھنے کے لیے ہیگم شہوانی کی طرف دیکھا ہی تھا کہ ایک خالی ٹیکسی وہاں آن رکی۔ میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا اور ڈرائیور سے کہا۔

”اگر ٹھیک ہو جائے تو لے آنا۔ ہم چلتے ہیں۔۔۔“ یہ کہہ کر میں نے ہیگم شہوانی کا ہاتھ پکڑا اور ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ میں نے ”چلو“ کہا تو وہ چل دیا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ اس کا گھر کدھر ہے، اس لیے میں نے اس کے کان کے پاس منہ لاکر پوچھا۔

”کدھر جانا ہے؟“ اس نے بڑی ادا سے میری طرف دیکھا اور اپنا پتہ بتا دیا۔ ایک بڑے سے گیٹ والی کوچھی کے سامنے ہم اترے۔ میں نے ٹیکسی والے کو کرایہ دیا۔ چونکہ ایرگیٹ کھول چکا تھا۔ ہم ڈرائنگ روم میں جا بیٹھے تو ایک یوزر صاحب ملازم گھبرایا ہوا آ گیا، میری طرف دیکھتے ہوئے ہیگم سے بولا۔

”خیر، تو ہے، ہیگم صاحب! گاڑی کدھر ہے؟“

”تم ان کے لیے ایک بہترین کپ کافی کا بنا کر میرے بیڈ روم میں لے آؤ“ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”آؤ شہناز...“ وہ اٹھی اور ڈرائنگ روم سے بیڑھیاں چڑھتی اوپر چل دی، میں اس کے پیچھے چلتا گیا۔ اس کا بیڈ روم بہت ہی خوبصورت تھا۔ وہ جاتے ہی ایک کرسی پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ ادھیڑ عمر عورت خاصی تھک چکی تھی۔ اس نے جوتے اتارے اور لا پرواہی سے ایک طرف پھینک دیئے۔ چند لمبے سوچنے والے انداز میں بیٹھی رہی، پھر سر اٹھا کر بولی۔ ”خاصا خوف ناک حادثہ تھا۔۔۔“

”ہوں۔۔۔“ میں نے ہنکارہ بھرا اور پھر بولا۔ ”ہو سکتا ہے، اب پولیس کا پھندا بھی پڑے لیکن میں۔۔۔“

”کچھ نہیں ہوتا، میں دیکھ لوں گی مگر یہ قاتل کب کیوں ہوئی، کس نے کی؟“

”یہی میں سوچ رہا ہوں“ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو وہ ہنس دی۔

”چھوڑو، اب مت سوچو، آرام کرو، صبح ہوگی تو دیکھا جائے گا۔“ اس نے کہا تو فطری طور پر میری نظر گھڑی پر پڑی، رات کے دو بج چکے تھے۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر بیڈ کی طرف بچ رہا ہوں۔ ”جہاں جی جا ہے، سو جاؤ۔ میں ابھی کچھ دیر اور جاؤں گی۔“

”وہ کس لیے؟“ میں نے یونہی لاشعوری طور پر پوچھ لیا۔

”میرا سا موڈ غارت ہو گیا۔ اگر تم جاؤ تو میرا ساتھ دے سکتے ہو۔“

”نہیں، میں اب سو جاؤں گا“ میں نے کہا۔ اسی لمحے دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی اور وہ ملازم کافی کانگ تھا سے اندر آ گیا۔ اس نے ایک سائیکل بیل پر رکھا اور مڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی ہیگم نے ایک الماری کھولی۔ اس میں مختلف برائڈ کی بوتلیں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر اس نے فرنیچ سے برف، سوڈا اور شاید اسی مقصد کے لیے رکھے ہوئے گلاس لگالے اور پینے بیٹھ گئی۔ جب تک میں نے کافی ختم کی، اس وقت تک وہ دو پیگ پنی چکی تھی۔ اس دوران ہم میں باتیں بھی چلتی رہیں جو صرف اور صرف پارٹی کے بارے میں ہی تھیں۔ تیسرے پیگ کے بعد ہیگم موڈ میں آ گئی، اس کا اندازہ مجھے اس کے لہجے سے ہوا۔ پھر جلد ہی اس نے سب کچھ سمیٹ دیا اور بیڈ کے ایک طرف آ بیٹھی۔ وہ لینے کے بعد خاموش رہی جبکہ میری آنکھوں

سے نیند کو سوں دور تھی۔ میرے ذہن سے وہ حادثہ نہیں نکل رہا تھا۔ قاترنگ اس انداز سے ہوتی تھی جیسے محض وارننگ دی گئی ہو۔ حملہ آوروں کا مقصد قتل کرنا نہیں تھا اور نہ جس طرح وہ پیچھے سے آئے تھے، برابر آ کر گولی چلاتے تو میں یا پھر بیگم شہوانی یا پھر دونوں ہی قتل ہو جاتے۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا کہ آخر وہ تھے کون؟ اس کے ساتھ ہی خیال شدت سے ابھرا کہ وہ مارنا کس کو چاہتے تھے۔ مجھے یا پھر بیگم کو؟ یہی سوچ کا وہ دور رہا تھا جہاں میں آ کر ششدر رہ گیا، بیگم شہوانی کے بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اپنے بارے میں وثوق سے یہ سوچ سکتا تھا کہ حملہ مجھ پر نہیں ہوا۔ میرا کوئی ایسا دشمن نہیں تھا جو اس حد تک چلا جاتا اور پھر اگر کوئی تھا بھی تو اسے نزدیک کیسے ہو سکتا ہے۔ اسے کیا پتہ کہ میں ایسی عورت کے ساتھ جا رہا ہوں جس سے محض میری دوسری ملاقات تھی؟ اگر اس نے میرے لیے پلان بنا بھی لیا ہوگا تو صبح وقت پر میں عامر بشیر کا ساتھ چھوڑ گیا تھا، اس صورت میں حملہ عامر بشیر کی گاڑی پر ہونا چاہیے تھا۔ ایسی ہی کئی سوچوں سے مجھے پختہ یقین ہو گیا کہ حملہ مجھ پر نہیں، اس ادا جیز عمر عورت پر ہوا ہے جو نشے میں مدہوش میرے ساتھ ایک ہی بینڈ پر پڑی ہے۔ میں نے گھڑی پر نگاہ ڈالی تو چار بجتے ہیں کچھ وقت رہتا تھا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ لاک کیا، لائٹ آف کی اور ایک کونے میں سٹ کر لیٹ گیا۔ پھر مجھے ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں ہوں۔

میری آنکھ کھلی تو بیڈروم روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ بیگم شہوانی ایک ایزی چیئر پر بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی، اس کی پشت پر گھڑی تھی جس کے پردے بٹے ہوئے تھے اور یہ روشنی وہیں سے آرہی تھی۔ وہ اس وقت فریش تھی، اس کے پیکے بالوں سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ نہا جاتی ہے۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا، میری آنکھ بھی معمول کے مطابق کھلی تھی حالانکہ رات میں بہت دیر سے سویا تھا۔ ابھی نیند کا شمار میری آنکھوں میں تھا لیکن پھر بھی میں کراہنے لگا تھا گیا، آہٹ پر بیگم نے اخبار ہٹا کر میری طرف دیکھا اور پھر مسکراتے چہرے سے بولی۔

”صبح بخیر، شجاع۔۔۔!“

”صبح بخیر۔۔۔“ میں نے کہا اور سر ہانے کے نیچے سے سہل اٹھا کر اسے آن کر دیا۔

”اب جلدی سے فریش ہو جاؤ، پھر ناشتہ کرتے ہیں۔“ اس نے اخبار سمیٹ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا۔ اخبار چمک رہی تھا جس سے میں وابستہ تھا اس لیے فطری تجسس کے تحت اسے اٹھا لیا۔ میں نے سرسری نظر ڈال کر اسے رکھنا چاہا تو بیگم شہوانی نے کہا۔

”اپنے ہارے میں خبر پڑھی؟“

”اپنے ہارے میں؟“ میں نے پھر سے اخبار کھولتے ہوئے کہا۔

”بچھلے صفحہ پر اوپر، دائیں طرف“ اس نے مجھے بتایا۔ وہ دو کالمی خبر تھی اور اس میں صرف قاتلانہ حملے کی خبر تھی، ساتھ ہی ایک ”سماجی قانون شخصیت“ کا ذکر تھا۔ بیگم شہوانی کا نام کہیں نہیں تھا اس کا نام نہ آتا اگرچہ اچھی بات تھی لیکن خبر کے شائع ہونے سے میری پریشانی بڑھ گئی تھی۔ یہ خبر کیسے لگی؟ اگرچہ حادثہ والی جگہ پر ہم اتنی زیادہ دیر تک نہیں ٹھہرے تھے۔ لوگ جمع ہوئے تھے مگر اخبار والوں کو کیسے پتہ چل گیا کہ اس میں شجاع نامی کوئی صحافی بھی تھا۔ ہو سکتا ہے کسی نے بیگم شہوانی کے ڈرائیور سے پوچھ لیا ہو۔ لیکن اسے میرے ہارے میں کیا ظلم، یا پھر کوئی اور۔۔۔ یہ جواب طلب سوال اپنی جگہ مگر اب پتہ نہیں کہنے لوگوں کے، کیسے کیسے سوالوں کے جواب دینا پڑیں گے مجھے؟۔۔۔ میں سہیل بند کر دیا۔

”چلو فریش ہو جاؤ، باقی باتیں بعد میں سوچ لینا“ بیگم شہوانی نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں ہاتھ روم میں جا کھسا۔ ناشتے کی میز پر بیگم نے کہا۔ ”شجاع! تمہیں اپنی بہت زیادہ حفاظت کرنا چاہیے۔ اس حملے سے تو بچ گئے“

”بیگم صاحبہ! میرا کوئی ایسا دشمن نہیں ہے، بلکہ میں تو آپ کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ آپ سے کہوں، آپ اپنی حفاظت۔۔۔“

”نہیں، میرا بھی کوئی دشمن نہیں ہے۔ کوئی مجھے مار کر کیا کرے گا؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں اسے دلیلیں دینے لگا جو رات میرے ذہن میں آئیں تھیں۔

”تمہاری دلیلیں بجا ہیں لیکن میں پھر بھی یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ حملہ مجھ پر نہیں ہوا۔ وہ تمہارے ہی دشمن ہو سکتے ہیں“

”ایسا یقین۔۔۔ آخر کس بنیاد پر۔۔۔؟“ میں نے تقریباً جھنجھلاتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، شجاع! میرا دشمن کوئی کیوں ہوگا، میرے مرنے سے کسی کو کوئی فائدہ نہیں ہونے والا اور میں نے اپنی پوری زندگی میں کسی سے بھی زیادتی نہیں کی تھی کہ اپنے طائرین سے بھی نہیں۔۔۔ میں نے بھی سوچا ہے کہ حملہ کیوں ہوا؟ میں نے موجودہ حالات کو بھی غور سے دیکھا، کہیں بھی کوئی ایسا نہیں ہے جسے میں کہہ سکوں کہ یہ میرا دشمن ہے اور اس حد تک ہے کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کر سکتا ہے۔“

”کہیں نہ کہیں کوئی معاملہ۔۔۔؟“ میں نے جرح کرتے ہوئے کہا تھا۔

”شجاع! میں تمہیں بتاتی ہوں۔۔۔ میں اپنے شوہر کی دوسری بیوی تھی۔ میرا سابقہ شوہر کون ہے، اسے چھوڑو۔ وہ جاگیر دار ہے اور خاصا مشہور آدمی ہے۔ ہمارے درمیان محبت پر وان چڑھی، ہم نے خفیہ شادی کی اور اس نے مجھے اپنے خاندان سے الگ رکھا۔ میرا ایک بیٹا بھی ہے جو اس وقت امریکہ میں ہے، اس کی شادی ہو چکی ہے اور وہ انتہائی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ میرے اور میرے شوہر کے درمیان ایک ایسا وقت آیا جب میرا شوہر مجبور ہو گیا کہ مجھے طلاق دے دے۔ میں نے یہ فیصلہ قبول کر لیا، اس کے عوض اس نے اپنی مرضی سے مجھے اتنا کچھ دیا جس کا میں تصور بھی نہیں کر سکتی۔۔۔ میرا بیٹا جوان ہوا، اس نے پرنس کیا۔ جب میں نے عسوس کیا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا ہے تو میں نے سب کچھ اس کے نام کر دیا۔۔۔ طلاق کے بعد میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک بار بھی نہیں ملی۔“ یہ سب کہتے کہتے وہ یکدم خاموش ہو گئی۔ پھر چھ لمبے سانس لینے کے بعد بولی۔ ”شجاع! میرا سابقہ شوہر یا اس کے خاندان سے کوئی تازہ نہیں، پچھلے سات سالوں سے کوئی ایسی بات نہیں ہوئی۔ میرے نام کچھ بھی نہیں۔ یہ گھر، فیکٹری، بینک پیلس سب بیٹے کے نام ہے۔ میرے مرنے کے بعد اس طرح بھی کسی کو فائدہ نہیں ہونے والا“ اس نے مسکراتے ہوئے اپنی بات ختم کی۔

”چلیں ٹھیک ہے، ابھی تک تو سب کچھ اندھیرے میں ہے“

”ہاں۔۔۔ تم سوچو اور غور کرو اور میرا مشورہ مان کر اپنی حفاظت کا بندوبست کرو“

”موت جب آتی ہے تو وہ آ جاتی ہے سارے حفاظتی بند تو ذکر بھی، میں موت سے نہیں ڈرتا۔“

”ابھی بات ہے، تاہم پھر بھی“ وہ پوری سنجیدگی سے بولی۔ ہم ناشتہ کب کا ختم کر چکے تھے۔ میں نے گڑی پر نظر ڈالی، دفتر جانے کا

وقت ہو رہا تھا۔

”او کے بیگم شہوانی! آپ کا ساتھ مجھے ہمیشہ یاد رہے گا“

”تم مجھے اچھے لگے ہو۔ جب چاہو اور جس وقت چاہو میرے گھر کے دروازے تم پر کھلے ہیں۔“

”او کے“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا اور گاڑی میں جا بیٹھا۔

میں ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ گیا۔ استقبالیہ سے ہوتے ہوئے جب میں رپورٹنگ کی طرف جانے لگا تو میں نے سیل آن کر لیا۔ اسی لمحہ ٹیل بیج

آنکھی، دوسری طرف حسن تھا۔

”کہاں ہو، یا رافون کیوں بند کیا ہوا ہے؟“

”میں دفتر میں ہوں، ابھی آیا ہوں۔“

”اوہ، چلو آ جاؤ پھر“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں جب رپورٹنگ میں پہنچا تو سبکی نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ مجھے اس بات کا

بخوبی احساس تھا کہ ہر کسی کے ذہن میں اپنی نوعیت کا کوئی سوال ضرور ہوگا، سبکی اس واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔ میں نے سب کی

طرف دیکھا، پھر اپنی سیٹ پر بیٹھ کر بولا۔

”آپ سب لوگ اس واقعہ کے بارے میں جاننا چاہتے ہوں گے۔“ یہ کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ تقریباً سب کا رد عمل ایک جیسا ہی تھا۔

میں نے استقبالیہ منظر انداز میں بیگم شہوانی کا نام لیے بغیر سارا واقعہ کہہ دیا۔

”اب کیا سوچا ہے؟“ چیف نے پوچھا۔

”کچھ نہیں، میں کیا سوچوں گا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

”نہیں۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ پولیس وغیرہ سے مدد لی جائے، معلوم تو ہووے کون لوگ تھے؟“ چیف نے اپنی بات کی وضاحت کی۔

”فی الحال میرا ارادہ تو نہیں ہے۔ موت چونکہ اس کے ہاتھ میں ہے، جس نے زندگی دی ہے اس لیے میں ایسے حالات سے گھر مند نہیں

ہوں۔ اگر میرے دشمن کا ارادہ مجھے قتل کرنے ہی کا ہے تو وہ پھر وہاں رہنا سہنے آئے گا، تب دیکھ لوں گا۔“

”آپ کو بہر حال محتاط رہنا چاہیے۔“ ایک ساتھی صحافی نے گھر مند لہجے میں کہا۔

”ظاہر ہے، بندہ جب رہنا اندر بننے کے چکر میں ہوگا، پھر ایسے حالات تو ہوں گے۔“ ماری نے انتہائی نخوت سے کہا تو ماحول یکدم بدل

کر رہ گیا۔ اس سے بات کرنے کا مطلب تھا کہ حدیں تلخ ہاتھیں بڑھیں۔ میں نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو اس نے بڑی ڈھٹائی سے میری آنکھوں

میں آنکھیں ڈال دیں۔ ایک دم ہی خضہ میری کنپٹیوں پر ٹھوکریں مارنے لگا۔ میں نے ضبط کیا اور اپنا سیل فون بند کر کے میز پر رکھ دیا، گویا میں اپنی

طرف سے بات ختم کر کے میٹنگ کی شروعات کا انتظار کرنے لگا۔ معمول کی میٹنگ میں سارے فون آف کر دیئے جاتے تھے تاکہ کوئی غلط نہ

ہوے۔ میٹنگ ختم ہوتے ہی پہلا فون بیگم شہوانی کا ملا، اس نے بڑے اطمینان بھرے لہجے میں مجھ سے کہا۔

”مختلفہ تھانے سے اس کے انچارج کا فون تھا، وہ اس بارے میں مجھ سے تفصیل پوچھ رہا تھا اور یہ بھی کہ اب میں اس سلسلہ میں کیا

چاہتی ہوں؟“

”پھر آپ نے کیا کہا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نبی کہ میں تمہاری دیر بعد فون کر کے بتاتی ہوں۔ میں تم سے مشورہ چاہ رہی تھی کہ کیا کیا جائے؟“

”میرے خیال میں ابھی اس کو اہمیت ہی نہیں دینی چاہیے۔ دشمن اندھیرے میں ہے، پولیس کے درمیان میں آجانے سے معاملہ خواہ مخواہ

طول پکڑ جائے گا۔ پہلے اسے اپنی طور پر تو سمجھیں“

”یہ ٹھیک ہے، میں اسے تمہارے بارے میں کہہ دیتی ہوں، تم اسے مطمئن کر دینا اور نہ پھر میں سارا معاملہ خود دیکھ لیتی ہوں۔“

”میں دیکھ لوں گا اور آپ کو فون کی ضرورت نہیں، وہ انچارج مجھ سے ضرور رابطہ کرے گا۔“

”اوکے، ہی یو۔۔۔“

ڈیکم شہوانی نے کہا اور فون بند کر دیا۔ حسن میرے ساتھ بیٹھا تھا اور اس نے اب تک مجھ سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ وہ یقیناً فرصت کے

لمحات کا منتظر تھا۔ پھر میرے کئی ملتے والوں کے فونز کا تانتا بندھ گیا، اس میں پولیس انسپکٹر کا فون بھی تھا۔ میں نے اسے ہر طرح سے مطمئن کر دیا اور

اسے یہ باور کرا دیا کہ میں کوئی کارروائی نہیں چاہتا۔ اس نے مجھ سے خاصی دیر بحث کی۔ وہ چاہتا تھا کہ کانڈی کارروائی کی حد تک سہی، مجھے کچھ نہ کچھ کرنا

چاہیے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے دماغ میں کیا بات ہے، وہ اتنا اصرار کیوں کر رہا ہے۔ پھر بھی میں نے کوئی بھی کارروائی نہ کرنے کی بابت کہہ دیا۔

اس دوران حاضر بشیر کا فون بھی آیا۔ سب سے پہلے تو اس نے مجھ سے معذرت کی، مجھے معلوم تھا کہ وہ اس وقت دو آٹھ نشتے میں غموں میں تھا۔ پھر اس نے

تفصیل جانتا چاہی تو میں نے اسے بھی مختصر انداز میں بتا دی، وہ ایک بار پھر سے معذرت کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ میں اس کے ساتھ چلا آتا تو

شاید یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ اب ہوتی کھو کوئی نہیں نال سکتا تھا، ایسا ہی تاثر دے کر میں نے بات کسی اور کسی اور وقت کے لیے ٹال دی۔ میں نے فون بند

کیا تو میرے سامنے کی میز پر مارے ایک ایک لٹکا کو جو بے غور سے دیکھ رہی تھی ممکن ہے اس نے میرا فون سنا بھی ہو میں نے بس ایک لمحہ دیکھا اور پھر

لگا ہیں پھیر لیں۔ دفتر میں اب تک میں نے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اور فون سن سن کر کتا چکا تھا، ایک ہی بات بار بار کہنے سے طبیعت مکر ہو گئی تھی۔

میں نے اس لمحے پر بس کلب جانے کا سوچا تو حسن کہیں دکھائی نہیں دیا۔ میں اس کے آجانے تک رک گیا۔ اسی وقت ہمارے اخبار کارٹسٹ

رپورٹنگ روم میں آ گیا۔ گول شیٹوں کی ٹیک میں سے اس کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئیں تھیں، وہ اپنی مخصوص مسکراہٹ اور سنٹائے ہوئے انداز میں

ہاتھ ملا کر بولا۔

”شمار صاحب! آپ کا ایڈیشن ہے اور آپ نے ہمیں ڈی ایم ای نہیں دی؟“

”ہائیں، تمہیں کس نے کہا ہے کہ ایڈیشن میں دوں گا؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہمیں جو شیڈول ملا ہے، اس میں تو آپ ہی کا نام ہے۔“ اس نے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

”اور نثار شاہ؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”وہ صرف ٹی وی اور ٹی وی دیکھے گا، ایڈیشن آپ دیں گے“ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”بڑی مہربانی کہ تم نے مجھے مطلع کر دیا“ میں نے مسکراتے ہوئے آرٹسٹ سے کہا تو ماریہ کی طویہ آواز ابھری۔

”اب شجاع صاحب لکھیں گے فنکاروں کی شان میں قصیدے، میں بھی پڑھوں گی کہ کیا کچھ فرماتے ہیں آپ“

”ماریہ بی بی ایسا نہیں کہتے۔“ آرٹسٹ نے اپنے مخصوص انداز میں اس کو ٹوکا۔

”اور مجھے کوئی روک بھی نہیں سکتا، تمہارے شجاع صاحب بھی نہیں۔ میرے من میں جو آئے گا، وہ میں کہوں گی“ ماریہ نے سرخ ہوتے

ہوئے چہرے سے کہا تو میں نے آرٹسٹ کی توجہ اپنی طرف کی۔

”چھوڑو، یارا تمہیں آج کسی وقت ڈی مل جائے گی۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ وہ یہ کہہ کر چل دیا تو فطری طور پر میری نگاہیں ماریہ کے چہرے پر ٹپک گئیں، وہ ہاں سوائے غلطی کے اور کوئی تاثر نہیں

تھا۔ وہ جس پر ہنسی سے گزر رہی تھی، وہ میں ہی جانتا تھا اس کا احساس کرتے ہی میرے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ ایک تک میری طرف دیکھے

پہلی جا رہی تھی۔ میری مسکراہٹ نے اس پر چلتی کام کیا، اس نے غصے میں کاغذ لیے اور اٹھ کر چلی گئی۔ اس وقت میں حسن کو ڈھونڈنے کے لیے فون

اٹھانا چاہ رہا تھا کہ فون بج اٹھا۔ میں نے ریسیور اٹھایا تو پلچتی ہوئی ”ہیلو“ میرے کان میں گونج اٹھی، دوسری طرف ہاتھی۔

”جی فرمائیے؟“ میرا لہجہ بچانے کیوں سخت ہو گیا۔

”کل رات کے واقعہ پر مجھے بہت افسوس ہوا، میں نے ابھی پڑھا ہے، کہیں نقصان تو نہیں ہوا آپ کا؟“ مجھے یوں لگا جیسے اس کے لہجے

میں ٹھوہری نہیں بلکہ دھمکی چھپی ہوئی ہے۔

”جی نہیں۔۔۔ بہت شکر یہ کہ آپ نے مجھے فون کیا۔“ میں نے خود پر جبر کرتے ہوئے ملامت انداز میں کہا۔

”میں نے بخش افسوس کرنے کے لیے ہی تو آپ کو فون نہیں کیا بلکہ۔۔۔“

”بلکہ کیا؟“ میں نے سرد سے لہجے میں پوچھا۔

”میں یہ سوچ رہی ہوں کہ آپ نے یکدم ہی کتنی شہرت لے لی۔ ہم تو ترستے ہیں کہ کوئی نقصان بھی نہ ہو اور ڈھیروں شہرت مل جائے۔

آپ نے تو ہم شوہز کے لوگوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔“

”میں سمجھا نہیں، آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟“ میں نے اس کی باتوں میں جھجھی ہوئی بات کو محسوس کرتے ہوئے انجان بن کر کہا۔

”آپ نہ ہی سمجھیں تو اچھی بات ہے۔ بہر حال، میں آپ سے ایک درخواست کرنا چاہ رہی تھی اگر قبول ہو جائے تو؟“ وہ ہنستے ہوئے

بولی۔

”بولیں“ میں نے پوچھا۔

”آپ میرے ساتھ اسکیپٹل کیوں نہیں بخالیتے۔ یقین جانیں، آپ کو بھی بہت فائدہ ہوگا“ یہ کہتے ہوئے اس نے ایک دم سے قہقہہ لگا دیا۔
”یہ آپ کیا باتیں کر رہی ہیں، مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا؟“ میں نے سختی سے کہا۔

”میرے پاس آؤ، آپ کو سب کچھ سمجھا دوں گی، ہائے دادے، سٹوڈیو جانے سے پہلے آپ کا پروگرام کیا ہے۔ کھانا کھائے کھاتے ہیں؟“
”وہ پھر سے ہنسی تو میں نے انتہائی سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھیں، ہماری بی بی! آپ جو کچھ بھی مجھے کہنا چاہ رہی ہیں وہ میں پوری طرح سمجھ رہا ہوں۔ آپ جس انداز سے مجھے دعوت دے رہی ہو، کل میں بھی آپ کو ایسی ہی دعوت دے سکتا ہوں۔ آج میں تو آ جاؤں گا لیکن آپ نہیں آؤ گی“ میرا لہجہ نرم تھا۔

”شاید آپ کے پاس وہ ماحول نہ ہو جو میرے پاس ہے، مدہوش کر کے رکھ دوں گی۔“

”لیکن میں آپ کو ہوش مند دیکھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے انتہائی نرم انداز میں کہا۔

”میں کہتی ہوں، ہودستی کا ہاتھ بڑھا لو، اچھے رہو گے۔“ وہ میری بات پر اچانک ہی بھڑک اٹھی تھی۔

”دیکھو، ہاں آپ تو فقط دوستی کی بات کر رہی ہو، میں کچھ اور بھی چاہتا ہوں۔“

”یوہو، میں پورا کروں گی۔“ وہ تیزی سے بولی۔

”وقت کا انتظار کرو“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”میں انتظار کروں گی، شام کو ملتے ہیں۔“ اس نے جلدی سے کہا اور فون بند کر دیا۔ اس کے فون نے میرے دماغ کی چولیس تک ہلا کر رکھ

دی تھی۔ میں نے ریسیور کرینڈل پر رکھا اور اس کی ایک ایک بات یاد کرنے لگا۔ بڑی سچی چیز باتیں کی تھیں اس نے اور وہ بھی بڑے اعتماد کے ساتھ۔

اس کا لہجہ میرے دماغ میں ٹھوکریں مارنے لگا۔ اس کی ایک ایک بات اور دعوت دینے کا انداز کس قدر دھمکی آمیز تھا۔ سچی اچانک میرے ذہن میں

تھکی کی طرح یہ خیال کونسا کہیں رات والا حملہ ہانے تو نہیں کروایا محض مجھے ڈرانا یا دھمکانے کے لیے؟ میں جیسے جیسے سوچتا چلا جا رہا تھا، مجھے اس کی

باتیں یاد آنے لگیں۔ وہ تو اس قدر جذباتی ہو گئی تھی کہ اس کے کارندے سٹوڈیو میں ہی مجھے پرچہ دوڑے تھے۔ تو ہاں اس سٹیج پر بھی اتر سکتی ہے؟ میں

شاید اس بات پر مزید سوچتا، اسی لحاظ سے اندر آ گیا۔ مجھ کو دیکھتے ہی بولا۔

”آج کھانے کا پروگرام ملتوی کر دیا ہے کیا، جان تھی؟“

”نہیں، بس چلتے ہیں، پھر وہاں بھی جلدی آتا ہے، ایڈیشن کی ڈمی دینا ہے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔ پھر راستے میں باتیں کرتے

ہوئے ہم پریس کلب جا پہنچے۔ میز چمیاں اترتے ہی سامنے ندیم کو بیٹھا ہوا پا کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔ وہ مجھ کو دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔ ٹیک سٹیک کے

بعد اس نے کہا۔

”شجاع ہماری! میں نے خبر پڑھی لیکن فون اس لیے نہیں کہ آپ ایک تو بہت فون سن چکے ہوں گے، دوسرا تفصیل فون پر تو نہیں بتائی جا سکتی اس

لیے میں یہاں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔“

”ماتا ہوں، کیا گوندل نہیں آیا ابھی تک۔۔۔؟“ میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”وہ آکر چلا گیا ہے، کہہ رہا تھا کہ شام کو سٹوڈیو ہی ملیں گے“ ندیم نے کہا تو مجھے قدرے لمبوس سا ہوا۔ پھر کھانے کے دوران میں نے اسے رات ہونے والے واقعہ کے بارے میں بتا دیا اور صبح سے اب تک جو فون تھے، وہ بھی بتا دیئے۔ تبھی حسن بولا۔

”ہا کے بارے میں تمہارا خیال بالکل ٹھیک ہے، اس سے بہت محتاط رہنا“

”میں بھی یہی کہوں گا“ ندیم نے چائے کے کپ کو آہستہ سے گھماتے ہوئے کہا۔

”وہ کیوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا تو ندیم نے دھیرے سے کہا۔

”وہ اگر آج ٹاپ کلاس اداکارہ ہے تو وہ صرف اپنے بل بوتے پر نہیں آئی، ایک پوری لابی ہے اس کے پیچھے۔ اس میں کون کون لوگ ہیں، تفصیل سنو گے تو چکرا کر رہ جاؤ گے اور لوگوں کو چھوڑیں، ہمارے صحافی ہماری بھی شامل ہیں۔“

”تمہارا خیال ہے، گوندل؟“ میں نے تصدیق چاہی۔

”جی ہاں، مگر یہ لمبوس کرنے والی کوئی بات نہیں ہے۔ اس دنیا میں ہر بندہ اپنا فائدہ سوچتا ہے۔“ ندیم نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مجھے بتاؤ، ندیم! اہا کے پیچھے کون لوگ ہیں؟“ میں نے تیزی سے اک خیال کے تحت پوچھا۔

”شجاع ہماری! میں آپ کو سب کچھ بتا دینے کے لیے تیار ہوں لیکن مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ آپ نے اس شعبہ میں نہیں رہنا۔ جو وقت گزارنا ہے، اسے گزاریں۔“ ندیم نے مجھے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

”لیکن اس طرح تو میں اندھیرے میں۔۔۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”کوئی بات نہیں ہے، میں ہوں نا! میں گوندل نہیں ہوں اور نہ ہی کسی طوائف کی کمائی سے حصہ دار ہوں۔“ ندیم نے اپنے مخصوص احتجاجی لہجے میں کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، جیسے تم کہو۔ میں تم پر بھروسہ کرتا ہوں“ میں نے بات ختم کرنا چاہی تو حسن نے بھی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اسی موضوع پر باتیں کرتے رہنے کے بعد میں نے ندیم سے ایڈیشن کے بارے میں مشورہ کیا۔ اس نے بڑے خلوص سے مجھے بہت ساری باتیں بتائیں۔ پھر شام کی چائے پی کر ہم وہاں سے اٹھ گئے۔ میں دفتر چلا گیا اور حسن نکل گیا، ندیم نے مجھ سے سٹوڈیو میں ملنے کا وعدہ کیا تھا۔

شام ڈھل رہی تھی اور شفق ابھی واضح تھی۔ میں فریش ہونے کے بعد اپنے فلیٹ کی کڑکی میں کھڑا کافی پی رہا تھا۔ میرے ذہن میں تیزی سے خیال گردش کر رہے تھے۔ میں جب سے ہمدانی صاحب چلے گئے تھے اور میں دوبارہ آفس آیا تھا تب ہی سے میں یکدم ہی بے سکون ہو گیا تھا، اس کی وجہ سے سلیم فارانی تھا۔ اک انہماکی دنیا میں چلے جانے کے باعث معاملات بہانے سلیم کے حریفانہ چلے جا رہے تھے۔ دفتر میں اور دفتر سے باہر بھی اک عجیب طرح کی بے اطمینانی جھیل گئی تھی۔ اگرچہ میں اپنے مخصوص ماحول سے نکلا تھا جہاں مہر سیاست کی زبان ہی سہی جاتی تھی لیکن شوہر کی دنیا میں آکر بھی مجھے کوئی رعینتی نظر نہیں آتی تھی حالانکہ شوہر کو رعینتیں شہجہ سمجھا جاتا ہے جبکہ یہی میرے لیے سنگین بن گیا تھا۔ میں

سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک اداکارہ میری راہ میں اس طرح آن کھڑی ہوگی کہ لوگ مجھے محتاط ہو جانے کے مشورے دینے لگیں گے۔ مجھ میں اتنی برداشت تھی کہ میں ہر طرح کے حالات کا سامنا کر سکوں اور میں ہر طرح کے حالات کا سامنا کرتا بھی آیا تھا لیکن یوں اچانک پکرا دینے والے حالات سے پہلی بار ساہتہ پڑا تھا

”کیا محض دونوں میں ہی گھبرا گئے؟“ میرے اندر سے یہ آوازی اٹھی تو میں مسکرا دیا۔ میرا جواب ”نہیں“ میں تھا۔ دراصل انہی چند دنوں میں حالات اتنی تیزی سے تبدیل ہوئے تھے کہ میں خود کو تیار نہیں کر پایا تھا۔

”تو کرونا خود کو تیار۔۔۔“ میرے اندر کے آدمی نے مجھے فوراً ہی مشورہ دے دیا۔ یہی وہ لمحہ تھا جس سے میں پراچھا ہو گیا۔ حالات جیسے بھی ہوں، مجھے ان کا سامنا کرنا تھا چاہے مجھے اس کے لیے چوکھی لڑائی ہی کیوں نہ لڑنا پڑے مگر میری ایک اپنی سہولت تھی، میری اپنی شخصیت جس پر بہر حال میں کوئی داغ نہیں لگنے دینا چاہتا تھا۔ یہ دنیا چاہے جھسی جھسی تھی، مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مجھے تو اس چیلنج کا سامنا تھا جو خواہ مخواہ مجھ پر مسلط کر دیا گیا تھا۔ شو بزنس اور فنکاروں کی دنیا ہے۔ اس کو بھی بڑے عجیب و غریب حالات سے دو چار ہونا پڑا ہے۔ کبھی اس میں وہ لوگ تھے جنہیں اگر غرض تھی تو محض فن سے، وہ تعلقیت کا رتھے۔ ان کے نزدیک دولت اتنی اہمیت نہیں رکھتی تھی جتنی فن کی قدر افزائی ان کے نزدیک اہم تھی۔ جہاں مادہ پرستی نے زندگی کے ہر شعبہ کو متاثر کیا وہاں شو بزنس کے حالات بھی تبدیل ہوتے چلے گئے۔ کالے و سفید کرنے والے اس دنیا میں وارد ہوئے تو ماحول ہی تبدیل ہو گیا۔ یہاں ہر چیز کو دولت سے ناپا جانے لگا، یہاں تک کہ جذبے بھی دولت کے ذریعہ آگئے۔ فن کی قدر بہت پیچھے رہ گئی، ایک نئی طاقت جو اس دنیا میں وارد ہو چکی تو کبھی اسی کے سامنے ٹھکنے لگے تھے۔ وہ لوگ جنہیں قلم کی حرمت کا پاس تھا، وہ بھی اس میں بہہ گئے۔ اور جو بچے وہ سکرین کے پیچھے گھورا اندھیرے میں کھو گئے۔ منٹو جو ایک کہانی کا تھا اور ساغر صدیقی جو کہیت نگار تھا ان راہوں پر۔۔۔ فون کی کھنٹی نے مجھے خیالوں سے واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ کانی ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ میں نے گھونٹ بھرا دمک ایک طرف رکھ کر فون ریسو کیا۔ دوسری طرف ندیم تھا، اس کے لہجے میں شوٹی تھی۔

”شجاع بھائی! کہاں ہیں آپ؟“

”ابھی تک تو گھر میں ہوں“ میں کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔

”تو آجائیں نا وہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”کوئی خاص بات؟“ میں نے یونہی پوچھا۔

”آج میں آپ کو اپنی دوست سے ملانا ہوں، وہ ماہر ہے اس نے تیزی سے کہا۔

”بس آ رہا ہوں نا یا رانا“ میں نے کہا، اور پھر تھوڑی دیر بعد سٹوڈیو کی طرف نکل گیا۔

خلاف توقع مجھے ندیم دکھائی نہیں دیا۔ میں کچھ دیر سٹوڈیو میں گزار کر وہاں پارکنگ میں آیا کہ ایک گاڑی زن سے آئی اور مجھ سے کچھ قہقہے پر رک گئی۔ اگلے ہی لمحہ اس میں سے ہانقلی، شاید وہ مجھے گاڑی میں ہی دیکھ چکی تھی اس لیے اس کی نظریں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کے گاڑی

اس کے دائیں بائیں تھے۔ میں اسے نظر انداز کرتا ہوا پارکنگ کی طرف جانے لگا تو اس نے مجھے آواز دے لی۔

”حضور! ہمارے ساتھ نارنگی ہے کیا؟“ ہانے چپے ہوئے لہجے میں پتے ہوئے کہا۔ میں رک گیا اور چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ لا کر بولا۔

”ہماری دوستی تو اب شروع ہوئی ہے، اس میں نارنگی کہاں سے لپک پڑی؟“

”شکر ہے، آپ نے ہماری دوستی کو مانا تو۔۔۔ خیر آئیں، کچھ دیر بیٹھتے ہیں۔“

”ابھی وقت نہیں ہے۔۔۔ آپ کا سیٹ پر انتظار ہو رہا ہے اور مجھے بھی کام ہے۔ ملتے ہیں کسی وقت۔“

”میری آفر ہو وقت آپ کے لیے ہے“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھتا ہوں“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”ابھی بات ہے کہ آپ مجھ جائیں ورنہ سمجھانا پڑتا ہے۔“ اس بار اس کا لہجہ نرم نہیں رہ سکا تھا۔ تب غصے کی ایک لہر میرے دماغ کو چڑھا

گئی، تاہم میں نے ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”اصل میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کچھ بہت جلدی جاتے ہیں لیکن اس کا اظہار نہیں کرتے، کہہ سکتے ہوئے بھی نہیں سمجھنا چاہتے

اور کچھ لوگ سمجھتے بعد میں ہیں لیکن سمجھا پہلے دیتے ہیں اس لیے تم بھی سمجھو۔ کہیں تمہیں سمجھانے کے لیے وقت نہ نکالنا پڑ جائے گی یو ہائے!“

ہانے میری اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا، بس مجھے دیکھتی رہی۔ میں نے پارکنگ سے گاڑی نکالی اور اسے نظر انداز کرتا ہوا نکل پڑا،

میں نے سٹوڈیو کا گیٹ کراس کیا ہی تھا کہ ندیم کا فون آ گیا۔

”بھئی، کہاں ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”بیمیں مٹان روڈ پر ایک ٹی بی ای او سے فون کر رہا ہوں، آپ کہاں ہیں؟“ اس نے پوچھا تو میں نے اسے بتا دیا، تب وہ بولا۔ ”جلس، آپ

آجائیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ٹی بی ای او کا نام اور لوکیشن بتا کر فون بند کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں وہاں پہنچ گیا۔ وہ سڑک کے ساتھ ہی ڈرامہٹ کر

کھڑے تھے، اس کے ساتھ ایک نوخیز لڑکی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا، بلاشبہ وہ حسین لڑکی تھی۔ ایک ہی نظر میں اس کی کشش نے توجہ حاصل

کر لی تھی، رکی ہی ہاتوں کے بعد ندیم بولا۔ ”شجاع بھائی! میں اسے سٹوڈیو نہیں لے جانا چاہ رہا تھا، ایویں خواہ مخواہ نظروں میں آجاتا اور ابھی میں اس

کے بارے میں بتانا بھی نہیں چاہ رہا ہوں“

”تو ہا، اسے کسی ریستوران میں لے جاتے“

”وہی تو چاہ رہا تھا، آپ نے دیر سے آنے کا کہا تو ہم گھر سے ہی دیر کر کے نکلے ہیں۔“

”او۔۔۔! تو چلو، اب چلتے ہیں“ میں نے کہا۔

”مجھے ایویں ڈراما سا کام ہے سٹوڈیو میں، بس گیا اور آیا۔ آپ اتنی دیر میں دونوں ہی بور نہیں ہوں گے، ہو سکتا ہے، ہم کھانے کے بعد آپ

ہی کے ہاں ٹھہر جائیں۔“ ندیم پتے ہوئے بولا۔ مجھے یقین ہے کہ میرے آنے تک آپ اچھے خاصے بے تکلف ہو چکے ہوں گے، میں نے غائبانہ

تعارف کرادیا ہے۔" اس نے کہا تو میں نے وہیں سڑک پر کھڑے ہو کر اس سے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے میں نے سختی سے کہا۔

"گازی میں بیٹھو۔" یوں وہ دونوں چپ چاپ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ میں نے گاڑی بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تمہیں اگر بہت ضروری کام ہے تو ہمیں ڈراپ کر کے گاڑی لے آنا، پھر سکون سے اپنا کام کر کے واپس آ جانا۔"

"جی ٹھیک ہے" اس نے دھیرے سے کہا اور پھر دہائی چوک کے اوپن انیئر ریستوران تک ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ وہ پارکنگ

ہی سے گاڑی لے گیا۔ سٹلٹی میرے سامنے والی میز پر بیٹھی اور میری جانب دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ندیم آپ کی بڑی تعریف کرتا ہے، حالانکہ اسے آپ سے ملے چند دن ہی بنے ہیں۔"

"ہاں۔ ایسا ہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اس کی اچھائی ہے" میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔

"احمد تو آپ پر ایسا ہے کہ جیسے برسوں سے آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔" وہ آنکھوں میں ہنستے ہوئے بولی۔

"ہاں۔! کچھ لوگ ہوتے ہی ایسے ہیں کہ پہلی نگاہ میں یہ احساس دے جاتے ہیں کہ وہ اپنے ہیں۔" میں نے بخیردگی سے کہا۔

تب میں نے اس کا بھرپور جائزہ لیا۔ پہلی نظر میں اس کی آنکھیں متوجہ کر لینے والی تھیں۔ قدرے کھڑی، ہاک کے ساتھ تپتے تپتے ہونٹ، لمبی گردن،

سفید رنگ، خوب گھنے بال اور تکی سی، اس کے بدن پر لباس اتنا زیادہ قیمتی نہیں تھا۔ کان میں بڑے بندے شاہے سونے کے رہے ہوں گے۔ ہمارے

پینے کے تھوڑی دیر بعد ہیرا آ گیا۔ میں نے فی الحال اسے کوئی ڈرنک لانے کو کہا، وہ وہاں سڑ گیا اور ہمارے درمیان باتیں شروع ہو گئیں۔ وہ بی اس

سی کر چکی تھی اور اب مزید پڑھنے کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی کوشش میں تھی۔ ندیم سے اس کی ملاقات چند ماہ پہلے ہی ہوئی تھی۔ اصل میں وہ

شوہر میں آنا چاہ رہی تھی۔ بھول اس کے، یہ اس کی خواہش ہی نہیں بلکہ مجبوری بھی تھی۔ میں نے یہ تو معلوم نہیں کیا کہ اس نے اس بارے میں کیا کیا

خواب دیکھے ہیں اور اس نے شوہر ہی کو کیوں چنا تاہم میں اتنا ضرور جانتا تھا کہ اگر کوئی اسے سہارا دے دے تو اس میں اتنی صلاحیت گنتی تھی کہ وہ اپنا

نام بنا جائے۔ اب اس کی تقدیر کیا تھی، میں اس بارے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ اپنی خواہش یا مجبوری کے تحت شوہر میں آنے کا سوچتی بھی رہی لیکن

انجوائی تھا طوا انداز میں، پھر کالج لکچریشن میں نمایاں طور پر سامنے آ جانے کی وجہ سے ایک خاتون رپورٹر سے اس کا رابطہ ہوا تو اس نے ندیم سے ملوایا،

یوں یہ تعلق دوستی میں بدل گیا۔ میں نے اس کے گھریلو معاملات جاننے کی ذرا بھی کوشش نہ کی اور نہ ہی مجھے اس کی ضرورت تھی، بس یونیورسٹی کے

حوالے سے اس کے ساتھ باتیں کرتا رہا۔ ہمیں باتیں کرتے کافی وقت گزر گیا لیکن ندیم نہ پہنچا۔ مجھے اس پر غصہ آ رہا تھا کہ اگر اسے دیر لگا کر آنا تھا تو

پہلے ہی بتا دیتا یا پھر اسے فون کر دینا چاہیے تھا۔ مجھے وقت کا احساس اس وقت ہوا جب ہر اور دوسری بار پوچھ کر چلا گیا۔ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔

"اسے ایسا پتہ نہیں کیا کام پڑ گیا جو ابھی تک نہیں پہنچا؟"

"مجھے بھی خیال آ رہا تھا لیکن میں نے اظہار نہیں کیا؟" سٹلٹی نے دھیرے سے کہا۔

"کیوں نہ اسے تھوڑی سی سزا دے دی جائے؟" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب۔۔۔ سزا کیسے؟" وہ بولی۔

”ہم کھانا کھا لیتے ہیں۔ وہ جب آئے گا تو دیکھ لیں گے“ میں نے کہا اور اشارے سے سرے کو بلا لیا، اسے آرڈر رکھوایا تو وہ چلا گیا۔ مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ ندیم نے دیر کیوں کر دی؟ اس وقت تک سسٹنی کی جھجک دور ہو چکی تھی لیکن ندیم کے نہ آنے کے باعث اک عجیب سے وسوسے نے مجھے آن گھیرا، سسٹنی کا وجود مجھے کھٹکے لگا۔ محض چند دن کی ملاقات اور ندیم پر پھر وسوسے کبھی کسی اور ہی کہانی کی بنیاد نہ بن جائے۔ آخر وہ مجھے اس سے کیوں ملوانا چاہتا تھا اور پھر میرے پاس چھوڑ کر وہ خود غائب ہو گیا، آخر یہ کیا معرکہ ہے۔ ابھی سارا دن کچھلی رات کے ہونے والے واقعہ کی بازگشت ختم نہیں ہو پارہی تھی اور اب۔۔۔؟

”کیا سوچتے گئے آپ۔۔۔؟“ سسٹنی نے مسکراتے ہوئے بڑی ادا سے کہا۔

”نہی کہ ندیم کیوں نہیں آیا؟ میں واقعی اس کے بارے میں پریشان ہو گیا ہوں۔“

”وہ ایسا ہی ہے، کبھی کبھی مجھے اس کا بہت انتظار کرنا پڑتا ہے۔“ وہ بولی۔

”یہ اچھی بات تو نہیں ہے نا۔“ میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔

”ہاں، اچھی تو نہیں لیکن بس چل رہا ہے۔۔۔“ سسٹنی نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔

کھانے کے دوران ایسے ہی ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں جبکہ میرے اندر کے وسوسے زیادہ شدت سے مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے لگے۔ وہ شہزادی دنیا میں چانس کی منتظر کبھی تھی۔ ایسا چانس دو دھماکا خیز ہو، ایسا نہیں کہ بس چھوٹے چھوٹے کرداروں کے سہارے آگے بڑھا جائے آہستہ آہستہ وہ کھل رہی تھی۔ مجھے احساس ہو گیا کہ وہ کیا چاہتی ہے لیکن میں نے اپنے احساس کا اس پر اظہار نہیں کیا۔ میں فطری طور پر خاموش ہو چکا تھا، بس اس کی منتظر رہا۔ چھانے کیوں میں اس وقت سسٹنی سے جان چھڑا لینا چاہتا تھا۔ اس وقت ہم کھانے کے بعد کولڈ ڈرنک پی رہے تھے کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے جلدی سے آن کر کے ”ہیلو“ کہا تو ایک اجنبی سی آواز تھی، اس نے پوچھا۔

”آپ شجاع صاحب ہیں؟“

”جی ہاں، کیا ہے؟“

”میں شان ہسپتال سے بات کر رہا ہوں۔ آپ کے دوست ندیم کو حادثہ پیش آ گیا ہے، وہ ادھر ہمارے پاس پہنچ چکے ہیں۔ انہوں نے اطلاع کرنے کے لیے کہا ہے۔“

”وہ خیریت سے ہے؟“ میں بوکھلا گیا تھا۔

”اتنا زیادہ سیرس نہیں ہے، آپ خود آ کر دیکھ لیں۔“ اس نے غیر جذباتی انداز میں کہا تو میں نے اس کا پتہ سمجھ کر فون بند کر دیا۔

”خیریت؟“ سسٹنی نے صغریٰ سیکڑ کر پوچھا۔

”نہیں، خیریت نہیں ہے۔ ندیم کو حادثہ پیش آ گیا ہے۔۔۔ آؤ چلیں“ میں نے جلدی سے بل ادا کیا اور رکشے میں جا بیٹھا۔ میں قدرے پریشان ہو گیا تھا۔ جس قسم کے پے در پے حالات سامنے آ رہے تھے، ان میں کچھ بھی ممکن تھا۔ یہی سوچتے سوچتے اچانک مجھے یہ خیال آیا کہ مجھے

ترسپ کرنے کے لیے تو حادثہ کا ذکر نہیں کیا گیا؟ یہ خیال آتے ہی میں مضطرب سا ہوا، ایک بے چینی تھی جو میرے اندر سرایت کر گئی۔ اک لمحہ کو میں نے اس کا سامنا کرنے کے لیے متبادل سوچنا چاہا لیکن میرے اندر کے ضدی اور انا پرست شخص نے ذرا بھی قبول نہیں کیا، کوئی میرے اندر بیٹھا بول رہا تھا۔۔۔ "مرد ہو، مرد! حالات کا سامنا کرو۔ کیا ہو جائے گا، تمہیں مار ڈالیں گے تو پھر کیا ہے۔ موت سے ڈرتے ہو؟ اگر تم ڈر گئے تو تمہیں ڈرانے والے اور بہت سارے لوگ پیدا ہو جائیں گے۔" میرے اندر کے شخص نے مجھے ڈھیروں حوصلہ دے دیا۔ ہسپتال کے سین سامنے دکشا رکاشا کا تو میں نے پیسے دیئے اور استقبالیہ پر جا پہنچا۔ وہ ایک پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ کاؤنٹر پر ایک ساٹولا سا شخص بیٹھا تھا، وہ میری طرف متوجہ ہوا تو میں نے ندیم کے بارے میں پوچھا۔

"اچھا تو آپ شجاع ہیں، میں نے ہی آپ کو فون کیا تھا" پھر ایک وارڈ بوائے نے شخص کو بلا کر اس نے ندیم سے ملوانے کا کہہ دیا۔ چند لمحوں بعد ندیم کے پاس تھے اس کے بازو پر پٹیوں بندھی ہوئی تھیں اور باقی جسم کبل میں تھا۔ وہ ہوش میں تھا، مجھے دیکھتے ہی اس کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔ میں اس کے قریب جا بیٹھا اور دیر سے سے پوچھا۔

"کیسے ہوا یہ سب؟" اس نے میری طرف دیکھا اور مسکراتے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی شوڈیو سے کچھ فاصلے پر تھا کہ ایک چپ میرے دائیں طرف سے آئی اور اس نے مجھے سائٹیز مار دی، رولڈرز زیادہ تیز نہیں تھی اس لیے اتنی زیادہ چوٹیں نہیں آئیں۔ میں سڑک پر گر گیا تو مجھ پر دو فائر ہوئے جو مجھے نہیں لگے پھر وہ اچانک ہی غائب ہو گئے۔"

"تم نے انہیں دیکھا کسی کی شکل یا جیب بھجان سکتے ہو؟" میں نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں، میری کوشش تھی کہ میں دیکھ لوں مگر نہیں دیکھ سکا۔"

"اور چوٹیں، میرا مطلب کوئی ہڈی وغیرہ؟"

"خدا کا شکر ہے، کوئی ہڈی نہیں ٹوٹی۔" اس نے پھر مسکراتے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو مجھے حوصلہ ہوا۔ پھر وہ سٹلنی سے باتیں کرنے لگا۔ چند باتوں کے بعد وہ سٹلنی سے کہنے لگا۔

"تم اگر جانا چاہو تو جلی جاؤ"

"نہیں۔ میں ادھر ہی رہوں گی تمہارے پاس" سٹلنی نے جذباتی سے انداز میں کہا تو میں نے ندیم سے پوچھا۔

"مجھے یہ بتاؤ، تم شوڈیو لینے کیا گئے تھے؟"

"میں نے کہا نا، کوئی کام تھا" وہ دیر سے سے بولا۔

"کیا کام تھا؟" میں نے سختی سے پوچھا تو اس نے سٹلنی کی طرف دیکھا پھر میری طرف، میں سمجھ گیا کہ وہ اس کے سامنے بتانا نہیں چاہ رہا۔ میں نے سٹلنی کو باہر بھیج دیا تو اس نے کہا۔

"شجاع بھائی! آج میرے پاس ایک لکابھی نہیں تھا۔ یہ اچانک ہی مجھے مل گئی، اب میں اس سے یہ تو اظہار نہیں کر سکتا تھا کہ میرے پاس

میں نے اپنے ایک دوست سے پیسے مانگے تھے، اس نے سٹوڈیو میں لے لینے کا کہا۔ پھر میں نے بہت سوچ کر آپ کو فون کیا۔“

”اوہ، تو یہ بات تھی، مگر بے وقوف! جب میں آ گیا تھا تو پھر نہیں کہیں جانے کی ضرورت کیا تھی؟“

”بس ایویں لالچی سا ہو گیا تھا کہ آپ کے سامنے بھی مجرم رہ جائے“ اس نے لگاؤ میں لہجہ کرتے ہوئے کہا تو مجھے اس پر بہت عیاں آیا۔

”آئندہ ایسا نہیں سوچنا“ یہ کہہ کر میں نے سٹوڈیو کو آواز دے دی، وہ آ کر ایک طرف بیٹھ گیا تو میں نے کاؤنٹر پر جا کر کچھ پیسے جمع کروا

دیئے۔ ڈاکٹر سے مل کر اس کی صحیح صورت حال کے بارے میں پوچھا، اس نے مجھے تسلی دی کہ اتنا زیادہ سیریس نہیں ہے اور سٹ و فیورہ کے بعد مزید

تسلی ہو جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ دو چار دن میں گھر چلا جائے گا۔ وہاں سے پوری تسلی کرنے کے بعد میں ندیم کے پاس آ گیا اور اسے سمجھاتے

ہوئے کہا۔ ”محض روڈ ایکسیڈنٹ بتانا، فائرنگ کا ذکر نہیں کرنا۔ یونہی بات کا ہنگامہ نہ بنے گا“

”کیا آپ دشمنوں سے خوفزدہ ہیں؟“ سٹوڈیو جلدی سے یوں۔

”نہیں، وہ اتنا میرے میں ہیں۔ ہم اگر وار کرنا بھی چاہیں تو کس پر کریں؟“ میں نے ندیم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”آپ پر اور مجھ پر۔۔۔ کہیں یہ ایک ہی طرف سے تو مسلسل نہیں ہے؟“ ندیم نے کہا۔

”نہیں، کچھ اور ہے یا پھر وہ بھی سکتا ہے لیکن خیر، ہم دماغ مت کھاؤ۔ وہ ڈاکٹر نہیں نیند کا انجکشن لگا دے گا۔ تم آرام کرو، صبح ملاقات ہوگی۔“

”ایک بات اور۔۔۔“ اس نے ہنسنے لگا۔

”یوں؟“ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

”یہ سٹوڈیو اپنے ساتھ لے جائیں، صبح یہ چلی جائے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے گھروالوں کے یا اور کسی کے سامنے۔۔۔ آپ سمجھیں نا

.....“

”اوکے، لیکن تمہارے گھروالوں کو کیسے پتہ چلے گا؟“

”میں انہیں صبح مطلع کر دوں گا، سسٹی کی وجہ سے میں نے ابھی انہیں نہیں بتایا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ کسی بھی معاملے میں پریشان نہیں ہونا، بس جلد از جلد ٹھیک ہونے کی کوشش کرنا، سمجھے!“ میں نے اس سے ہاتھ ملاتے

ہوئے کہا۔ پھر سٹوڈیو اس سے باتیں کرنے لگی تو میں کمرے سے نکل گیا۔ کیا یہ میری طرح کا ہی ندیم پر قاحلانہ حملہ تھا۔ میں تمام راتے ہی سوچتا ہوا

آیا۔ اس حملے انداز بھی مجھ پر ہونے والے حملے جیسا ہی تھا۔ محض دھمکانا۔ وہ کس کے کہنے پر ہی یوں حملہ آور ہو رہے تھے۔ ان کی پشت پر کون ہو سکتا

تھا؟ میں اسی سوال کا جواب چاہتا تھا۔ میرا گمان مجھے یہ کہہ رہا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے، خود سامنے آنے کی کبھی کوشش نہیں کرے گا۔ اسے مجھے ہی

ڈھونڈنا کالنا ہوگا اور اس کے لیے برداشت اور حوصلہ چاہیے تھا۔ میں بھڑک کر کوئی ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے میرے ارد گرد اور اندر میرا اتنی رہے

اور میں روشنی نہ پاسکوں۔ مجھے ندیم کے زخمی ہو جانے کا بے انتہاد کہ تھا، یہی دکھ میرے اندر کے وحشی پن کو جگانے کا باعث بن رہا تھا۔ حالات مجھے

برداشت کرنے اور حوصلہ ہارنے کا اشارہ کر رہے تھے، یہ تضاد میرے اندر اک نئی قسم کی کشش پیدا کرنے کا محرک بن گیا تھا۔ میں نے فلیٹ کا

دروازہ کھولا تو سلی نے دیر سے پوچھا۔

”آپ یہاں تمہارے ہیں؟“

”ہوں؟“ میں نے ہنکارا بھرا اور تکیاں روشن کر دیں۔ وہ ایک صوفے پر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔ ”کچھ کھاؤ بیجی؟“

”میرا تو دل نہیں چاہ رہا لیکن آپ چاہیں تو میں آپ کو بنا دیتی ہوں؟“

”مجھے اس وقت کافی کی شدت سے طلب ہو رہی ہے اور میں نے ابھی کام بھی کرنا ہے۔“

”میں ابھی بنا دیتی ہوں، لیکن کدھر ہے؟“ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ پھر میرے بتانے پر وہ لیکن کی طرف بڑھ گئی اور میں ہاتھ روم سے فریش

ہو کر کھینے کی میز پر آ بیٹھا۔ میں نے کافی سپرڈ کے لیے اور سب کچھ ذہن سے نکال کر ایڈیشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ کافی کام بہتا ہو گیا لے کر آ گئی۔

”اپنے لیے نہیں بنائی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میرا دل نہیں چاہ رہا“ وہ میرے پاس کھڑے کھڑے بولی تو میں نے کہا۔

”سلی مجھے کام کرتے ہوئے شاید دیر ہو جائے۔ تم جاؤ، سو جاؤ، میں ضرورت خواہ ہوں کہ تم سے باتیں نہیں کر پارہا ہوں۔“

”نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، گڈ نائٹ!“ وہ یہ کہتے ہوئے مڑ گئی اور میں نے اپنی پوری توجہ کھینے کی طرف مرکوز کر لی۔ صبح معمول کے

مطابق ہی میری آنکھ کھلی، نیند کا شمار مجھے بستر سے اٹھنے نہیں دے رہا تھا مگر توجہ نہ چاہنے کے باوجود میں اٹھ گیا۔ میں نے اپنے بیڈ روم کا دروازہ کھولا تو سامنے ہی سلی اخبار پڑھنے میں مشغول تھی، تبھی میرے ذہن میں آیا کہ وہ بھی سیکس موجود ہے۔ آہٹ سے اس نے میری طرف دیکھا اور مسکرا دی، جواب میں بھی مسکرایا۔

”آپ تو ابھی سے اٹھ گئے۔ میں تو سوچ رہی تھی، آپ کافی دیر سے اٹھیں گے۔“ سلی نے فریش دلی سے کہا۔

”بڑوں سے عادت ہے اس لیے آنکھ کھل گئی“ پھر میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”لگتا ہے تم فریش ہو چکی ہو؟“

”جی، آپ نہیں، میں ناشتہ بنا دیتی ہوں۔ کیسا کرتے ہیں ناشتہ؟“

”جیسا تمہارا سن چاہے، میرا خیال ہے، فریج میں اتنا کچھ تو ضرور ہوگا۔ دیکھ لو، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں مارکیٹ سے لے آتا

ہوں۔“

”میں نے دیکھا ہے، سب کچھ ہے، آپ فریش ہو لیں۔“ اس نے کہا تو میں ہاتھ روم میں جا گھسا۔ ناشتہ کے دوران سلی نے اچانک

پوچھا۔

”آپ کے خیال میں ندیم پر کس نے حملہ کیا ہوگا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ سوچتی لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”میں کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن یہ بات تمہارے سوچنے کی نہیں ہے“

”وہ کیوں، میرے سوچنے کی کیوں نہیں ہے؟“ وہ تنک کر بولی۔

”اس لیے کہ نہ تمہیں بس منظر کا پتہ ہے اور نہ ہی موجودہ صورت حال کے بارے میں خبر ہے، سوچو گی تو الجھ جاؤ گی، خیر، یہ بتاؤ کہ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دل تو چاہتا ہے کہ ہمیں رہوں لیکن جانا تو ہے،“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔ وہ اپنے لفظوں میں مجھے کچھ اور ہی معنی سمجھا رہی تھی یا پھر میرا وہم تھا۔ میں نے سمجھنے کے لیے پوچھا۔

”مطلب؟“ میرے لہجے میں حیرت تھی۔

”مطلب یہ کہ اتنی پرسکون تہائی اور پھر سب کچھ اس چھوٹے سے قیث میں موجود ہے“ اس نے بڑی حسرت سے کہا تو میں مجھ گیا کہ وہ کس خواہش کے تابع ایسا کہہ رہی ہے۔

”مجھے تو کوئی اعتراض نہیں، تم رہو یا جاؤ“ میں نے اس کا دل رکھنے کو کہہ دیا۔

”بہت شکریہ اب میں کبھی بھی آجایا کرو گی“ اس کے لہجے سے حسرت نہ گئی تھی۔

”جیسا تم چاہو“ میں نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔ ”میرے ساتھ ٹکنا چاہو تو ٹھیک ورنہ جب چاہو، چلی جانا“ مجھے اس پر ترس سا آ گیا تھا۔

”میں ابھی کچھ دیر بعد جاؤں گی“ وہ خوش ہوتے ہوئے بولی۔

”اوکے، میں جا رہا ہوں“ یہ کہہ کر میں نے سگریٹ سلگا لیا اور فون اٹھا کر کھانا چل گیا۔ میرے ایڈیشن کا مواد میری جیب میں تھا۔ میں دفتر پہنچا اور میٹنگ سے پہلے ہی مواد کی دہز ہونے کے لیے دے دیا۔ اچھی حسن آن پہنچا تو میں نے اسے رات کی صورت حال کے بارے میں بتا دیا۔

”اوہ، یہ تو بہت برا ہوا، اب کسی طبیعت ہے اس کی، جان جی؟“

”ٹھیک ہے وہ، میٹنگ کے بعد ملتے ہیں“ میں نے کہا تو وہ سوچے والے انداز میں بولا۔

”شہار، یار! یہ یکدم کیا شروع ہو گیا ہے، ہا کو اتنا کیا کہہ دیا ہے جان جی، کہ وہ اس طرح کی دھمکیوں پر اتر آئی ہے، جیسا کہ فٹنڈہ گروٹی ہے، تم کچھ کرتے کیوں نہیں ہو؟“

”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”ہم آئی جی سے بات کرتے ہیں اور دوسری طرف ایسا ہی کوئی تماشائے بھی دکھا دیتے ہیں، جان جی!“ اس نے چنگی بجا کر مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں، وہ عورت ہے اور میں اس سے انتقام لینے کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا، یہ میری مرواگی کے خلاف ہے۔“

”جب گولی تمہارے جسم کے آ رہا ہو جائے گی تب تمہاری مرواگی کی۔۔۔“

”تم نہیں سمجھو گے، یارا لیکن مجھے پوری طرح یہ بھی تو یقین نہیں ہے کہ یہ سب اسی کا کیا پرہو رہا ہے“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”پھر کون ہے؟“ وہ اچھتے ہوئے بولا۔

”مجھی کتنی فرم کرنا ہے اور جب یہ کتنی فرم ہو گیا تو پھر دیکھنا حسن! میں اندھیرے میں اپنے حیرت خیز نہیں کرنا چاہتا۔“ میں نے کہا اور ہم

رپورنگ روم کی طرف چل پڑے۔

”آگے راجہ اندر۔۔۔!“ ماریہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے طویہ انداز میں کہا تو یکدم ٹھہرے دماغ کو چڑھا گیا مگر میں نے برداشت کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”تمہیں کیسے پتہ کہ میں راجہ اندر ہوں؟“ میرے اس طرح کہنے پر وہ یکدم ہلکا گئی۔ پھر اگلے ہی لمحے خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”تم نے ہی تو بتایا ہے مجھے“ اس کے جواب میں میرے پاس کہنے کے لیے بہت کچھ تھا مگر اسے کہنے کا بیس اس کی طرف دیکھتا رہ گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے پیرے کے ساتھ کہا۔ ”بولو۔۔۔ ٹھیک کہہ ہی ہوں نا میں؟“

میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور اپنی میز پر جا بیٹھا۔ میں چیخ رپورنگ کا انتظار کر رہا تھا کہ وہ آئے تو میٹنگ شروع ہو گئی بیون نے

۲ کر کہا۔

”آپ کو فارانی صاحب جاد ہے ہیں“ اس کے اس طرح کہنے پر مجھے غصہ آ گیا۔ اسے پتہ تھا کہ میں یہاں ہوں اور وہ انتظار کام پر بھی مجھے بلا سکتا تھا یا کوئی جو بات کرنا تھی، کر سکتا تھا۔ بیون کو بھیج کر مجھے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ براہ راست بات کرنے کے لیے ریور اٹھانے کی بھی زحمت نہیں کرتا۔

”جاؤ، اسے کہو کہ میرے پاس وقت نہیں ہے، ارجنٹا ہے تو فون پر بات کر لے۔“

”سہ، آپ کو فارانی صاحب نے۔۔۔“ بیون نے حیرت سے کہا۔

”تم نے سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟“ میں نے سخت لہجے میں کہا تو وہ تیزی سے مڑ گیا۔ میٹنگ ختم ہو جانے تک فارانی کی طرف سے کوئی رد عمل نہ ہوا۔ میں نے حسن کو لیا اور عدیم کی طرف چل دیا۔ کافی دیر تک ہم میں خاموشی رہی۔ حسن اپنی گاڑی خود ڈرائیج کر رہا تھا تب اچانک اس نے کہا۔

”یارا ماریہ تمہارے ساتھ اس قدر بدتمیزی سے کیوں پیش آتی ہے؟“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ وہ تمہارے ساتھ طویہ گنگو کرتی ہے۔ تم غصے میں بھی آتے ہو، پلٹ کر کوئی جواب بھی نہیں دیتے ہو اور بس سکتے رو جاتے ہو“

”تم کیا سمجھتے ہو؟“ میں نے جان بوجھ کر بات کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

”میں سمجھتا ہی تو چاہ رہا ہوں۔ آج اس نے جو بات کی، اس کے رد عمل میں تم نے فارانی کے پیغام پر سخت رو پیا پنا لیا۔ یہ سلگنا نہیں تو اور کیا ہے، جان جی؟“

”اب یہ تو ماریہ سے ہی پوچھا جاسکتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے؟“ میں نے دھیرے سے کہا

”اب سے بھی کہنا کہ تمہاری مراد آئی ہے کہ تم اس سے بیک نہیں پوچھ سکتے؟“ وہ بولا

”تم اتنا قصہ کیوں کر رہے ہو؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”یار اہات ہی ایسی ہے۔ وہ جب چاہے، کسی کے بھی سامنے اول فول بک دیتی ہے اور تم خاموش رہو“

”کہنے دو، ہمارا کیا لگتی ہے۔“

”بہت کچھ لگتی ہے۔ مجھ سے ایسی کوئی ایک بات کہے تو میں چار سنا دوں۔ آخر تمہاری کیا کمزوری اس کے ہاتھ میں ہے جو تم اس کے

سامنے نہیں بول سکتے؟“

”چھوڑو، ابھی وقت نہیں ہے، پھر کبھی جنہیں تحصیل سے بتا دوں گا۔“

”اب کیوں نہیں؟“ اس نے بھنجھلاتے ہوئے کہ۔

”وقت کا انتظار کرو، جنہیں سب پتہ چل جائے“ میں نے خوش دلی سے کہا تو وہ بڑا بڑا لگا جس کی جیسے قطعاً سمجھ نہیں آئی۔ کچھ دیر بعد ہم

ندیم کے پاس پہنچ گئے۔ اس کے گھر والے آئے ہوئے تھے اس لیے ہم کچھ دیر ہی ٹھہرے۔ چلنے وقت میں نے کچھ نوٹ اس کے ہاتھ میں چپکے سے

تھما دیئے، وہ انکار کرنے لگا تو میں نے زبردستی اس کی جیب میں ڈال دیئے۔ تب اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں سسلی کے بارے میں پوچھا، میں

نے اشارے میں ہی اسے مطمئن کر دیا۔

وہ میرا سارا دن دفتر میں گزار گیا۔ شام سے ذرا پہلے عام ریٹائر آ گیا۔ میں اس وقت اپنے ایئر لین کی کاپی لکھا کر اس انتظار میں تھا کہ کاپی

چھپ جائے تو میں ایک نظر دیکھ لوں۔ حسن کہیں گیا ہوا تھا، وہ اسی کی سیٹ پر آ بیٹھا۔ رکی ہی باتوں کے بعد اس نے کہا۔

”یہ ہمارے تمہارا کیا پھنڈا چل رہا ہے؟“

”میرا تو کوئی نہیں ہے، وہ اگر سمجھتی ہے تو سمجھتی رہے“

”مجھے خبر ملی تھی کہ تم پر کوئی حملہ ہو گیا ہے“

”یہ تو پرانی بات ہے، اس بارے میں ہماری بات ہو گئی تھی“

”نہیں، میں رات کی بات کر رہا ہوں لیکن بعد میں پتہ چلا کہ وہ تم نہیں، کوئی اور تھا۔“

اس نے کہا تو میں ٹھنک گیا۔ اسے ایسی معلومات کہاں سے مل جاتی ہیں؟ میں اگر اس سے پوچھتا تو لازماً اس واقعہ کی تصدیق کر دیتا اور وہ

اگر بتانا نہ چاہتا تو نہیں کے یہ کہہ سکتا تھا کہ میں دوستوں کی خبر رکھتا ہوں۔ تب میں نے گوندل کے سے انداز میں پوچھا۔

”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“ میرے اس طرح کہنے پر وہ یکدم پریشان ہو گیا، پھر اضطراری انداز میں بولا۔

”یار! مجھے پتہ چلا تھا کہ تم پر وہ حملہ ہوا ہے اور حملہ آوروں کا نشانہ کوئی اور بن گیا ہے“

”تمہیں یہ بات معلوم کیسے ہوئی؟ اپنے ذرا کچھ کورسٹ کرو۔“

”خیر تم اب نہ بانو تو الگ بات ہے۔ مجھے تو تفصیل سے پتہ ہے“

”میں تمہیں تفصیل سے کیا بتاؤں اگر تمہیں پتہ ہے تو۔۔۔ مگر اس سے یہ بھی گمان کیا جاسکتا ہے کہ تم حملے کروا رہے ہو مجھ پر؟“ میں نے

جستے ہوئے کہا۔

”بہت افسوس ہے، یار! اگر تم یہ گمان کرو، یہ افسوس تم پر نہیں، مجھے اپنی ذات پر ہوگا۔ میں تو پورے غلوں سے تمہارے بارے میں خبر رکھتا

ہوں۔“ وہ دھمکے لہجے میں بولا۔

”اور میں پورے غلوں سے یہ پوچھنے میں حق بجا ہوں کہ تمہارا ذریعہ کون سا ہے جو تمہیں میرے بارے میں خبریں دیتا ہے؟“ میں نے

قدرے خطر لہجے میں کہا۔

”اصل میں میری حسرت سے اس بارے میں خاصی بحث ہوئی ہے، اس نے مجھے کہا ہے کہ میں تمہیں سمجھاؤں“ اس نے پریشان ہوتے

ہوئے سارا سانس توڑ دیا۔

”کیا سمجھانا چاہ رہے ہو مجھے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”دو باتیں۔ ایک تو یہ کہ تم اپنی حفاظت کے لیے کچھ بندوبست کرو اور دوسرا کہ کوئی طور پر۔۔۔“

”مثلاً کیا کروں میں؟“ میں نے اس سے پوچھا۔

”اپنی حفاظت کے لیے کوئی گارڈ، کوئی سیکورٹی، کسی طرح بھی کوئی بندوبست کرو اور حسن ٹھیک کہتا ہے کہ ہمیں آئی جی سے بات کرنی

چاہیے۔“ وہ بڑے نرم انداز میں بولا۔

”وہ ٹھیک ہے، ہم آئی جی سے بات کر لیتے ہیں۔ ایسا ہونا چاہیے لیکن یہ گارڈ وغیرہ، کیا ممکنہ خیز گئے گا، یار!“ میں نے اچھتے ہوئے

کہا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہیں شاید میرے ماضی کا نہیں پتہ، میں اپنی حفاظت خود کر سکتا ہوں۔ یار! یہ تمہارا وہ غیرہ کبھی میرے لیے

کھلونے رہے ہیں اور یہ جو تماشے میرے ساتھ ہو رہے ہیں، یہ کوئی نئے نہیں ہیں۔ میرا دشمن اندھیرے میں ہے وہ بل میں گھسا ہوا ہے۔ میں اسے

باہر لانا چاہتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی ہے، میں اس سے نپٹ لوں گا۔“

”حسن تو ہا کی وجہ سے کہہ رہا تھا“

”ہو سکتا ہے، وہی ہو لیکن میرا دل نہیں مان رہا۔ حالات کو دیکھو تو وہی گتی ہے لیکن نہیں، وہ نہیں سکتی۔“

”تمہیں شاید نہیں پتہ، تم اسے صرف ایک ہیرو دین ہی سمجھ رہے ہو۔ یہ ایک پورا گروہ ہے بلکہ مافیا سمجھو اسے۔۔۔ ان کے لیے بقول

تمہارے، یہ کھیل تماشے کی کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔“

”عامر! مجھے جس لمحہ یہ کسٹرم ہو گیا کہ یہ سب ہامانی کر رہی ہے تو بھروسہ ہے کہ وہ ہے یا مافیا، سمجھو کہ وہ اپنا وجود کو بیٹھا ہے۔“

”دیکھو، ہم تمہارے دوست ہیں اور نہیں چاہتے کہ تم ایسے کسی جال میں پھنس جاؤ، سیدھا سیدھا اپنی حفاظت کرو۔ اس کے لیے تمہیں شوہر

چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دو، اخبار چھوڑنا پڑے تو وہ بھی چھوڑ دو یا کچھ دنوں کے لیے منظر سے ہٹ جاؤ۔ ہمیں تمہاری سلامتی چاہیے۔“

عامر نے جذبات میں آ کر اچھی خاصی تقریر کر ڈالی۔ اس کا غلوس دیکھ کر اپنی کچھ دیر پہلے کی سوچوں پر مجھے شرمندگی ہونے لگی۔

”عامر! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور مجھے اپنے دوستوں کی بات مان لینا چاہیے لیکن کیا میں بزدلوں کی طرح چھپ کر

پردے میں ڈبک جاؤں؟ تمہیں یقین ہے، نا کہ جس دن موت آتی ہے وہ آ کر رہتی ہے، اسے کوئی نہیں روک سکتا؟“

”میں مانتا ہوں لیکن کم از کم اپنی حفاظت کے لیے کچھ نہ کہو۔۔۔“

”پلیس ٹھیک ہے میں اپنی حفاظت کا بندوبست کروں گا اور کل ہی آئی جی سے مل لیتے ہیں۔“

”شکر ہے، تم نے اتنی بات تو مانی“ عامر ایک لمبا سانس لیتے ہوئے پھر چند لمحوں کے بعد بولا۔ ”کیا کرو گے؟“

”کچھ نہ کہو ہو جائے گا، تم اب فکر مت کرو“ میں نے جتے ہوئے۔

”میں اب چلتا ہوں۔ کل کسی وقت پھر“

”اوکے، کل میری آف ہے، میں فون کر کے تمہارے پاس آ جاؤں گا۔“

”حسن کو بھی لیتے آنا۔“ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور رپونگ روم سے نکلتا چلا گیا۔ اینڈیشن کی طرف سے مطمئن ہو جانے کے بعد

میں صحن محسوس کرنے لگا تھا لیکن ابھی مجھے ندیم کے پاس جانا تھا۔ میں میز پر بکھری چیزیں سمیت کمرہ میں رکھ رہا تھا کہ میرے سامنے رکھا فون بج

آٹھا، دوسری طرف سلیم فارانی تھا۔

”بولو“ میں نے اپنے لہجہ کو انتہائی نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ میرے دفتر تک تشریف لاسکتے ہیں؟“ اس کا لہجہ طویہ تھا۔

”کوئی کام ہے مجھ سے؟“ میں نے انتہائی رکھائی سے کہا۔

”جی، کام ہی ہے تو بلا رہا ہوں ورنہ۔۔۔“ اس نے فخرہ اور اچھوڑ دیا۔

”میں فون پر بتا دیں“ میں یکدم سخت ہو گیا۔

”تو گویا آپ دفتر تک آنا ہی نہیں چاہتے“ اس نے استہزاء سے لہجہ میں کہا۔

”خاہر ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے میرے لہجہ میں سختی کھل گئی۔

”اوہ، لیکن میرے ماتحت کام کرنا ضرور پسند کرتے ہو۔ اوکے، فون پر ہی بتا دیتا ہوں۔ یہ جو تم پر کا حملہ حملہ ہوا ہے، اس بارے تم نے

ابھی تک اپنے اخبار کو مطلع نہیں کیا؟“

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتا۔“

”کیا یہ تمہارا نجی معاملہ ہے؟“

”یہ آپ اسے سوال کیوں کر رہے ہیں مجھ سے؟“

”آپ جس اخبار میں کام کرتے ہیں اس کے مالک کی طرف سے یہ پوچھا گیا ہے۔“

”آپ نے مطلع کر دیا؟ میں خود ان سے بات کر لوں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا۔

تھانہ محلے کے واقعہ کو شاید میں اتنا سمجھ گیا کہ نہ لیتا اور اگر اسے اہم سمجھ کر کچھ کرنا بھی تو وہ میری اپنی سوچ ہوتی۔ میرے ارد گرد کے لوگوں نے اس واقعہ کو اس قدر شدید بنا دیا تھا کہ مجھے یہ واقعات سرے سے ہی احتمال نہ لگ رہے تھے۔ میرا توجہ چاہ رہا تھا کہ کوئی بھی مجھ سے اس بارے میں سوال نہ کرے کیونکہ جب بھی کوئی اس بارے میں بات کرتا تھا، مجھے اپنی اس بے بسی کا احساس ہوتا کہ میرا دشمن میرے سامنے نہیں ہے۔ میرا دشمن جیسے بھی تھا، جو بھی تھا، جتنا طاقتور یا کمزور تھا، مجھے اس سے غرض نہیں تھی۔ میں ان لوگوں میں تھا جو اپنی ایک کولی بھی ضائع نہیں کرتے بلکہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایک کولی سے کئی سارے ٹم ہو جائیں۔ حالات، ہمارے مخالف جا رہے تھے، لوگ بھی بچی کہہ رہے تھے لیکن میرے اندر بیٹھا آدمی یہ بات مان نہیں رہا تھا کہ وہ اتنا آگے جا سکتی ہے۔ پھر میرے سامنے یہ سوال آن کھڑا ہوا تھا کہ اگر وہ نہیں ہے تو پھر کون ہے؟ یہ سوال مجھے بھول بھلیوں میں بھٹکنے پر مجبور کر دیتا۔ میں اگر ان حالات کے شروعات پر نظر دوڑاتا تو میری شوخیز میں آدھی سے سب شروع ہوا تھا۔ میں کئی بار اپنے طور پر تجزیہ کر چکا تھا لیکن فی الحال مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ میں نے سب سوچوں کو جھٹکا اور دفتر سے باہر آ گیا، پھر وعدت روڈ سے ہوتا ہوا اندیم کے پاس جا پہنچا۔ اس کے پاس دوستوں کا ٹھکانہ لگا ہوا تھا۔ میرے آنے سے ڈراما پھیل ہوئی، خیر خیر سے دریافت کرنے کے بعد میں اٹھ گیا۔

”شجاع بھائی! ابھی سے؟“ اندیم جلدی سے بولا۔

”میں ابھی گھر جا تا ہوں، فریش ہو کر دوبارہ آتا ہوں۔ آج رات کافی دیر تمہارے پاس رہوں گا، کل میری آف ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں انتظار کروں گا“ اندیم نے کہا تو میں نے سب سے ہاتھ ملایا اور وہاں سے آ گیا۔ میں نے گاڑی مجھے پارک کی اور اٹلی میں چابی گھماتا ہوا اپنے فلیٹ کے دروازے پر آن پہنچا، دروازہ لاک تھا لیکن اندر روشنی ہو رہی تھی۔ ایک لمبو کو خیال آیا کہ سلٹی چلتی ہوئی لائٹ چھوڑ گئی ہوگی لیکن اسی وقت اندر سے پانی گرنے کی آواز آئی جیسے کوئی ہاتھ روم میں ہو۔ میں ایک لمبو کو ٹھک گیا۔ ”اندر کون ہو سکتا ہے؟“ میں اپنے فلیٹ کے دروازے پر کھڑا اندر ہونے والی آہٹوں کو فور سے سن رہا تھا۔ چند لمحوں بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اندر ہاتھ روم میں کوئی نہا رہا ہے۔ ”کیا سلٹی ابھی تک اپنے گھر نہیں گئی؟ میں نے چابی کی ہول میں ڈالی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ پورے گھر کی چیمیں روشن تھیں۔ میں کوئی آہٹ پیدا کیے بغیر ڈرائیونگ روم میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر بعد پانی گرنے کی آواز بند ہوئی تو مگنتا نے کی آواز بھرا آئی، اسی لمحے میرے متھے ہوئے احصاب یکدم ڈھیلے پڑ گئے۔ وہ سلٹی ہی تھی۔ اس کے یہاں ہونے کے احساس کے ساتھ ہی میرے ذہن میں کئی سارے سوال ابھر آئے۔ میں نے انہیں یکسر نظر انداز

کرتے ہوئے غور کیا تو پورے فلیٹ کی صفائی ستھرائی کے بعد تزیینت تک بدلی ہوئی تھی، میں نے سگریٹ سلگایا اور اس کے ہاہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے وہی رات والے کپڑے پہنے ہوئے تھے مگر ان پر کوئی ٹخن نہیں تھی، کیلے کپڑوں اور سر پر بندھے تو لپے کے ساتھ وہ فریش فریش سی اور بڑی جاؤب نظر لگ رہی تھی۔ مجھ سے دیکھتے ہی چونک گئی، پھر فوراً ہی نارمل ہوتے ہوئے ہنس دی۔

”آپ۔۔۔ کب آئے؟“ اس نے بڑی اداسے پوچھا تو میں نے خشک سے لہجے میں سوال کیا۔

”سہلی! تم اپنے گھر کیوں نہیں گئی ہو؟“

”اوہ۔۔۔!“ اس کے منہ سے یوں سرسرا تا ہوا بنگارا نکلا جیسے اسے شاک پہنچا ہوا۔ وہ چند لمبے یونہی ساکت سی رہی، پھر وہی آواز میں

بولی۔ ”میرا یہاں رہنا آپ کو برا لگا؟“

”نہیں، برا نہیں لگا، تم سارا دن یہاں اکیلی رہی ہو، تمہارے گھر والے کیا سوچتے ہوں گے؟“ میں نے نرمی سے کہا تو وہ وہیں کھڑے

کھڑے ہوئی۔

”میرے گھر میں میرا کوئی انتظار نہیں کرتا، مجھے ایسی کوئی فکر نہیں اور نہ ہی میرے گھر والوں کو ہے۔“

”میں سمجھا نہیں؟“

”شاید میں آپ سے اپنا تعارف ٹھیک طرح سے نہیں کروا سکی تھی، اگر آپ کو برا لگا ہے تو میں ابھی پہلی جاتی ہوں“ اس نے حسرت ناک

مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر زبردستی لاتے ہوئے کہا۔ میں نے گہری نظر سے اس کی طرف دیکھا۔ پہ نہیں وہ کیا تھی، کیا کہنا چاہتی تھی اور کس مجبوری

کے تحت یوں سہاروں کی تلاش میں تھی؟ اسی لمحے مجھے اس کے ہارے میں جاننے کا تجسس ہوا، تب میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایسے کیوں سوچ رہی ہو، سہلی؟ چلو چھوڑو ان باتوں کو، جلدی سے تیار ہو جاؤ، پھر ندیم کے پاس چلتے ہیں۔ میں اتنے میں فریش ہو

جاؤں، کھانا بھی کھا آئیں گے۔“

”میں نے کھانا بنا دیا ہے۔“ اس نے گویا یوں کہا جیسے قلعہ فتح کر لیا ہو، پھر جیڑی سے بولی۔ ”آپ فریش ہو جائیں، میں کھانا لگاتی

ہوں“ اس کے چہرے پر تازگی امتزائی تھی، میرے ذرا سے حوصلہ افزا نظروں سے جیسے وہ کھل گئی تھی۔ میں نے سگریٹ اینش ٹرے میں مسلا اور ہاتھ

روم کی طرف بڑھ گیا۔ اس نے کھانے کے نام پر خاصا اہتمام کر رکھا تھا، لیکن میں موجود سہولیات سے بھرپور فائدہ اٹھایا گیا تھا۔ کھانا خاصا سحریدار تھا

جس کی بہر حال مجھے توقع نہیں تھی۔ سہلی نے اس دوران باتیں کرنا چاہیں مگر میں نے اسے روک دیا۔ کھانے کے بعد ندیم کی طرف چل دیئے۔ وہ

سہلی کو میرے ساتھ دیکھ کر چونک گیا۔ اس وقت اس کا چہرہ بھائی ہی اس کے قریب تھا، وہ گھر کا ایک چکر لگانے کا کہہ کر نکل گیا۔ رگی سی باتوں کے

بعد چائیک ندیم نے پوچھا۔

”سہلی! تم گہری نہیں گئیں یا گھر سے ہو کر پھر آ گئی ہو؟“

”میں گئی ہی نہیں، سارا دن فلیٹ پر رہی ہوں“ سہلی نے آرام سے کہہ دیا تو وہ چپ سا کر گیا۔ کئی لمبے یونہی خاموشی میں گزر گئے، پھر ندیم

”ندیم! تمہارے جذبات سر آنکھوں پر، لیکن میں بوجھ نہیں بخوں گی۔ تمہیں خود پتہ ہے کہ میں نے کتنی بار تمہیں جا ب کے لیے کہا ہے اور جب تم نے شجاع صاحب کے بارے میں بتایا تو مجھے کچھ امید ہوئی۔ میں آج سارا دن ان کے فلیٹ پر کیوں رہی ہوں، صرف اس لیے کہ جب یہ آئیں تو میں اس بارے میں بات کروں، وہ صاف گوئی سے ذرا جذباتی لہجے میں بولی تو ندیم نے نجی سے کہا۔“

”یہ بات تم مجھ سے بھی کہہ سکتی تھیں، میں خود ان سے بات کر لیتا۔“

”ڈونٹ وری، کوئی بات نہیں۔ وہ اپنی راہ خود بنانا چاہتی ہے تو ہٹانے دو۔“ میں نے ندیم کا شانہ تھکتے ہوئے کہا۔ پھر سلی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”میں تمہارے لیے کوشش کروں گا، ہو جائے گا کچھ نہ کچھ، تم اپنی تعلیم کی طرف دھیان دو۔“

”اور اب رکشہ پکڑو اور اپنے گھر جاؤ۔“ ندیم نے تلخ سے کہا تو وہ چند لمبے لمبے نفیسی رہی، پھر اٹھ گئی۔ تب میں نے کہا۔

”تمہارے پاس میرا خیال ہے، کوئی پیسے نہیں ہیں، کیسے جاؤ گی گھر؟“

”بس میں چلی جاؤں گی۔“ اس نے بھرائے ہوئے لہجے میں کہا۔

”ادھر آؤ“ میں نے اسے بلایا۔ اپنے ملاقاتی کارڈ پر موبائل نمبر لکھا اور پھر چند بڑے نوٹ نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا۔ ”مجھ سے رابطہ رکھنا یا پھر میں ندیم کو بتا دوں گا“

”ادھر دیکھو، میری طرف“ ندیم نے پیار سے کہا تو اس نے ڈبڈباتی آنکھوں اور مسکراتے ہونٹوں سے اس کی طرف دیکھا اور پھر ہنس دی۔ ندیم نے مجھ سے کہا کہ شجاع بھائی، آپ اسے ڈراپ کر دیں۔ ہم کچھ دیر بیٹھے رہے۔ ندیم کے بھائی کے آجانے پر ہم اٹھ گئے۔ سلی کو میں نے اس کے گھر کے نزدیک ڈراپ کیا اور فلیٹ پر آ کے اطمینان سے سو گیا۔ میری آنکھ فون بٹن بچنے سے کھلی۔ بیل فون میرے سر ہانے پڑا ہوا تھا، میں نے نمبر پڑھے تو حسن کے گھر کے تھے۔ میں نے فون آن کر کے ”ہیلو“ کہہ تو حسن بولا۔

”تمہیں یاد ہے کہ آج آئی جی سے ملتا ہے؟“

”بالکل یاد ہے۔“ میں نے غمازاً لہجے میں کہا۔

”اب پروگرام یہ ہے کہ تم میری طرف آؤ گے، عامر بھی ہمیں آجائے گا۔“ حسن نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اوکے، میں آ جاؤں گا“ میں نے جان چھڑانے والے لہجے میں کہا۔

”آ جاؤں گا نہیں، بس آ جاؤ جان جی! ناشتا ادھر ہی کرنا، اب اٹھ جاؤ! ناشتا ادھر ہی کرنا۔“ حسن نے لفظ چپاتے ہوئے کہا۔

”میں اٹھ گیا، بس کچھ دیر میں پہنچ جاؤں گا“ میں نے ہستے ہوئے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ میں دو بارہ نہیں سو سکتا تھا اس لیے اٹھنے میں ہی عافیت جانی۔ حسن ناشتے کی مہر میرا انتظار کر رہا تھا۔ میں بھائی اور بچوں سے ملنے کے بعد اس کے پاس جا بیٹھا، جلد ہی ناشتہ لگا دیا گیا۔

آئی جی سے ملاقات میں وہی کچھ ہوا جو میرے ذہن میں تھا، بس نشستیں بر خاستن والی بات تھی۔ انہوں نے ہماری بات بڑے خود سے سنی اور پھر تلفظ کا نوٹی پہلو واضح کر کے بات ہم پر ہی چھوڑ دی کہ شک کس رہے؟ حتی طور پر ہم بھی کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ پھر معلقہ تھانے کو کہہ دینے

اور قانونی تقاضے پورے کرنے کے بعد ہر ممکن تعاون کی یقین دہانی کروادی گئی۔ واپسی پر حسن نے مجھے لہجے میں کہا۔

”شجاع! تم ٹھیک کہتے ہو۔ جو کچھ بھی کرنا ہے، ہمیں خود کرنا ہے۔“

”میں تو آپ لوگوں کو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“

”مگر سیکورٹی بھی تو ضروری ہے۔“ عامر نے کہا۔

”عامر! میں نے اس حد تک سوچ لیا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ آپ لوگوں کا غلوس اور جذبات ہی میرا حوصلہ ہیں مگر پھر بھی

میں چاہوں گا کہ مجھے اپنے طریقے سے کچھ کرنے دیا جائے، میں سب سنبھال لوں گا۔“

”خیر، ہم تمہیں اکیلا بھی نہیں چھوڑ سکتے۔“ حسن نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور ہاں، اب تم قیث میں نہیں رہو گے۔ تمہارے لیے میں نے مین روڈ پر ایک پورشن کا بند درست کر دیا ہے۔ نیچے فرم کا دفتر ہے، اوپر تم

رہو گے۔ میں بندے بھجوادوں گا۔“ عامر بولا۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے“ حسن نے کہا۔ ”اس طرح یہ خاصا محفوظ رہے گا“

یونہی باتوں ہی باتوں میں ہم حسن کے گھر آ پہنچے، وہاں میں دو پہر تک رہا اور کھانا کھا کر ہی نکلا۔ میرا رخ گوالنڈی کی طرف تھا جہاں

مجھے آصف چوہدری سے ملنا تھا۔ وہ میرا کلاس فیلو تھا اور ہم اکٹھے ہی کالج تک پڑھے تھے۔ میں ہی نہیں، ہمارا پورا گروپ اس کی دلیری کو مانتا تھا۔

ہمارے گروپ میں اس کا کام ہر مسئلہ کو فیس کرنے کا تھا جب کہ میں ان لوگوں میں سے تھا جو سامنے آئے بغیر اپنا کام کر جاتے تھے۔ ایک عرصہ ہو گیا

تھا مجھے اس سے ملے ہوئے، تاہم اس کے بارے میں خبریں مجھ تک پہنچتی رہتی تھیں۔ چند ماہ پہلے اس نے مجھے فون کر کے کچھ معلومات چاہی تھیں جو

میں نے دے دی تھیں، پھر اس کے بعد میرا اس کا رابطہ نہیں رہا تھا۔ کالج سے نکلنے کے بعد سارا گروپ ہی ٹکڑا گیا تھا۔ جس کو جو میدان ملا، ادھر نکل گیا

مگر آصف چوہدری ایک خاص ڈگر پر چلتا ہوا تھا آگے نکل گیا جہاں سے واپسی کا راستہ ناممکن ہو گیا تھا۔ وہ ایک مخصوص علاقے ہی میں نہیں بلکہ سیاسی

اور تہارتی ایوانوں میں طاقت کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ذہنی طور پر میں اس قدر شدت کے خلاف تھا۔ نوجوانی کے دنوں میں جو کر لیا سو کر لیا لیکن

طاقت کا نشہ بھی کبھی کے چال کی مانند ہوتا ہے کہ جہاں میں پھنس گیا، پھر نکلنے کی راہ نہیں رہتی۔ یہ الگ بات ہے کہ طاقت کا روپ کون سا ہے۔ میں

انہی خیالوں میں بھٹکتا ایک بیٹھ مارک ہوئی کے سامنے جا پہنچا۔ وہاں مجھے مخصوص چروں میں سے کسی ایک کی تلاش تھی۔ اس ہوئی کا مالک مجھے اچھی

طرح جانتا تھا لیکن وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا تھا، اس کی جگہ اس کے بیٹے نے لے لی تھی اور پھر ہم بھی دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گئے تھے۔ وہاں رکے

ہی مجھے ماضی کی بے ساختہ یاد آگئی۔ جیب میں ایک دیوالی بھی نہیں ہوا کرتا تھا لیکن روٹی کی کبھی ٹکڑی نہیں ہوا کرتی تھی۔ یہاں لہا ادھار چلتا۔ طالب علمی

کا زمانہ بھی کیا زمانہ تھا۔ میں نے گاڑی ایک طرف کر کے بند کر دی۔ میں ایک نظر میں اس ہوئی میں موجود لوگوں کا جائزہ لے چکا تھا۔ کاؤنٹر پر ایک

نوجوان سالز کا بیٹھا تھا، جیسی اس سے ذرا قاصدے پر ایک بوڑھے شخص پر نظر پڑی۔ میں نے بہت غور سے دیکھا تو اس کی توجہ بھی میری طرف ہو گئی۔ وہ

بھی میری طرف ہلکی ہانڈ سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھ گئی۔ اس نے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا تو میں اس کے نزدیک

پڑی پلاسٹک کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ تب وہ بولا۔

”تمہارا چہرہ دیکھا بھلا سا لگتا ہے، کیا نام ہے تمہارا؟“

”میرا نام شہناج ہے، تاپا برکت۔“ میں نے کہا تو وہ میزک اٹھا، بھرا انتہائی خوشی سے بولا۔

”اوائے ہو تو ابھی چند گھنٹے پہلا بھائی بن گیا ہے۔ اسے عرصے سے بھرتے دیکھا ہے، کیا ہے تو؟“ اس نے پوچھا

”آصف سے ملتا ہے مجھے“ میں دھیرے سے بولا۔

”خیریت ہے نا؟“ تاپے برکت کا لہجہ یکدم سنجیدہ ہو گیا۔

”بالکل خیریت ہے، بس اس سے ملنے کو دل چاہ رہا ہے“ میں نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہاں جتنی یادیں امتزاتی چلی آ رہی تھیں۔

یہی تاپا برکت کبھی یہاں بیٹھ ویٹر ہوا کرتا تھا۔ اس نے کس کس طرح ہماری خدمت نہیں کی تھی۔ مجھے ملائی کھانے کا شوق ہوتا تھا اور تاپا برکت اکثر

رات کے کھانے پر میرے لیے ملائی رکھ چھوڑتا تھا۔ میں تاپے برکت کے چہرے پر گزروں دونوں کے اثرات دیکھ رہا تھا، خاصا کمزور لگ رہا تھا۔

”اس کا فون نمبر نہیں ہے تمہارے پاس؟“ اس نے دھیرے سے پوچھا۔

”نہیں ہے، اسی لیے تو یہاں بھٹکتا پھر رہا ہوں“ میں نے خوش دلی سے کہا تو تاپے نے میرا سوبائل نمبر لے کر کاڈیٹر پر موجود لاکے کو

دیا۔ لاکے نے نمبر ملائے، چند لمحوں بعد رابطہ ہو جانے پر دو چار باتیں کیں جس کا ایک لفظ بھی مجھے سنائی نہیں دیا۔ اس نے فون رکھ دیا۔ میں تاپے

برکت سے باتیں کرنے لگا۔ دو تین منٹ گزرے ہوں گے کہ میرا سوبائل جاگ اٹھا۔ دوسری طرف آصف تھا۔

”اب کہاں ہے تو؟“ اس نے انتہائی شوخ لہجے میں کہا۔

”تیرے علاقے میں بھٹکتا پھر رہا ہوں۔“ میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

”اب اپنا علاقہ بہت دستخوش ہو گیا ہے۔ میں گاڑی بھیجتا ہوں“

”میرے پاس ہے گاڑی“ میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

”تو پھر یہ فون کاڈیٹر پر موجود جو کوئی بھی ہے، اسے دے۔“ آصف نے جلدی سے کہا تو میں نے فون اس نوجوان کو دیدیا۔ اس نے

دوسری طرف سے چند لمحوں سا اور پھر فون میری طرف بڑھا دیا، لائن آف ہو چکی تھی۔ میں نے فون بند کر کے جیب میں رکھا تو وہی نوجوان کاڈیٹر سے

نکل آیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک بڑے سے مکان کے باہر جا کر کے جہاں پہلے ہی سے ایک ٹیکسٹر وکڑی تھی۔ میں نے اس کے ساتھ ہی گاڑی پارک کی

اور اس نوجوان کے ساتھ اس مکان میں چلا گیا، سامنے ہی کرسیوں پر بیٹھے لوگ ہمیں دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ میرے ساتھ آنے نوجوان نے میری

طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ انہیں آصف بھائی کے پاس لے جائیں۔ یہ کہہ کر وہ واپس مڑ گیا۔ ان میں ایک بھاری موٹھیوں والے نے میرا ہنور

جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”آئیے جی“ یہ کہہ کر وہ بڑھ گیا اور میں اس کے پیچھے چند راہداریاں عبور کر کے اوپری منزل پر کچھ ہی دیر بعد آصف کے سامنے تھے۔

اس کے چہرے پر ہنسی آئی تھی۔ وہ مصوبیت جو کبھی اس کے چہرے کو روشن رکھتی تھی، اب کرخلی میں بدل گئی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ اٹھا اور میرے گلے لگ گیا، کافی دیر گلے لگے رہنے کے بعد اس نے مجھے چھوڑا اور انتہائی خوشی اور حیرت کے نلے پلے لہجے میں بولا۔

”میں سوچا بھی نہیں سکتا تھا کہ تم مجھے یوں آن ملو گے۔“

”یار از زندگی میں لوگ نلے چمڑتے ہی رہتے ہیں، کیا ہوا جو ہم ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے اتنا عرصہ نہیں ملے۔“

”بس، یار کیا بتاؤں“ اس نے طعنا سانس لیا، پھر بولا۔ ”بیٹھو“ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ صوفے پر بٹھالیا۔ تب میں نے وہاں موجود دوسرے شخص پر غور کیا۔ وہ خاصے ذیل ڈول والا شخص تھا۔ ہماری مونچھوں کے ساتھ ہارعب چہرہ، سفید کائن شلوار کے ساتھ وہ خاصا صاف رہا تھا۔ آصف نے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

”ٹھیک ہے، شاہ جی! تمہارا کام ہو جائے گا لیکن میں نے جو کہا ہے، میں اتنا ہی لوں گا۔“

”میں دینے کو تیار ہوں مگر۔۔۔“ وہ کہتے کہتے جھجک گیا۔

”کام تمہاری مرضی کا اور۔۔۔“ آصف نے جلدی سے جان چمڑانے والے انداز میں کہا۔

”مجھے منظور ہے۔۔۔“ اس نے جلدی سے کہا اور جیب سے ایک گڈی نکال کر بولا۔ ”یہ بیٹھلی ہے اور تصویر میں تمہیں دے چکا ہوں۔ کام صاف طریقے سے ہو گیا تو چھوڑن ہے اس سے بھی زیادہ ہو جائے گا۔ یاد رہے کہ میرا حوالہ کہیں بھی نہ آئے۔“ وہ تسلی چاہ رہا تھا۔ تبھی آصف نے کہا۔

”او، شاہ جی! ایسی باتیں کر رہے ہو۔“

اس کے لہجے میں قدرے فخر جھجک گیا تو وہ شاہ جی گھبراتے ہوئے اٹھ گئے، آصف بیٹھا رہا اور اس سے ہاتھ ملا کر میری طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے یہ خیال بھی نہیں کیا کہ شاہ جی کب کمرے سے گئے۔ ہم یونہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ تھوڑی دیر بعد کافی سارے لوازمات کے ساتھ سوڈا آ گیا تو آصف نے پوچھا۔

”میری یاد کیسے آئی؟“

”تمہاری ضرورت پڑنے پر۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا تو وہ انس دیا۔ تب میں نے فقیر سے انداز میں اسے ساری بات کہہ دی۔ وہ سوچتے ہوئے بولا۔

”اس کا مطلب ہے کہ ہا۔۔۔“ اس نے تسنی خیز لہجے میں فقیرہ ادھر ادھر چھوڑ دیا۔

”میرا مقصد کسی کو نقصان پہنچانا نہیں۔ میں فقط یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کون ہے؟ میں خود مطلع کر لیتا لیکن مجھے سلیم فارانی کو بھی جواب دینا ہے، میں اسے بتا دینا چاہتا ہوں کہ اس نے اپنے فیصلہ پر کتنا ہیا تک شیارہ بٹکتا ہے۔“

”میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔ تو اب لکرنہ کر، تیری طرف اب کوئی آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھے گا۔“ اس نے سفاک لہجے میں دہسی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو میں جلدی سے بولا۔

”لیکن میں کسی بے گناہ کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا، یہ بات دھیان میں رہے۔“

”اوے، اوے“ پھر اپنا موبائل فون نکال کر نمبر پیش کرنے لگا۔ رابطہ ہو جانے پر کرسٹ لہجے میں بولا۔ ”وہ اداکارہ ہا ہے نا، میرے دوست شجاع پر حملے کروا رہی ہے۔ اسے بتا دو کہ وہ صرف شو بیزر پور ٹرینس، میرا بگڑی یاد ہے۔ یہ بات اسے اچھی طرح سمجھا دینا۔“

اس نے بس حکم دیا اور پھر فون آف کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ پھر چند لمحوں کے بعد نمبر پیش کرنے لگا، رابطہ ہو جانے پر اس نے میرے اخبار کا نام لیتے ہوئے کہا۔ ”اس کا ایڈیٹر سلیم قادری ہے، ذرا اسے چیک کرو“

وہ شاید کچھ اور کہتا لیکن میں نے جلدی سے کہا۔

”نہیں، آصف اب بند کرو فون۔۔۔“

”کیوں، کیا ہوا؟“ وہ حیرت سے بولا۔

”وہ میرا اداکار ہے اور اس کے ساتھ صرف میں نے کھیلتا ہے“ میں اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سرد لہجے میں کہا تو اس نے فون پر دوبارہ کچھ نہ کرنے کی بابت کہہ کر فون بند کر دیا۔ پھر ہم میں کچھ دیر خاموشی طاری رہی، تب میں نے اس خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

”اور سناؤ، آج کل کہاں کہاں تک اڑائیں ہیں؟“ میرے اس طرح کہنے پر وہ ذرا سا مسکرایا اور پھر باتوں کا ایک سلسلہ چل نکلا۔ یہ سلسلہ اس قدر پھیلا کہ پھر وقت گزرنے کا احساس نہ ہوا۔ اس وقت سورج ڈھل رہا تھا جب میں اس کے ہاں سے نکلا۔

☆☆☆

من و سلویٰ (معاشرتی رومانی ناول)

من و سلویٰ آپ کی پسندیدہ مصنفہ عمیرہ احمد کی ایک نہایت عمدہ تحریر ہے جو انہوں نے حرام حلال

رزق کے حصول جیسے اہم موضوع پر تحریر کی ہے۔ ہمارے معاشرے میں دو طرح کے لوگ پائے جاتے ہیں ایک وہ جو اپنی روزی کمانے کے لئے رزق حلال کا راستہ چنتے ہیں اور دوسرے وہ جو کامیاب ہونے کے لئے شارٹ کٹ کی تلاش میں رہتے ہیں اور حرام ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتے۔ اس ناول میں مصنفہ نے جائز اور ناجائز کا فرق بہت خوبصورتی سے بیان کرتے ہوئے بتایا ہے کہ حلال کی کمائی ہمیں برائی پر جانے سے روکتی رہتی ہے اور حرام کا ایک لقمہ بھی اگر ہمارے خون میں شامل ہو جائے تو وہ کس طرح ہمیں بربادی کے کنارے لے جاتا ہے۔

مصیرہ احمد کے یہ ناول کتاب گھر کے معاشرتی رومانی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

آصف چوہدری سے ملاقات میرے لیے عجیب سا تاثر لے ہوئے تھی۔ اس تاثر کو میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ لاشعوری طور پر میں اپنا اس سے موازنہ کرتا چلا گیا۔ ہم جب سے الگ ہوئے تھے، وہ کسی اور راہ کارا بن گیا جہاں سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں تھا جبکہ میں نے روشن راہوں کا انتخاب کیا تھا لیکن ہم میں مشترک بات یہی تھی بلکہ دونوں ہی کو پڑ رہا تھا۔ وہ اسطرح اٹھائے ہوئے تھا جبکہ میں قلم سے اپنی جنگ جاری رکھے ہوئے تھا۔ اصل میں ہمارا انکلام ہی کچھ اس طرح کا بن گیا ہے، ہمیں لاشعوری طور پر ایک اُن دیکھی جنگ میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ بڑھتی عمر کے ساتھ نت نئی طاقتیں ہم پر مسلط ہوتی چلی جاتی ہیں اور ہم ان سے نبرد آزما ہوتے ہوئے اس طرح ہارتے ہیں کہ باقی کچھ بھی نہیں بچتا۔ میں نے اپنی روشن راہوں میں محبتوں کا فروغ ہی چاہا تھا لیکن انہی چند دنوں میں میرے ارد گرد ایسے حالات بنتے چلے گئے کہ جنہیں میں اب تک ذہنی طور پر قبول ہی نہیں کر پایا تھا۔ جو رہ رہا تھا، میں وہ نہیں چاہتا تھا مگر یہ سب مجھ پر مسلط کر دیا گیا۔ مجھے اس بات کا پورا احساس تھا کہ میں نے انگریزی کی زبان میں جواب دینا شروع کر دیا تو مجھ میں اور آصف میں کچھ فرق نہیں رہ جائے گا۔ میں نے اپنے اندر کے وحشی پن کو کسی طرح بھی جانگنے نہیں دیا تھے برسوں پہلے میں نے سلا دیا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ میرے اُن دیکھے دشمن چاہے گولی کی زبان میں ہی بات کرتے ہیں لیکن میں انہیں بہترین انسانی رویے کی صورت میں جواب دوں گا۔ پھر اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے، تب اس کی بنیاد پر میرا آئندہ لائحہ عمل ہوگا۔ انہی خیالات کے تانے بانے ہنڈ میں ندیم کے پاس جا پہنچا، وہ اس وقت اپنے گھر جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔

”میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا اور نہ ڈاکٹر نے تو مجھے دو گھنٹے پہلے چھٹی دے دی تھی۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”مگر ابھی تمہارے زخم تو۔۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر فخر و ادھورا چھوڑ دیا۔

”ان کی پٹی تو روز ہوگی، وہ میں آکر کروا جایا کروں گا۔“ ندیم جلدی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، آؤ، میں تمہیں چھوڑ دوں۔“ پھر اس کے بھائی سے کہا۔ ”سامان وغیرہ گاڑی میں رکھو۔“ مختصر سامان ڈرامی دہریں اکٹھا ہو گیا۔ میں ندیم کو سہارا دے کر باہر گاڑی تک لے آیا۔ پھر وہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتاتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہم ایک ایسی سچی آبادی میں تھے جسے دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ لوگ نہ جانے کس طرح کی زمینگی گزار رہے ہوں گے؟ جیسے ہی مین سڑک سے آبادی میں جانے والی مگی سڑک پر اترے تو اچانک ندیم بولا۔

”شہار بھائی! ہم ایسی ہی غریب بستی میں رہتے ہیں اور میں۔۔۔۔“

”آگے کچھ مت کہنا، جگہوں میں رہنے والے کسی بددیانت، کرہٹ اور بے غیرت شخص سے اس بستی کے غریب ترین مگر تخلص شخص کی قدر میرے نزدیک زیادہ ہے۔ سبھی تم! اور یہ جو تم نے خود پر غریبی کا خود ساختہ لیبل چپکا لیا ہے اور اپنے تئیں احساس کمتری کو اپنے کانڈھوں پر لادے پھر رہے ہو، اتار دو اسے۔ تم کتنے اچھے انسان ہو، اس کو دیکھو۔ یہی تمہارا معیار ہونا چاہیے۔“ ندیم ہی میں جذبہ ہاتی ہو گیا اور میں نے اچھی خاصی تقریر جہاز ڈالی، ندیم کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔

”سوری، شہار بھائی! آپ کی عزت میرے دل میں۔۔۔۔“

”ندیم! عزت ہمیشہ دل سے کی جاتی ہے اور اس کا اظہار لفظوں میں نہیں ہوتا۔ خیر چھوڑو اس پکڑ کو، بتاؤ اب کدھر مڑنا ہے؟“ میں نے دوراہے پر گاڑی کو بریک لگاتے ہوئے کہا تو وہ پھر سے مجھے راستہ بتانے لگا۔ جلد ہی ہم ایک گھر کے سامنے چار کے جس کا گیٹ لکڑی اور لوہے کی پتھری سے بنا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم ایک چھوٹے سے محن میں چار پائی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس کے بوڑھے ماں باپ خوش تھے۔ ندیم کا ایک چھوٹا بھائی اور پھر اس کے بعد ایک بہن تھی۔ یہ چھوٹا سا کتبہ قدرے عزت کی روٹی کھا رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر ان کے درمیان بیٹھا رہا اور پھر اجازت چاہی۔

”نہیں بھائی آپ کھانا کھا کے جائیں گے۔“ اس کی بہن نے کہا جس کا لہجہ مودب ہونے کے ساتھ قدرے شوخ تھا۔ میں ہنس دیا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر مجھے اپنی بہن یاد آگئی، تب میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن پکایا کیا ہے؟“

وہ آنکھیں گھما کر بڑے لاڈ سے بولی۔ ”دال چاول بنائے ہیں مگر آپ کے لیے بھائی سے کچھ منگوا لیا ہے۔“

”میں دال چاول ہی کھاؤں گا اور جو کچھ تم نے منگوا لیا ہے، وہ تم ہی کھانا۔ اب جلدی سے لے آؤ، بھوک لگی ہے۔“ میرے اس طرح کہنے پر ندیم ہنس دیا۔ اس لمحے مجھے اس قدر خوشی کا احساس ہوا کہ کوئی الجھن، کوئی پریشانی جیسے شے ہی نہیں۔ کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ہمارے پاس کوئی نہیں تھا۔ تب میں نے کسی کا ذکر کیے بغیر اسے بے خوف ہو جانے کا کہا اور ڈیسروں حوصلہ دے ڈالا۔ پھر میں ان سے رخصت ہو کر سٹوڈیو کی طرف نکل پڑا۔

اس رات خلاف معمول سٹوڈیو میں خاصی روٹی تھی، کسی قلم کا مہورت تھا۔ میں گاڑی پارک کر کے یونٹی بکے قدموں سے جھلتا ہوا اندر کی جانب جانے لگا تو ایک درمیانے سے قد کے نوجوان سے لڑکے نے میرا راستہ روک لیا۔ اس نے پرانی سی جین اورٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، پہلی نظر میں وہ اس طبقے سے تعلق رکھنے والوں میں سے نظر آ رہا تھا جو درمیانے درجے کی اداکاروں کے سیکرٹری ہوتے ہیں۔ ایسے لڑکے دوسری اداکاروں کے بارے میں معلومات دینے میں بڑے شوقییل ہوتے ہیں اور جن کے وہ سیکرٹری ہوتے ہیں، انہیں بڑھا چڑھا کر پیش کرنے میں بڑے ماہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دوسرے لوگوں کے لیے اہم ہوں یا نہ ہوں لیکن صحافی طبقہ ان سے گہر پورا کھانا کھاتا ہے۔ پہلے ہی دن گوئندل نے مجھے یہ بات سمجھا دی تھی۔ میں نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا تو اس نے بڑے ادب سے، قدرے جھکتے ہوئے مصافحہ کے لیے دونوں ہاتھ بڑھا دیئے۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے سلام کا جواب دیا تو وہ بڑے محتاط لہجے میں بولا۔

”سر، جی! کیا حال ہیں؟“

”میں ٹھیک ہوں۔“ پھر چند لمحے بعد سوچنے والے انداز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔ میرا خیال ہے، ہم پہلی بار مل رہے ہیں؟“

”جی، سر جی! ہائل فست ٹائم، میں جی، میڈم زارا کا سیکرٹری ہوں“ اس نے مسکراتی آنکھوں سے اپنی بات کا راز ایکشن میرے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی، کوئی تاثر نہ پا کر وہ پھر سے محتاط لہجے میں بولا۔

”میں بڑی دیر سے آپ کی راتک رہا تھا۔“

”کوئی خاص بات؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا کیونکہ مجھے قدرے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ مجھ سے کیوں اس انداز سے ملتا تھا۔

”جی، وہ آپ سے میڈم زرار ملنا چاہتی ہیں۔“ اس نے کہا تو میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ ریک گئی۔ اس نے میرے اندازے کی تصدیق کر دی، وہ اس کے لیے زرار اور ہاس وقت ایک دوسرے کے مد مقابل تھیں اور ایک کا ڈسٹن دوسری کا دوست تصور کیا جاتا تھا۔ ان دونوں میں کسی حد تک یہی خیال کیا جاتا تھا، آئے دن ان کی چپقلش سے متعلق بیان بازیاں جھجکتی رہتی تھیں۔

”بہت خوشی ہوگی مجھے ان سے مل کر۔۔۔ کہاں ہیں وہ؟“ میں نے پوچھا تو وہ کھل اٹھا، جلدی سے بولا۔

”وہ ابھی آئیں گی جی، مہورت پر، اس فلم کی وی سی بیروٹن ہیں لیکن انہوں نے آپ سے گھر پر ملنے کے خواہش کی ہے، ویسے آپ ان سے بات کر لیں۔“ اس نے میرے سٹیل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، پھر نمبر دہرانے لگا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور سٹیل پر نمبر پیش کر دیئے۔ جیسے ہی منتقل ہوئی، میں نے فون اسے تھما دیا۔ وہ دوسری طرف غور سے سننے لگا۔ پھر رابطہ ہوتے ہی میرے متعلق بتانے لگا، چند لمحوں بعد فون بجھنے لگا۔

”جی بات کریں۔“ میں نے فون کان سے لگا کر ”ہیلو“ کہا تو دوسری سمت سے انتہائی خموری آواز میں زرار بولی۔

”زبے نصیب کہ ہم نے آپ کی آواز سنی۔ یہ جان کر بے انتہا خوشی ہوئی کہ میں آپ سے ملنے کا شرف حاصل کروں گی۔“

”مجھے بھی خوشی ہوئی۔ آپ جب چاہیں اور جہاں چاہیں، ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”میں ابھی کچھ دیر بعد سٹوڈیو آؤں گی، آپ سے ملوں گی لیکن حسرت کہ شاید کوئی تفصیل سے بات نہ ہو پائے۔ آپ مجھے حکم دیں۔ کوئی

ڈنر، کوئی بیچ۔۔۔“

”ایسے اجتام کی ضرورت نہیں۔ مجھے احساس ہے کہ آپ اس وقت مصروف ہوں گی، باقی باتیں پھر کسی وقت سمی۔“

”جی اوکے، میں خود ہی آپ کو کال کر دیا کروں گی۔“ اس نے کہا تو میں نے فون بند کر کے اس نوجوان کو دیکھا جو میری طرف بڑے

مسرور انداز سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے کچھ کہے بغیر اس سے ہاتھ ملایا اور آگے بڑھ گیا۔ دراصل مجھے کچھ قاصدے پر گوندل نظر آ گیا تھا۔ وہ میرا دوست تھا لیکن ہمارے ساتھ ہونے والی چپقلش کے بعد وہ مجھ سے بھٹک رہا تھا۔ ظاہری بات ہے اس کی بھوریوں میں بھی ہوں گی۔ وہ اپنے رویے سے مجھے یہ یاد رکھنا چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے زیادہ اپنے پروفیشن سے غافل ہے اور میں اس بات کو مانتا تھا کہ بندے کو اپنے پروفیشن سے غافل ہونا چاہیے۔ وہ ایک رپورٹر سے باتیں کرنے میں گمن تھا کہ میں نے ان کے قریب جا کر اونچی آواز سے سلام کہہ دیا۔ گوندل نے چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر بڑے اچھے انداز سے ملا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی بات کہتا، وہ بولا۔

”شہار! نظر میں آرہے ہو۔ ویسے میں نے تمہارا ایڈیشن دیکھا تھا، بہت خوبصورت تھا۔“

”ہا کے بارے میں بھی پڑھا ہوگا۔ میں نے اس کے بارے میں۔۔۔“ میرا جملہ مکمل ہونے سے پہلے ہی اس نے اس رپورٹر سے

معذرت چاہی اور مجھے لے کر ایک طرف بڑھ گیا۔

”میں مانتا ہوں کہ تم نے ہمارے بارے میں اچھا ہی لکھا ہے لیکن یہ جو افواہ گردش کر رہی ہے کہ تم پر قاتلانہ حملے ہو رہے ہیں، ان کا تعلق ہمارا

سے قطعاً نہیں ہے۔ وہ اس حد تک نہیں پہنچ سکتی۔“

”ہوسکتا ہے، نہ ہو مگر حالات تو یہی کہہ رہے ہیں۔“

”غلط فہمی ہے تمہاری۔ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب قلمی دنیا میں آئی بھی نہیں تھی۔“

”اور گوندل! یہ ضروری بھی نہیں کہ وہ سارے معاملات میں تمہاری رائے لے۔ یہ بات تم اچھی طرح سمجھتے ہو کہ یہ لوگ دوسروں کے ساتھ کیا تھیں نہیں ہوتے۔“ میں نے سختی سے کہا۔

”میں تمہاری بات کی تردید نہیں کروں گا مگر ہا اور کا تعلق نہ حملہ، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔“

”تم اچھے واثق سے کس طرح کہہ سکتے ہو؟“

”اس لیے کہ میری اس سے ہی نہیں، دوسروں سے بھی بات ہوئی ہے۔“ پھر چند لمبے رک کر بولا۔ ”میرا مشورہ یہ ہے کہ شخص اس امر پر مت سوچو، دوسرے زاویے سے بھی غور کرو۔ ہوسکتا ہے، کوئی اور ہو۔ اپنی نظر کو وسعت دو۔“

”دیکھو، گوندل! اگر یہ سب ہا کی طرف سے بھی ہوتی ہیں۔ تو کوئی جوانی کاروائی لائیکس کی اور نہ ہی میں کروں گا، چھوڑو ان باتوں کو، کہنا میں یہ چاہتا تھا کہ یوں اجنبیت ٹھیک نہیں ہے، یاد ا! بس مصروفیات ہی ایسی ہیں۔“ اس نے تجلالت سے کہا اور میرا ہاتھ تقاضا لیا۔ پھر یونہی ہم ایک طرف بڑھ گئے۔

قسم کی سہولت کی وجہ سے اس رات بہت سارے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ زارا کے آنے کے ساتھ ہی ماحول میں آگ بجلی ہی پیدا ہوئی تھی۔ روشنیوں، رنگوں اور خوشبوؤں کے ساتھ چہرے تھے کہ امنڈے ہوئے تھے۔ قہقہے، دھیمی مسکرائیں، باتیں کرتی ہوئی آنکھیں، بے باکیاں، سرگوشیاں اور نجانے کیا کچھ وہ رات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے تھی۔ اک نئی دنیا میرے سامنے آشکار ہوئی تھی اور میں اس سے ہر ممکن حد تک حظ اٹھا رہا تھا۔ میں نے اپنے ذہن کے تمام ٹکرات جھٹک دیئے تھے اس لیے ہلکا پھلکا ہوجانے کے باعث زیادہ خوشی محسوس کر رہا تھا۔ نئے نئے لوگوں سے تعارف کے باعث ایک عجیب سا ماحول بن گیا تھا۔ میز پر جہاں کے گانے سے اس رسم کی شروعات ہوئی اور پھر وہی ہلکا گلاب جو اس موقع کی مناسبت سے روایت رہا ہے۔ میں شو بیز رپورٹرز میں ہی ایک طرف کھڑا تھا کہ دو تین لوگ میری طرف بڑھے۔ وہ خاصے خوش پوش تھے، تینوں نے باری باری مجھ سے مصافحہ کیا اور اپنا تعارف کروایا۔ ان میں سے زیادہ خوش پوش اور صحت مند شخص نے اپنا نام صادق پھر بتاتے ہوئے کہا۔

”آصف چوہدری اپنا یاد ہے، مجھے اس نے آج ہی فون کیا ہے۔ اب کم از کم یہاں پر کوئی چیز پائینس پھڑک سکتی۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ، بہت شکر یہ! میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ مجھے کوئی تحفظ دیا جائے بلکہ میں نے تو اس کے ذمے کچھ اور کام لگا دیا تھا۔“

”وہ بھی ہو جائے گا، بس ایک دو دنوں کی بات ہے۔“ اس نے باقاعدہ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا، پھر کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ چل دیا۔ اس رات خاصی دیر تک کہا گئی رہی مگر ہا وجود و کوشش کے میری زارا سے ملاقات نہ ہو سکی تھی۔ ایک دو بار ایسا موقعہ آیا بھی لیکن رش کے

باعث بات صرف "بیٹو ہائے" تک ہی محدود رہی تھی۔ پھر رات گئے میں لوٹ آیا۔

دو دن بڑے سکون سے گزر گئے۔ اس دوران عامر بشیر نے میرا فلیٹ خالی کر دیا اور کیمین روڈ پر سامان خشک کروا دیا۔ میں اب اپنے دفتر سے اور زیادہ نزدیک ہو گیا تھا مگر سٹوڈیو کے لیے کافی وقت لگ جاتا تھا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ ہمارے اخبار کے فون نمبر پر کئی ہار فون کر چکی تھی، شاید اسے میرے بدل نمبر بارے پوچھیں تھا یا پھر وہ جان بوجھ کر اخبار کے ہی دفتر کرتی تھی۔ مجھے اس کی یہ منطقی سمجھ نہیں آتی تھی۔ وہ گوئڈل سے بھی میرا نمبر معلوم کر سکتی تھی۔ میں نے اس پر ذرا غور کیا، پھر میں نے سوچا ہی نہیں۔ حراسے کی بات یہ تھی کہ اس نے جب بھی فون کیا، میں دفتر میں موجود نہیں تھا۔ ہر بار اس کا مجھے یہی پیغام ملتا کہ فون کر لیں لیکن میں نے اس کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ مجھے ذرا سکون ملا تو میں نے اپنے آفس کے اندرونی ماحول اور خصوصاً سلیم فارانی کے بارے میں پھر پورا جائزہ لیا۔ حسن اور اس کے چند دوست رپورٹر ایک ایسا ماحول بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں سلیم فارانی کے بارے میں عدم تعاون کی فضا بن گئی تھی۔ اخباری دنیا میں رپورٹنگ سب سے اہم شعبہ ہوتا ہے اور یہی شعبہ کمزور پڑ گیا تو اخبار پھیکا پڑنے لگا۔ اس دو پہر ہم سب اسی موضوع پر بات کر رہے تھے اور یہ طے پا چکا تھا کہ جیسے ہی سلیم فارانی کی طرف سے کوئی معاملہ ہو، اس کا پھر جواب دیا جائے۔ ایک بالکل نیا اخبار مارکیٹ میں آ رہا تھا جس کے لیے حسن سے بات ہو گئی تھی کہ وہ عملہ پورا کرے۔ میری فکر اس معاملے میں بھی شتم ہو گئی تھی کیونکہ میں نے جو سوچا تھا اس کے لیے ابھی وقت پڑا تھا اس لیے میں مطمئن تھا۔ انہی باتوں کے بعد ہمارے ہی ایک صحافی دوست نے مجھ سے سرسری سے انداز میں مجھ پر قحطانہ حملے کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے اچانک کہا۔

"یارا جیسا تم بتا رہے ہو کہ وہ حملے یوں تھے جیسے دمکھی ہو، اس کے پیچھے سلیم فارانی کا ہی ہاتھ نہ ہو؟"

"ہو سکتا ہے لیکن اس کا کوئی جواز نہیں بنتا"

"یارا سامنے کی بات ہے۔ اس نے تمہاری سیٹ بدلی ہی اس لیے تھی کہ تم اخبار چھوڑ جاؤ۔ اسے تم نے نتیجہ سمجھا تو اس نے بھی پھر جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ آخر وہ کرائم رپورٹر ہے، اس کا تعلق ضروران لوگوں کے ساتھ بھی ہے جو کرائم کرتے ہیں۔ اس کے لیے یوں کسی کو دھمکانا کوئی بڑی بات نہیں۔" اس نے سادگی سے کہہ دیا تو گوئڈل کی بات میرے ذہن میں لپک گئی۔

"ویسے پہلے میں نے ایسا سوچا نہیں تھا۔"

"تو اب سوچ لو۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تو میں نے سنجیدگی سے اس نئے انداز پر غور کرنا شروع کر دیا۔ یہ ممکن تھا، سلیم فارانی اپنی خواہش کے باعث ایسا کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچا اور اس پر کوئی حتمی رائے اس لیے قائم نہ کی کہ ہاں کی طرف سے معاملہ صاف ہو جائے تو پھر میں اسے دیکھ لوں گا۔ دو پہر کا کھانا کھا کر میں اور حسن دفتر آ گئے تو خلاف معمول رپورٹنگ روم میں خاصی رونق تھی یا شاید مجھے ہی محسوس ہوا تھا۔ ماریہ بہت چمک رہی تھی اور مجھے دیکھ کر ہلکی ہلکی طنز آمیز گفتگو ہونے لگی تھی۔ میں محض مسکرا کر رہ گیا۔ حسن نے بیون کو چائے لانے کا کہا اور کاغذ قلم نکال کر مصروف ہو گیا۔ ہمیں میرے موبائل کی کھنٹی بج آئی، دوسری طرف زارا تھی۔

"کیا کر رہے ہیں آپ۔۔۔؟" اس نے رکی باتوں کے بعد پوچھا۔

”ابھی تک تو کچھ نہیں کر رہا۔“ میں نے یونہی خوشگوار لہجے میں کہا۔

”میں آ رہی ہوں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

”تو آجائیں، میں انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے بھی اسی شوخ انداز میں کہا تو اس نے الوداعی کلمات کہہ کر فون بند کر دیا، پھر چند منٹ گزرے ہوں گے کہ زرارہ پورنگ روم میں آن وارد ہوئی۔ اس کے ساتھ بڑے بے ہاک لباس میں ایک لڑکی تھی اور ایک بڑے ٹرل ڈول والا شخص۔ اس کے یوں اچانک آنے پر مجھے ہلکی سی حیرت تو ہوئی لیکن میں نے خود پر قابو پا لیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میں ادھر سے گزر رہی تھی۔ میں نے پہلے پوچھ کر دیا کہ آپ آفس میں ہیں تو آپ کو فون کر دیا تاکہ تھوڑا سا آپ کو حیران کر دوں۔“ اس کے اس طرح کہنے پر میں مسکرا کر رہ گیا۔ اس نے بیچوں نے کرسیاں لگا دیں تو وہ عین میرے سامنے بیٹھ گئی۔

”بہت اچھا کیا، آپ ملنے آئیں ورنہ میں تو آپ کو فون کرنے والا تھا۔“ میں نے اخلافا کہا۔

”میری بڑی زبردست خواہش تھی آپ سے ملنے کے لیے، سوچ رہی تھی کہ کب ملاقات ہو۔ ایسے میں ہی اسے دن نکل گئے۔“

”نہیں، آج اتفاق سے آپ کا ادھر سے گزر ہوا تو آپ نے ملنے کی زبردست کر لی۔“

”نہیں، اتفاق سے نہیں۔ میں سوچ کر آئی ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا، پھر بڑی ادا سے بالوں کو جھٹک کر بولی۔ ”میں نے آپ کو دیکھا تھا لیکن ملاقات نہ ہو سکی، دل چاہ رہا تھا کہ آپ سے ایک طویل ملاقات ہو۔ ڈھیر ساری باتیں کروں میں آپ سے“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو بڑی مصومیت سے پھینایا جو صریحا اداکاری تھی۔ اس لمحے میں نے ماریہ کی جانب دیکھا جو سرخ ہوتے ہوئے چہرے اور شعلہ ہار آنکھوں کے ساتھ مجھے گھور رہی تھی۔ میں دھیرے سے مسکرایا، پھر میں نے زرارہ کی طرف دیکھا جو کہہ رہی تھی۔ ”قدرت نے رات ہی ایک موقع دے دیا۔ ہمارا پینٹ شوٹنگ کے لیے آج جا رہا ہے، مری کے مضامقات میں شوٹنگ ہے۔ ام رات کی فلائٹ سے پنڈی جائیں گے، رات اسلام آباد ٹھہریں گے اور پھر صبح ہی صبح وہاں سے نکلیں گے۔ میں نے رات ہی فیصلہ کر لیا کہ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ آپ کی سیٹ بک ہے۔ آپ ڈنر میرے ساتھ لیں گے، پھر وہیں سے ایئر پورٹ نکل جائیں گے۔“

”یہ آپ نے یکدم۔۔۔“ میں نے کہنا چاہا تو اس نے میری بات کاٹ کر کہا۔

”اسی لیے میں آئی ہوں۔ فون پر اس لیے نہیں کہا کہ اگر آپ بحث کریں گے تو میں آپ سے کچھ کہہ نہ سکوں گی، خود آئی ہوں تاکہ اس نے شاید جان بوجھ کر فقرہ ادھر اس لیے چھوڑ دیا تھا کہ باقی بات اس نے آنکھوں سے کہہ دی تھی۔ زرارہ کی یکدم آفر پر میں کچھ ڈسٹرب ہو گیا تھا۔ میں نے کچھ لمحے سوچنے کے لیے زرارہ سے کہا۔

”اچھا، یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ آپ بتائیں، کیا تھکن گی۔ کوئی فریش جوس یا کافی؟“

”کچھ۔۔۔ بھی۔۔۔ تو نہیں میں اس وقت جلدی میں ہوں۔“ اس نے اک ادا سے کہا۔

”پھر بھی، کچھ نہ کچھ؟“ میری بجائے حسن نے کہا۔

”تو، ٹھیکس“ اس نے حسن کی طرف دیکھ کر کہا، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”تو پھر میں آپ کا انتظار کروں گی۔“

”دیکھیں، میں آپ کو کچھ دیر بعد بتاؤں گا، ویسے آپ کا نور ہے کتنے دنوں کا؟“

”اوہ میں بتانا بھول گئی۔ بس ایک دن کام ہے میرا۔۔۔ ورنہ یونٹ تو ایک ماہ اور ہے گا۔“

”چلیں، میں آپ کو تھوڑی دیر بعد فون کرتا ہوں۔“ میں نے کوئی حتمی فیصلہ دینے بغیر کہا۔

”نہیں، فون نہیں کرنا بس آپ آرہے ہیں، اوکے“ یہ کہہ کر وہ اٹھنے ہوئی بولی۔ ”میں انتظار کروں گی۔“ اس نے میرے ساتھ ہاتھ ملایا

اور پھر مزے لاشعوری طور پر میری نظر مار یہ پر پڑی، وہ شدید غصے کی حالت میں تھی۔ میں توقع کر رہا تھا کہ وہ اب ضرور طرہ گفتگو کرے گی، اس کے لیے میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار بھی کر لیا مگر اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب وہ چپ چاپ انہی اور پورنگ روم سے نکل گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اگر کچھ کہہ دیتی تو مجھے اتنی حیرت نہ ہوتی جتنا اس کے تجزی سے چلے جانے پر تھی۔ میرے ساتھ بیٹھا حسن فون دیا۔

”شہزادی نے کچھ کہا نہیں، جان جی؟“

”مجھے بھی حیرت ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”پھر کیا خیال ہے تمہارا، ذرا اشاریہ ہا کی مخالفت کی وجہ سے ہی تم پر مہربان دکھائی دے رہی ہے؟“ وہ بولا۔

”ہاں، ہے تو ایسا ہی۔۔۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

”چلے جاؤ، ایک دن تو ہے۔ دیکھیں، کیا کہتی ہے؟ پھر ذرا اجسی خاتون کا ساتھ۔۔۔ میں ہوتا تو فوراً ہاں کر دیتا۔ وہ تمہیں خود آفر کرنے آئی

ہے۔“ حسن نے خوشگوار موڈ میں دوسروں کو سناتے ہوئے کہا اور اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، میرے سامنے پڑا فون بج اٹھا۔ میں نے ریسیور اٹھا کر ”ہیلو“ کہا تو دوسری طرف نہایت غصے میں ماریہ نے کہا۔

”دیکھو، کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں اور اگر تم گئے تو میں تمہیں بٹھنے والی نہیں۔“

”تم صرف بکواس کر سکتی ہو، اور کچھ نہیں۔“ میں نے دھیرے سے نہایت سرد لہجے میں کہا۔

”میں نے جو کہہ دیا، وہ سن لیا ہے نا۔!“ اس نے مجھ سے بھی سرد لہجے میں کہا۔

”ضروری نہیں کہ میں تمہاری ہر بات کا جواب دوں۔، تمہیں تم۔“ یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا، غصے کی لہر نے میرے وجود کو اپنی پلیٹ

میں لے لیا تھا۔

”خیریت۔ کون تھی؟“ حسن نے چونک کر پوچھا۔

”ماریہ تھی، ذرا اس کے ساتھ نہ جانے کا کہہ رہی ہے“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”نہیں رہ سکی نا۔“ وہ یہ کہہ کر خاموش ہو گیا، پھر چند لمحوں بعد بولا۔ ”دیسے، شجاع اقبال نہ مان، کوئی معاملہ ہے ضرور تیرے اور ماریہ کے

درمیان۔ اب یہ تیری مرضی ہے کہ تو اپنے دوست کو نہ بتائے۔“

”چھوڑ دے یارا، اس قصے کو، میں نگل آ گیا ہوں اس عورت سے۔“ میں نے انتہائی الجھتے ہوئے کہا۔

”اچھا چھوڑ دیا اور باقی رہی اس سے نگل آنے کی بات تو اس کا بہت آسان معاملہ میرے پاس ہے، پھر کبھی نگل نہیں کرے گی۔“

”وہ کیا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے اس بات کا یقین کر لیا ہے کہ جب بھی کسی عورت یا کہیں کسی عورت کے ہونے کا امکان ہو، یہ تمہارے معاملے میں وہیں بھڑکتی

ہے۔ تم ہر روز اس نئی عورت کو یہاں بلا لیا کرو۔ یہ نگل آ جائے گی، کہنا چھوڑ دے گی یا اخبار چھوڑ جائے گی۔“

”میں۔۔۔ یعنی میں ہر روز یہاں عورت کو بلا لیا کروں؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہاں، دیری سہیل۔“ حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تا کہ یہ میرا سر بچاؤ دے نگل آ کر“ یہ کہتے ہوئے میں اپنا تہہ نہروک سا۔

”اس نے تمہارا سر کیا بچاؤ ہے، یارا، ویسے اگر تم اس کے بارے میں کوئی نرم گوشہ رکھتے ہو تو الگ بات ہے، جان لی ا“ اس نے غمور

لہجے میں کہا تو میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”مجھے اس سے شدید قسم کی نفرت ہے۔“ میں نے لفظ چبا کر کہے تو حسن نے حیرت سے میری طرف دیکھا۔ کئی لمحے وہ اسی حالت میں رہا

جب دوسرے سے بولا۔

”معاظہ لہیا ہی نظر آتا ہے۔ خیر تم جاؤ، یارا پکنک منا آؤ۔“ اس نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

اس رات تنگی قدرے تریا دھمی۔ میں نے زارا کے پورچ میں گاڑی کھڑی کی تو وہ میرے استقبال کو آن موجود ہوئی۔ ”ٹھیک وقت پر

آئے ہیں آپ۔“ اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے نہایت خوشگوار لہجے میں کہا۔

”کیا کریں، عادت ہے۔“ میں نے بھی شوقی سے کندھا چکا کر کہا تو وہ میرے خالی ہاتھوں کی طرف دیکھ کر بولی۔

”جا ہے سڑا ایک دن کا ہی سہی لیکن ہے تو۔۔۔ آپ نے۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا تو میں نے کہا۔

”میرا بیگ کھجلی سیٹ پر پڑا ہے۔“

”اوہ، ڈیش گنڈ۔۔۔ چلیں، آئیں“ وہ مجھے لے کر ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ اس ڈرائنگ روم سے اس کی نفس طبیعت کا اندازہ ہو رہا تھا

کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد ہم ڈنر کے لیے ایک دوسرے کے سامنے آ بیٹھے۔ اس نے خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ پھر ہلکی پھلکی باتوں کے دوران

ڈنر ختم کر کے جب میں اٹھا تو وہ بولی۔

”جائے ہم بیڈ روم میں بیٹھیں گے۔“

”جیسے آپ کی مرضی، میڈم۔۔۔!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر ہم دونوں ہی بیڈ روم میں ایک جہازی سائز کے بیڈ پر جا بیٹھے۔ وہ

میرے سامنے اتنی پانسی مار کر بیٹھ گئی۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی، کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ میں نے محسوس کیا جیسے زارا بیڈ روم میں ہونے کے باوجود

ذاتی طور پر وہاں نہ ہو۔ پھر وہ یکدم چونک گئی

”شجاع، جی ایک بات کہوں۔۔۔“ وہ دھیرے سے مسکرا کر بولی۔

”بولیں۔“ میں نے تجسس سے کہا تو میری طرف دیکھ کر تیزی سے بولی۔

”ایک تو آپ یہ آپ جناب فہم کریں۔“

”چلیں ٹھیک ہے، اور۔۔۔؟“

”آپ نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ میں یکدم ہی آپ پر اتنی مہربان کیوں ہو گئی، یوں جیسے بہت پرانی دوستی ہو اور پھر آپ نے یہ بھی سوچا ہوگا

کہ میں آپ کی طرف یکدم اس لیے متوجہ ہوئی ہوں کہ آپ کے اور ہمارے درمیان جو معاملہ چل رہا ہے، اس کے باعث۔۔۔؟“ وہ چپ ہو کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں خاموش رہا تو وہ بولی۔

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”پھر کیا بات ہے؟“

”اس کا مطلب ہے، آپ نے سوچا ضرور ہے، خیر، یہ انسانی فطرت ہے اور آپ کو سوچنا بھی چاہیے۔ دراصل میں یہ کہنے جا رہی تھی کہ

میں آپ کی طرف متوجہ کیوں ہوئی؟ پہلی بات تو آپ پیڑھن میں رکھیں کہ اس کا کوئی حوالہ شوہر سے نہیں ہے۔ میں نے اس دن آپ کو وہیل بار دیکھا

تھا جب آپ کے بارے میں خبر شائع ہوئی تھی اس رات میں نے دور سے ہی آپ کو دیکھا تھا اور پہلی ہی نظر میں۔۔۔“ وہ جذبات کی رو میں بہتی پہلی جا

رہی تھی کہ یکدم رک گئی، پھر ہنس کر بولی۔ ”آپ شاید یہ توقع کر رہے کہ میں پہلی نظر میں گمانس ہو گئی۔ او، نو۔۔۔ گمانس تو میں پہلے کی ہوں۔ پہلی

ہی نظر میں آپ نے مجھے ماضی کی ان اہم گہرائیوں میں لاپھونکا جنہیں میں یاد نہیں کرنا چاہتی۔“

”لیکن اس میں میرا کیا قصور؟“

”قصور آپ کا نہیں۔ آپ خوبصورت ہیں، پیارے ہیں، وجہ یہ ہیں۔ یہ صفات اپنی جگہ لیکن میری زندگی میں لپٹل کیوں بچ گئی، وہی وجہ

میں آپ کو تانا چاہ رہی ہوں۔ یقیناً آپ بھی جانتا چاہیں گے اور اسی وجہ نے مجھے آپ کے قریب آنے پر مجبور کر دیا۔“

”اتنا تجسس تو نہ پھیلاؤ، سیدھے سیدھے بتا دو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے سائینڈ ٹیبل پر الٹی پڑی تصویر والا فریم سیدھا کر دیا۔

اس پر نظر پڑتے ہی میں چونک گیا۔ وہ تصویر میری نہیں تھی لیکن کوئی بھی اجنبی اس تصویر کو کچھ کرے کہہ سکتا تھا کہ یہ میری آٹھ دس سالہ پرانی تصویر ہے۔

وہ جو کوئی بھی تھا، مجھ سے حدود چھ مشابہت رکھتا تھا۔ میں کتنے ہی لمبے اس حیرت میں رہا، پھر میں نے سرسراتے ہوئے کہا۔

”حیرت انگیز۔۔۔ کون ہے یہ جو مجھ سے اتنی مشابہت رکھتا ہے۔؟“

”ہے کوئی دلہن اس ملک میں نہیں بلکہ پڑھیں کہ ہے بھی یا نہیں، تاخیر بار سنا تھا کہ لندن میں سدا ہوا گیا ہے۔ بہت عرصہ ہوا وہ مجھ سے نہیں ملا۔“

”پھر بھی، کون ہے یہ؟“

”جس کی یادوں کے سہارے میں جی رہی ہوں، جس کا مجھے آج بھی انتہا ہے اور شاید زندگی کی آخری سانس تک رہے گا۔ میری زندگی، میرا جیون، میرا سب کچھ ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو چمک پڑے۔ کتنی ہی دیر تک وہ گم سم سی رہی، پھر اچانک ہنستے ہوئے بولی۔ ”آپ گھبرائیے گامت، میں آپ پر قطعاً عاشق نہیں ہونے والی“

”اور میں بھی عاشق ہونے والا نہیں ہوں۔“

”میں جانتی ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں جو سنا ہے، وہ سب سچ ہے۔“

”اس کا مطلب ہے تم باقاعدہ گفتگو کرنا ہی ہو؟“

”بالکل، اور ایسا میں نے اس لیے کیا کہ میرا من بے کھل تھا۔ مجھے پتہ چلا تھا کہ آپ میڈم ٹیلیم کے ہاں پارٹی میں گئے تھے، میں نے ان سے ہی پوچھا تھا اور پھر حیرت انہوں نے آپ کے بارے میں۔۔۔ خیر چھوڑیں، میں چاہتی ہوں کہ آپ میرے دوست بن جائیں۔“

”دوست ہوں تو تمہارے پاس تمہارے بیڈ پر بیٹھا ہوں۔“

”ایک درخواست اور کہ ہمارے درمیان ہمارا پروفیشن نہیں آئے گا۔ میں کہی آپ سے نہیں کہوں گی کہ آپ مجھے پروجیکٹ کریں، میرے بارے میں خبر لگائیں یا میرا کوئی بیان یا تصویر بچھا لیں۔ میں اس دوستی کو بالکل الگ، سب سے چھپا کر رکھنا چاہتی ہوں۔“

”اوکے، یا رانا تقریر بند کرو۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو وہ بھی ہنس دی۔ وہ تمہاری چائے نہیں آئی۔“ مجھے اچانک یاد آیا۔

”اوہ، میں بھول گئی۔ میں نے کہا تھا، میں خود بناؤں گی۔ میں ابھی بنا کے لائی۔“ وہ یہ کہہ کر جلدی سے اٹھ گئی اور میں اس تصویر کو فوراً دیکھنے لگا جس سے مشابہت کے باعث ذرا میرے قریب ہوئی تھی۔ کیا یہ عجیب اتفاق نہیں ہے؟ میں نے اپنے آپ سے سوال کرتے ہوئے تصویر کو دیکھا۔ پہلی نظر میں واقعی وہ میری برائی تصویر لگتی تھی لیکن غور کرنے پر معلوم ہوا کہ محض بالوں کے انداز، موچھوں کے سٹائل اور آنکھوں کی مشابہت ہے، باقی وہ مجھ سے مختلف تھا۔ شاید وہ اپنے محبوب کا ذرا سا کس پانچویں چل گئی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ پتہ نہیں کیوں، میں نے یہاں آ کر تھوڑا سا کون محسوس کیا تھا۔ پھر چائے پینے کے کچھ ہی دیر بعد ہم ایئر پورٹ کے لیے نکل گئے۔

فلٹس پر سیٹھی سیٹ کھولنے کے بعد وہ ذرا سا گھوم کر بیٹھ گئی، اس سے ظاہر تھا کہ وہ مجھ سے ہانسی کرنا چاہ رہی تھی۔ کچھ لمبے پونجی مزر گئے جب پھر وہ بولی۔

”آپ کہیں یہ تو خیال نہیں کر رہے کہ میرے ساتھ آ کر کوئی غلطی کی ہے؟“

”تمہیں یہ خیال کیسے آیا؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”ایسا اس لیے کہ ہم شو بڑے کے لوگ اپنی شہرت میں کچھ اچھے نہیں ہوتے۔“ اس نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

”جیسی بھی ہو، تم نے کہا اور میں نے مان لیا۔ پھر زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا۔ لوگ ہاتھ بنا نہیں گے تو بتانے دیں، ہمارا کیا لیتے ہیں۔“ میں نے اظہارِ اسی سے کہا۔

”وہ بھی ایسا ہی کہتا تھا۔“ وہ پھر سے ماضی میں کھوئی۔ پھر ہارگت کی ہی آواز کے ساتھ کہا۔ ”اتنی پیاری باتیں کرتا تھا، اتنا مصوم، بس بارادہ میری قسمت میں نہیں تھا اور شاید میں ہی اس قابل نہیں تھی۔“

”تم اس کے بارے میں بتاؤ تو سہی۔“ میں نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

”ہاں، آپ کو بتانا ہی ہوگا۔ اب تو میں اس کی باتیں آپ ہی سے کر کے اپنا من پکا کرنے کی ایک کوشش کر سکتی ہوں۔“ وہ اسی طرح کھوئے ہوئے لہجے میں بولی۔ پھر چند لمبے چپ رہنے کے بعد کہنے لگی۔ ”کوئی وقت تھا، ہم کوٹھے والیاں گانے بجانے کے علاوہ مردوں کو بھانے کی تعلیم ہی حاصل کرتی تھیں اور یہی ہمارے لیے کافی سمجھا جاتا تھا۔ پھر وقت اور حالات بدلتے چلے گئے۔ میری ماں کوٹھے سے اٹھ کر علامہ اقبال ٹاؤن آئی لیکن باقاعدہ اپنے اڈے پر جاتی رہی۔ مجھے ڈانس کی تعلیم تو ملی مگر میں سکول سے نکلی تو کالج تک جا پہنچی۔ میری ماں کا خیال تھا کہ اس طرح وہ میرے دامن زیادہ کھرے کر سکتی ہے۔ صفدر مجھے کالج میں ہی ملا تھا، وہ جنگ سائیکل کے کسی گاؤں کا تھا۔ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی جیسے اندر ہی اندر کسی اچلتے ہوئے لاوے کو روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ میں اس کے چہرے کو دیکھتا رہا اور وہ کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولی۔ ”پھر یوں ہوا کہ اسے میری اصلیت کا پتہ چل گیا۔ وہ میرے ساتھ قلعہ تھا، اسے صرف مجھ سے غرض تھی۔ وہ میری زندگی کے سنہرے دن تھے۔ میں صفدر کے ساتھ زندگی گزارنے کے خواب دیکھ رہی تھی لیکن میری ماں مجھے تم میرے بنانے کی ٹھان چکی تھی۔ میں ان دنوں کالج میں ہی تھی کہ صفدر گم ہو گیا۔ میں نے پاگلوں کی طرح اسے تلاش کیا لیکن وہ مجھے نمل سکا۔ وہ اپنے گاؤں بھی نہیں رہا تھا، بس یہی پتہ چلا کہ وہ مزید پڑھنے کے لیے لندن چلا گیا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ وہ لندن چلا گیا ہے؟“

”ایک دوست کو میں نے اس کے بارے میں معلوم کرنے کے لیے مجبور کیا تو وہ اس کے آبائی گاؤں گیا تاکہ اس کے والدین سے صحیح معلومات لے آئے۔ وہ وہاں سے ایک خط لایا جو صفدر نے لندن سے اپنے والدین کو لکھا تھا۔“

”اس پرائیڈ میں تو ہوگا اس کے لندن کا؟“

”نہیں، اس کے والدین نے وہ بھاڑ لیا تھا۔“ وہ حیرتی سے بولی۔ پھر چند لمبے بعد کہی۔ لہجے میں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ان کی مجبوری تھی۔ یہ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ میری ماں نے میرے علم میں لائے بغیر اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا تھا۔ اچھا ہی ہوا، وہ منظر سے ہٹ گیا۔ ورنہ اس کھراؤ میں اس کا بہت نقصان ہو جاتا..... اللہ کرے، وہ ایک شاعر کیرئیر بنا چکا ہو۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں، زارا بہت جذباتی ہو گئی تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ہلکے سے چیتھایا تو وہ آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرنے لگی۔ پھر تسلی دیر خاموشی کے بعد بولی۔

”میرے پاس سب کچھ ہے لیکن اس کی کمی مجھے آج شدت کے ساتھ محسوس ہوتی ہے بلکہ گزرتے دنوں کے ساتھ مزید بڑھ گئی ہے۔“

”رٹیکس، زارا“ میں نے اسے سہارا دیا مگر وہ اس حصار سے نہ نکل سکی۔ پھر جب تک ہم ایئر پورٹ نہیں پہنچی گئے، وہ وہی کی باتیں کرتی رہی اور میں سنتا رہا۔ فلم پینٹ کے کئی لوگ ہمیں لینے آئے ہوئے تھے، اس وقت زارا کچھ اور ہی تھی۔ مجھے یقین کرنا پڑا کہ وہ ایک کامیاب اداکارہ ہے۔ کچھ دیر پہلے کی زارا تاج نے کہاں غائب ہو چکی تھی۔ اسلام آباد میں وہ لوگ ایک بڑے سارے بنگلے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ باتیں کرتے اور

کافی پیٹے رات گہری ہوگئی، تب ہدایت کار نے جلدی سو جانے کو کہا تاکہ صبح جلد نکل سکیں۔

وہ دن بہت خوشگوار گزرا تھا۔ میں جب بیدار ہوا تو زارا میک اپ کر چکی تھی۔ وہ ایک پہاڑی لڑکی کے روپ میں تھی۔ زارا کو ایک ایسی پہاڑن لڑکی کا کردار ادا کرنا تھا جو بھیڑیں چراتی ہے۔ جب لوکیشن پر پہنچے تو معلوم ہوا، سین کیا ہے۔ زارا کو مختلف زاویوں سے بھیڑیں چراتے ہوئے دکھانا تھا۔ ہیرو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے گاؤں کا راستہ پوچھتا ہے، یہی چند مکالمے تھے۔ دوپہر تک وہ اپنے سین فلٹا کر فارغ ہو چکی تھی۔ یونٹ نے ابھی وہیں رہنا تھا جبکہ ہم اسلام آباد واپس آ گئے۔ کچھ دیر وہاں آرام کرنے کے بعد لاہور کے لیے چل دیئے۔ اس وقت رات بھیگ چلی تھی جب میں زارا کے ساتھ اس کے گھر پہنچا۔ میری گاڑی اسی کے ہاں کھڑی تھی۔ میں اسی وقت اپنے گھر جانا چاہا وہاں تھا کہ اس نے روک لیا۔

”سوٹا ہی ہے نا، ادھر سو جائیں۔ صبح آپ کو کھانا نہیں روکوں گی۔“ اس نے تھکے تھکے لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر کچھ دیر خوشگوار سوڈ میں باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم سو گئے۔

☆☆☆

اردو ٹائپنگ سروس

- اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔
- ☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر لیکن کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا
 - ☆ اپنی تحریر روٹن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا
 - ☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کر دیجئے یا
 - ☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جاسکتا ہے
- اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کر دیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

http://pktypist.com : ویب سائٹ

میں اس وقت ناشتے سے فارغ ہو کر نکلنے کے لیے پر تول رہا تھا کہ عامر بشیر کا فون آ گیا۔
”کہاں ہو یا ر؟“

”لاہور میں۔۔۔ تمہیں حسن نے نہیں بتایا؟“ میں نے خوشگوار لہجے میں کہا۔

”ہاں، بتایا تھا، کیا ابھی تک زارا کے پاس ہی ہو؟“ اس نے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

”بالکل وہیں ہوں اور اب یہاں سے نکل کر دفتر جاؤں گا، ویسے خیریت؟“ میں نے چوکتے ہوئے کہا۔

”نہیں، خیریت نہیں ہے۔ رات تمہارے گھر کو کسی نے آگ لگا دی ہے۔“ اس کا لہجہ خود سنجیدہ تھا۔

”اوہ۔۔۔ ا“ مجھے یکدم ایک جھٹکا سا لگا۔

”مجھے رات ہی پہ چلا تھا، چوکیدار نے فون کر کے اطلاع دی تھی۔ ان لوگوں نے چوکیدار کو بے ہوش کر دیا تھا اور پھر جب اسے ہوش آیا تو آگ بجڑی ہوئی تھی۔“

”چوکیدار کو تو کچھ نہیں ہوا؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”نہیں، ہر میں معمولی زخم ہے۔ وہاں اور ٹوک بھی آگئے تھے، فائر بریگیڈ بھی آ گیا تھا۔“

”آگ کتنی تیزی سے پھیلی؟“

”میں سمجھ گیا ہوں، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو۔ وہ پولیس کو معلوم ہو چکی ہے، خیر، کوئی بات نہیں۔ دوپہر کو ملتے ہیں پریس کلب میں۔“

”تقصان کتنا ہوا ہے؟ میرا مطلب۔۔۔“

”کچھ نہیں بچا، بس تم اسے بھول جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے خدا حافظ کہا اور فون بند کر دیا۔ سچی زارا بولی۔

”خیریت، شجاع؟“

”میرے گھر کو آگ لگا دی گئی ہے، یہ واقعہ اس گزرنے والی رات ہی کا ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اوہ، آئی سی۔۔۔“ یہ کہہ کر وہ کتنی ہی دیر تک گم سم رہی۔ جب میں نے جانے کے لیے اجازت چاہی تو وہ بولی۔

”مجھے یہ احساس تو ہے کہ شاید آپ میرے پاس رہنا گوارا نہ کریں لیکن ایک چھوٹی درخواست ہے کہ جب تک کوئی بندوبست نہ ہو

جائے، آپ میرے پاس۔۔۔“

”ڈونٹ وری، ذرا ہوسکتا ہے، میں تمہارے پاس ہی رہوں۔ اس وقت تو میں دفتر چلوں۔“

”میں انتظار کروں گی اور آپ کی راہ نکوں گی“ اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔

”اوکے، مجھے تمہارے غلوں پر یقین ہے۔“ یہ کہہ کر میں اٹھ کر باہر کی طرف چل دیا۔

میں وہاں اس لیے شفت ہوا تھا کہ یہاں زیادہ تحفظ ہے مگر چند دنوں میں ہی یہ ناخوشگوار واقعہ پیش آ گیا۔ انسان اپنے تحفظ کے لیے ہر

ممکن کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی حادثہ ہو جاتا ہے، شاید اسی کو مقدر کہتے ہیں۔ ایسے حادثات میں نقصان کبھی ناقابل تلافی ہوتا ہے اور کبھی انسان صاف بچ لکتا ہے۔ مجھے اپنے نقصان کا لالہ نہیں تھا لیکن اس واقعہ نے مجھے یہ باور کرا دیا تھا کہ میرے دشمن اس وقت تک یہ سلسلہ جاری رکھیں گے جب تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو جاتے لیکن ان کا مقصد کیا تھا؟ میں ابھی تک نہیں جان پایا تھا اور اب جان لینا میرے لیے بہت ضروری ہو گیا تھا۔ ایسی کیا بات ہو گئی تھی کہ جس کا عوض محض میری زندگی کا خاتمہ ہے؟

میں دفتر پہنچا تو حسن میرے انتظار میں تھا۔ اسے سب معلوم ہو چکا تھا۔ میٹنگ کے بعد مجھے ذرا تہائی ملی تو میں نے آصف کو فون کیا۔ میرے بیوکرتے ہی اس نے سمجھ گیا سے کہا۔

”میں شرمندہ ہوں، یار! کہ تمہارا گھر جل گیا۔ یہ میرے آدمی کی غلطی تھی کہ تمہارے اسلام آباد جانے کے باعث وہ تمہارے گھر کی نگرانی نہیں کر سکا۔“

”اوہ، تو تمہیں پتہ ہے؟“

”ہاں، پتہ ہے۔“

”لیکن میں نے تمہیں یہ بتانے کے لیے فون نہیں کیا بلکہ میں نے تو۔۔۔“

”مائی ڈیئر! ان میں سے کوئی ہاتھ لگ جاتا تو پتہ چل جانا تھا لیکن خیر، کوئی بات نہیں۔ اب لاہور آتا ہوا ابھی نہیں کہ میں سارے بدعواش نہ نکال سکوں۔ پتہ چل جائے گا، وہ کون ہے؟“

”ٹھیک ہے۔“

”بہر حال تم اپنا خیال رکھنا۔ پاس کچھ رکھتے بھی ہو یا سمجھوں کوئی شے؟“

”نہیں، ہے میرے پاس“ میں نے جھوٹ بول دیا۔

”کہاں ہے، مگر تو تمہارا جل گیا، کہیں اسلحہ جانا بھول تو نہیں گئے؟“

”ایسا نہیں ہے، یار! اس بس چتا ہوں اس سے۔“ میں نے صاف کہہ دیا۔

”خیر، ضرورت محسوس ہو تو بلا مجھ کو فون کرو بنا۔ دس منٹ میں تم تک پہنچ جائے گا۔“

”اچھا، اوکے، اللہ حافظ!“ میں نے مزید بات سے بچنے کے لیے جلدی سے کہا اور پھر فون بند کر دیا۔ ریسورڈر کھ کر میں نے کرسی سے ٹک لگائی تو ماریہ کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے دیکھتے ہوئے خوبصورت گال اور بڑی بڑی آنکھیں بڑی قائل تھیں، پتلے پتلے ہونٹوں پر اگر مسکراہٹ ہو تو دل موہ لینے والے تھے مگر وہاں ایک ایسا تاثر تھا جسے میں کوئی نام نہیں دے سکا۔ وہ مجھ سے آپ سے جدا لگ رہی تھی۔ وہ بظاہر میری ہی طرف دیکھ رہی تھی لیکن میرے دیکھنے کے باوجود اس کا تاثر نہیں بدلتا تھا، جیسے بے جان مورتی ہو۔ میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ کتنے ہی لمبے پونجی بیت گئے۔ اچانک مجھے اسے چھیڑنے کا خیال سوجھا اس لیے اونچی آواز میں حسن کو حیا طلب کرتے ہوئے بولا۔

”یار! عجیب بھالیاتی حسن سے عاری شخص ہوتم، کل کے ٹوری رووا دتی نہیں مئی تم نے؟“

”میں ذرا یہ کام ختم کر لوں تو پھر ذرا چسکے سے سنوں گا نا، یارا! آخر تم ایک ہیروئن کے ساتھ دو راتیں اور ایک دن گزار چکے ہو۔ مجھے سرخیاں نہیں، پوری خبر سنی ہے“ حسن سب کچھ سمجھتے ہوئے چور نظروں سے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”چلو ٹھیک، میرا دل تمہیں سنانے کو چاہ رہا ہے۔“

”اتنا رتھیں وقت گزارا، جان جی؟“ حسن نے مصنوعی حیرت سے کہا تو میں دل ہی دل میں اس کی حیرت پر مسکرا دیا۔ ماریہ غصے میں اٹھی اور پورنٹھ روم سے نکلتی چلی گئی، تبھی میرا تہبہ نکل گیا۔

پریس کلب میں بچ پریش، عامر اور حسن تینوں تھے۔ اس دوران عامر نے بتایا کہ پولیس نے ابتدائی رپورٹ لکھی ہے اور یقیناً اپنی تفتیش شروع کر دیں گے، اس ضمن میں وہ مجھے بھی ملیں گے۔ میری طرح وہ لوگ بھی اندھیرے میں تھے۔ میں نے انہیں آصف چوہدری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ آصف سے میرا تعلق پرانا تھا اور میری موجودہ زندگی میں جو لوگ میرے ارد گرد تھے، ان میں تقریباً ایسے لوگ موجود تھے جو میرے ماضی کے بارے میں نہیں جانتے تھے۔ حسن اور عامر بھی میرے ایسے ہی دوستوں میں سے تھے۔ ظاہر ہے، آصف چوہدری کا نام آجانے سے مجھے بھر بہت کچھ بتانا پڑتا۔ کافی دیر تک ہم یونہی ٹاک ٹوئیاں مارتے رہے مگر ہمارے ہاتھ کوئی سرانہ آیا۔ میری رہائش بارے میں عامر نے بندوبست کر دیا تھا۔ وہ قلیت ابھی خالی تھا، وہ چاہتا تھا کہ وہ قلیت فرسٹڈ ہو جائے تو میں وہاں جاؤں اور اس دوران میں اس کے ہاں جا کر رہوں۔

”یار! میں بہت دیر سے آتا ہوں، آپ لوگ ڈسٹرب ہو گئے۔“ میں نے اسے باور کرایا۔

”کچھ نہیں ہوتا، انکی کسی خالی ہے۔ ایک بندہ تمہارے لیے موجود ہے گا، پھر چوکیدار ہے۔“ عامر نے لمحوں میں مسئلہ حل کر دیا۔ میں اس کے غلطیوں سے بے حد متاثر تھا۔ اس کی تمام تر باتوں سے میں یہی سمجھا کہ وہ قلیت میں آگ لگنے کا قصور وار خود کو سمجھ رہا ہے۔ میں نے اس کے اس احساس کو ختم کرنے کی کوشش کی، پھر کافی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم اٹھ گئے۔

کلی ہار مجھے بے گھر ہونے کا احساس ہوا تھا۔ شام ڈھلے پر ہم نے اپنے گھونٹوں کی جانب لوٹے ہیں، کتنا اطمینان ہوتا ہے کہ میرے پاس رہنے کا ٹھکانا ہے۔ اس دن نہیں تھا تو عجیب بے چینی میرے اندر در آئی تھی۔ وہ کیسے لوگ ہوں گے جن کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہوتا؟ اس سوچ نے یوں سلسلہ ہاندھا تو پتہ نہیں کہاں کہاں کے خیال اور کن کن لوگوں کا درصت آیا۔ میں نے ذہن کو جمع کیا اور اپنے آنے والے ایڈیشن کے بارے میں سوچنے لگا۔ کل مجھے اس کی ڈی ریٹھی۔ میں انہی خیالوں میں تھا کہ میرا سیل بج اٹھا۔ میں نے فہرہ دیکھے تو وہ اجنبی سے تھے۔ میں نے فون آن کر کے ”ہیلو“ کہا تو دوسری طرف نسوانی آواز میں کہا گیا۔

”سیٹھ افراسیاب بات کریں گے۔ ہولڈ آن، پلیز“ چند لمحوں بعد سیٹھ افراسیاب کی بھاری آواز میرے کانوں سے نکرائی۔ ”ہاں جی، شجاع صاحب! کیسے ہیں آپ؟“

”ٹھیک ہوں، اللہ کا شکر ہے۔“ میں نے مختاطہ انداز میں حتی الامکان اپنا لہجہ خوشگوار بنالیا۔

”بڑی بات ہے جو آپ میں اتنا حوصلہ ہے، بہت کم لوگ ہوتے ہیں جو گھر جل جانے کے باوجود یوں نارمل ہوں۔“ اس نے سرسراتے ہوئے انداز میں کہا تو میرا ہاتھ ٹھنک گیا۔ سیٹھا افراسیاب کو معلوم ہو گیا ہے کہ میرا گھر جل گیا ہے، اس نے بات کی شروعات ہی میں یہ حوالہ دے کر کیا ثابت کرنا چاہا ہے؟ اچانک ہی میرے ذہن میں یہ سوال ابھرا آئے۔ اسی لمحے مجھے یہ خیال بھی آیا کہ سیٹھا افراسیاب نے مجھے کس مقصد کے لیے فون کیا ہے؟ ”کس سوچ میں کھو گئے؟“ اس نے کہا تو میں بڑے نارمل انداز میں بولا۔

”میں آپ کے خریدے کچھ کہنے کا انتظار کر رہا تھا۔“

”او۔۔۔ اچھا، خیر آج شام کیا کر رہے ہیں آپ؟“

”کچھ نہیں، وہی معمول کے مطابق سٹوڈیو جاؤں گا۔“

”پھر ایسا کیجیے کہ سٹوڈیو جانے سے قبل اگر آپ کے پاس وقت ہو تو مجھے مل لیں۔ آپ سے کچھ باتیں کرنا ہیں اور ہاں، یہ مت کہنے گا کہ فون پر ہی کہہ دوں۔“

”آپ مجھے بتائیں، کہاں اور کس وقت ملتا ہے۔ میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”میں اپنے کچھ دوستوں کو ڈر دے رہا ہوں، آپ تشریف لے آئیں تو محفل کی رونق اور بڑھ جائے گی۔“ سیٹھا کے اس طرح کہنے پر نجانے کیوں مجھے اس کے لہجے میں چھپا طنز محسوس ہو گیا اس لیے میں نے اچھتے ہوئے بظاہر خوشنوار لہجے میں ہی کہا۔

”سواری، سیٹھا صاحب! میں ڈنر کسی اور کے ساتھ کروں گا۔ اس سے پہلے۔۔۔“

”اوہ، ذرا اچھی لڑکی ہے۔ اس کے مقابلے میں میری کبھی آپ کو کیا مزہ دے گی۔ خیر، آپ اگر چاہیں تو وہیں آ جائیں۔ ڈنر نہ لیں، ویسے ہی کچھ وقت مجھے دے دیں۔“ اس کا انداز اور لہجہ وہی تھا جس سے مجھے بہر حال بے چینی ہونے لگی۔ کیا وہ میرے بارے میں اتنا جانتا ہے کہ اسے یہ تک معلوم ہے کہ میری ذرا کے ساتھ کبھی ہے؟ تب میں نے فوراً کہا۔

”جی، میں حاضر ہو جاؤں گا۔“ اس نے مجھے ریسیورٹ کا نام اور وقت بتایا، پھر الوداعی کلمات کے بعد فون بند کر دیا۔ اسی لمحے سے میرے دماغ میں یہ سوال ٹھوکریں مارنے لگا کہ سیٹھا افراسیاب میرے بارے میں معلومات کیوں رکھتا ہے اور وہ مجھ سے آخر کیوں ملنا چاہتا ہے؟ میں نے ہر پہلو پر سوچا مگر مجھے کچھ سمجھ نہ آ سکی۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ سیٹھا افراسیاب سے میری ملاقات میڈیم ٹیلیم کے گھر پارٹی میں ہوئی تھی، وہاں اس نے بڑی بھل سی گفتگو کی تھی۔ جس پر عامر بشیر نے مجھ سے پوچھا کہ ہمارے درمیان کیا باتیں ہوئیں ہیں۔ میں خود اس کی بھل باتیں نہیں سمجھ سکا تھا تو عامر کو کیا بتاتا؟ پھر اسی رات جب میں تنگ شہوانی کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا، جب مجھ پر قحطانہ حملہ ہوا تھا۔ حملے کا اندازہ مہنگی آمیز تھا۔ اس کے بعد ایک سلسلہ چل نکلا۔ سیٹھا افراسیاب کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے اس کے بارے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں، پھر وہ میرے بارے میں اتنی معلومات کیوں رکھتا ہے؟ ایسے ہی بے شمار سوال میرے ذہن میں آتے چلے گئے۔ میں نے اپنے ذہن کو مزید نہیں کھپایا بلکہ اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب مجھے اس سے ایک ریسیورٹ میں ملنا تھا۔

میں وقت پر وہاں پہنچ گیا۔ ڈائیننگ ہال کے ایک گوشے میں وہ دو تین لوگوں کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا اور وہی نوخیزی لڑکی جسے میں نے پہلے بھی اس کے ساتھ دیکھا تھا، اب بھی وہاں موجود تھی۔ وہ شاید میری ہی راویک رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھ آئی۔ وہ دور سے ہی مسکراتی ہوئی آ رہی تھی، میرے قریب آ کر بولی۔

”بہت خوب، آپ تو وقت کے بہت پابند ہیں“ پھر ساتھ ہی ایک ادا سے کہا۔ ”آپ نے ایک اور میز کی طرف اشارہ کیا تو میں ادھر بڑھ گیا۔ وہ میرے سامنے بیٹھ گئی۔ تب میں نے غور سے دیکھا، وہ خاصی سچان خیر تھی، اس پر اس کے بیٹھنے کا انداز قیامت ڈھار ہوا تھا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے دوران اس نے میرے ساتھ سوٹ ڈرنک فٹم کی اور پھر اٹھ گئی۔ میں نے کئی بار سیٹھ افراسیاب کی طرف دیکھا۔ اس کے ساتھ بیٹھے لوگ قطعاً کاروباری نہیں تھے، میں بہر حال کاروباری لوگوں کو جانتا تھا۔ ہم نے سوٹ ڈرنک فٹم کیا ہی تھا کہ سیٹھ افراسیاب اٹھ کر میرے پاس آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

”ڈارنگ! تم ذرا مہمانوں کو کبھی دو، میں ان سے بات کر لوں۔“

ہم میں کچھ دیر ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں۔ وہ میرے گھر مل جانے کے بارے میں پوچھتا رہا، پھر اس نے وہی اہل باتیں شروع کر دیں۔

”نشیمن اجڑ جائے تو کوئی بات نہیں، نیا بسا لیا جاتا ہے مگر نکلے اکٹھے کرنے میں خاصا وقت لگتا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو میں ڈھیر سارے نکلے آپ کو دے سکتا ہوں۔“

”سیٹھ صاحب! جہاں تک میں سمجھتا ہوں، آپ یہ نکلے مجھے یونہی نہیں دیں گے۔“

”ہاں! آپ خاصے بھگدار ہو، آپ کی ذہانت کا تو میں پہلے ہی سے معترف ہوں۔ آپ کی ڈھیر ساری باتیں مجھ تک پہلے ہی پہنچتی رہتی ہیں۔“

”مجھے نہیں معلوم کہ آپ مجھ میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہیں؟“

”آپ کی مصمصیت مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔ آج تو آپ کی شخصیت کے بہت سارے پہلو میرے سامنے آ رہے ہیں۔ آپ با حوصلہ ہیں، پراعتماد اور مصمص بھی ہیں، خیر، کہتے ہیں کہ شیر کی کچھار میں یا سانپ کے گل میں ہاتھ نہیں ڈالنا چاہیے۔“

”میں سمجھتا ہوں، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں؟“

”نہ، ایسے نہیں۔ آپ کو تو یہ کہنا چاہیے تھا کہ جب کوئی شیر کی کچھار میں گھس جائے یا سانپ کے گل میں ہاتھ ڈال دے تو پھر کیا ہو سکتا ہے؟“

”اس نے پوری سمجیدگی سے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھتے ہوئے کہا۔ یہ اس کی سمجیدگی ہی تھی جو میں اس کی جہل باتیں بھی بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ ضرور اشارے کنائے میں مجھے کوئی بات سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اب جبکہ میرے پاس اس کی کسی بات کا کوئی ریفرنس نہیں تھا تو میں اس کی بات کس طرح سمجھ جاتا؟ یقیناً کوئی بات تھی جو وہ مجھ سے کہنا چاہ رہا تھا لیکن کہہ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یہ چاہیے تھا کہ میں اس کی بات سمجھنے کی

کوشش کروں اس لیے میں نے کہا۔

”جلیں، میں یہی پوچھ رہا ہوں آپ سے؟“

”تو، میرے پیارے! اس کا جواب بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اس طرح کرنے میں سوائے موت کے اور کچھ نہیں ملتا“ اس نے اجماعی سرود لہجے میں کہا تو میری ریزہ کی بڑی میں سناہٹ دوڑ گئی۔ کبھی مجھ پر قاتلانہ حملے سینٹھ افراسیاب ہی تو نہیں کروا رہا؟ اس وقت شاید میں پھٹ پڑتا لیکن میں نے اجماعی ضبط سے کام لے کر سکرآتے ہوئے کہا۔

”تو ٹھیک ہے، آپ صحیح کہہ رہے ہیں“

”بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ شیر یا سانپ دوستی بھی کر لیتے ہیں۔ خیر، سوچ لو۔ پھر مجھے اس کا جواب دے دیجئے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنی بات کا اثر میرے چہرے پر دیکھنے کی کوشش کی۔ میں تیزی سے کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ چند لمحوں کوئی جواب نہ پا کر اٹھ کھڑا ہوا تو مجھے بھی اٹھنا پڑا۔ ہاتھ ملاتے ہوئے اس نے کہا۔

”اگر آپ ذرا لیتے تو اچھا تھا خیر، اگلی ملاقات میں ہم ڈنر ضرور لیں گے، اوکے!“ ایسا کہتے ہوئے اس کا لہجہ اکڑا ہوا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں کی اور واپسی کے لیے مڑ گیا۔ سینٹھ افراسیاب کی باتوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا تھا، ایک بیچانی کیفیت میرے اندر طاری ہو گئی تھی۔ اگر کبھی قاتلانہ حملے کروا رہا ہے تو کس مقصد کے لیے؟ یہی بات اندھیرے میں تھی اور میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ میں بے خیالی میں یہی سوچتا اور ازانے کی طرف بڑھ گیا تھا۔ میں گاڑی میں بیٹھا تو سینٹھ افراسیاب کی باتیں میرے دماغ میں چلنے لگیں۔ وہ ایسا کیا چاہتا ہے کہ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی تک دے بیٹھا ہے۔ مجھے یہ کافی حد تک یقین ہو گیا تھا کہ یہ دھمکی آمیز قاتلانہ حملے سینٹھ افراسیاب ہی کی وجہ سے ہو رہے ہیں۔ لیکن کیوں؟ اس کی وجہ بھی تو سامنے آنی چاہیے۔ اس نے حملے کروا کر مجھے دھمکانے اور ڈرانے کی کوشش کی۔ پھر جب اس کا اثر نہ ہوتے دیکھا تو اب کھل کر سامنے آ گیا۔ مگر بات ہنوز وہیں تھی کہ کیوں، وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے؟ وہ صاف بھی نہیں بتا رہا تھا۔ مجھے تو اسی وقت پہ چلنا تھا جب وہ کھل کر مجھ سے بات کرتا۔ یہ بات کنفرم تھی کہ وہ مجھ سے کچھ چاہتا ہے۔ کیا چاہتا ہے، میں اس بابت کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ اس نے جس انداز سے میرے ساتھ بات کی تھی وہ بہر حال ذلت آمیز تھی۔ یہ احساس میرے اندر ٹھوکریں مار رہا تھا۔ وہ پوری طرح میرے سامنے نہیں کھلا تھا۔ میرے ضبط کر جانے کی وجہ بھی یہی تھی کہ وہ مجھ پر کھل جائے۔ پھر اس کے بعد سینٹھ افراسیاب کو یہ بتانا ضروری تھا کہ وہ مجھ پر حملے کروا کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکا ہے۔

میں اس وقت آہستہ روی سے گاڑی چلاتا ہوا مال سے گزر رہا تھا کہ میرا فون بج اٹھا، دوسری طرف ذرا تھی۔ اس لمحے اس کی آواز میرا سواؤ خوشگوار کر گئی۔

”کہاں ہیں آپ؟“ اس کے لہجے میں شوقی تھی۔

”سڑکوں پر آوارہ گردی کر رہا ہوں۔“ میں نے بھی شوقی سے کہا۔

”اوائے ہوئے، جواز بردست شوق فرما رہے ہیں۔“ اس نے تہقیر لگاتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، وہ بولی۔

”میں نے پوچھا ہے کہ آپ کہاں ہیں؟“

”خیریت؟“ میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”ہاں، خیریت ہے۔ آپ بتائیں نا، جلدی سے“ وہ ہمدی سے لہجے میں بولی تو میں نے بتا دیا۔

”میں اس وقت گلبرگ مین مارکیٹ میں ہوں، آپ ادھر آ جائیں۔“ اس نے مجھے لوکیشن سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ مت پوچھئے گا کہ کیوں؟ بس آپ آ جائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے اپنا فون جیب میں رکھا اور اگلے یوٹرن سے گاڑی موڑ لی۔ تھکی میں نے سوچا کہ زارا کی دلچسپی مجھ میں ضرورت سے زیادہ ہی بڑھ رہی ہے۔ اس نے مجھے جو کہانی سنانی تھی، وہ بھی میرے حلق سے نہیں اتری تھی مگر ایک بات ایسی تھی جس کے باعث وہ مجھے اچھی لگتی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس سے مل کر خوشگواریت کا ایک احساس رگ و پے میں سرایت کر جاتا تھا۔ وہ اجنبی ہونے کے باوجود اپنی اپنی لگتی تھی۔ میں نے سوچا کہ جس طرح کئی لوگ ذراگی میں آنے کے بعد نکل جاتے ہیں، ان میں یہ بھی ایک سہی۔ اب پوچھیں، یہ فوراً ہی نکل جانے والی تھی یا پھر کچھ دیر بعد؟ اس وقت بھی زارا کا فون کچھ ایسا ہی تاثر دے گیا تھا۔ میں جو سینما فریسیاب کے باعث لگا ہوا تھا، ان سوچوں نے میرے ذہن پر اثر انداز ہونا چاہا تو زارا کی باتیں تپتے ہوئے سحر میں بادل کا ٹکڑا ثابت ہوئیں۔ میں اس وقت خالی الذہن ہو چکا تھا۔ میں زارا کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچا تو اس کا ڈرائیور گاڑی کے قریب کھڑا تھا، مجھے دیکھتے ہی میری طرف بڑھا۔

”لائیں، صاحب جی! گاڑی مجھے دے دیں، میں پارک کرویتا ہوں، میڈم وہ سامنے والی شاپ میں ہیں۔“ اس نے اگلی کے اشارے سے ایک شاپنگ سنٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے چابی گاڑی میں ہی رہنے دی اور اس شاپنگ سنٹر کی طرف بڑھ گیا، جلدی وہ مجھے نظر آگئی۔ اس نے مجھے خوشگوار حیرت سے دیکھا، پھر خوشی سے بولی۔

”آپ اتنی جلدی آ جائیں گے، مجھے توقع نہیں تھی۔“

”آ تو میں گیا ہوں لیکن بلا یا کس لیے ہے؟“ میں نے پوچھا تو وہ ہنس دی، اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔

”مجھے آپ کے ساتھ میں الجھن ہو رہی تھی۔ میں نے آپ کے لیے کپڑے خریدنا تھا اور دوسری استعمال کی چیزیں۔“

”اوه تو تمہیں میرا اس قدر خیال ہے۔“ میں نے خوشگوار حیرت سے کہا۔

”جی“ پھر آرزو لہجے میں بولی۔ ”مگر عمل جانے کے بعد اب آپ کو سننے سرے سے چیزیں تو خریدنا ہیں استعمال کی۔“

”وہ میں۔۔۔ خیر چلو خریدو، جو خریدنا ہے۔“ میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔ حقیقت یہی تھی کہ مجھے اب اپنے استعمال کی چیزیں نئے

سرے سے تو خریدنا ہی تھیں۔ میرے لاشعور میں تھا کہ جیسے ہی جگہ جاؤں گا تو سب لے لوں گا۔ اس کا احساس زارا نے کیا تو میرے دل میں اس کے لیے اک خاص قسم کا جذبہ ابھرا یا جسے میں کوئی نام نہیں دے پایا تھا۔ کافی دیر بعد ڈیروں شاپنگ بیگ اٹھائے ہم وہاں سے نکلے۔ ڈرائیور زارا کی گاڑی لے آیا تو اس نے سب کچھ اس میں رکھ دیا، پھر وہ ڈرائیورنگ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”آؤ، شجاع۔!“

”مگر ابھی تو مجھے سٹوڈیو جانا ہے۔“

”مجھے بھی جانا ہے لیکن مگر سے ہو کر چلتے ہیں۔“ پھر پلٹ کر ڈرائیور سے پوچھا۔ ”کوئی فون؟“

”جی، دو مرتبہ مسکری صاحب پوچھ چکے ہیں۔“

”اب تم ایسا کرو کہ صاحب کی گاڑی لے کر گھر آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر اس نے گاڑی کا گینر لگایا اور چل دی۔ سٹوڈیو پہنچنے سے ذرا پہلے میں نے

زارا سے کہا۔

”مجھے نہیں اتار دو، میں پیدل آتا ہوں۔“

”اگر آپ کو میرے ساتھ دیکھ لیا گیا تو کیا قیامت آجائے گی؟“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

”سمجھا کر؟“ یہ کہہ کر میں نے دوبارہ کہا۔ ”گاڑی روک دو۔“ اس نے گاڑی روک دی اور میں پیدل ہی سٹوڈیو چلا گیا۔ اس رات سٹوڈیو

میں خاصی روٹی تھی۔ اسے دلوں میں اجنبیت ختم ہو چکی تھی۔ میں کئی سارے لوگوں سے ملتا ہوا ایک ایسے سیٹ پر جا پہنچا جہاں ہا کی شوک جلی رہی تھی، شاید کوئی گانا فلمایا جا رہا تھا کیونکہ وہ ڈانس ڈانس میٹر کے ساتھ ڈانس کی ریہرسل کر رہی تھی وہیں اچانک میری نظر ندیم پر پڑی، وہ میری طرف دیکھ کر ہنس رہا تھا۔

”ارے تم کیسے۔۔۔ تمہیں تو آرام کرنا چاہیے تھا، یہاں کیسے برا بھلا ہو.....؟“ میں نے ہا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، جو میری طرف

دیکھ رہی تھی۔

”آپ بے فکر ہو جائیں، اب یہ ہا میری ڈیوٹی میں ہے۔ اس غمبخت کو اس قدر۔۔۔“

”ایسا نہیں کہتے مگر کوئی کمینہ بن دکھائے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا جواب اسی طرح دیا جائے، اور بہت سارے طریقے ہوتے

ہیں۔“

”بھائی! آپ اس دنیا کی زبان نہیں سمجھتے، یہاں کچھ اور طرح سے بات کی جاتی ہے۔“

”جگہ یاد دینا کوئی بھی ہو لیکن تم تو تم ہونا! تم برے کیوں بننے ہو۔ بہت وقت پڑا ہے، تم خواہ مخواہ اپنا دامخ خراب نہ کرو آؤ، چلتے ہیں ذرا

کھلی ہوا میں۔“ میں نے اسے ساتھ لیتے ہوئے کہا۔ ابھی ہم نے چند قدم ہی اٹھائے تھے کہ ایک شخص تیزی سے آیا اور بولا۔

”وہ آپ کو ہاتھی بلا رہی ہیں“ اس کے اس طرح کہنے پر میں رک گیا۔ میں نے مڑ کر ہا کی طرف دیکھا، وہ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

تبھی میں نے اس شخص سے کہا۔

”اسے کہو کہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ اگر کوئی بات کرتا ہے تو دفتر میں آجائے گیا رہ بجے کے بعد۔“ یہ کہہ کر میں چل دیا۔ اس

رات میں ڈیڑھ سارے لوگوں سے ملا۔ ان میں صادق مگر بھی تھا۔ وہاں خاصا وقت گزر گیا، رات جب گہری ہو چلی تو زارا نے مجھے فون کیا۔

”کہاں تشریف رکھتے ہیں؟“

”میں آپ کے انتظار میں آئیں فرش راہ کیے بیٹھا ہوں۔“

”تو حضور! ہماری آمد ہے۔ پارکنگ کے قریب پہنچے۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

صبح ناشتے کے بعد میں جائے پیتے ہوئے اخبار دیکھ رہا تھا کہ عامر بشیر کا فون آ گیا، چند ادھر ادھر کی باتوں کے بعد یوں۔

”رات تم سینٹرا فریاب سے ملے تھے؟“

”ہاں، ملا تھا۔“ میں نے کہا اور پھر ایک خیال کے تحت فوراً ہی پوچھ لیا۔ ”لیکن تمہیں کیسے خبر۔۔۔ معلوم ہوتا ہے، میرے بارے میں کچھ

زیادہ ہی خبریں رکھنے لگے ہو؟“

”یار! بات یہ نہیں ہے۔ تم مجھے ملو لیکن تمہاری میں، تم سے ڈیویر ساری باتیں کرنی ہیں۔ میں تمہیں دوبارہ فون کروں گا تم دفتر میں ہی رہنا“

اس کے لہجے میں گہری سنجیدگی تھی۔

”ٹھیک ہے، میں ادھر ہی رہوں گا اور کوئی خاص بات؟“ میں نے پوچھا۔

”کوئی نہیں، بس اپنا خیال رکھنا“ پھر ہلکے سے قہقہے کے ساتھ بولا۔ ”مگر زارا کے معاملے میں نہیں، لگتا ہے، خاصی دوستی ہو گئی ہے؟“

”یہ تو ہے خبر، ملتے ہیں۔“ میں نے فون بند کر دیا اور گھڑی دیکھی تو دفتر کا وقت ہو چلا تھا۔ زارا ابھی تک سو رہی تھی۔ میں نے اس کا انتظار

نہیں کیا اور دفتر کے لیے نکل گیا۔

میٹنگ کے بعد، میں نے سگریٹ سلگایا اور حسن سے کہا۔

”یار! چائے تو منگواؤ لیکن ہوڈا مارا یہ جیسی تلخ اور کڑوی۔“ میں نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا تھا۔ اس نے چونک کر میری

طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر حیرت تھی، میں نے پہلی بار اس سے یوں مذاق کیا تھا۔

”نہیں، جان جی! ایسی چائے یہاں نہیں ملتی۔“ حسن نے ہوری سنجیدگی سے کہا جو معمولی تھی۔

”تو پھر کیسی ملتی ہے؟“ میں نے ماریہ کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا۔

”زارا کی طرح میٹھی اور جاندار چائے مل سکتی ہے، جان جی!“ یہ جملہ کہتے ہوئے حسن کی مسکراہٹ بندرک سکی۔

”بہت خدمت کرنے والی عورت ہے، یار!“ یہ کہتے ہوئے میں نے پھر ماریہ کی جانب دیکھا۔

”خوش قسمت ہوتی حسین لڑکی تمہاری خدمت کر رہی ہے۔“ حسن نے شوفی سے کہا۔

”اپنی اپنی قسمت کی بات ہے۔“ میں نے کہا

”ذرا حق کے رہنا اس سے، کہیں اس کے عشق میں۔۔۔۔۔“ حسن کچھ اور بھی کہتا لیکن درمیان میں ماریہ بول اٹھی۔

”عشق مرد کرتے ہیں۔ اس سے پوچھ لو، کیا یہ واقعی ہی مرد ہے؟“ اس کے لہجے میں آگ تھی اور جو لفظ اس نے کہے تھے، آگ لگا دینے

والے تھے۔ اس وقت دو چار لوگ ہی ارد گرد بیٹھے ہوئے تھے۔ چاہے تو یہ تھا کہ میں بھڑک اٹھتا لیکن میں نے نہایت تحمل سے کہا۔

”اور عورت عشق کرتی ہے، اس کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”عورت کی تو فطرت میں ہی وفا ہے اور جس طرح کا عشق عورت کر سکتی ہے، مرد اس تک کبھی نہیں پہنچ سکتا۔“

”غور کرو، تمہاری اپنی بات میں ہی تضاد ہے۔ باقی میں مردوں یا نہیں، ماریہ! تم سے بہتر کون جان سکتا ہے۔“ میں نے دھیرے سے کہا تو وہ چیخ مچی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا، پھر اس نے کوئی بات نہیں کی۔ سر جھکائے دو کاغذوں سے اٹھتی رہی۔ کتنے ہی لمحے خاموشی نے گل لے لیے، تبھی حسن نے سرگوشی میں کہا۔

”آج شام کہیں نہیں جانا، نئے اخبار کے مالک کے ساتھ میٹنگ ہے“

”قارانی کا کیا کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”معلوم یہ ہوا ہے کہ مالک اسے بنانے کی فکر میں ہیں مگر کوئی قاعدہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے؟“

”کہیں نہیں۔۔۔“ میں نے فکر مندی سے پوچھا۔

”نہیں، ابھی معلوم نہیں ہوا لیکن ہو سکتا ہے، آج رات انہیں معلوم ہو جائے۔“ حسن نے اجمہائی سمجیدگی سے کہا، اسی لمحے میرے سامنے پڑا فون بج اٹھا۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے ریسیور اٹھا لیا۔ دوسری طرف ہاتھی۔ میں نے اجمہائی سمجیدگی سے کہا۔

”ہلو ہلو، بات کریں.....؟“

”دیکھیں، میں آپ سے ملنا چاہ رہی ہوں۔ دفتر میں کیا ضروری ہے، آپ لہجے میرے ساتھ کیوں نہیں لیتے؟“

”بی بی! ملنا تو چاہ رہی ہے، مجھے ضرورت نہیں ہے جو میں نے کہا ہے، اس پر عمل کرو ورنہ میرا وقت ضائع مت کرو“ میں نے ہنس میں کہا اور ریسیور کرینل پر رکھ دیا۔

”کون تھی، جان ہی! اتنا قصہ؟“ حسن نے پوچھا تو میں نے روانی میں کہہ دیا۔

”ہاتھی، مجھ سے ملنا چاہ رہی ہے۔“

”طل لیا کرو نا، بار! ایک خوبصورت عورت تم سے ملنا چاہ رہی ہے تو اتنا غرور کس لیے، جان ہی؟“ حسن نے ماریہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن اس وقت میں اسے بھینرنے کے موڈ میں نہیں تھا اس لیے کوئی بات نہیں کی۔ مجھے اس وقت عامر بشیر کے فون کا انتظار تھا۔ اس کا فون تو نہ آیا لیکن کچھ دیر بعد وہ خود آ گیا، وہ بیٹھا نہیں بلکہ کھڑے کھڑے ہی بولا۔

”اچھا ہوا حسن، تم نہیں ہو آؤ، چلیں۔“

”کہاں؟“ حسن نے پوچھا۔

”شجاع کا تیا گھر دکھانے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ اس کا ساتھ نہیں دے دیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا کہ وہ شدید قسم کے ہاؤ میں ہے۔

میں نے کوئی بات نہیں کی اور ہم چل دیئے۔ ہم نے اپنی گاڑیاں وہیں رہنے دیں اور حاصر کے ساتھ بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد من آباد میں پہلے گول پکر کے نزدیک ایک طرف مڑ گئے اور ایک ڈرا سے پرانے طرز کی لیکن تازہ رنگ دروغن والی کوشی کے سامنے گاڑی جا روکی۔ راستے میں حاصر نے تاد یا تھا کہ اس گھر کے دو پورشن ہیں۔ اوپر والے پورشن میں ایک اویسٹر عورت مسز خان رہتی ہیں۔ جن کا ایک بیٹا ہے اور بہو، ان کے دو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ نیچے والا پورشن ان کی ضرورت سے زائد ہے، پہلے بھی کرائے پر تھا اور اس میں کوئی فیملی رہتی تھی۔ چونکہ یہ ان کے بہت قریبی لوگوں میں سے ہیں۔ اس لیے میرے رہنے پر رضامند ہو گئے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد گیٹ کھول دیا گیا اور ہم گاڑی سمیت اندر چلے گئے۔ مجھے پہلی نظر میں وہ گھر اچھا لگا تھا۔ بالکل پرسکون، بڑا سا ڈرائنگ روم میں چابیٹھے۔ مسز خان کا بیٹا ابراہیم بھی گھر پر تھا۔ ان سے تعارف کروا کر مکان کی پسندیدگی کے بارے میں بتایا پھر معاملہ طے پا گیا تو ابراہیم نے کہا۔

”حاصر بھائی! میں چلتا ہوں، محض دو گھنٹے کی چھٹی لے کر آیا تھا۔“

”ہاں ٹھیک ہے، تم جاؤ۔ ہم کچھ دیر یہاں بیٹھیں گے۔“ حاصر نے کہا تو وہ چلا گیا۔

”اب یہاں کیا کام، جان جی؟“ حسن نے حیرت سے پوچھا۔

”ہے نا۔۔۔ کام۔۔۔ میں نے بات کرنی ہے۔ آؤ، نیچے چلے ہیں۔“ حاصر نے بے چینی سے کہا تو میں نے سنجیدگی سے حاصر کی حالت کے بارے میں سوچا۔ میں نے کبھی بھی اسے اس طرح مضطرب نہیں دیکھا تھا۔ نیچے ایک کمرے میں صوف اور کرسیاں پڑی تھیں۔ ہم ان پر جا بیٹھے تو میں نے حاصر کی حالت کا احساس کرتے ہوئے کہا۔

”حاصر! تمہارے من میں جو کچھ بھی ہے، کہہ دو۔ جتنی بڑی بات بھی ہے، بولو۔“

”یار! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے“ اس نے ڈرتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”موت سے ڈرتے ہو، گولی لگ جائے گی کیا؟“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ بولا۔

”میں موت سے نہیں ڈرتا لیکن مجھے کچھ اور ڈر ہیں۔ وہ کہہ کر وہ بات جو بھی ہو، پہلے اس کی اچھی طرح تصدیق کر لینا۔ میری نیت پر شک مت کرنا۔“

”اوہ تو یہ بات ہے۔ بولو، لیکن شرط یہی ہے کہ بالکل سچ کہنا۔“

”سچ ہی تو کہنے جا رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ جیسے بات کہنے کی بہت کر رہا ہو، پھر دھیرے سے بولا۔ ”مجھے سمجھ نہیں آ رہی کہ میں

بات کہاں سے شروع کروں لیکن خیر، تم لوگوں کو پتہ ہے کہ عورت اور وہ بھی خوبصورت عورت میری کمزوری ہے۔ میری ذہنی میں نجانے کتنی آئیں اور کتنی گئیں۔ جس طرح شراب پینے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ یہ کہاں سے ملے گی، اسی طرح مجھے بھی سمجھ آتی گئی کہ میرے مطلب کی لڑکیاں کہاں مل سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک ذریعہ فوریہ گل نامی ایک عورت ہے۔ بھابھوہ ایک بیوٹی پارلر چلاتی ہے لیکن اس کا دھندہ کچھ اور ہے۔ اس کے پاس ایک ایسی لڑکی آئی جسے دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا۔ میں اس کی بڑی سے بڑی قیمت دے دینا چاہتا تھا لیکن مجھ سے پہلے ہی وہ بیٹھا افراسیاب کے پہلو میں

جانچنی۔ اس لڑکی سے وہیں فوزیہ کے گھر میری کئی ملاقاتیں ہوئیں تھیں۔ میں اس کی آنکھوں میں، اس کی باتوں اور اس کے رویے سے اپنے لیے پسندیدگی دیکھ چکا تھا لیکن میری بیاس جھنے سے پہلے ہی وہ سیٹھ کے پاس چلی گئی جس کا مجھے بہت دکھ ہوا۔" یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ ہم میں سے کوئی نہ بولا تو وہ کہتا چلا گیا۔ "نجانے اس کے لیے میرے اندر ضد کیوں اتر آئی۔ میں نے اس سے بھی زیادہ پیسے کی آفر کی تھی فوزیہ کو لیکن وہ بھی مجبور تھی، وہ اسے سیٹھ کے پاس بھیج چکی تھی اور وہ مستقل طور پر اسے اپنے پاس رکھ چکا تھا۔ سیٹھا فریسیاب اپنے پاس نوخیزی لڑکی رکھتا ہے اور اس پر جی کھول کر خرچ کرتا ہے۔ فوزیہ کو یہ معلوم تھا کہ اسے جو کچھ سیٹھ سے مل سکتا ہے، وہ میں نہیں دے سکتا۔ وہ اپنا ایک بہت بڑا گاہک خراب نہیں کرنا چاہتی تھی اور پھر وہ سیٹھ کو پسند بھی آتی تھی۔ اس سلسلے میں فوزیہ نے میری کوئی مدد نہ کی تو مجھے چڑسی ہو گئی اور میں نے اس لڑکی کو حاصل کرنے کی ضمان لی۔" یہ کہہ کر وہ رک گیا۔ اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور پھر بولا۔ "میں نے صرف دو ماہ میں اس لڑکی کو حاصل کر لیا۔ اب وہ میرے پاس ہے اور اس کی خبر نہ تو سیٹھا فریسیاب کو ہوئی اور نہ ہی فوزیہ کو۔۔۔ اب آپ لوگ سوچو گے کہ میں نے یہ ساری کہانی کیوں سنائی؟"

"ظاہر ہے، اس وقت تو یہی خیال آ رہا ہے، جان جی۔" حسن نے تجسس سے کہا۔

"میں نے اس لڑکی کو وہ طرح سے حاصل کیا ہے۔ ایک طریقہ تو میں نے یہاں پایا کہ میں نے انتہائی محتاط انداز میں لڑکی سے رابطہ کیا، اسے اپنی طرف مائل کرنے کی ہر ممکن کوشش کر ڈالی جس کا ناکام یہ ہوا کہ ایک شاندار ماحول چھوڑ کر میرا دم بھری ہے۔"

"بے وقوف ہے وہ۔۔۔" حسن نے جہتے ہوئے کہا۔

"خیر، یہ الگ بات ہے۔ دوسرا طریقہ میں نے یہاں پایا کہ سیٹھا فریسیاب کے لوگوں میں سے انتہائی قریبی بندے کو توڑا۔ اسے میں نے اپنی برطانیہ برانچ کا منیجر بنانے کا لالچ دیا اور اس کے انتہائی اہم راز حاصل کر لیے جس سے میرے سامنے بہت ساری امکشافات ہوئے۔ ایسا میں نے صرف اس لیے کیا کہ اگر کسی وجہ سے میری اور اس کی ٹیم جانے تو میں ان رازوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتوں۔"

"وہ راز کیا تھے؟" میں نے کچھ کچھ جھکتے ہوئے مزید جاننا چاہا۔

"اس کی کاروباری اور اس کی نجی زندگی کے بارے میں تھے۔ کاروبار میں جو اس نے بے قاعدگیاں کی تھیں، حکومت کے ساتھ اور کچھ لوگوں کے ساتھ۔ اس کی نجی زندگی بڑی رنگین ہے۔ مجھے کچھ تصویروں ایسی ملی ہیں جن سے اس کی شخصیت مسخ کی جاسکتی ہے۔"

"اتو یہ بڑھا۔" حسن نے کہا

"اس معاملے میں بہت غلطی ہے۔ اصل بات جو میں بتانا چاہ رہا تھا، وہ یہ ہے کہ تقریباً ایک ماہ پہلے اسے چھ چل گیا کہ وہ لڑکی میرے پاس ہے۔ فوزیہ نے مجھ سے رابطہ کیا تو میں نے صاف انکار کر دیا، جب وہ میری دشمن ہو گئی۔ اس نے سیٹھا فریسیاب کو اکسایا کہ لڑکی مجھ سے چھین لی جائے۔ اس نے مجھ سے اس معاملے میں ذرا سختی سے کہا تو میں نے رازوں کا حوالہ دے دیا، وہ جیش بندی میرے کام آگئی اور شہان! میں نے تمہارے نام کی ذمہ داری سے اس پر بہت سارے وار کیے۔"

"یعنی ان رازوں سے متعلق تم نے میرا نام لیا؟"

”ہائل، میں نے اس سے یہی کہا کہ تم میرے دوست ہو۔ اس لیے یہ سارے راز اور ثبوت تمہارے پاس ہیں اور میرے کہنے پر اسے کسی بھی وقت استعمال کر سکتے ہو۔ اس طرح وہ براہ راست رقم سے کہہ سکتا تھا اور نہ مجھے کوئی نقصان پہنچا سکتا تھا اس لیے خاموش ہو گیا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ وہ مجھ پر قاطحانہ حملے اس۔۔۔۔۔“

”نہیں، میں بتا رہا ہوں اس نے مجھ سے بات کی کہ میں تم سے بات کر کے منہ مانگی رقم کے عوض وہ ثبوت واپس کر دوں اور آئندہ کچھ بھی نہ کرنے کا وعدہ کر لوں تو وہ سب کچھ بھول جائے گا۔ میں نے تم سے بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ میں اس معاملے ہی کو رقم کرنا چاہ رہا تھا۔ اس لیے سوچا کہ تم سے بات کر لوں اور تمہیں ساری صورت حال بتا کر اٹھاؤں لے لوں۔ میری اس سے یہ بات ان دنوں ہوئی جب تم ہوائی صاحب کے ساتھ تھے، واپس آئے تو حکم ہی حالات تبدیل ہو گئے۔ میں بھی یہی سمجھا تھا کہ تم پر قاطحانہ حملے سیٹھ افریاب ہی کر رہا ہے، اسی وجہ سے مجھے اس پر بہت غصہ آیا۔ ان حالات میں اگر میں تم سے بات کرتا تو تم نجانے میرے بارے میں کیا خیال کرتے اور شاید میں بتا بھی دیتا لیکن ایک دن تم نے براہ راست مجھ پر ٹھک کر لیا تھا کہ کہیں میں ہی تم پر حملے تو نہیں کر رہا ہوں۔ ہوتا ہے ایسا، جب بندہ ذہنی الجھن کا شکار ہو تو کچھ بھی سوچ سکتا ہے۔ میں دہرے خطاب کا شکار ہو گیا۔ میں تم لوگوں کو نہیں سمجھتا تھا اور سیٹھ افریاب کو بھی اس کے عمل پر متاثر ہو کر جواب دینا چاہتا تھا اور میں نے ایسا کیا۔“

”کیا کیا تم نے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”میں نے اسے بہت بھاری نقصان پہنچایا اور اسے یہ یاد کرادیا کہ اگر اس نے تمہاری طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس کی خیر نہیں۔ اب لڑائی اس کی اور میری تھی مگر تمہیں پتہ ہی نہیں تھا۔ پھر مجھے اپنے ذرا فح سے پتہ چلا کہ سیٹھ افریاب نے تمہارے خلاف کچھ بھی نہیں کیا تھا بلکہ وہ خاموش ہو چکا تھا۔ میرے نقصان پہنچانے اور دم مکی دینے پر وہ بھڑک اٹھا اور رات تم سے اس نے بات کی۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ اب تک جو مجھ پر حملے ہوئے ہیں، وہ سیٹھ افریاب نے نہیں کروائے؟“ میں نے تصدیق طلب انداز میں پوچھا۔

”ہاں، شجاع! اس نے نہیں البتہ اب وہ بھڑک گیا ہے۔ اس لیے اس نے براہ راست تم سے بات کی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ میری شروع کی ہوئی لڑائی مجھ تک ہی محدود رہے اور میں ہی اسے ختم کر دوں اور اب ہو بھی گیا تھا لیکن میری غلط فہمی کے باعث اب یہ معاملہ بہت الجھ گیا ہے۔“

”ڈونٹ وری، عامر! میں سیٹھ کو کچھ لوں گا۔ تم گھبراؤ مت۔ جو ہونا تھا، وہ ہو گیا لیکن سوال بنوڑ وہی ہے کہ مجھ پر حملے کروا کون رہا ہے؟“

”یہی تو بات سوچنے کی ہے۔“ عامر نے شدت سے کہا مگر ایک لمبا سانس لے کر میرے سامنے ہاتھ باندھتے ہوئے بولا۔ ”شجاع، میرے دوست! میں نے جو کچھ تمہیں بتائے بغیر کیا ہے تمہاری دوستی کے مان میں کیا ہے۔ پلیز، مجھے معاف کر دو۔“ اس نے کچھ طرح کہا کہ میرا دل بھرا آیا۔ میں نے اس کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

”ادو یار! ایسے مت سوچو۔ میں نے کوئی شکوہ تو نہیں کیا تم سے، اگر تم ویسے بھی مجھے کہہ دیتے تو میں تمہارے ساتھ تھا اور اب بھی ہوں۔ تم

میرے دوست ہو، یار!“

”او چھوڑو، ان باتوں کو۔ اس پر ہی چہرہ کا دیا رتو کرواؤ۔ جس کے لیے یہ سارا کٹڑا ک بھیلایا گیا ہے؟“ حسن نے کچھ اس طرح کہا کہ ماحول رچھایا تکدر ختم ہو کر رہ گیا۔

”یار! مسز خان نے چائے پلوانا تھی ہمیں، وہ ابھی تک“ میں نے جان بوجھ کر فخر و ادھر اچھوڑ دیا تو عامر جلدی سے بولا۔

”میں نے خود کہا تھا کہ ذرا دیر سے نکلتے اور وہاں، ان کا پورشن ہانگل الگ ہے۔ کھلی طرف سے راستہ ہے۔ تمہیں یہاں کوئی پرابلم نہیں ہوگا۔ میں اپنے ہاں سے ایک ملازم بھجوا دوں گا، وہ سارے کام کر دیا کرے گا۔“ عامر نے یوں باتوں کا سلسلہ چھیڑا تو کافی دیر ہو گئی۔ اس دوران چائے بھی پی لی۔ عامر نے سیٹھ کے بارے میں مجھے تفصیل سے بتا دیا۔ واپس پر میں نے خاموش رہا۔ میرے ذہن میں سیٹھ سے منٹنے کا منصوبہ طے پانگیا تھا۔ پھر جب ہم دفتر کے سامنے پہنچے تو میں نے عامر سے کہا۔

”وہ بڑی کدھر ہے اب؟“

”میں نے ایک جگہ دکھا ہوا ہے“

”میں اگر فون کروں تو اسے میرے پاس بھیج دینا۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو عامر بولا۔

”آج ہی یا کسی اور دن۔۔۔؟“

”ممکن ہو تو آج ہی یا پھر۔۔۔“

”اوکے، باس! میں اسے بتا دوں گا، وہ تیار رہے گی۔“ اس نے کہا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد حسن نے کہا۔

”کیا خیال ہے تمہارا، عامر ٹھیک کہہ رہا ہے۔؟“

”اگر ٹھیک نہیں بھی کہہ باتو کیا ہوا، ہم نے اسے دوست کہا ہے۔ وہ کچھ بھی کرے، ہم نے تو اپنی دوستی بھائی ہے۔“

”او، شجاع! مجھے تم پر فخر ہے۔“ حسن نے انتہائی جذباتی انداز میں میرا ہاتھ پکڑ لیا تو میں نے تھپتھپاتے ہوئے دھیرے سے چھوڑ دیا۔ تب

وہ شوخی سے بولا۔

”آؤ، اس خوشی میں تھڑے پر رکھے ہوئے بیچ پر بیچہ کر بیچ کریں۔“ بیچ کے بعد حسن نکل گیا اور میں اپنی سیٹ پر آ بیٹھا۔ اس وقت میرے

علاوہ ایک اور خاتون روپورٹنگی یا پھر بیچون ایک کرسی پر بیٹھا اگتھ رہا تھا۔ میں نے روپورٹنگ میں موجود انٹریکٹ فون اٹھایا اور سیمپل فریسیاب کے نمبر ملا دیئے۔ وہ دفتر میں ہی موجود تھا۔

”جناب! کہئے، کیسے مزاج ہیں آپ کے؟“ میں نے لہجے کو انتہائی خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

”میں تو ٹھیک ہوں، آپ کے مزاج کا مجھے اندیشہ بتا ہے۔“

”یہی سوچ کر میں نے آپ کو فون کیا ہے کہ آپ کو میرے متعلق کوئی اندیشہ نہ رہے۔ میں تو آپ کے ساتھ رات ڈرنر لے لے گا، آج میں

آپ کو آفر کرتا ہوں۔“ میرے کہنے پر اس نے چند لمبے توقف کیا شاید سوچ رہا تھا پھر بولا۔

”کہاں؟“

”جہاں آپ پسند کریں۔“

”ٹھیک ہے، میں بتا دوں گا لیکن یہ طے رہا کہ ضرور کریں گے۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا، اب مجھے شام ڈھلنے کا انتظار تھا۔

اس وقت میں اپنی معمول کی خیریں فائل کر کے سکون سے سگریٹ کے کش لگا رہا تھا کہ عامر شیخ کا فون آ گیا۔

”وہ میں نے بندے بھجوا دیے تھے۔ گمر کی صفائی کر کے سامان سیٹ کر دیا ہے، اب سکون سے جا کر ادھر ہی سو جانا۔“

”وہ تو میں سو جاؤں گا لیکن کیا تم نہیں چاہتے کہ میں زارا کی ”خدمات“ سے استعطاء کروں؟“ میں نے شوخی سے کہا تو وہ قہقہے سے ہنسا۔

بڑے ہی موڈ میں بولا۔

”بہم تو کہتے ہیں کہ تم بھی وہ کچھ کرو جو ہم کرتے ہیں۔ قسم سے تم نے بی بی نہیں۔ تمہیں کیا پتا ہے اس کا نشہ کیا ہوتا ہے۔ یوتھوں کے پاس

رہنے سے نشہ نہیں ہوتا، نا۔۔۔۔۔۔“

”مجھے ایسا نشہ نہیں چاہیے جو عقل پر پردے ڈال دے۔“

”اور کبھی کبھی عقل سے بھی پرے ہو جانے میں بڑا سرور ہے، پیارے ابھی آزماؤ گھو۔“

”دیکھیں گے، ابھی تو جو تھوڑی بہت عقل ہے، وہ چاہیے مجھے۔“ میں نے کہا تو وہ بھیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

”ارے ہاں، وہ میں نے نائنڈ سے کہہ دیا ہے اور تمہارا فون بھی دے دیا ہے۔ اس کے پاس موبائل ہے۔ اسے جب بھی کال کرو گے اور

جہاں بھی آنے کے لیے کہو گے، وہ پہنچ جائے گی“

”ہاں، اس کی ضرورت پڑے گی مجھے۔ شاید آج ہی۔“

”میں نے فون کر کے کہہ دیا ہے، جب چاہو وہ پہنچ جائے گی، باقی باتیں پھر ہوں گی۔ ادا کے، ہائے۔“ اس نے جلدی سے کہا اور فون بند

کر دیا۔ میں نے گزری پر نظر ڈالی تو حسن کے آنے کا وقت ہو گیا ہوا تھا۔ اب تک نجانے وہ کدھر تھا، بہر حال مجھے تو اس کا انتظار کرنا تھا۔ کافی وقت

گزر جانے کی وجہ سے صبری بوریٹ میں اضافہ ہو گیا تو میں لٹف لوگوں کو فون کرنے لگا۔ کبھی میرا سلی بچ اٹھا، دوسری طرف حسن تھا۔

”بھئی کہاں ہو تم، میں یہاں انتظار کر رہا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا تو وہ خوشگوار لہجے میں بولا۔

”اوسنو تو سہی، جان جی اوہ میٹنگ کینسل ہو گئی ہے، میں نے خود کی ہے۔ ابھی میں بھی صاحب کے پاس سے اٹھ کر آ رہا ہوں۔“ اس

نے اخبار کے مالک کا نام لیا جس میں ہم کام کر رہے تھے تو مجھے حیرت ہوئی۔ میں چپ رہا تو وہ بولا۔ ”اسے معلوم ہو گیا تھا کہ ہم جارہے ہیں۔ اس

نے وجہ پوچھی تو میں نے بتا دی۔“

”پھر کیا کہا اس نے؟“

”یہی کہ ہم ان کو بندہ دے دیں، وہ اسے تبدیل کر دے گا۔“

”تم اسے بندہ نظر نہیں آتے؟“

”نہیں، میں نے فقیر تارڑ کا نام دیا ہے۔ کل تک اگر کچھ ہو گیا تو ٹھیک، ورنہ ہم اخبار بدل جائیں گے۔ میں نے حتیٰ فیصلہ کر لیا ہے۔“

”اوکے، جیسا تم چاہو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا ہے۔ میرے ذہن پر چھائی الجھن دور ہو گئی تھی۔

اس وقت سورج ڈوب چکا تھا جب میں زارا کے ہاں پہنچا۔ وہ ڈرائنگ روم میں ایک شخص کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھی۔ میں کچھ دیر ان کے پاس ٹھہرا اور پھر اوپر چلا گیا۔ میں خوب نہایا، فریش ہو کے کپڑے بدلے اور نیچے آیا تو وہ شخص جاچکا تھا لیکن زارا وہیں بیٹھی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی چپک کر بولی۔

”یہ بال بٹا کر اور کپڑے بدل کر کدھر قیامت ڈھانے کے ارادے ہیں؟“

”بس کر دی، نا، عورتوں والی بات۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”عورت، ہوں، بات بھی عورتوں والی ہی کروں گی۔“ وہ بھی مسکرائی، پھر میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھنے لگی۔ ”چائے نہیں پیتیں گے؟“

”ضرور پیتیں گے، آؤ، لان میں بیٹھتے ہیں۔“ میں نے کہا تو اس نے چائے کا کہا اور میرے ساتھ لان میں آکر بیٹھ گئی۔ یونہی ادھر ادھر کی

باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران سینٹھ انفراسیاب کا فون آ گیا۔

”کہاں ڈنڈے سے ہے ہیں آپ؟“ اس کا لہجہ طویہ تھا لیکن میں نے نرم لہجے میں کہا۔

”یہی بتانے کے لیے تو آپ نے فون کرنا تھا۔“

”چلیں ٹھیک ہے پی سی میں آجائیں۔“

”میں ایک گھنٹے میں پہنچ رہا ہوں۔“

”میں انتظار کروں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ابھی میں نے نائلہ کے نمبر ڈائل کیے، دو چار منٹ لگانے کے بعد نسوانیت کی تمام تر

خوبیوں سے مزین انتہائی خوبصورت آواز میں ”ہیلو“ کہا گیا۔ وہ آواز یقیناً مجھے متاثر کر گئی تھی۔

”تم نائلہ ہو؟“

”جی اور آپ شجاع؟“

”ہاں، میں شجاع ہی ہوں، کتنی دیر میں پی سی پہنچ جاؤ گی؟“

”یہی کوئی آدمی سمجھتے ہیں۔“

”تو پھر وہیں پہنچو اور ہاں، تمہیں پہچانوں گا کیسے؟“

”میں خود آپ تک پہنچ جاؤں گی، میں نے آپ کو دیکھا ہوا ہے۔ آپ کو یاد نہیں، آپ سے ایک ہارل بھی جگتی ہوں۔“

”او، ایسا، میں اب سے ٹھیک آدمے گھنٹے بعد تمہارا لابی میں انتظار کروں گا۔ سی یو، ہائے۔“ میں نے یہ کہہ کر فون بند کر دیا۔ تو زارا نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میرا شک ٹھیک تھا، نایا بن اس کے، ویسے یہ نائلہ ہے کون؟“

”ایک ماڈل گرل ہے۔“ میں نے چائے کا آخری سپ لیتے ہوئے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا، سچی زارا بولی۔

”او کے، وٹس یو ڈنگ۔۔۔“

میں لابی میں پہنچا تو ایک سبکی لڑکی میری طرف بڑھا آئی میرے سامنے آکر مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں نائلہ ہوں“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں پھر مسکرائیں تھیں۔

”او، اچھا، تو تم نائلہ ہو؟“ میں نے اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ بلاشبہ وہ خوبصورت تھی۔ پورے چہرے پر اس کے ہونٹ سب

سے زیادہ جاندار تھے، پھرے پھرے ریلے سے۔ قدموں پر اوپر کو اٹھی ہوئی ناک اور سوئی سوئی، کاجل بھری نقلی آنکھیں۔ سیاہ سوٹ میں اس کا سفید رنگ نکھرا تھا۔ لابی گرون میں سونے کی چین، اس کے سر پے میں اک ایسی بے نام سی کشش تھی کہ میں کافی دیر تک اس کے لیے کوئی تھپتھپ ڈھونڈتا رہا۔

”کہاں کھو گئے آپ؟“ اس نے پھر سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”بلاشبہ تم حسین ہو، تمہارے لیے کوئی بھی جنگ لڑی جاسکتی ہے۔“ میں نے شوخ سے انداز میں کہا تو وہ کھٹکھٹا کر ہنس دی۔

”آپ کا تعریف کرنے کا انداز پسند آیا، خیر آئیں، بیٹھتے ہیں۔“ پھر ہم دونوں ایک ایسی میز پر جا بیٹھے جہاں سے پورا ہال نظر آ رہا تھا۔

اطمینان سے بیٹھنے کے بعد اس نے بڑی ادا سے کہا۔ ”جی، کیسے یاد فرمایا آپ نے مجھے؟“

”ابھی کچھ دیر بعد یہاں سیٹھ افراسیاب آنے والا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ چونک گئی، یوں جیسے بوکھلا گئی ہو۔ جب میں نے کہا۔ ”گھبرانے

کی ضرورت نہیں۔“

”وہ بہت ظالم ہے۔“ اس نے دہرے سے کہا۔

”کوئی بات نہیں، میں اس سے بھی بڑا ظالم ہوں۔ میں نے تمہیں اس لیے بلا یا ہے کہ میں اسے یہ یاد کرانا چاہتا ہوں کہ تمہاری دوستی

عامر کے ساتھ نہیں، میرے ساتھ ہے۔ بس یہ تمہارے ذہن میں رہے، باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”میں نہیں جگتی، آپ ایسا کیوں چاہ رہے ہیں؟“

”اس لیے کہ اس کے ذہن سے عامر نکل جائے اور میں رہوں۔“ میں نے کہا تو شاید وہ کچھ اور کہتی لیکن میں نے اسے منع کر دیا۔ میں نے

سیٹھ افراسیاب کے ساتھ اسی نو فیزی لڑکی کو آتے دیکھ لیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میری نظر ان تین بندوں پر بھی پڑ گئی جو اس کے پیچھے ہی آئے تھے، میں

مجھ گیا کہ سینٹھ اپنی پوری حفاظت کے ساتھ آیا ہے۔ پھر جلد ہی اس کی نظر ہم پر پڑ گئی تو وہ بری طرح چمک اٹھا۔ وہ ایک تک نالندہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر اس اور بڑے سینٹھ نے جلد ہی خود پر قابو پاتے ہوئے چہرے پر مسکراہٹ سجالی۔ مہینا وہ ایک گھاگ ٹھنٹھا۔ ہیلو ہائے کرنے اور ہاتھ ملانے کے بعد وہ میرے ساتھ بیٹھ گیا جبکہ نالندہ اور نوخیز لڑکی آمنے سامنے تھیں۔ تبھی میں نے کہا۔

”آپ تو ٹھیک وقت پر پہنچے جبکہ میرا خیال تھا کہ آپ نے میں تو ہر وقت لیں گے۔“

”مطلب؟“ اس نے اپنی منوں اچکاتے ہوئے کہا۔

”میرا مطلب ہے کہ کہیں جانے سے پہلے تیاری تو کرنا ہی پڑتی ہے اور اس میں وقت لگ جاتا ہے، بڑی بات ہے کہ آپ مختصر وقت میں تیاری کے ساتھ آتے ہیں۔“ میں نے اسے ان بندوں کے بارے میں اشارہ دیا۔

”اوہ نہیں، ایسا نہیں۔ یہ تو معمول کی بات ہے۔“ سینٹھ نے کہا تو اسی لمحے پیر امینو رکھ کر چلا گیا۔ ہم میں ایک طویل خاموشی چھا گئی۔ پھر آرزو دینے کے بعد میں نے سینٹھ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میری آپ سے پہلے وہ دفعہ ملاقات ہو چکی ہے اور انہی دونوں ملاقاتوں میں آپ نے بڑی مہملی سی بات مجھ میں آنے والی باتیں کی تھیں۔ میں پوچھ سکتا ہوں کہ ان باتوں کا سیدھے سبب کیا تھا؟“

”شجاع صاحب! میرا خیال ہے کہ ہمیں اب اس موضوع پر بات نہیں کرنا چاہیے۔ نالندہ کے یہاں ہونے سے آپ بھی اور میں بھی سب کچھ دیکھتے ہیں۔“

”دیکھیں، سینٹھ صاحب! آپ نے کچھ شیر اور سانپ وغیرہ کی مثالیں دی تھیں۔ میں آپ سے کہوں کہ میں موت سے نہیں ڈرتا، میں نے ہمیشہ دشمن کو ہائل کرنے کا موقع دیا ہے اور وہ آپ کر چکے۔“

”نہیں، ابھی میں نے کچھ نہیں کیا اور اگر کرتا تو آپ یہاں میرے سامنے نہ بیٹھے ہوتے۔“

”میں آپ کو ہر طرح سے موقع دیتا ہوں، لیکن آپ کے دل میں حسرت نہ رہ جائے اور آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ میں نے ہمیشہ شیر ہی کا شکار کیا ہے۔“

”کرتے ہوں گے۔“ اس نے لا پرواہی سے کہا، پھر چند لمحے میری طرف دیکھتے رہنے کے بعد بولا۔ ”خیر، ہمیں کیا، اب معاملے کی بات نہیں کرنا چاہیے؟“

”وہ تو ہو چکی، آپ نے مجھے دھکی دی جسے میں نے قبول کیا۔“

”شجاع صاحب! لگتا ہے، آپ خامے نھے میں ہیں۔ میں آپ سے کہہ چکا ہوں کہ میں نے آپ پر کوئی قاتلانہ حملہ نہیں کروایا۔ آپ کے پیغام عامر بشیر کے ذریعے مجھ تک پہنچے رہے ہیں۔ میں انہیں کچھ دیر پہلے تک کچھ اور ہی سمجھتا رہا۔ میں نے آپ کو دھکی دی، یہ اسی پرانی بات کی وجہ سے تھی۔ اب آپ جیسی بھی ذلیل چاہیں، کر سکتے ہیں۔ آپ میری چیزیں مجھے دے دیں اور اس کے عوض جو مانگیں، جتنا مانگیں، میں دیتے کے

لیے تیار ہوں۔"

"مجھے آپ کی آفر سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، ہاں ایک بات پر ہم سمجھتے کر سکتے ہیں۔"

"بھولیں، مجھے آپ کی آفر سے دلچسپی ہوگی۔"

"اب تک جو ہو چکا ہے، ہم دونوں ہی اسے بھول جاتے ہیں اور میں اس وقت تک کچھ نہیں کروں گا جب تک آپ کی طرف سے کوئی فضول حرکت نہیں ہوتی۔ میرا مطلب نقصان کسی بھی قسم کا مجھے یا میرے دوستوں کو، یہ میرا وعدہ ہے۔"

"لیکن اگر؟" اس نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ "صرف اسی بات پر ڈن ہو سکتا ہے۔ سوچنا چاہیں تو سوچ لیں اور ساتھ میں یہ یقین بھی رکھیں کہ اگر اب مجھے یا میرے دوستوں کو نقصان پہنچا تو۔۔۔"

"ٹھیک ہے، ڈن، ہم ایک دوسرے کی راہ میں نہیں آئیں گے۔" اس نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا تو میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ کھانا کھانے کے دوران بھی اس نے ہر ممکن طرح سے مجھے یہ باور کرانے کی بھرپور کوشش کی کہ مجھ پر ہونے والے قاتلانہ حملے اس کی طرف سے نہیں ہوئے البتہ وہ عام بشر کو کر لیش کر دینے کے لیے بالکل تیار تھا۔ تب میں نے بھی اسے باور کرا دیا کہ وہ محض میرا بیوقوف رسوا تھا، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ نائلہ کو اکثر ٹریپ کیا ہے تو میں نے، اس کی تصدیق نائلہ نے بھی کر دی۔ جلد ہی سب نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔

جس وقت میں نائلہ کے ساتھ ہوٹل سے نکلا، میرے ذہن پر اک بوجھ آن پڑا تھا۔ اگر حملے سے پہلے افراسیاب نے نہیں کروائے تو پھر کون ہے وہ؟ یہ سوال اک نئے سرے سے میرے سامنے آ گیا تھا اور اب میں اس سے آگنا بھی چکا تھا۔ میری زندگی میں جو حالیہ ہنگامہ خیزی آئی تھی، اس نے مجھے اک پلی بھی سکون نہیں لینے دیا تھا۔ پہلا شک ہمارا ہوا تھا، پھر میں نے عام جیسے شخص دوست کے بارے میں غلط سوچ لیا۔ بات سیٹھ افراسیاب تک جا پہنچی مگر نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ میں جنوز وہیں تھا جہاں سے چلا تھا اور اب تک میں اندھیرے میں تھا۔ چاہے تو یہ تھا کہ اس ڈنر کے بعد میرے کشیدہ اعصاب کو تھوڑا اطمینان ہوتا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ اب میرے سامنے صرف سلیم قرانی تھا جو میرے دشمنوں میں اس حد تک جا سکتا تھا۔ نجانے میں اس وقت یہ کیوں خیال کرنے لگا کہ میرے ان الجھے ہوئے دونوں کی وجہ صرف اور صرف وہی ہے۔

"کہاں کھو گئے آپ؟" نائلہ کی پرکشش آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

"کہیں نہیں، یہیں ہوں۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو بوی بخجیدی سے بولی۔

"کیا سیٹھ اپنی بات پر قائم رہ سکے گا؟"

"اسے رہنا ہوگا۔" میں نے سختی سے کہا تو وہ چپ ہو گئی نائلہ گلبرگ ٹو میں رہتی تھی، میں نے اسے گھر کے سامنے ڈراپ کیا تو وہ چڑے شمار آلود لہجے میں بولی۔

"ایک کپ کافی ہو جائے، پلیز؟" اس نے اپنے ریلے ہونٹوں اور آنکھوں سے یہ لفظ کچھ اس انداز سے کہے تھے کہ میں انکار نہیں کر سکا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہی جب وہ اندر چلی گئی تو اچانک مجھے خیال آیا کہ آصف چودھری نے حملہ آوروں کو تلاش کرنے کی ذمہ داری لی تھی۔ ظاہر ہے،

اگر وہ تلاش کر لیتا تو مجھے ضرور مطلع کرتا۔ اب تک جو اس نے مجھ سے بات نہیں کی تھی تو اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ وہ صرف ایک فون کال کے فاصلے پر تھا اور میں اس سے پوچھ سکتا تھا کہ اب تک اس نے کیا کوشش کی ہے لیکن باوجود خواہش کے میں نے کچھ نہیں پوچھا۔ تاہم کے ساتھ کافی پیٹے ہوئے ڈیجیٹل ساری باتیں ہوئیں۔ وہ اپنی موجودہ زندگی سے اتنا جلی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ آزاد فضاؤں میں اڑے، کچھ بھی کرے لیکن شام کو تنگی ہاری واپس لوٹے۔ میں اس کے حسن اور آواز کے بحر میں کھویا رہا۔ پھر اچانک ہی احساس ہو جانے پر میں اٹھا اور سٹوڈیو کی طرف نکل گیا۔

دو دن بڑے سکون سے گزرے۔

میں نے گھر میں شفٹ ہو گیا تھا۔ پہلی بار مسز خان کے گھر والوں کے ساتھ ناشتہ کرتے ہوئے میں نے اپنے معمولات کے بارے میں بتانا چاہا تو مسز خان نے مسکراتے ہوئے کہا کہ وہ سب جانتی ہیں، عامر بشیر نے سب باتوں سے آگاہ کر دیا ہے۔ میرے ساتھ کون آتا ہے، کون رہتا ہے، انہیں اس سے کوئی فرق نہیں۔ وہ ایک سال کا ایڈوائس لے چکی تھیں اور انہوں نے میرے ہر ممکن سکون کا وعدہ بھی کیا تھا۔ یوں انتہائی خوشگوار ماحول میں ناشتہ ختم ہوا تھا۔ اس دن مجھے یوں لگا جیسے میں واقعتاً ایک گھر میں ہوں اور اب تک یونہی بسکتا رہا تھا۔ اس دن مجھے اپنا آبائی گھر بہت یاد آیا۔ میرا دل بھرا آیا تھا، دل چاہ رہا تھا کہ چاہے ایک دو دن کے لیے ہی سہی مگر ضرور جاؤں۔ ایک جذبائی لمحے کے تحت میں نے اسی وقت جانے کا فیصلہ بھی کر لیا مگر یہاں کے معاملات اس قدر عجیبہ نوعیت کے ہو چکے تھے کہ کسی بھی لمحے کچھ ہو سکتا تھا۔ میں تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھنے والا تھا کہ میرا تیل بج اٹھا۔

”جان جی! ایک خوشخبری ہے تمہارے لیے۔“ حسن کے لہجے سے خوشی ٹپک رہی تھی۔

”ہلو“

”سلیم فارانی! متعلق دے چکا ہے۔“

”گڈ اور اب اس کی جگہ؟“

”ظفر تارڑ، اب تم آؤ جلدی سے، وہ چارج لے چکا ہے۔“

”میں پہنچ رہا ہوں مگر سلیم فارانی اب ہے کہاں؟“

”پتہ نہیں، مگر میرے ذرائع یہی بتا رہے ہیں کہ وہ نئے اخبار والوں کے ساتھ جا ملا ہے۔“

”ظاہر ہے تم نے انہیں مایوس کیا ہے تو پھر ایسا تو ہوتا ہی تھا۔“

”خیر، آؤ تم، باقی باتیں یہاں ہوں گی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میں دفتر پہنچا تو وہاں گہما گہمی ہی اور طرح کی تھی۔ میں بڑے سکون سے ظفر تارڑ کے پاس جا پہنچا جو اس وقت ایئر ٹیکر کی کرسی پر براجمان تھا، حسن کے علاوہ اور دوست بھی وہیں موجود تھے۔ یونہی باتوں کے دوران میں نے پوچھا کہ اب سلیم فارانی ہے کہاں؟ وہیں پر کسی نے بتایا کہ فی

الحال اس کی کوئی خبر نہیں۔ پھر کافی دیر تک ہاتھ ملتتی رہیں۔ تبھی مجھ سے پوچھا گیا کہ میں اب کیا کروں گا شوہنزی یا پھر اپنی پرانی بیٹھ؟

”نی الحال تو میں چند دن آرام کروں گا۔“ میں نے ایک خیال کے تحت کہا۔ ”پھر دیکھوں گا کہ کیا کرنا ہے۔“

”کہیں شوق تو نہیں لڑا رہے ہو۔ شوہنزی کی رہنمائی تو۔۔۔“ دوستوں میں سے ہی ایک نے کہا۔

”ایسا نہیں ہے، یارا میں نے اگر ایسا کچھ کیا تو کھل کر کروں گا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے خوشدلی سے کہہ دیا۔

”مجھے تو کچھ اور ہی خبر ملی ہے؟“ وہی دوست ہنستے ہوئے بولا۔ ”سنا ہے کہ تم ذرا سے شادی کر رہے ہو۔“ اس نے معنی خیز لہجے میں کہا تو

میں ہنس دیا۔ پھر اسی انداز میں بولا۔

”اگر کبھی لوں تو کسی کو کیا اعتراض؟“

”اوہ بابا! ہم تو کہتے ہیں کہ کروسی، چاہے کچھ کرو۔“ حسن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے ہی باتوں کا رخ بدل دیا۔ کافی دیر بعد ہم

رپورنگ میں آئے تو ماریا سردھی بیٹھی ہوئی تھی، اس پر نگاہ پڑتے ہی حسن نے سرگوشی کی۔

”سلیم فارانی کاظم کر رہی ہے، بے چاری!“ پھر سیٹ پر بیٹھتے ہی اونچے سر میں بولا۔ ”اب تو یاں، اپنی پرانی بیٹھ کرو۔ تم چھوڑ دو شوہنزی، کیا

رکھا ہے اس میں؟“

”نہیں، میں اب وہ نہیں چھوڑ سکتا۔“

”اب یہ ضروری تو نہیں کہ تم ذرا سے شادی کر لو اور شوہنزی سے نکل ہی نہ سکو؟“ حسن نے یہ کہتے ہوئے مجھے ہلکے سے آنکھ مار دی۔ مجھے

معلوم تھا کہ اس بات کا مار یہ پر کیا بدلہ ملے گا۔ میں نے لاشعوری طور پر اس کی طرف دیکھا، وہ ہونٹوں کی طرح مجھے دیکھ رہی تھی۔ تبھی ارد گرد لوگوں

میں پہلے ذرا سی جھنجھٹا ہٹ ہوئی اور پھر کئی لوگوں نے اس کی تصدیق بھی کر ڈالی۔ میں چپ رہا لیکن حسن نے اپنی بات بھانے کی خاطر کئی سارے

جھوٹے بول دیئے۔

”یار! وہ تو مرتی ہے اس پر، پھر اس کا بھی جا دو کھل گیا ہے۔ شادی کے فوراً بعد یہ سوئے ٹرزی لینڈ جائیں گے کئی مہینوں کے لیے۔“

”یہ سوئے ٹرزی لینڈ پنجاب ہی میں ہے یا واقعی۔۔۔“ ایک خاتون رپورٹر نے یونہی مذاق میں کہہ دیا۔

”تم کیا سمجھتی ہو، اس نے تو اک کوشی ڈیننس میں خرید کر اس کے نام بھی کر دی ہے۔ بس دیر اپنے شجاع کی طرف سے تھی۔ اب ہو جائے

گا معاملہ نہیں یقین آتا تو اپنے ایڈیٹر سے پوچھ لو۔ ابھی شجاع نے کچھ دنوں کی چھٹی مانگی ہے، ابھی کر کے دیکھ لو تو؟“ حسن نے ہاتھ کاٹھڑے سے پوراس

کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس بھی کرو، یارا!“ میں سرگوشی میں بولا تو اس نے میری سنی آن سنی کرتے ہوئے کئی سارے اور بیان داغ دیئے۔ اب میرے پاس

سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ میں کبھی کبھی ماریہ کے چہرے کی طرف دیکھ لیتا جہاں مایوسی اپنا ڈیرا بنا چکی تھی، ایسا دیکھ کر مجھے ذرا

بھی ترس نہیں آیا۔

اس رات میں سنوڈیو سے لوٹا تو بیڈ پر جاتے جاتے تین بج چکے تھے۔ مجھے بے تحاشا نیند آرہی تھی اور اس وقت میری آنکھ بھی لگ گئی تھی کہ میرے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے نیند کے غماز میں ہی فون آن کر کے کان سے لگا یا تو دوسری طرف بھرائی ہوئی آواز میں ماریہ بات کر رہی تھی، غصے کی لہر میرے اندر سرایت کر گئی۔

”اتنی رات گئے تمہیں فون کرنے کی کیا سوجھی؟“

”کیا تم واقعی زارا سے شادی کر رہے ہو؟“ اس کی آواز رو دینے والی تھی۔

”یہی پوچھنے کے لیے تم نے اتنی رات گئے فون کیا ہے؟“ میں نے قدرے غصے میں کہا۔

”دیکھو، جو کچھ بھی ہو اسے بھول جاؤ۔ میں بھی سب کچھ بھول جاتی ہوں۔ خدا کے لیے تم۔۔۔“

”دیکھو میرا دماغ خراب مت کرو اور سو جاؤ۔“ میرے لہجے سے بدستور غصہ ٹھنک رہا تھا۔

”میں نہیں سو سکتی، میرے دل پر کیا گزر رہی ہے، اس کا شاید تمہیں احساس نہیں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”اچھا صبح بات کریں گے۔“ میں نے جان چھڑانے والے لہانہ میں کہا۔

”شجاع! تم مجھے جہاں رکھو، میں رہنے کے لیے تیار ہوں۔ تم جو کہو گے، میں وہی کروں گی، پلیز شجاع! میں مری جاؤں گی۔“ اس کے لہجے میں انتہائی درجے کی بے چارگی تھی۔

”تو مری جاؤ۔“ میں نے انتہائی نفرت سے کہا تو چیخ اٹھی۔

”شجاع۔۔۔ ا۔۔۔“ وہ شاید کچھ اور کہتی لیکن میں نے فون بند کر دیا اور تمام خیالات کو ڈھن سے نکال کر سو گیا۔

میں دفتر پہنچا تو ظفر تاز میرے انتظار میں تھا۔ میں اس کے پاس جا پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی بولا۔

”یار! تم کنگزم کرو، شو بیز کرو گے یا بندہ رکھ لیں؟“

”کوئی بے نظر میں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی مل جائے گا لیکن تم تو تباؤ، ویسے میرے خیال میں تم میگزین سنبھال لو۔“

”چلو ٹھیک ہے لیکن شو بیز کے لیے بندہ میں دوں گا۔“

”بولو، وہی رکھ لیتے ہیں، بندہ تو ٹھیک ہے نا؟“

”ایک دم ٹھیک۔ کل وہ ادھر جوائن کر لے گا، ہاتی کوئی مسئلہ تو نہیں؟“

”ہائلکل نہیں، سب ٹھیک ہے۔“ اس نے خوشدلی سے کہا اور پھر ہم باتوں میں لگ گئے۔ دوپہن لچ کر کے میں رپورٹنگ میں آ گیا اور وہاں سے ندیم کو ڈھونڈنے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ مجھے کہیں بھی دستیاب نہیں ہوا۔ میں نے ہر جگہ اس کے لیے پیغام چھوڑ دیا۔ شام ڈھلے تک ندیم کا کہیں سے بھی فون نہیں ملا۔ جہاں جہاں میں نے پیغام چھوڑے تھے، وہاں سے اسے پیغام مل جانا چاہئے تھا اور مجھے پوری توقع تھی کہ وہ مجھے کال

کرے گا۔ مجھے سنوڈیو سے کوئی خبر تو لینی نہیں تھی مگر ندیم کے لیے میں جانا چاہتا تھا۔ دفتر میں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا سو میں نے ذرا اکوفون کر دیا، وہ گھر پر ہی تھی میں نے اسے اپنی آمد کے بارے میں بتایا اور اس کی طرف چل دیا۔

میں ذرا کے پاس پہنچا تو وہ ایک صوفے پر بیٹھی کوئی میگزین دیکھ رہی تھی۔ اس وقت وہ نائٹس اور سیلویس ٹی شرٹ پہنے ہوئے تھی، سر کے بالوں کو اکٹھا کر کے پونی بنائی ہوئی تھی اور سفید ٹکمرے ہوئے بہت خوبصورت لگ رہے تھے۔ میں نے سناٹھی نظروں سے اس کی جانب دیکھا تو وہ دھیرے سے مسکادی، پھر بڑی ادا سے بولی۔

”حضور کیسے راست بھول پڑے ادھر کا؟“

”یہ تم نے کوئی نظر کیا ہے یا لگ رہا ہے؟“ میں نے اس کے پاس صوفے پر بیٹھے ہوئے کہا۔

”کچھ بھی کہہ لیں، مطلب تو سمجھ رہے ہوں گے میری بات کا۔۔۔ خیر، کیا نہیں گے آپ؟“

”تھوڑا سا پانی، پھر اس کے بعد تمہاری باتوں کا رس اور پھر سکون سا، مزید ارساؤ تر۔۔۔ اپنا تو یہی پروگرام ہے۔“ میں نے جو تے اتار کر آلتی پالتی مارتے ہوئے کہا۔

”ماشا اللہ، آج آپ بہت خوش دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ہاں، بہت خوش ہوں۔ شو بڑا چھوڑ دیا ہے میں نے۔۔۔“

”واقعی؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔۔۔؟“

”مجھے اندازہ تو تھا کہ آپ بہت جلدیہ شعبہ چھوڑ دیں گے لیکن اتنی جلدی، ایسا کہاں نہیں تھا۔“

”ہاں، اندازے ہوئے ہی غلط ہونے کے لیے ہیں۔۔۔ خیر، یہ بتاؤ کہ تمہاری شوٹنگ ہے آج؟“

”ہاں، کل ہے۔“ پھر ایک لمحہ رک کر بولی۔ ”جائے جواؤں؟“ میں نے تو ابھی خاصا وقت ہے۔“

”جواؤں کے ساتھ میں ہاتوں کا رس ضرور ہو۔“ میں نے کہا تو وہ مصنوعی حیرت سے بولی۔

”آپ خوش ہیں لیکن اتنے رومانٹک۔۔۔ پہلی بار دیکھا ہے۔“

”بس یار، ذرا! ہم نے بھی سوچا کہ تھوڑا رومانٹک ہو کر دیکھ لیں۔“ میں ہنسنے ہوئے بولا۔

”جو پھر ہوتے ہیں وہ پھر ہی ہوتے ہے پھول نہیں بنتے۔ بڑے آئے، رومانٹک۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے میگزین ایک طرف رکھا اور

اپنے ملازم کو آواز میں دینے لگی۔ پھر اسے چائے کا کبکہ کر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”اتنے دنوں میں آپ نے شو بڑے کیا تجربہ کیا، کیا دیکھا آپ نے اس میں؟“ میرے لیے ایسا کوئی سوال غیر متوقع تھا اس لیے میں نے قدرے سوچ کر کہا۔

”جھوٹ اور فریب کی دنیا، پانی پر نقش کی مانند یا پھر اسے روشن اندھیرا کیوں تو زیادہ بہتر ہے۔ یہ اس لیے کہ فلم اندھیرے میں بنتی ہے،

اندھیرے میں ہی دکھی جاتی ہے۔ ایک طرف اگر سطور سکرین جگمگا رہی ہے تو دوسری جانب اتنا ہی گہرا اندھیرا ہوگا۔ اس کا اثر فلم کی دنیا سے وابستہ لوگوں کی زندگی پر بھی میں نے دیکھا ہے۔ یہاں راتیں جاگتی ہیں اور دن سوتے ہیں۔ یہاں بہت زیادہ فریب ہے۔ شاید لوگ اسی لیے اسی طرف پھرتے ہیں۔ معاف کرنا، زارا اتم سے بھی زیادہ خوبصورت اور حسین اور تم سے بھی باصلاحیت لڑکیاں جنہیں ایکسٹرا کا نام دیا گیا ہے، انہی اندھیروں میں پڑی ہیں۔ ایک طویل اور تھکا دینے والا انتظار ان کے مقدر میں لکھا جا چکا ہے۔ وہ اس روشن اندھیرے کے چنگل سے نہیں نکل سکتیں، پھر اسی اندھیرے کی چادر نے جرم کے راستے پر نکل پڑتی ہیں۔ "یہ سب کہتے ہوئے میں ایک لڑکی کو چولا، جس کس قدر جذباتی ہو کر سوچ رہا تھا۔ تجھی میں بس دیا لیکن زارا کا چہرہ دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ "تم کیوں لگ کر کرتی ہو۔ تم ایکسٹرا نہیں، ایک سٹار ہو۔"

"شہانہ استارہ بھی تو اندھیرے میں روشن ہوتا ہے اور اندھیرا اتنا خوفناک ہے۔" وہ پھیلی آنکھوں کے ساتھ خود کو کامی کے انداز میں بولی تو میں ہنسنے ہوئے بولا۔

"اوہ زارا! میں نے اتنا کڑوا رس پینے کو تو نہیں کہا تھا، جتاؤ، شمالی علاقے کی طرف کب جا رہی ہو؟" میں نے بات کا رخ بدلا تو وہ آہستہ آہستہ معمول پر آتی چلی گئی۔ اسے میں اس کا ملازم چائے لے آیا۔ وہ چائے بنانے لگی، کپ مجھے ہنسا کر اس نے اپنے کپ سے پلایا اور دھیرے سے بولی۔

"آپ نے بھی محبت کی ہے؟"

"کبھی محبت کرنے سے کیا مراد، میرے ہونے کا ثبوت ہی محبت ہے۔"

"میں کبھی نہیں، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میرا مطلب ہی، کسی لڑکی سے محبت؟"

"کسی لڑکی سے محبت۔" میں نے پر خیال لہجے میں کہا اور پھر حتمی لہجے میں بولا۔ "نہیں، میں نے کسی لڑکی سے محبت نہیں کی۔"

"ایسا کیوں؟" وہ حیرت سے بولی۔

"یہ وہ اور وہ چارو والا فارمولا تو ہے نہیں۔ مجھے اب تک کسی سے محبت ہوئی ہی نہیں۔"

"اور کسی لڑکی کو آپ سے محبت ہوئی؟"

"یہ خاصا نایاب سوال ہے، میں کسی کے بارے میں کیا جانوں کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے یا نہیں؟"

"آپ کی ان باتوں سے تو لگتا ہے جیسے انتہائی خود غرض ہوں۔ کیا آپ میں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے کہ دوسرے بندے کے جذبات سمجھ

سکتیں؟"

"دیکھو، زارا! سورج پورے غلوں سے روشن ہوتا ہے تو اندھیرے چھٹ جاتے ہیں، چاند چڑھتا ہے تو وہ بھی اپنی روشنی پھیلا دیتا ہے۔"

انہیں اس بات سے غرض نہیں ہوتی کہ روشنی کسی گل پر پڑ رہی ہے یا جمونہ پڑی پر، ہرے بھرے باغ پر یا کسی ٹنڈر زمین پر، محبت کوئی محدود سارا دینے نہیں ہے کہ یہ چھپ جائے یا ہم اسے خانوں میں بانٹ سکیں۔"

”یہ آپ کس طرح کی باتیں کر رہے ہیں؟“

”زارا اگر تم نے محبت کی ہوتی اور وہ بھی خالص محبت تو میری باتوں کو روح کی گہرائیوں سے سمجھ جاتیں۔ اصل میں جب تم نے شعوری طور پر آنکھ کھولی تو تم نے اپنے دامن میں ایک ایسی محبت کو پایا جو انجانی خود غرضی کے جذبات میں لتھڑی ہوئی تھی۔ اسے تم نے بڑی احتیاط سے سنبھال لیا اور آج تک سنبھالے ہوئے ہو۔ تم سکون دے سکتی ہو، ہمدردی کر سکتی ہو لیکن کہو کہ خالص محبت۔۔۔ وہ تم نہیں کر سکتیں اور نہ سمجھ سکتی ہو۔“

”میرے نہ سمجھنے کی وجہ؟“

”ہو سکتا تم سمجھ جاؤ یا شاید نہیں یا شاید ہاں۔ وقت گئے لگا۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو تمہاری جائے اچھی تھی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس کا چہرہ سرخ ہو گیا شاید شرم سے۔ پھر ہم میں اس کی لمبوں کے بارے میں بات ہونے لگی جو پچھلتی چلی گئی۔

میں زارا کے ساتھ اس کی گاڑی میں سٹوڈیو کی طرف جا رہا تھا کہ مجھے ندیم کا خیال آ گیا۔ نجانے کیوں میرے دل میں اس کے لیے ہمدردی تھی، وہ مجھے پہلی نظر میں ہی اچھا لگا تھا۔ وہ ایک معمولی سے اخبار میں شو بیز رپورٹر تھا جس کی وجہ سے اس کی آمدنی بھی کم تھی۔ اس وقت اس کے لیے بہت اچھا موقع تھا۔ ایک بڑا اخبار اور محصول آمدنی تھی۔ مجھے تشویش ہو رہی تھی کہ اس نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ اس کے بارے میں جاننے کے لیے اب دو جاہلیں ہی رہ گئیں تھیں۔ ایک اس کا گھر اور دوسرا سٹوڈیو۔ ایک انجانا خوف میرے ذہن میں یہ بھی تھا کہ کہیں اسے حادثہ نہ پیش آ گیا ہو، انسان کے ساتھ کسی وقت بھی کچھ ہو سکتا ہے۔ زارا خاموش تھی اور گاڑی میں ہلکی موسیقی تیر رہی تھی۔ سٹوڈیو کے دوسرے گیٹ پر گاڑی رکھی تو ہم دونوں ہی باہر نکلے۔ ڈرائیور گاڑی پارکنگ میں لے گیا۔ ہم دونوں ایک ساتھ آگے بڑھے، تب میں نے کہا۔

”زارا! تم جاؤ، مجھے ایک بندے کو تلاش کرنا ہے۔“

”اوکے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک طرف بڑھ گئی۔ پھر کئی لوگوں نے اسے گھیرے میں لے لیا تھا اور وہ ان کے درمیان شان بے نیازی سے بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ وہ نظروں سے اوجھل ہوتی تو میں نے شو بیز رپورٹر کو تلاش کرنا شروع کر دیا۔ چل رہی وہ مجھے مل سکتے، انہی سے معلوم ہوا کہ وہ کل بھی سٹوڈیو نہیں آیا تھا اور آج بھی ابھی تک کہیں دکھائی نہیں دیا۔ تقریباً دو گھنٹے تک اس کے بارے میں معلوم نہیں ہو سکا تو میں نے اس کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک سیٹ پر زارا کا ڈرائیور بیٹھا ہوا تھا، میں نے اسے ساتھ لیا اور ندیم کے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھڑی اور نو بجے کی پتہ سے بنے ہوئے اس گیٹ کو بجاتے ہوئے میرا دل دھڑک رہا تھا۔ ندیم سے میرا کوئی رشتہ نہیں تھا اور تعلق کو اتنے دن بھی نہیں ہوئے تھے لیکن پھر بھی اک انجانا خوف مجھ پر طاری تھا جیسا کسی اپنے کے لیے محسوس ہوتا ہے۔ دوسری دستک کے ساتھ ہی اس کا چھوٹا بھائی باہر نکلا۔ مجھے دیکھتے ہی حیرت سے چونک گیا۔

”آپ۔۔۔ آئیے۔“

”ندیم کہاں ہے؟“

”گھر پر ہی ہے۔“

”خیریت تو ہے نا؟“

”پتہ نہیں، نکل شام سے گھر میں ہی پڑا ہے، بظاہر تو ٹھیک ٹھاک ہے، پوچھنے پر اس نے یہی بتایا ہے کہ طبیعت خراب ہے۔“
”اسے ہاں سمجھو۔“

”آپ آجائیں اندر۔“

”نہیں، بس تم اسے بھیج دو۔“

”جی، ابھی بھجوائے دیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ندیم کی سکرانٹ چمڑے پر لیے میرے سامنے تھا۔
”خیریت ہے، یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں، بھائی، آئیں، اندر بیٹھتے ہیں۔“

”نہیں، اتنا وقت نہیں ہے۔ میں نے سارا دن تمہیں تلاش کیا ہے، اب سٹوڈیو میں دیکھنے کے بعد یہاں آیا ہوں۔“

”خیریت، شجاع بھائی؟“ اس نے تشویش سے پوچھا تو میں نے اسے نئی جاب سے متعلق بتایا۔ اس نے یہ ساری بات بڑی بے دھیانی سے سنی تو مجھے معاملہ سمجھیر سا لگا۔

”اچھا ایسا کرو، گھر میں ہوتا آؤ کہ تم میرے ساتھ جا رہے ہو اور ایک آدھ صاف سوٹ بھی اٹھانا۔“ میرے کہنے پر وہ مز گیا اور میں گاڑی میں آ بیٹھا۔ تقریباً پانچ منٹ کے بعد وہ وہاں آ گیا تو ہم سٹوڈیو جا پہنچے، وہیں ایک پرسکون سے گوشے میں بیٹھ کر میں نے اس سے پوچھا۔

”ندیم اہتاؤ، معاملہ کیا ہے؟“ وہ چند لمحوں میں جھکا کر رہا، پھر میری طرف دیکھ کر بڑے ہی غم زدہ لہجے میں بولا۔

”وہ سہلی ہے نہ، بہت لطیف قسم کی لڑکی نکلی ہے۔“ اس نے کہا تو میری نگاہوں میں وہ لڑکی محوم مئی۔ جو ندیم کی دوست تھی اور جب اسے حادثہ پیش آیا تھا تو وہ میرے ساتھ تھی۔ پھر وہ رات اور دن بھر میرے قلبیت پر رہی تھی۔ ندیم کا اس کے ساتھ نہ سا جذباتی تعلق تھا۔

”کیا فلفلی نکلی وہ؟“

”اس کے ذہن پر دولت سوار تھی۔ وہ اس کے حصول کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی، سہارے لے کر ٹھنکتی رہی مگر میں اس کے اندر کے لالچ سے بے خبر رہا۔“

”تم بے خبر رہے یا اس نے تمہیں بے خبر رکھا؟“

”جیسا بھی سمجھ لیں مگر مجھے یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر گھٹیا ہو جائے گی۔“

”کیا ہوا، مجھے تفصیل سے بتاؤ۔“

”شجاع بھائی اس نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔ مجھے کچھ کہتی رہی اور خود۔۔۔۔۔ میں کچھ نہ بولا بلکہ اس کی طرف دیکھتا رہا۔ چند لمحوں کے بعد وہ کہتا چلا گیا۔“ جن دنوں میں ہسپتال میں تھا، انہی دنوں اس کی ملاقات ایک کسٹم آفسر سے ہوئی۔ مجھے پتہ اس وقت چلا جب

وہ راتوں کو بھی گھر سے باہر رہنے لگی۔ یہاں گلبرگ میں ایک بیوٹی پارلر ہے، وہ وہاں جاتی تھی۔ اس کا دھندہ چند مخصوص لوگوں تک ہے، وہیں سے

اس کی ملاقات اس کشم آفسر سے ہوئی اور اب وہ اس کی رکھیل بن چکی ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں شدت کا دکھ تھا۔
”تمہیں اس ساری کہانی کا پتہ کیسے چلا؟“

”وہ راتوں کو گھر سے غائب رہنے لگی تو اس کی ماں نے مجھ سے کہا۔ میں نے پوچھا تو وہ وہیں بیوی پارلر پر کام کرنے والی لڑکی نے مجھے ساری صورت حال بتائی۔ میں نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا لیکن کل شام میں نے اس شخص کے ساتھ دیکھا ہے۔“
”تو اس میں اتنا غم کرنے کی کیا ضرورت ہے جو تم کل سے ہی گھر میں پڑے ہو۔“ میں نے ذرا سختی سے کہا۔
”شجاع بھائی اس نے اتنا بڑا دھوکا دیا، بے وفائی کی ہے اس نے تو میں۔۔۔“

”اس نے کوئی دھوکا نہیں دیا، دھوکا تم کھار ہے ہو یہ کچھ کر کہ تم اس سے صحبت کرتے ہو اور اسی بدگمانی کی سزا یہ ہے کہ تم اب دکھ محسوس کر رہے ہو۔ تم اسے زنجیریں نہیں پہنا سکتے۔ اس نے جو اچھا سمجھا، وہ کیا۔ اس نے کوئی بے وفائی نہیں کی۔ ہر کوئی آگے بڑھنا چاہتا ہے، اک دوڑ لگی ہوئی ہے اور سٹپٹی نے اس راستے کو بہتر جانا اور بڑھ گئی۔ کل تم اس کشم آفسر سے بھی اچھے ہو جاؤ تو وہ گھر سے تمہارا دم بھرے گی۔ تو کیا اس صورت حال میں تم اس کو وفا کہو گے؟“ میں نے دیر سے دیر سے اسے سمجھاتے ہوئے سوال کر دیا۔ اس نے چمک کر میری طرف دیکھا، کتنی ہی دیر تک ہونٹوں کی طرح حیرت سے چہرے کو گھورنا رہا۔ تب میں بولا۔ ”ایک لمحے کو میں مان لیتا ہوں کہ عورت وفا کی دیوی ہے، اس کی سرشت میں وفا شامل ہے تو ٹھیک ہے، اس نے وفا کی اپنے مقصد کے ساتھ۔ وہ جو چاہتی ہے، اس کے ساتھ اس نے وفا کی ہے۔ وہ تمہارے ساتھ وقادار نہیں تھی سو تمہیں اس قابل بھی نہیں سمجھا اور نہ ہی اچ یہ ہے کہ تم اس قابل ہو بھی نہیں۔“

”کیا مطلب، میرے جذبے اس کے لیے۔۔۔“

”جذبات کو کون پوچھتا ہے۔ تمہارے جذبے اس کی سوچوں کا غم الہدیل نہیں ہو سکتے، نہ تمہارے جذبے نونوں میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اگر تمہارے پاس ملتا طیس ہے تو ہی تم لوہے کو کھینچ سکتے ہو۔“
”میں کیا کروں، بھائی! وہ میرے دل میں اتر چکی ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم ایک انتہائی کمزور شخص ہو، بزدل اور احمق ہو جو محض ایک عام ہی عورت کے سامنے ٹوٹ گئے ہو۔“
”میں ٹوٹا نہیں ہوں۔“ اس نے جلدی سے کہا۔

”تو یہ سب کیا ہے؟ ایک جھٹکے سے نکال باہر بھیجے گا تو اسے اور اتنی محنت کرو کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے آئے تو اسے اتنی شرم آئے کہ وہ اپنے لفظ بھلا بیٹھے۔“

”میں اب بھی اسے اپنے سامنے جھکا سکتا ہوں۔“

”انتقام لو گے اور وہ بھی عورت سے؟ نہیں، نہ یہ ایہ مردانگی نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، شجاع بھائی! جیسے آپ کو۔“

”مجھ پر احسان مت کرو، میرے کہنے پر نہیں، اپنے اندر کے شخص سے بات کرو۔“ میں نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تو وہ جیسے نیند سے جاگا ہو۔ کتنی دیر تک وہ گم سم بیٹھا رہا، پھر میرے سے منس دیا۔ تب میں نے کہا۔

”آؤ چلیں، جا کر آرام کرتے ہیں، صبح تم نے اک نئی زندگی کی شروعات کرنی ہیں۔“

”چلیں“ اس نے کہا تو میں نے ڈاراکے نمبر ملائے۔ فون اس کے ڈرائیور کے پاس تھا، میں نے اسے اپنے گھر جانے کے بارے میں بتایا اور ٹیکسی لے کر سن آباد جا بیٹھا۔

اگلی صبح میں اور ندیم اکٹھے دفتر پہنچے۔ ظفر تازہ اپنے کمرے میں ہی تھا۔ میں نے ندیم کو اس سے ملوایا۔ وہ دونوں شناسا تھے۔ کچھ دیر گپ شپ کے بعد ندیم بینک میں آ بیٹھے، تبھی حسن نے مسکراتے ہوئے ایک اخبار میرے سامنے رکھا دیا۔ پھر ایک چھوٹی سی خبر جس پر دائرہ لگا ہوا تھا، اس پر اگلی رکھتے ہوئے بولا کہ اسے پڑھو۔ میں نے اسے دیکھا تو چونک گیا، بڑی تیز رفتاری سے۔

”ظفر تازہ ایک صحافی کے عشق میں گرفتار، جلد ہی شادی متوقع ہے۔“ دو کالمی خبر میں جو تفصیلات تھیں، وہ کچھ تو حسن کا گڑا ہوا جھوٹ تھا اور کچھ میرے اس کے ساتھ اسلام آباد جانے اور اس کے گھر میں رہنے کا ذکر تھا۔ براہ راست میرا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ میں نے خبر کا ذریعہ دیکھا تو وہ ایک دوسرے درجے کی ٹھوڑا بھنجی تھی۔ میں مسکرایا، ندیم نے وہ خبر دیکھی تو پوری مہمندی سے بولا۔

”میں اس کا جواب دیتا ہوں۔“

”نہیں، بچے! اس کو نظر انداز کر دو۔ اسے جتنی اہمیت دیں گے، بات اتنی ہی بڑھے گی۔ یہ جان لو کہ نظر انداز کر دینا سب سے بڑا انتقام ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے اخبار پرے پھینک دیا۔ ماریہ اس دن بھی نہیں آئی تھی، بینک ختم ہو گئی تو میں میگزین میں جا بیٹھا۔ پھر ان کے ساتھ بائیس کرتے ہوئے دوپہر داخل گئی۔ اس وقت میں حسن کے ساتھ پریس کلب جانے کی سوچ رہا تھا کہ آصف جو دھری کا فون آ گیا، اس نے مجھے فوراً پہنچے کو کہا تھا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد میں اس کے پاس تھا۔ وہ جیسے میرے انتظار میں تھا، مجھے دیکھتے ہی اٹھا اور مجھ سے گلے ملنے کے بعد بولا کہ آؤ میں اس کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ایک تہ خانے میں اتار گیا جہاں ایک عقوق سے بلب کی روشنی کانپ رہی تھی۔ سلین زدہ ہونے کی باعث ایک خاص قسم کی ٹونے ناگواری پیدا کر دی۔ اچانک میں نے دیکھا کہ وہیں پختہ فرس پر ایک شخص ادھم منہ پڑا تھا۔ قدموں کی چاپ سن کر اس نے سر اٹھایا۔ میرے لیے وہ اجنبی چہرہ تھا۔ میری طرف دیکھ کر وہ بری طرح چونک گیا، پھر اضطرابی انداز میں اٹھ بیٹھا۔ آصف نے جاتے ہی ایک شوکر ماری اور کہا۔

”بولو، تم اس شخص پر قاتلانہ حملے کیوں کیے؟“

”وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ مجھے ملک منیر نے انہیں محض دھمکانے کے لیے بہت بڑی رقم دی تھی۔“

”ملک منیر کون ہے اور اس نے کیوں ایسا کیا؟“

”میں بتا چکا ہوں گی، کہ وہ بزنس من ہے اور ایسا اس نے اپنی مگتیر کے کہنے پر کیا ہے۔ میں اسے ہی جواب دہ تھا۔ وہ مجھے فون پر ہدایت دیتی تھی اور جو کرتا تھا اسے بتا دیتا تھا۔“

”تم نے اسے دیکھا نہیں، جانے نہیں ہواس کے بارے میں؟“

”میں ملک منیر کے پاس ہی ایک دفعہ ملا تھا اس لڑکی سے، ویسے میں اس کے بارے میں جانتا ہوں۔“

”کون ہے وہ؟“ آصف نے پوچھا تو میرادل دھڑک اٹھا۔

”وہ جی، انجی کے اخبار میں کام کرتی ہے۔ ماریہ نام ہے اس کا۔“

”ماریہ۔۔۔ اے بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔ میں سشدرہ گیا کہ ماریہ ایسی حرکت کر سکتی ہے، وہ اتنا آگے بڑھ جائے گی؟ وہ ایسا

کیوں کر رہی ہے اس کا تو مجھے پتہ تھا لیکن اتنا کہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کروا دے، میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ میں سوچوں کی اقتداء گہرائیوں میں ڈوب کر رہ

گیا۔ جی آصف نے کسی کو زور سے پکارا تو میں چونکا۔ لہجوں میں ایک گرائڈ مل شخص وہاں آن موجود ہوا، آصف نے اس لیے ہونے شخص کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”اسے لے جاؤ اور۔۔۔“ یقیناً اس نے اس شخص کو قتل کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ جی میں بولا۔

”نہیں، آصف! ابھی ٹھہرا اسے ایک دو دن رکھو۔“

”کیا کرنا ہے رکھ کے، یہاں سزا دے دے گا۔ اب اس کی جگہ ملک منیر کا بھی تو آنا ہے اور پھر وہ ماریہ۔۔۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولا تو میں

نے اچھے ہوئے اعزاز میں کہا۔

”آصف! میں نے کہا نا، ذرا رکھو، مجھے سوچنے دو۔ ابھی تم کچھ نہیں کرو گے۔“

”اوکے، آؤ، اوپر چلے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ سزا تو وہ زمین پر پڑا شخص صبح اٹھا۔

”مجھے معاف کر دو، چودھری! مجھے نہیں پتہ تھا کہ یہ آپ کا بندہ ہے۔“

”بندہ نہیں، بھائی ہے میرا۔۔۔“ آصف نے انتہائی درشت لہجے میں کہا۔

”میں وعدہ کرتا ہوں کہ خود ملک منیر کو۔۔۔“

”کیوں نہیں کرو۔ آؤ، شجاع!“ اس نے کہا اور ہم اوپر آگئے۔ میں کافی دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ میں انتہائی شاک میں تھا۔ میرے

سامنے کھانا بھی رکھا گیا مگر مجھ سے کھایا ہی نہیں گیا۔ میں سکرٹ سگائے ماریہ کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ اس نے مجھے موجودہ معاملات کے

بارے میں پوچھا تو میں نے کہا۔

”ابھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ ایسا کیوں ہوا یا ہمیں کیا کرنا ہے، یہ میں تمہیں کل بتاؤں گا۔“

”کوئی بات نہیں، ابھی تم جاؤ اور ہاں، خود کو سنبھالو۔“ اس نے ہنستے ہوئے ہاتھ ملایا تو میرے ذہن سے کافی حد تک بوجھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔

میں ذہنی طور پر مطلق ہو چکا تھا۔ میں خود کو سکون دے کر ہی سوچنا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا اس وقت زارا ہی ہے جو مجھے پر سکون کر سکتی

ہے۔ اس لئے میں نے اسے فون کیا۔ وہ گھر پر تھی۔ جلد ہی میں زارا کی کوشی کے سامنے پہنچی گیا اور گیٹ کھلنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس سے پہلے کہ گیٹ

کھلتا، اچانک مجھے خطرے کا احساس ہوا۔ میں نے اپنے دائیں طرف دیکھا، ایک موٹر سائیکل پر دو نوجوان سوار تھے۔ پھر میں نے پیچھے بیٹھے ہوئے لڑکے کو گن سیدھی کرتے ہوئے دیکھا۔ لاشعوری طور میں نے اپنا سر نیچے جھکا لیا، تبھی فائرنگ سے ماحول بترق گیا۔ فائرنگ کی آواز بھی ہوا میں تحلیل نہیں ہوئی تھی کہ مجھے اپنے کانہ سے میں جلن کا شدید احساس ہوا، لہجوں میں اس جلن نے میرے بدن میں آگ لگا دی۔ مجھے یوں لگا جیسے آگ میرے جسم میں سرایت کر گئی ہے۔ اس جلن کی اذیت اس قدر تھی کہ مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہوا، ایک تاریکی تھی جو میرے دماغ پر چھاتی چلی جا رہی تھی۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر میرے ہر طرف اندھیرا پھیل گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا، سب کچھ تاریکی میں ڈوب گیا تھا۔

مجھے ہوش آیا تو سب سے پہلے میرا دماغ بیدار ہوا۔ لہجے کی طرح کی سوچوں کے باعث مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دھیرے دھیرے میرے شعور نے ان سوچوں کو تحلیل کر دیا اور واضح خیالوں نے مجھے سب کچھ یاد دلایا۔ میرے ارد گرد سناٹا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ لوگ جس طرح حملہ آور ہوئے تھے، اس سے یہی کہا جاسکتا تھا کہ وہ مجھے زندہ چھوڑنے والے نہیں تھے۔ ہو سکتا ہے، وہ مجھے اپنی طرف سے ختم کر کے ہی گئے ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں بچ گیا ہوں مگر میں ہوں کہاں؟ سوچ کی اس تیز لہر نے مجھے آنکھیں کھولنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو خود کو بیلڈ پر پڑے ہوئے پایا، جلد ہی مجھے احساس ہو گیا کہ میں ہسپتال میں ہوں۔ جی مجھے اپنی زندگی بچ جانے کا احساس ہوا تو میرا اللہ کے حضور جھک گیا، وہی زندگی دینے والا ہے اور موت بھی اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ میں نے اپنے ارد گرد دیکھا، وہاں کوئی نہیں تھا۔ میں پھر سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ شاید وہ انہیوں کی وجہ سے مجھے تکلیف کا احساس نہیں ہو رہا تھا، تاہم اوپری دھڑکنوں میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ اپنی طرف سے مجھے مار کر پھینک گئے تھے لیکن زندگی تھی کہ میں بچ گیا۔ کیا یہ حملہ بھی مارے نے ہی کر دیا ہے؟ اس خیال کے آتے ہی میں بے چین ہو گیا۔ میں آصف چوہدری کو کھٹکتا تھا، اسے اگر اس واقعہ کی خبر ہو جاتی تو اب تک جو بھی اس کے مجھے چڑھا، پہلی فرصت میں اسے ختم کر کے ہی اسے جہنم ملتا تھا۔ اس کا یہ رد عمل میری وجہ سے ہی ہونا تھا۔ اس سے یہ امید بھی نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ کسی کو صاف کرے اور یہ ناممکن تھا کہ مجھ پر کاٹھانہ حملے کی اطلاع اس تک نہ پہنچی۔ جب میرا گھر جلا تھا اس وقت اس کے لیے میں جو کاشی جھٹک رہی تھی، مجھے معلوم تھا کہ وہ بہت ہی خطرناک تھی۔ اب جبکہ میں ہسپتال میں پڑا تھا۔ اسے جیسے ہی اطلاع ملتی تو وہ اسے پاگل کر دینے کے لیے کافی تھی۔ پتہ نہیں، وہ کیا کرے گا؟ مارے ایک عورت تھی اور میں کسی بھی عورت سے انتقام لینے کو مرادگی خیال نہیں کرتا تھا جبکہ آصف چوہدری! میں اس کا ہاتھ کسی طور بھی نہیں روک سکتا تھا۔ اس وقت یہی خیال میرے دماغ میں پھیلنے چلے گئے، انہی خیالوں نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ میں اسی وقت آصف چوہدری کو فون کرنا چاہتا تھا۔ میری بے چینی حد سے بڑھی تو میں پکارا تھا۔

”کوئی ہے؟“ میری آواز کی بازگشت میں سفید براق لباس میں ملبوس نرس مجھ پر آن بھگی، اس نے نہایت ملامت سے کہا۔

”کیا بات ہے، بولیں؟“

”مجھے فوری طور پر ایک فون کرنا ہے کسی کو بھی بلاؤ، کچھ بھی کرو لیکن فوری۔۔۔“

”دیکھیں! آپ تقریباً چھ گھنٹے بے ہوش رہے ہیں اور ابھی آپ ہوش میں آئے ہیں، آپ آرام کریں۔“

”میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے فون کرنا ہے۔ جاؤ، تم ڈاکٹر کو سمجھو، نہ مجھے خود ریڈ سے اٹھنا پڑے گا۔“ میرے لہجے میں انتہائی سختی تھی جسے سن کر نرس کے چہرے پر گھبراہٹ طاری ہوئی، اس نے زبردستی اپنے چہرے کو خوشگوار بناتے ہوئے کہا۔

”آپ۔۔۔ آپ سکون سے لیٹے رہیے، میں ابھی ڈاکٹر کو بلا کے لاتی ہوں۔“

”جلدی جاؤ۔“ میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

چھ گھنٹیں وہ کون سا ہسپتال تھا۔ میرے یہاں ہونے کے بارے میں کسی کو پتہ بھی ہے کہ نہیں، پھر مجھے یہاں کون لایا ہوگا؟ میں تو زارا کے پاس گیا تھا اور ابھی اس کے دروازے پر تھا کہ یہ حادثہ ہو گیا۔ نرس نے کہا تھا کہ میں چھ گھنٹے بے ہوش رہا ہوں، اس کا مطلب ہے کہ اب صحت کا پہلا پیمانہ ہو جانے والا ہوگا۔ میں نے یہ سب ذہن پر زور دے کر سوچا تو مجھے تھکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ مجھے لگا جیسے دماغ بے قابو ہو رہا ہے۔ میں نے ذوقی ہوئی نظروں سے دیکھا، سفید اور آل میں ملیں ڈاکٹر کے ساتھ حسن کھڑا تھا، اس کے پیچھے زارا اور پھر نرس تھی۔ ڈاکٹر نے میری دیکھی اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ آپ کی زندگی بچ گئی، اب آپ خطرے سے نکل آئے ہیں اس وقت آپ کو سکون کی ضرورت ہے، آپ آرام کیجیے۔“

”ڈاکٹر! مجھے ایک فون کرنا ہے، وہ بھی فوری، پلیز!“

”کرنا دیں گے فون، آپ اپنے ذہن پر زور نہ دیں۔“

”ڈاکٹر! میں پاگل ہو جاؤں گا، اگر مجھے فون نہ ملا تو۔۔۔“ میں نے اضطرابی انداز میں اٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا تو حسن جلدی سے آگے بڑھ کر بولا۔

”کیا کرتے ہو، جان جی! لیٹے رہو، میں دیتا ہوں تمہیں فون۔۔۔“ حسن نے مجھے بہلا دیا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ مجھ پر کیا بیت رہی

ہے۔ میں اس وقت دہرے مذاق میں جتنا تھا۔ نرس انجکشن جا کر کر کے کھڑی تھی، وہ مجھے بہلا دیا۔ کرینڈا کا انجکشن دینے والے تھے۔ یہ خیال آتے ہی میں نے کہا۔

”ڈاکٹر! آپ کو نہیں پتہ کہ میں کس کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ پلیز، میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں اتنی گھنٹیں ہوں کہ آپ کی بات

نہ مانوں۔“ میں نے انجکشن کی طرف دیکھ کر ڈاکٹر سے کہا۔ سچی حسن نے ڈاکٹر کے کاندر سے پر ہاتھ رکھا، اس نے نرس کو اشارہ کیا تو وہ ایک طرف ہٹ گئی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد مجھے فون دیا گیا۔ میں نے آصف چوہدری کے نمبر ملائے تو کچھ لمحوں بعد اس کی آواز بھرتی۔

”میں شجاع بات کر رہا ہوں۔“

”او، شجاع! تمہیں ہوش آ گیا، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے۔ کہاں سے، کیسے فون کر رہے ہو؟“ اس نے خوشی اور حیرت کے طے طے لہجے میں

تیزی سے پوچھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ میرے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں اسے پتہ چل چکا ہے ایک خوف میرے اندر سرایت کر گیا،

تھی اس نے کہا۔ ”یولو، شجاع؟“

”آصف! تمہیں میرے بارے میں کیسے پتہ چلا؟“ میں نے ظہرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اس وقت جب وہ لڑکے تم پر گولی چلا کر بھاگ رہے تھے، میرے آدمیوں نے انہیں پکڑ لیا اور اب تک ان کی لاشیں بھی ٹھکانے لگ چکی ہوں گی۔“ وہ انتہائی سرد لہجے میں بولا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”تم پر کوئی گولی چلائے اور مجھے معلوم ہو جائے، میں کیسے اسے برداشت کر لوں؟ وہ جسے تم نے تہ خانے میں دیکھا تھا، وہ بھی انہی کے ساتھ گیا تھا۔ بس ملک منیر کی حماس جاری ہے، جلدی وہ بھی مل جائے گا۔“

”نہیں، آصف! خون نہیں بہاؤ، چھوڑ دو ملک کو۔۔۔ میں۔۔۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا۔“

”کیوں نہیں کرو، تمہارا کام صرف یہی ہے کہ جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ۔“ وہ بولا۔

”دیکھو، تم جو کچھ بھی کرو، میں تمہارا ہاتھ نہیں روک سکتا لیکن تم نے ماریہ کو کچھ نہیں کہنا، وعدہ کرو مجھ سے۔۔۔“ میں نے نرم سے انداز میں اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم، وہی اس سارے فساد کی جڑ ہے اور اسے چھوڑ دوں؟“ اس نے بخوشی سے کہا۔

”ہاں، اسے تم کچھ نہیں کہو گے۔“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”مگر کیوں، شجاع؟“ اس کے لہجے میں خصلی حیرت تھی۔

”وہ میرا شکار ہے، میں ہی اسے خود اپنے ہاتھوں سے، میری بات سمجھ رہے ہو، نا؟“ میں نے آصف کی نفسیات کو سمجھتے ہوئے ایک دوسرے طریقے سے اسے روکنا چاہا۔

”ٹھیک ہے، لیکن ملک منیر؟“ گویا اس نے وضاحت چاہی۔

”وہ تمہارا اختیار ہے۔“ میں نے کہہ دیا تو وہ مجھے اپنا خیال رکھنے اور جلد از جلد تندرست ہو جانے کے بارے میں کہتا رہا۔ مجھے شدید فاقہت محسوس ہونے لگی تھی سو میں نے فون بند کر دیا، جلدی نرس نے مجھے انجکشن لگا دیا اور پھر میں نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ فطری طور پر اس وقت چاہئے

مجھے یہ تھا کہ میں پوچھتا، ہسپتال تک مجھے کون لایا ہے اور میں کس حالت میں تھا۔ مجھے کتنی گولیاں لگیں، میرا خون کتنا بہا اور گاڑی کو کس قدر نقصان پہنچا لیکن اس وقت آصف چوہدری کو فون کرنے کی دھم اس قدر سوار ہوئی تھی کہ جس نے میرا داغ باؤف کر کے رکھ دیا۔ میری بے چینی صرف اور صرف

اس لیے تھی کہ میں ان لوگوں کو پہالوں جو آصف چوہدری کے ہتھے چڑھ چکے تھے مگر اس نے جلد بازی کی۔ وہ لوگ اس قدر قصور وار نہیں تھے، انہیں کوئی بھی استعمال کر سکتا تھا۔ اصل قصور وار تو ماریہ تھی جس کے ایماء پر ملک منیر نے مجھ پر کاٹنا شروع کر دیئے تھے۔ ماریہ سے میرا تعلق

میرے ہانسی کا وہ حصہ تھا جسے سوچتے ہوئے یاد ہراتے ہوئے مجھے کوئی محسوس ہوتی تھی۔

دوسری بار جب مجھے ہوش آیا تو کمرے میں خاصی روشنی تھی۔ میں نے روشنی کے منبع کی جانب دیکھا تو کمرے سے پردہ ہٹا ہوا تھا اور اس کے پاس زارا اخبار چڑھ رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے جلدی سے اخبار سمیٹا اور میری طرف بڑھ کر اپنا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا۔ پھر بڑے نرم لہجے میں بولی۔

”کیسی طبیعت ہے؟“

”ٹھیک ہوں اور تمہارے سامنے ہوں۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ پھر چپک کر بولی۔

”میں ذرائع کو انعام کر دوں، ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ تیزی سے نکل گئی اور میں آنکھیں بند کر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد گفتگو سے چہرے والی

نرس آن ہو چڑھ ہوئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا، پی پی دیکھا، دو چار باتیں کیں اور واپس لوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی زارا آگئی، آتے ہی بولی۔

”آپ ذرا سا اٹھ کر بیٹھ جائیں تو میں آپ کو کھانے پینے کے لیے دوں۔ پھر اس کے بعد آپ نے دوائی لینی ہے۔“ میں نے اس کی

طرف دیکھا، اس کے لہجے میں انتہائی خلوص اور سادگی تھی۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو درد کی ایک لہر سے میرا جسم سمجھنا اٹھا۔ میں پے پس سا ہو کر پڑا

رہا، تب اس نے مجھے سہارا دے کر اٹھایا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ لیکن یہ سوال میں زبان پر نہیں لایا۔ وہ اپنے

ساتھ کچھ چیزیں بنا کر لائی ہوئی تھی۔ میں وہ کھا رہا تھا کہ ڈاکٹر دو نرسوں کے ساتھ آگیا، ریکی سی باتوں کے بعد اس نے مجھے دوائی دی اور چلا گیا۔

جب میں اور زارا اٹھا رہے تو میں نے اس سے پوچھا۔

”تم، میرے مطلب ہے، دوسرے لوگ بھی تھے۔“

”میں سمجھ گئی، آپ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ فی الحال تو میں ہوں، میں نے ہی سب کو کہا ہے کہ وہ بعد میں آجائیں۔“

”اوہ، میں ہسپتال کیسے پہنچا؟“ تاخیر سے ہی سہی، ایک ضروری سوال میرے لب پر آ گیا۔

”میں آپ کا انتظار کر رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں گیٹ کی طرف آگئی تاکہ جو کیدار کو بتا دوں۔ ابھی جو کیدار نے گیٹ کا بولٹ کھولا ہی تھا

کہ فائرنگ کی آواز گونج اٹھی۔ میں حواس باختہ ہو گئی، مجھے سمجھ نہ آیا کہ میں کیا کروں؟ آپ کو کوئی لگ چکی تھی۔ میں پھر کاہت بنی رہی۔ تبھی نبھانے دو

آدی کہاں سے نکل آئے، انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میرے گھر میں گاڑی ہے؟ اس وقت مجھے ہوش آیا۔ میں نے انتہائی تیزی سے گاڑی نکالی۔ وہ

لوگ آپ کو گاڑی سے نکال چکے تھے۔ اتنے میں وہاں کئی لوگ اکٹھے ہو گئے۔ ان دو آدمیوں نے آپ کو گاڑی میں ڈالا۔ میں گاڑی سے باہر آ چکی

تھی۔ انہوں نے مجھ سے کچھ نہ پوچھا اور آپ کو لے کر ہسپتال چلے گئے۔ پھر بعد میں جب وہ گاڑی چھوڑنے آئے تو میں نے ہسپتال کے بارے میں

پوچھا۔ اس وقت تک پولیس آپ کی گاڑی لے جا چکی تھی۔“

”کتنی گولیاں لگی ہیں مجھے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”ایک، وہ بھی کندھے میں گھس کر نکل گئی اور دوسری مس کرتی ہوئی گزری ہے۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر چونک کر میری طرف دیکھا اور

کہا۔ ”یہ مجھے ڈاکٹر سے پوچھا ہے، اب آپ کی حالت قطعاً خطرے سے باہر ہے۔“

”خیر، یہ ہونا تھا، وہ ہو گیا لیکن میرے بارے میں۔۔۔“ میں نے کہا جاتا تو ہسپتال کے محلے کے لوگ آگئے انہیں شاید چٹیاں تبدیل کرنا تھیں۔

میں چار دن ہسپتال میں سوتا جاگتا رہا جس کا باعث نیند کے انجکشن تھے، دو انہیں تھیں۔ میں جب اٹھتا، کوئی نہ کوئی دوست میرے پاس ضرور ہوتا۔ حسن، ندیم، عامر، ذرا اور ایک دن نائلہ۔ مجھے معلوم ہوا تھا کہ ماہی آئی تھی لیکن اس وقت میں نیند میں تھا۔ انہی چار دنوں میں ایک دن پولیس انسپکٹر بھی آیا، وہ اپنے تفتیشی انداز میں مجھ سے باتیں کرتا رہا۔ وہ مجھ سے پوچھنا یہ چاہ رہا تھا کہ مجھ پر حملہ کس نے کیا اور میں اپنی بات پر قائم رہا کہ مجھے نہیں پتہ۔ یوں ذہنی اور جسمانی کوفت کے چار دن گزرنے کے بعد میں ہسپتال سے گھر چلا آیا۔ نبجانے کیوں میں نے گھر پہنچ کر سکون محسوس کیا۔ ہسپتال میں میری گھبراہٹ اچھے طریقے سے ہو سکتی تھی، یہ محض میری سوچ تھی جیسے ہی میں گھر آیا تو میری دیکھ بھال کرنے والے کئی سارے تھے۔ جب بھی جسے فرست لیتی، وہ سیدھا میرے گھر آ جاتا۔ اس سارے دور ایسے میں عامر نے سب سے زیادہ وقت دیا۔ میرے دوستوں میں اتنی سمجھ تھی کہ میرے آبائی گھر تک اس واقعہ کی اطلاع نہیں پہنچے دی تھی۔ نائلہ تو میرے ہاں ہی اٹھ آئی تھی۔ اس وقت بھی وہ میرے پاس تھی اور اس نے سوال کیا تھا کہ حملہ آور کون تھے۔ میں نال گیا تو کافی بنانے چھے گئی۔

میں اسے غلط نہیں میں نہیں رکھنا چاہتا تھا لیکن سچائی بھی کسی کو نہیں بتا سکتا تھا، یہاں تک کہ حسن اور عامر جیسے برعکس دوستوں پر بھی یہ راز آشکار نہیں کر سکتا تھا۔ میں کیا کروں؟ کتنے ہی لمحے اسی خیال کے تحت گزر گئے۔ پھر میں نے خاموش رہنے کا ہی فیصلہ کر لیا۔ اس وقت نائلہ کافی لے کر آگئی اور وہ جھجک دے کر سامنے والے صوفے پر اتنی پالتی مارے بیٹھ گئی۔

”بہت مزیدار کافی ہے۔“ میں نے تعریف کی تو نائلہ شوخی سے بولی۔

”ایک چکی تو سبکی ہے میں نے کیونکہ یہ میری ضرورت ہے۔“

”لگتا ہے تمہارے دو جوڑی خوبصورتی کا راز بھی سبکی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر ایسی ہی کئی کئی باتوں میں کافی پی لی تو نائلہ بولی۔

”آپ آرام کرو، میں ذرا کھانا بنا لوں۔“

”ارے واہ، آج کوئی خاص اجتام ہے؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”جی۔ آپ کو مظلوم ہونا چاہئے کہ آج حسن کا آف ہے اور عامر جی بھی یہیں پہنچ کریں گے۔ وہ لاڈلہ راتوا تھا ماہر نہیں ہے، میں نے مسز

خان سے درخواست کی ہے اور سب کچھ اور مسز خان کے ہاں بن رہا ہے۔“

”اب یہ دن بھی آگئے ہیں کہ تمہارے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا پڑے گا۔“ میں نے مصحوبیت سے کہا تو ہم دونوں ہی ہنس دیئے۔

”نہ ہا ہا! میں تو اپنے پکائے ہوئے کھانے کا خورد یک نہیں لیتی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے کافی کے خالی گگ اٹھائے اور کمرے سے باہر

چلی گئی۔ اک سکون سا چھا گیا۔ میں سو گیا اور اس وقت جاگا جب۔ حسن اور عامر بھی آگئے تو نائلہ نے کھانا لگوادیا۔

میرے ذہم بھرنے میں تقریباً تین منٹے لگے۔ اس دوران میرے گھر میں دوستوں کا یوں میلہ لگا رہا کہ مجھے تہائی کا ذرا بھی احساس نہیں

ہوا۔ نائلہ مستقل میرے پاس رہی، شام ہوتے ہی ڈاکٹر بی بی بدل جاتا، مقامی تھانے کا انچارج بھی دو تین بار ملنے آیا۔ اسے حملہ آوروں کی تلاش تھی جبکہ وہ تو کب کے ٹھکانے لگ چکے تھے۔ میں نے جو ہسپتال میں بیان دیا تھا، وہی رہا کہ مجھے نہیں معلوم، وہ کون لوگ تھے۔ ندیم کا معمول تھا کہ وہ شام ڈھلے روز آتا۔ آصف چوہدری کا میرے ساتھ فون پر ہی رابطہ رہا۔ میرے دوستوں کی وجہ سے میرے آبائی گھر کے کسی فرد کو پتہ نہیں چلا تھا۔ سوائے میرے دوست حیدر شیخ کے، مگر وہ میرے آبائی شہر میں نہیں بلکہ روہی میں تھا۔ اسے میرے ہارے معلوم ہوا تو میں نے اسے سختی سے منع کر دیا کہ وہ میرے گھر والوں کو نہ بتائے۔

”تو پھر تیرے پاس ہے کون؟ تیری دیکھ بھال کون کرتا ہے۔“

”تیرا کا مطلب ہے میں یہاں جنگل میں ہوں۔ میرے گھر میں تو دوستوں کا یوں میلہ لگا رہتا ہے۔ وہ سب میری دیکھ بھال بہت اچھی طرح کر رہے ہیں۔“

”دیکھو اگر ایسی بات ہے تو بتاؤ، میں آجاتا ہوں۔“

”ویسے اگر تمہارا دل چاہو رہا ہے تو آ جاؤ، لیکن صرف میرے لیے نہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اُسے یہاں کی صورت حال کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ پھر وہ گاہے بگاہے فون کرتا رہا۔

اُس دن میں تین ہفتوں کے بعد اٹس گیا تھا۔ میری غیر حاضری میں خضر تارڑ نے خامی تہدی علی کی تھی۔ ماریہ پھر دفتر نہیں آتی تھی اور نہ ہی کوئی اطلاع تھی کہ اس وقت وہ کہاں ہے؟ ایک عجیب محمود سا طاری ہو کر رہ گیا تھا، یوں جیسے طوفان کے بعد ماحول شانت ہو جاتا ہے۔ اگرچہ ہر چیز ٹھہری ہوئی اور واضح تھی مگر کچھ بھی کرنے کوئی نہیں چاہ رہا تھا۔ پورے دن میں نے دفتر میں کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا، بس لوگوں سے ملتا رہا اور گپ شپ چلاتی رہی۔ اس وقت میں بیچرین سیکشن میں نوید درانی سے باتیں کر رہا تھا کہ ندیم آ گیا۔ اگرچہ اس نے صاف سحرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ بال بھی سنوارے ہوئے تھے، جو تا بھی قیمتی پہنا ہوا تھا لیکن وہ فریٹش نہیں لگ رہا تھا، صاف سحرہ ہونے کے باوجود دست ست اور بجا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ میں نے ایک ہی نظر میں اس کا جائزہ لیا اور نوید درانی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔ پھر چینی دیر تک ہم باتیں کرتے رہے، وہ خاموش رہا۔ نوید کے چلنے جانے کے بعد میں نے مسکراتے ہوئے ندیم سے پوچھا۔

”کیا بات ہے، میری جان اسے اس کیوں ہو؟“ میرے اس طرح کہنے پر وہ دیرے سے مسکرایا لیکن اس کی آنکھوں میں وہی ویرانی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ آہستہ سے بولا۔

”بس یونہی شہام بھائی اکام زیادہ ہے نا، آج کل اور پھر بڑا اخبار مل گیا ہے تو محنت زیادہ کر رہا ہوں۔“

”مگر تم ویل ڈر سٹ نہ ہونے کے باوجود بڑے تھکے تھکے سے لگ رہے ہو؟“

”میں نے کہا نا، آرام کے لیے وقت تو ہوا ملتا ہے۔“ اس نے دیرے سے مسکراتے ہوئے کھوکھلے سے لہجے میں کہا تو میں نے اسے حریف چہرہ نامناسب خیال نہیں کیا، بات بدلنے ہوئے پوچھا۔

”آج کل کام کیسا اچل رہا ہے؟“

”ہائل ٹھیک، ہاں، آپ کو زارا بہت یاد کر رہی تھی۔ رات اس سے خاصی گپ شپ ہوئی تھی۔“ اس نے اسی لہجہ میں عام سے انداز میں کہا۔

”وہ آگئی ہے شمالی علاقے سے؟“

”وہاں شوٹنگ ہو گئی ہے، کہہ رہی تھی کہ آپ چاہیں تو فون کر لیں۔“

”وہ خود فون کر لیتی؟“ میں حیران ہوتے ہوئے پوچھا

”میں نے بھی کہا تھا مگر وہ آپ کی طبیعت کی وجہ سے کہہ رہی تھی کہ جب آپ فریش ہو جائیں۔“

”چلو ٹھیک ہے، ہل لیں گے اس سے، آؤ، ذرا تھوڑی دیر کے لیے باہر نکلیں۔“ میں نے اکتائے ہوئے انداز میں کہا اور اٹھ گیا۔ میں واقف

اس وقت کھلے ماحول کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ اس وقت سورج ڈوب رہا تھا جب ہم باغ جناح میں ایک سٹی بیچ پر چاہٹھے، پھر لوٹنے والوں کے دوران اچانک ندیم نے کہا۔

”آپ کچھ دنوں کے لیے اپنے آبائی قصبہ کیوں نہیں چلے جاتے؟“

”یہ کیا بات کہی تم نے؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”یونہی، دل چاہ رہا تھا کہ میں بھی آپ کے ساتھ کچھ دنوں لاہور سے باہر رہوں۔ یہاں دل بہت تنگ ہے۔“

”اوہ، میں سمجھا۔“ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا پھر بولا۔ ”ندیم! اگر کوئی بات ہے تو بولو۔۔۔“ میں نے پوچھا تو ٹھی سی

مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

”بس، شجاع بھائی! ہمارے کا دکھ مجھے بے چین کیے ہوئے ہے، اور کوئی بات نہیں۔“

”مجھے تفصیل سے بتاؤ گے؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”آپ کو تو پتہ ہے، وہی سہلی۔۔۔“ اس نے اشارہ میں اپنی پوری بات کہہ دی۔

”تم اس کا روگ کیوں پال رہے ہو۔ کہیں عشق۔۔۔“

”نہیں۔۔۔“ اس نے سختی سے تردید کرتے ہوئے کہا، پھر دھیرے سے بولا۔ ”میں نے پہلے ہی آپ سے کہا ہے کہ میں اس سے کوئی

عشق و شوق نہیں کرتا۔ اصل میں بات یہ ہے کہ وہ مجھے ایک لٹو بیچ کی طرح استعمال کر گئی۔ میں اور آپ کس قدر غلطوں سے اس کے مستقبل کے بارے

میں اچھا سوچ رہے تھے لیکن وہ اس قدر اپنا رنگ بدل جائے، میں نے سوچا بھی نہ تھا۔ کبھی میں سوچتا ہوں کہ میں نے اس کے لیے اتنا اچھا کیوں

سوچا تھا؟ میں قطعاً غلط نہیں تھا۔ پھر..... پھر کہاں ایسی بات.....“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ بیگم گیا۔

”دیکھو، پیارے! تم ایسا کیوں سوچتے ہو اور تمہیں کون کہتا ہے کہ تم ہارے ہو۔ تم تو جیتے ہو۔ تم نے اس کے لیے اچھا سوچا، اس کی مدد کی۔

اس میں کہیں بھی مطلب یا غرض نہیں تھی۔ تم نے ایک اچھا انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ وہ کم طرف تھی جو ایک اچھے انسان کو نہ سمجھ سکی اور انسانیت کے

معیار سے نیچے گر گئی۔ میرے پیارے! ہار شجب ہوتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتی کہ وہ کہاں پڑ رہی ہے۔ وہ عبادت گاہ کے صحن میں بھی پڑتی ہے اور کوزے کے ڈھیر پر بھی۔ تم نے تنگی کی کس سے کی، اسے بھول جاؤ۔ کیا تم اپنے اچھے سوچنے یا اس کے ساتھ تنگی کرنے کا ریٹرن لینا چاہتے ہو؟

”نہیں، میں نے تو اس وقت بھی کسی مقصد کے تحت۔۔۔“

”یہی ہے نا، وہ تمہاری زندگی میں آئی اور چلی گئی۔ تم نے اچھا سلوک کیا، یہ تمہارا ظرف ہے۔ اب اس میں ہارنے جیتنے کا سوال کیا؟ رتی بات کس نے تمہیں لٹو بچہ کی طرح استعمال کیا۔ تو یہ تمہاری سوچ کا فرق ہے۔ وہ جو خورد رومی کاغذ کی طرح ہواؤں کے دوش پر ہو۔ وہ بھلا کسی کہ کیا استعمال کر سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے، شجاع بھائی! وہ اب کبھی میری سوچ پر غالب نہیں آئے گی۔“ ندیم نے عزم سے کہا۔

”ہونا کئی ایسے ہی چاہیے، تمہیں بہت آگے جانا ہے۔ تمہیں ترقی کرنا ہے، اپنے لیے، اپنے گمراہوں کے لیے، سبھی جیسی لڑکیاں ہوا کی طرح آتی ہیں اور چپے ہلا کر چلی جاتی ہیں۔ تمہیں ایک تناور درخت بننا ہے، جو طوفانوں میں بھی ایسا تادہ رہے۔“

”شجاع بھائی! میں اب خود کو بہتر کرنے کی کوشش کروں گا۔“ اس نے شرمندگی سے کہا تو میں ہنس دیا۔ وہ تقریبی کینٹین سے سوڈا لانے کے لیے اٹھ گیا۔ پھر کتنی ہی دیر تک باتیں کرتے رہنے کے بعد ہم وہاں سے اٹھے تو میں نے زارا کی طرف جاتے کا ارادہ کر لیا۔

”آپ مجھے دفتر ڈراپ کر دیں۔“ ندیم نے کہا تو میں نے گاڑی کا رخ دفتر کی جانب موڑ لیا۔

زارا میرے انتظار میں ہی تھی۔ میں نے راستے سے فون کر دیا تھا، بہت دنوں بعد میں اس کے ہاں جا رہا تھا۔ میں نے گاڑی پورچ میں کھڑی کی تو اس کی ملازمہ نے بتایا کہ وہ بیڈروم میں ہے، آپ وہیں چلے جائیں۔ وہ بیڈ سے ٹیک لگائے، بجھل کر بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہلکے سے مسکرائی اور وہیں بیٹھے بیٹھے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور پاس دھری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

”خیریت تو ہے، زارا! اہل عجیب سے انداز میں بیٹھی ہو۔“

”بس ایسے ہی سگن ہورہی ہے اور پھر آج کوئی شوٹنگ بھی نہیں ہے، اس لیے کسلندی سے پڑی ہوں۔“

”اوہ میں نے سوچا کہ شاید تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہے بلکہ میں تو عداوت محسوس کر رہی ہوں۔ میری اگر کمنٹ نہ ہوتی تو میں خود آپ کی خدمت کرتی۔“

”شکر ہے، زارا! ویسے مجھے ذرا بھی تمہائی کا احساس نہیں ہوا۔ خیر چھوڑو، بتاؤ کیسی گزر رہی ہے آج کل؟“ میں نے لہجے کو خوشگوار بناتے ہوئے پوچھا۔

”اپنی کیا گزرتی ہے، سب ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ بس ایک پرابلم ہے۔۔۔“

”کیسی پرابلم؟“ میں نے پوچھا تو وہ چند لمبے بے خیالی سے انداز میں مجھے دیکھتی رہی پھر بولی۔

”کبھی قلمی چٹوٹوں کے بارے میں سنا ہے؟“

”ہاں! سنا ہے، کیوں، کیا ہوا؟“

”آپ کو تو پتہ ہے کہ یہاں بھی چند قبضہ گروپ موجود ہیں، بظاہر وہ کسی نہ کسی شعبے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن حقیقت ان کی بھی دلال کی سی ہوتی ہے، وہ بھی جسموں کا کاروبار کرتے ہیں لیکن ذرا اونچے درجے پر۔“ اس نے انتہائی تلخی سے کہتے ہوئے میری طرف دیکھا، پھر چند لمبے خاموش رہنے کے بعد بولی۔ ”ایسے دلال قسم کے فلمی پنڈت نئے نئے جسموں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایک جسم پر توجہ سے انویسٹمنٹ کرتے ہیں، پھر اس کی ٹرانس میں پورا زور لگا دیتے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں کیا پرابلم ہے؟“ میں نے آگے بڑھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ایسے ہی ایک فلمی پنڈت سے میری ان بن ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے، اس کی پوری لابی فلم انڈسٹری میں ہے اور وہ میرے خلاف متحرک ہو جائے گی۔“

”اور تمہاری لابی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کا سامنا کریں گے لیکن مجھے پتہ ہے، میرے لوگ بہت کمزور ہیں۔ کم از کم اس فلمی پنڈت کے مقابلے میں خاصے کمزور ہیں۔“

”کون ہے وہ؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”تعمیر کا فلمی۔ اوہ مجھ سے ایک فلم چھین کر ایک ایسے نئے چہرے کو دینا چاہتا ہے جس کے سر پر اس نے ہاتھ رکھ دیا ہے جبکہ وہ فلم میرے کیریئر کے لیے بڑی اہم ہے۔“

”تم نے کیا سوچا ہے؟“

”کچھ بھی نہیں۔ کوشش تو کروں گی کہ وہ ہاتھ سے جانے نہ پائے۔“

”ڈونٹ وری، ہزارا! میں اس کے لیے کچھ کروں گا۔“

”نہیں، آپ کچھ نہیں کریں گے۔ میری آپ سے کشفت یہی ہے کہ میں اپنے فلمی معاملات میں آپ کو کبھی۔۔۔“

”اوہ چھوڑو۔ تم نہ سہی، میں تو تمہارے کسی کام آنا چاہوں گا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ اذرا آزدہ ہو گئی۔ پھر بڑے سوجھے لہجے میں بولی۔

”شجاع! قسمت سے ہم ایک دوسرے سے آن ملے ہیں۔ میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی اور نہ ہی چاہتی ہوں کہ آپ میری وجہ سے کسی

پینشن کا شکار ہوں۔“

”اچھا، ایسی ہی باتیں کرتی رہو گی یا پھر کچھ کھانے دانے کا بندوبست بھی کرو گی؟“ میں نے ایک دم سے ماحول کو بدلنے کے لیے خوشگوار

لہجے میں کہا تو وہ مسکرا دی۔ پھر وہ بھی ایک دم ہی بدل گئی اور بدلے ہوئے لہجے میں بولی۔

”جناب! بے چارہ باورچی آپ کے فون آنے کے بعد سے ہی لیکن میں مصروف ہے۔“ پھر رات گئے تک ہم یونہی باتیں کرتے

رہے۔ اگلی صبح بڑے خوشگوار انداز میں ناشتہ ختم کر کے میں دفتر جانے والا تھا کہ آصف چوہدری کا فون آ گیا، اس کے لہجے میں شوقی تھی۔

”صاحب! کیا کر رہے ہیں؟“

”تاڑھے سے فراغت کے بعد دفتر جانے کی سوچ رہا ہوں۔ خیریت، آپ اتنی صبح جاگ رہے ہیں؟“ میں نے اسی کے انداز میں شوخی سے کہا حالانکہ اس وقت کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔

”تمہارا ایک مہمان رات ہی میرے ہاں پہنچا ہے، میں چاہتا تھا کہ تمہیں اس سے ملوا دوں۔“

”مطلب؟“ میں نے چونکتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہ ہے کہ تم ادھر میرے ہاں ہی آ جاؤ، تمہارا مہمان تم سے ملنے کے لیے بڑا بے تاب ہو رہا ہے۔“ اس نے پھر ہاتھ گول سی کی تو میں سمجھ گیا کہ وہ واضح طور پر کچھ نہیں بتائے گا۔

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔“ میرے اتنا کہنے کی دیر تھی کہ اس نے جلدی سے فون بند کر دیا۔ میرے ذہن میں جھکڑ چلنے لگے۔ میرا کون سا ایسا مہمان ہے جو اس کے ہاں آن ٹھہرا تھا؟ یقیناً وہ ماریہ سے ہی متعلق کوئی شخص ہوگا۔ وہ خود یا پھر ملک منیر، ان دونوں میں سے ایک ضرور تھا۔ یہ سوچتے ہی میرے خون میں تیزی آگئی۔ میں فوراً اس کے پاس کے پہنچ جانا چاہتا تھا۔ اس دن مجھے احساس ہوا کہ سڑک پر ٹریفک زیادہ ہوتی ہے۔ آصف چوہدری اپنے مخصوص کمرے میں صوفے پر پھیل کر بیٹھا ہوا تھا۔ مجھ کو دیکھتے ہی والہانہ میری طرف بڑھا، بڑی گرجھوشی سے گلے ملا اور پھر میرے ساتھ صوفے پر بیٹھا ہوا بولا۔

”بڑی جلدی پہنچ گئے۔“

”تاؤ، مہمان کون ہے؟“

”ملک منیر۔۔۔“ اس نے کہا تو میرے بدن میں اطمینان پھیل گیا۔ ”کیوں، تم کیا سوچ رہے تھے؟“

”میں سمجھا، کہیں تم رہے۔۔۔“

”تم نے خود ہی کہا تھا کہ وہ تمہارا شکار ہے اس لیے میں نے اس کو بھیڑا بھی نہیں۔ وہ اس کے ساتھ ہی تھی جب رات گئے اسے میرے بندوں نے گھیرا تھا۔“

”اب وہ کہاں ہے؟“

”بے ہوش کر کے گاڑی میں ہی چھوڑ دیا تھا۔ اس وقت ہو سکتا ہے، کہیں داویلا کر رہی ہو؟“ اس نے بڑے اطمینان سے کہا اور چند لمبے توقف کے بعد آصف بولا۔

”تم جانتے ہو، یہ ملک منیرم ہے کون؟“

”بس نام سنا ہے اس کا اور اتنا پتہ ہے کہ وہ ماریہ کا دور پارکا کزن ہے۔“ میں نے کہا

”جیسی تم اسے اتنی اہمیت نہیں دے رہے ہو۔ میں بتاتا ہوں تمہیں۔۔۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔“ یہ وہ ملک منیر ہے

جیسے ہم ٹوٹی بڑگنوا کے نام سے پکارتے تھے۔" اس نے کہا تو میں چونک جانا یعنی تھا۔ کالج دور میں وہ ہماری مخالف سیاسی پارٹی کا بہت اہم رکن تھا۔ ان دنوں اس کے پاس ٹریل مولر سائیکل ہوتی تھی۔ چونکہ وہ ایک امیر کبیر فیملی سے تعلق رکھتا تھا اس لیے بے تحاشا پیسہ خرچ کرتا تھا۔ اس وقت لڑنا بھڑانا اس کا محبوب مشغلہ ہوتا تھا۔ ایک لمبے گل والا بھڑا ہمیشہ اس کے پاس رہتا۔ سرخ و سفید رنگ اور لمبے بالوں کی وجہ سے ہم اسے ٹوٹی بڑگنوا کہتے تھے، پھر یہی نام زبان پر چڑھ گیا۔ میرے ذہن کے کسی خانے میں بھی نہیں تھا کہ وہ یہی ہو سکتا ہے۔ ہماری اس کے ساتھ ہمیشہ ان بن رہی تھی اور ایک بار وہ آصف چوہدری کے بھڑ گھونپ چکا تھا۔ "دیکھو، قدرت کس طرح دوبارہ ملاتی ہے۔" آصف نے میری حالت کا اندازہ کرتے ہوئے کہا۔

"کہاں ہے وہ؟" میں نے پوچھا۔

"ایک محفوظ جگہ پر، میں بھی اس سے نہیں ملا ہوں۔ میں نے سوچا، اکٹھے ہی ملیں گے۔"

"تو چلو پھر، دیر کس بات کی ہے۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو وہ بھی اٹھ گیا ہم تقریباً قالے کی صورت میں نکلے۔ میری گاڑی اس کا کوئی بندہ ڈرائیو کر رہا تھا اور میں اس کے ساتھ لینڈ کروزر میں تھا۔ ہم بند روڈ پر جا چڑھے، پھر جلد ہی ایک ایسی گلی کے سامنے جا پھرے جو خوبصورت بیلوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ ہمارے ساتھ آنے والے لوگ ادھر ادھر ہو گئے اور گلی میں موجود سمارٹ سے نوجوان نے ہمارا استقبال کیا۔

"ہمارا مہمان کیسا ہے، تنگ تو نہیں کیا اس نے؟" آصف نے پوچھا۔

"اس بے چارے نے کیا تنگ کرنا ہے، بس چگالی بہت کر رہا ہے۔" نوجوان ہنستے ہوئے بولا۔

"اُٹسکی۔۔۔" آصف نے غصے میں ایک غلیظ گالی دی اور پھر بغیر وقت ضائع کیے اس نوجوان کے ساتھ تہ خانے میں اتر گیا۔ بڑے عرصے بعد میں نے اسے دیکھا تھا۔ وہ بالکل بدلا ہوا تھا، کوئی بھی اس کے ماضی کے حوالے سے "ٹوٹی بڑگنوا" کے طور پر نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ اس وقت بہت ہی سوہنہ جسم کا برنس من لگ رہا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی وہ نکلے فرش سے اٹھ بیٹھا۔ میں نے واضح طور پر اس کی آنکھوں میں اجنبیت دیکھی، شاید اس نے ہمیں نہیں پہچانا تھا۔ سچی آصف نے کہا۔

"ہاں بھئی، ملک انجینئرنگ سکول سے آئی یہاں پر؟"

"کون ہو تم؟" اس نے سرسراتے ہوئے پوچھا

"تمہاری موت۔" آصف نے سرد سے انداز میں کہا۔

"کیوں، میں نے کیا بگاڑا ہے تمہارا؟"

"میں نے کبھی کسی بے گناہ اور مظلوم پر ہاتھ نہیں اٹھایا۔ تم نے بگاڑا ہے اس لیے یہاں پڑے ہو۔ یلو، تم نے شجاع پر قاتلانہ حملے کیوں کروائے۔ اسے کیوں مروانا چاہا۔"

"اوہ۔" اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

"وہ میری ٹیگتیر کو بلیک میل کر رہا تھا۔" اس نے کہا تو مجھے احساس ہو گیا کہ وہ مجھے شکل سے نہیں پہچانتا تھا۔

”کس سلسلے میں؟“ آصف نے پوچھا اور تیزی سے بولا۔ ”وہ اگر بلیک سیل کر رہا تھا تو تم اسے قتل کرنے چل پڑے؟“

”جب بات عزت پر آن پڑے تو پھر دشمن کو ختم کرنا پڑتا ہے۔“ اس کا اعتماد بحال ہو گیا تھا اس لیے بڑے مضبوط لہجے میں اس نے کہا۔

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ آصف نے کہا۔

”نہیں، میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ میں اپنی منگیتر سے بہت زیادہ کرتا ہوں مگر اس نے میرے ساتھ شادی سے انکار کر دیا تھا۔ میں نے

جب اس سے پوچھا کہ اس کی وجہ کیا ہے تب بہت عرصہ اصرار کے بعد اس نے بتایا کہ اس کی کچھ تصویریں شجاع کے پاس ہیں۔ ان کے مل بوتے پر وہ اس کی عزت سے کھیل چکا ہے اور آئندہ بھی وہ یہی چاہتا ہے تب مجھ سے نہیں رہا گیا۔“

”تو تم اسے قتل کرنے چل پڑے، یہ قصہ یقیناً تمہارے لیے اسی ہوا بھی ہے یا نہیں؟“ میں نے سختی سے کہا تو اس نے میری طرف غور سے دیکھا۔

وہ چند لمبے میری طرف دیکھتا رہا۔ جیسے پچھاننے کی کوشش کر رہا ہو تبھی میں نے مزید کہا۔ ”ملک منیر! تمہیں اس عورت نے بہت بڑا ہموکا دیا ہے۔“

”اب تم لوگ کیا چاہتے ہو؟“ اس نے میری بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری موت“ آصف نے پھر سڑکی سے کہہ دیا تو اس کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے۔

”دیکھو، ہم ذلیل کر لیتے ہیں۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ کبھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھوں گا۔ اس کے عوض آپ جو چاہیں۔“

”میں نے پوچھا تم سے صرف یہی تھا کہ شجاع سے تمہاری کیا دشمنی ہے، وہ تم نے بتادی اس کے علاوہ اور کچھ؟“

”دیکھیں، میں۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا لیکن آصف نے مزے ہونے کہا۔

”آؤ، چلیں“ تمہارے اصرار پر آ کر وہ بیٹھا نہیں بلکہ اس نوجوان کی طرف متاثری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”بہت خوب، بڑی صفائی سے کام کیا ہے۔۔۔ خیر، جو ملتا ہے، لے کر اسے“

”جو حکم!“ اس نوجوان نے خوشی سے کہا تو آصف اس سے ہاتھ ملا تا ہوا وہ اپنی جگہ دیا۔ وہ اپنی پر میں نے اس سے پوچھا۔

”یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ اس نے نہ تمہیں پچھانا نہ مجھے۔۔۔“ مجھے کافی حیرت ہو رہی تھی

”بہت عرصہ ہو گیا ہے، وہ وہ شکل سے نہیں نام سے پچھانتا ہے۔“

”تم نے اسے بتایا کیوں نہیں۔۔۔؟“ میری حیرت دور نہیں ہوئی تھی۔

”کیا ضرورت ہے بار، اگر کھیل خراب بھی ہو جائے تو اسے پتہ ہی نہیں ہوگا کہ کس نے انہوں کو کیا تھا۔ کان بندے تھے۔“

”کیا تم نے ملک منیر کے بارے میں کوئی فیصلہ کر دیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، انہوں نے تاون کی صورت ہوگی۔ مرنا بہر حال اسے ہے“ پھر میری طرف دیکھ کر خوشی سے بولا۔ ”جیسے اس دنیا کے ہر شخص کو مرنا ہے۔“

آصف نے کچھ اس طرح سے کہا کہ میرے اندر ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ پتہ نہیں، وقت کے ساتھ میں بدل گیا تھا یا پھر وقت نے مجھے بدل دیا

تھا۔ مصلحت پسند، بزدل یا پھر کچھ اور۔۔۔ مجھے اپنے بارے میں سمجھ نہ آ سکی۔ میں نے دفتر جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مجھے آصف سے مزید باتیں

بھی کرتا تھیں۔ اس لیے میں نے وہ دن بھی چھٹی کے طور پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا۔ کچھ دیر بعد ہم آصف چوہدری کے گھر میں تھے۔ اس کے لیے یہ سارے کھیل معمول کے مطابق تھے جبکہ میرے ذہن پر تناؤ کی کیفیت تھی۔ مجھے یہ پوری طرح احساس تھا کہ باریہ مجھے ملک منیر کے انوا کے معاملے میں ضرور کھینے کی کوشش کرے گی۔ اگرچہ میں اس سے گھبراتا نہیں تھا لیکن اس معاملے کے کھل جانے پر بہت ساری باتیں منظر عام پر آ جانے والی تھیں۔ ایک باب جو میں بند کر چکا تھا، دوبارہ اسے کھولنا نہیں چاہتا تھا۔

”یار اتم اتنے چپ چپ کیوں ہو؟“ آصف نے چائے کا کپ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس یونہی!“ میں نے بے خیالی میں کہہ دیا پھر فراری اپنے ہی ایک خیال کے تحت کہا۔ ”سوچ رہا تھا کہ میں نے تم سے جو بات کہنی

ہے، وہ کہاں سے شروع کروں؟“

”کہیں سے بھی کر دو، میرے پاس سننے کے لیے بڑا وقت ہے۔“ آصف مسکراتے ہوئے بولا۔ پھر اس موضوع پر کئی دیر تک ہمارے

درمیان باتیں چلتی رہیں۔ سچی بچ کے بعد میں اس کے ہاں سے اٹھ کر دفتر چلا گیا۔

اسی شام جب میں آفس سے لگتا چا رہا تھا کہ عامر کا فون آ گیا۔ اس نے آواری میں اپنے چند ایسے کاروباری دوستوں کو ڈنر دینا تھا

جنہوں نے حال ہی میں ایک نیا پراجیکٹ شروع کیا تھا، وہ چاہتا تھا کہ میں اور حسن بھی اس ڈنر میں شامل ہو جائیں۔

”میں کیا کروں گا وہاں پہ آ کر؟“ میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ”تمہارے دوست ہیں، تم ان کے ساتھ اٹھو آئے کرو۔“

”وہ تمہارے بھی شناسا ہیں، اجنبیت والی کوئی بات نہیں بلکہ نائلہ کو بھی ساتھ لیتے آنا۔“ عامر نے تیزی سے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے مگر اس کے لیے مجھے اب گھر جانا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، یار! اس کا آنا ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ بھی اب کاروباری دنیا میں آئے۔“

”کوئی خاص بات؟“ میں نے پوچھا۔

”صحیح پوچھو تو میں نے یہ پراجیکٹ لیا ہی اسی کے لیے ہے۔ وہ بہت کچھ دار لڑکی ہے، یونہی وہ گھر میں پڑے بود ہو رہی ہے۔“ اس نے

وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، اسے ان ہو جانا چاہیے۔“ میں نے خوشی سے کہا۔

”ٹھیک ہے، پھر اسے لے کر وقت پر پہنچ جانا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ مجھے عامر کا نائلہ کے لیے اس طرح سوچنا اچھا لگا تھا۔ گو

ان کے درمیان جو بھی تعلق تھا اور عامر نے نائلہ کے حصول کے لیے سیٹھ افراسیاب کے ساتھ ایک طویل گفتگو جاری رکھی تھی۔ نائلہ ایک حساس لڑکی

تھی اور چاہتی تھی کہ وہ خود کچھ نہ کچھ کرے، اس کا اظہار اس نے مجھ سے بھی کیا تھا۔ میں نے اس کے لیے سوچا تھا مگر میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ ہو

سکتا تھا، عامر اور نائلہ کے درمیان کوئی معاملہ طے پا گیا ہو۔ یہی سوچنا ہوا میں اٹھ گیا۔ میرے پاس ڈرنیک کے لیے خاصا وقت تھا سو میں گھر کی

جانب چل پڑا تاکہ خود بھی تیار ہو کر آواری جا سکوں۔

میں گھر میں صوفے پر بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا۔ نائک تیار ہو رہی تھی، دلدار میرے لیے چائے رکھ کر گیا تھا کہ کال تکل ہوئی۔ چند لمحوں بعد دلدار نے آ کر بتایا کہ کوئی خاتون مجھ سے ملنا چاہتی ہے اور اس خاتون کا نام ماریہ ہے۔ میں چونک گیا، وہ یہاں کیسے؟

”اس کے ساتھ کوئی ہے؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”نہیں، وہ اکیلی ہے۔“ دلدار نے سوچنے والے انداز میں دھیرے سے کہا۔

”بلاؤ اسے“ میں نے کہا تو وہ انہی قدموں پر لوٹ گیا۔ پھر اس کے پیچھے ماریہ دروازے کی چوکھٹ میں نمودار ہوئی۔ وہ بڑی بے ہوشی سے بیٹھنے والی نظر آ رہی تھی۔ دلدار چلا گیا تو میں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی تو میں نے پوچھا۔

”کیسے آئی ہو اور تمہیں میرے گھر کے بارے میں کیسے پتہ چلا؟“

”تم جب سے یہاں شفٹ ہوئے ہو، میں تب سے جانتی ہوں اور باقی رہا سوال کہ میں کیوں آئی ہوں، یہ۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

پھر بڑے غصے میں بولی۔ ”ملک منیر کہاں ہے۔۔۔؟“

مجھے لاشعوری طور پر احساس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے یہی سوال کرنے والی ہے، اس لیے مجھے اس کے سوال پر قطعاً حیرت نہیں ہوئی۔ میں حیران اس بات پر تھا کہ وہ مجھ تک کیسے پہنچ گئی ہے؟ پھر آصف کا کھٹا طرہ رویہ مجھے یاد آ گیا۔

”چپ کیوں ہو، جواب کیوں نہیں دیتے؟“ اس نے غصے میں تیزی سے کہا۔

”دیکھو، ماریہ! اگر مجھے ملک منیر کے بارے میں پتہ ہوتا تو میں تب بھی تمہیں نہ بتاتا بلکہ خود سے اپنے ہاتھوں سے غم کرنے کی کوشش کرتا۔“

”تم جھوٹ بول رہے ہو۔“ وہ چیختے ہوئے بولی۔

”چلو مان لیا، میں جھوٹ بول رہا ہوں پھر؟“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”دیکھو، شجاع! اگر اسے کچھ ہو گیا تو۔۔۔“ اس نے کہا جاتا تو مجھے یکدم ہی طعنے آ گیا۔

”میں نہیں ڈرتا، تمہیں یاد ہوگا، تم نے کتنی بار مجھ پر حملے کروائے ہیں اور میں آئندہ بھی انتہا کروں گا۔ تم اپنی کھینگی دکھا چکی ہو اور میں آئندہ بھی تمہاری کھینگی دکھانا چاہوں گا۔“

”شجاع!“ وہ چیخ اٹھی۔

”جینو مت، مجھے پتہ ہے اور اس بات کا احساس مجھے تم نے ہی دلایا ہے کہ تمہاری رگوں میں گندا خون گردش کر رہا ہے جس نے تمہارے ذہن میں بھی فحاشی بھردی ہے۔ تم کیا ہو، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ میں تم سے یہی کہوں گا کہ تم اپنے بچے پن اور گندے خون کا احساس مجھے دلاتی رہو تاکہ میں نے جو تمہیں دھکا مارا ہے اپنے اس فیصلے پر مجھے کوئی شرمندگی نہ ہو۔“

”شجاع!“ وہ رونے والے انداز میں سسک اٹھی۔

”جاؤ، میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔ تم میرے لیے محض نفرت کی علامت بن کر رہ گئی ہو۔ میں انتہا کروں گا تاکہ تم مجھے اپنے گندے

خون کا کچھ اور بہت دے سکو، گٹ لاسٹ۔“

”دیکھو، شجاع! میں مانتی ہوں کہ سارا قصور میرا ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ اب تک میں نے جو کچھ کیا، تمہیں حاصل کرنے کے لیے کیا مگر اب میں یہ وعدہ کرتی ہوں کہ کبھی تمہارے راتے میں نہیں آؤں گی۔ میں التجا کرتی ہوں کہ ملک کو چھوڑ دو، میں سب کچھ بھول جاؤں گی۔“

”مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے، میرے مقدر میں تمہاری نفرت ہی سہی لیکن میں تم سے ملک کی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں۔ اس نے جو کچھ بھی کیا، میری وجہ سے کیا۔“

”میں نے کہا نا، ماریہ! ملک میری دسترس میں نہیں اور نہ ہی میں اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا جواز ہوں، وہ میرے پاس نہیں۔ تم اسے تلاش کرو اور تمہارے ملک کا پورا گیٹنگ ہے، کیا وہ اسے تلاش نہیں کر سکتا؟“

”اس وقت ہم بے بس ہیں، ہون کال پر ایک بڑی رقم مانگی گئی ہے۔ ہم وہ دینے کے لیے تیار ہیں لیکن مجھے ڈر ہے کہ وہ رقم لینے کے بعد بھی۔۔۔“ ماریہ یکدم ہی رو دی۔

”میں کچھ نہیں جانتا کہ تمہارا ملک کہاں ہے اور کس نے رقم مانگی ہے، میرا دماغ مت خراب کرو۔“

”شجاع! وہ مجھ سے بہت بڑا کرتا ہے۔ میں اسے محض تمہارے لیے ٹھکانا ہی رہی، وہ نہ رہا تو میں زندہ درگور ہو جاؤں گی۔ میرا ضمیر۔۔۔“

وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”اوہ تو تمہارے پاس ضمیر نام کی بھی کوئی چیز ہے؟“ میں نے انتہائی طنز سے کہا۔

”دیکھو، مجھے ذلیل مت کرو۔ میں تمہارے بارے میں سوچوں گی بھی نہیں تم جو چاہو، وہی ہوگا۔ میں اس کی زندگی کے لیے تم سے بھیک مانگتی ہوں۔ جتنی چاہے رقم لے لو مگر۔۔۔“

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں نے اسے رقم۔۔۔ تم جاؤ، ماریہ! گٹ لاسٹ۔“ میں نے انتہائی نفرت سے کہا تو اس نے چونک کر میری طرف دیکھا، آنکھوں آئے ہوئے آنسو پونچھے اور چند لمحے میری طرف بڑے غور سے دیکھتی رہی۔ پھر تیزی سے اٹھی اور تقریباً بھاگنے والے انداز میں کمرے سے نکلتی چلی گئی۔ میرے خون کی حرارت بڑھ چکی تھی جسے میں آنکھیں بند کر کے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ٹانگی کی آواز پر چونک گیا۔

”کون تھی؟“ وہ تو لڑنے سے سہیلے ہالوں کو خشک کرتی ہوئی مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ میں محض اس کی طرف دیکھ کر رہ گیا۔ وہ میرے کسی جواب کا انتظار کرتی رہی مگر کوئی جواب نہ پا کر واپس پلٹ گئی۔ میں اسے یاد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لیے اس کے خیال کو ذہن سے ہٹا کر کچھ دیر بعد میں نارل ہو گیا لیکن ایک عجیب ناخوش گوار کیفیت مجھ سے لپٹ گئی تھی۔

حاضر کے دوستوں میں خواتین بھی تھیں۔ وہ سب گارمنٹس کے ایک بڑے پراجیکٹ پر کام کرنا چاہ رہے تھے، ساری تفصیلات ان کے درمیان طے پا چکی تھیں۔ حاضر نے اپنی طرف سے ٹانگہ کوان کے ساتھ شامل کر دیا تھا۔ وہ کاروباری باتیں کرتے رہے۔ جبکہ میں اور حسن محض ان کی

سنے رہے۔ رات گئے وہاں سے چلے تو نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ اسی غماز میں گھر تک پہنچے اور پھر بیڈ پر لیٹے ہی مجھے ہوش نہ رہا۔

اگلی صبح نائٹ خوش تھی، وہ ناشتے کی میز پر بیٹھی چمک رہی تھی۔ اسے نیا دفتر دیکھنے کے لیے جانا تھا اس لیے وہ تیار ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ فریش فریش سی، گھمری ہوئی بڑی جاذب نظر لگ رہی تھی۔ اس نے ناشتے پر بھی خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ میں ساری کیفیت اور سوچوں کو ایک طرف ڈال کر اس کی خوشی میں خوش ہو گیا۔ وہ بڑی پر جوش تھی۔ بھرناشتے کے بعد میں نے اسے ڈراپ کیا اور اپنے دفتر چلا گیا۔ اس دن میں نے باقاعدہ طور پر میگزین سیکشن سنبھال لیا۔ معمول کی میٹنگ کے بعد میں نے میگزین کے لوگوں کی ایک میٹنگ کی اور ایک نئے سرے سے کام کرنے کی ٹھانی۔ میں چاہتا تھا کہ اب پوری توجہ اپنے کام کی طرف دوں۔ دوپہر سے ڈراپ بلے میں پوری طرح مطمئن ہو چکا تھا۔ سبھی میرے سٹیل کی کھنٹی بج گئی، میں نے نمبر پر ایک نظر ڈالی تو وہ آصف چوہدری کا تھا۔

”جی، حضور! بندہ حاضر ہے۔“ میں نے انجائی خوشگوار لہجے میں کہا۔

”شکر ہے، آج تم پریشان نہیں ہو۔“ وہ ہنستے ہوئے بولا۔

”جناب! یہ پریشانیوں تو مگر کے بھی بازگشت کی طرح انسان کا چہرہ کرتی ہیں، اب ان سے فرار ممکن نہیں۔“ میں نے کہا۔

”ہاں، تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ خیر، تمہارے سہمان کی ساری پریشانیوں ختم ہو گئی ہیں۔ وہ فلاحی کر گیا ہے۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا تو

میں چونک گیا۔

”کب؟“ مجھے اپنے لہجے میں دکھ اترتا ہوا محسوس ہوا۔

”یہ آج صبح کی بات ہے، تم نے وہ کہات سنی ہے، زندہ ہاتھی لاکھ کا اور مرنا ہوا سالا کھ کا؟“

”تو کیا“

”ہاں، جاتے جاتے ان لوگوں کے لیے بہت کچھ کر گیا ہے جنہوں نے اس کے لیے صحت کی تھی، میں نے اپنا تعارف کرا دیا تھا، یار اس

وقت دیکھنے والا تھا وہ۔ چلو! تم خوش رہو اور بے لگاری سے اپنا کام کرو، فرصت ہوتی نہیں گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ مجھے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ سبھی میرے سامنے ماریہ کا آنسوؤں بھرا چہرہ اٹھ آیا، وہ ٹھیک سوچ رہی

تھی۔ انہی لمحوں میں ماریہ سے ہا جو دفتر کے میرا دل بھر آیا۔ کتنے ہی لمبے یونچی مگر گئے، جب مجھے احساس ہوا کہ میں نے فون کان سے لگا دیا ہوا

ہے اور دوسری طرف سے لائن کٹ چکی ہے۔ میں نے فون آف کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ مجھے بہر حال دکھ ہوا تھا حالانکہ یہ وہی ملک منیر تھا جو ماریہ

کے ایماء پر میری جان کا دشمن ہو رہا تھا۔ میں نے اس دکھ سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایسا سب کچھ سوچا۔ کتنی ہی دیر میں وہاں بیٹھا رہا، پھر اس

احساس سے جان چھڑانے کی خاطر میں پریس کلب چلا گیا۔

شام ڈھلے میں گھر جانے کی سوچ رہا تھا کہ نائٹ کا فون آ گیا۔

”کب تک پہنچ رہے ہیں گھر؟“

”بس تھوڑی دیر بعد تک، کیوں، خیریت؟“

”ایسے ہی دل چاہ رہا تھا کہ آج کنکس باہر نکلیں، ولد ار بھی آیا ہے، کھانا بھی نہیں بنا۔“ وہ گمریلو عورتوں کی طرح بولی

”ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا اور پھر خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں جب گمریلو پہنچا تو دن ڈھل چکا تھا۔

مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”پہلے آپ تازہ دم ہو جائیں، پھر آپ کے لیے چائے لاتی ہوں۔“

میں فریٹس ہو کر آیا تو ہواپ اڑاتا چائے کا کپ میرے سامنے تھا۔ تب میں نے کہا

”حسن اور عامر کو بلا لیں؟“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ کبھی رہے گی۔“

”ٹھیکے میں فون کرتا ہوں۔“

اس سے پہلے کہ میں چائے پی کر فون کرتا میرا فون بج اٹھا۔ میں نے فہرہ دیکھ کر فون کان سے لگایا تو دوسری طرف حسن تھا۔ اس نے

گھبراتے ہوئے انداز میں کہا۔

”نئی خبر سنی تو نے، جان جی؟“

”نہیں، مجھے ابھی تک تم نے سنائی ہی نہیں۔“ میں نے یونی عام سے انداز میں کہہ دیا۔

”ماریہ نے خودکشی کر لی ہے، مجھے ابھی پتہ چلا ہے“

”کیا؟“

”میں دفتر سے بات کر رہا ہوں۔ ابھی یہاں خبر پہنچی ہے، اس نے زہر کھا لیا ہے، روپورٹر گیا ہے اس کے گھر۔“ حسن پہ نہیں کیا کہتا چلا گیا

لیکن کچھ سمجھ نہ آئی۔ نجانے کیوں میرے ذہن میں تھا کہ اسے ابھی مرنا نہیں چاہیے تھا۔

ماریہ سے شدید نفرت ہو جانے کے باوجود، میں نے کبھی یہ خواہش نہیں کی تھی کہ وہ مر جائے یا اس طرح خودکشی کر لے۔ وہ جو میری دشمن

جان بنی ہوئی تھی، یوں اس کے خودکشی کر لینے پر مجھے انتہائی دکھ اور افسوس ہوا تھا۔ مجھے اپنے اس رویے پر حیرت ہوئی تھی۔ لہوں میں سوچوں نے

نجانے کتنی یادوں بھری تصویریں میرے سامنے کر دیں۔ حسن کے فون بند کر دینے پر مجھے ہوش آیا کہ بات تو ادھوری رہ گئی تھی۔ میں نے دوبارہ اس

کے فہرہ اٹل کیے، ذرا سی دیر میں رابطہ ہو گیا۔

”جان جی! کیا بات ہے؟“ حسن کا لہجہ اندر ہوا تھا۔

”وہ۔۔۔ کہنا میں یہ چاہ رہا تھا کہ جیسے ہی تفصیل سے خبر آئے، مجھے ضرور بتانا۔“ میں نے حد درجہ اپنے لہجے پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، ویسے میں تو نکل رہا تھا، میں روپورٹر کے آنے تک یہیں انتظار کرتا ہوں۔ دفتر میں یہ خبر بڑی حیرت سے سنی جا رہی ہے۔“

حسن نے افسردگی بھرے لہجے میں کہا۔

”ہاں، ایسا تو ہونا ہی تھا۔ یوں اچانک۔۔۔ میں تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔“ میں نے چیزی سے کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ نائلہ

شاید میرے فون بند کرنے کے انتظار میں تھی، اس نے پوچھا۔

”خبریت تو ہے، نا کوئی ایسی ویسی اطلاع تو نہیں؟“ اس کے پوچھنے پر میں اپنے خیالوں سے واپس آ گیا۔

”ہاں، ایک بری خبر ہے۔ ہماری ایک کولیک تھی، ماریہ اس نے خودکشی کر لی ہے۔“

”یہ وہی ماریہ تو نہیں جو یہاں آئی تھی۔۔۔“

”ہاں، وہی، نجانے اس نے کیوں زہر کھا لیا؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میں ابھی تک اس خبر کے حصار سے ہمیں نکل پایا

ہوں۔

”کوئی وجہ تو رہی ہوگی ورنہ کون اپنی جان گنوا تا ہے؟“ اس نے عام سے انداز میں کہا میں نے ایک لڑکوا سے دیکھا۔ کبھی کبھی لاعلمی کتنی

بڑی نعمت ہوتی ہے جبکہ میرے اندر اس خبر نے کتنی لچل چلا دی تھی کیونکہ میں اس کے پس منظر میں دوڑ تک دیکھ رہا تھا۔ ماحول انتہائی بوجھل ہو گیا تھا۔

اس وقت شدت سے مجھے غمخانی کی مالب ہوئی۔ میں لکھے ہوئے داغ کے ساتھ صوفے پر ڈھیر ہو گیا، وہ میری طرف بنو رو پکھتے ہوئے پوی۔

”خبریت، آپ نے اس خبر کو بہت زیادہ محسوس کیا ہے۔“

”وہ جیسی بھی تھی ہماری کولیک تھی۔“ میں نے افسردہ لہجے میں کہا پھر چند لمحوں بعد بولا

”سوری، نائلہ! ہم کھانا کھانے باہر نہیں جائیں گے تم ولد دار سے منگوا لو۔“

”وہ تو سب ٹھیک ہے لیکن آپ کی طبیعت بوجھل ہو رہی ہے، آپ کا لہجہ۔۔۔“

نائلہ نے تشویش سے کہا تو میں چونک گیا۔ کیا ماریہ کے مر جانے کی خبر نے مجھ پر اتنا اثر کیا ہے کہ دوسرے مجھ میں واضح تبدیلی محسوس کر

رہے ہیں؟ اس سوال کے ابھرتے ہی میں نے فوری طور پر خود کو سنبھال لیا اور مسکراتے ہوئے بولا۔

”تھک گیا ہوں نا، یار! ابھی گل ہی تو بیڈ سے اٹھا ہوں، تم جلدی سے کھانا منگوا لو، پھر کھاتے ہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا اور اپنے

کمرے کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس وقت کھانا کھا کر ڈرائنگ روم میں اکیلا بیٹھا تھا کہ حسن کا فون آ گیا۔

”ہاں تو، جان مٹی! ماریہ نے زہر ہی چا تھا۔ وہ اپنے میں کمرے میں بند تھی، کافی دیر بعد اس کے گھر والوں کو معلوم ہوا۔ اس وقت نزع کی

حالت میں تھی۔ اسے فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ ڈاکٹروں نے انتہائی کوشش کی لیکن وہ زندگی ہار گئی۔ خودکشی کی وجہ اس کے گھر والوں کی سمجھ میں

نہیں آئی۔ گمان یہ ہے کہ وہ اپنے مگتیر ملک منیر کی موت کا صدمہ برداشت نہیں کر سکی۔“

”اس نے کوئی خط وغیرہ نہیں چھوڑا، میرا مطلب ہے کہ وہ فلمی سا انداز۔۔۔“ میں نے انتہائی کوشش کر کے اپنے لہجہ کو مضحکہ خیز بنا کر کہا۔

”نہیں، فی الحال تو ایسا کچھ دستیاب نہیں ہوا اور اگر اس نے کوئی خط چھوڑا بھی ہوگا تو اس کا ابھی کوئی ذکر نہیں آیا۔ انہوں نے معاملہ خود

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

تک ہی محدود رکھا ہے، جواز ہی مگر تیز کاغم۔۔۔ صبح اس کا جنازہ ہے۔"

"تمہارا کیا خیال ہے، حقیقت یہی ہے؟" میں نے مزید کرید لگائی۔

"دل اور ذہن اس کا جواب لٹی میں ہی دے رہے ہیں۔ اب حقیقت کیا ہو سکتی ہے، میں نہیں جانتا۔ خیر اس پر بحث کسی اور وقت اٹھا رکھو،

ابھی مجھے گھر جانا ہے۔ سی یو ہائے؟" اس نے تیزی سے کہہ کر مزید کوئی مہری بات سے بغیر فون بند کر دیا۔

ماریہ کی خود کشی سے متعلق اس کے گھر والوں نے جو بھی جواز بتایا تھا، میں بھی اسے نہیں مان سکتا تھا مگر میں وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا تھا جو

میرے خیال میں حقیقت ہو سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح جلد بازی کر گئی، اس نے موت کو بھی جلدی سے گلے لگ لیا۔ کہنے کو تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ اس کی

قسمت میں برائی مہر جانا لکھا ہوا تھا، لیکن وہ پھر پور جوائی کے دور میں تھی۔ یہ بھی سوچا جا سکتا تھا کہ اگر وہ یوں نہ کرتی تو اس دنیا سے خوشیاں حاصل کر

سکتی تھی۔

"اب تو میں پردے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" نائلہ نے اسروگی والے انداز میں کہا تو میں خیالوں سے

باہر آ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھوں میں چائے کی بیالیاں تھامی ہوئی تھیں اور وہ میرے سامنے کڑی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ مجھے اس کے آنے

کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔ سوائی قاسب دماغی پر شرمندہ ہو کر رہ گیا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مزید بولی۔

"خامسے تھک گئے ہوں گے آپ؟"

"مجھے چھوڑو، اپنی سناؤ تم اپنا دفتر دیکھنے گئی تھیں؟" میں نے موضوع بدلتے ہوئے سوال کر دیا تو وہ چپک کر بولی۔

"اجی کیا بات ہے دفتر کی، ایک دم قائل ہو سکتا ہے کہ اس سے بھی اچھے اچھے دفتر ہوں لیکن میں نے جیسا سوچا تھا، میرا دفتر ویسا ہی ہے۔"

"دفتر تو جم گیا مگر یہ تو تھا ڈاکٹر تم وہاں پر کرو گی کیا؟"

"میں۔۔۔!" اس نے چسکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔ "بس دیکھئے گا، میں کیا کرتی ہوں۔ اگرچہ مجھے کوئی مہارت تو نہیں ہے لیکن میرے

پاس حوصلہ ہے، کام کرنے کی لگن ہے۔" یہ کہتے ہوئے وہ یک دم خاموش ہو گئی، پھر میری طرف زور سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "شجاع! ہمارے سماجی

سیٹ اپ میں عورت کی اہمیت کتنی ہے، یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ میرا کام کے ساتھ کیا تعلق ہے، اس سے بھی آپ بخوبی واقف ہیں۔ یہ

کوئی قابل فخر نماندگی نہیں ہے۔ میرا رنگ روپ کب تک میرا ساتھ دے گا اور پھر عامر بھی یہ تعلق کب تک نبھائے گا؟ کوٹھے پر بیٹھنے والی طوائف کو تو پھر

بھی آسرا ہوتا ہے۔ نائیکہ ہوتی ہے، دلال ہوتے ہیں۔ انہیں تحفظ حاصل ہوتا ہے لیکن میں تو کال گرل ہوں، ایک خزاں رسدہ پڑ جسے۔۔۔

جسے۔۔۔" اس سے آگے وہ کوئی لفظ بھی نہ کہہ سکی۔ اس کا گلارندہ گیا اور آنسو پانکوں سے ڈھلک گئے۔ کس قدر سچائی تھی اس کے لفظوں میں، ایک تلخ

حقیقت اور کس بری طرح اس نے اپنے زخموں کو کرید ڈالا تھا۔ مجھے اس پر بے حد ترس آیا۔ میں چاہتا تو اسے دلاسا دے سکتا تھا مگر میں نے اسے

رونے دیا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بہتے ہوئے آنسوؤں میں مسکراتے ہوئے بولی۔ "عامر تو میرے ساتھ شادی نہیں کرے گا۔ آج میں کچھ کر سکنے کی طاقت

رکھتی ہوں، مگر اگر یہ میرے پاس نہ ہوئی تو میں کیا کروں گی؟"

"نانک! میں تمہارا دکھ سمجھتی ہوں لیکن اتنا مایوس بھی نہیں ہوتے تم تمہاری دست نہیں ہو۔ تمہارے ساتھ تمہارے دوست ہیں۔"

"اسی بات نے تو مجھے کچھ کرنے کی طاقت بخشی ہے۔ ورنہ آپ سے ملاقات ہونے سے قبل میں خود کو اپنے مستقبل میں ایک کال گرل ہی

کی حیثیت سے دیکھ کر خوف زدہ ہوتی رہی ہوں اور کچھ مجھے نظری نہیں آتا تھا۔"

"نہیں، نانک! تم بہت اچھی لڑکی ہو، بہت حسرے دار چائے پاتی ہو اور تم میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ دوستوں کے کہنے پر بغیر کچھ

سوچے، آرام سے جا کر سوجاتی ہو۔" میرے یوں کہنے پر وہ بنا اختیار مسکرا دی اور چھپ چھاؤں کا یہ منظر مجھے بہت اچھا لگا۔ تب وہ دھیرے سے بولی۔

"مگر میں اپنا شمار کالنے کے لیے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کرو نا، باتیں۔ روکا کس نے ہے؟" میں نے صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھے ہوئے کہا۔ پھر رات گئے تک ہم باتیں کرتے رہے۔ وہ

اپنے ماضی کو کھریاتی رہی کہ وہ کس طرح دنیا میں رہتی تھی اور اب کہاں پر ہے۔ وہ ایک نئی طرح کی زندگی میں داخل ہو رہی تھی۔ مستقبل میں کیا ہوگا،

اس بارے وہ بڑی پر جوش تھی۔ بچانے کتنے دوسرے، خواہشیں، اعلیٰ پے اور امیدیں اس نے مجھ سے کہہ ڈالیں۔ میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سنتا

رہا۔ پھر اس وقت ہم اٹھ گئے جب نیند سے میری آنکھیں پوچھل ہو کر بند ہون شروع ہو گئیں۔

صبح جب میں بیدار ہوا تو فریض تھا۔ رات نانک سے باتیں کرتے رہنے کی وجہ سے سوتے وقت ذہن میں کچھ بھی نہیں تھا، شاید اسی لیے

مجھے اچھی اور بھرپور نیند آئی تھی۔ ماریہ کی خودکشی کے باعث جو میرا دماغ پرانگندہ ہو گیا تھا، اس کا اثر اب تک میرے دماغ پر چھایا ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا

تھا جیسے کوئی بڑی اسٹیم شے تم ہو گئی ہو۔ کھودینے کا احساس مجھے دکھی کر رہا تھا۔ یہی سوچتے ہوئے میں بیڈ سے اٹھ گیا۔ اس وقت ہم تیار ہو کر ناشتہ کر

رہے تھے کہ عامر اور حسن تک آ گئے۔

"بڑے اثر کا نئی نیشنل مارکنا شے چل رہا ہے ہیں۔" حسن میرے سامنے نانک کے ساتھ بڑی گری پر بیٹھے ہوئے بولا تو وہ ہنس دی۔

"ہمارا رب بڑا پاپن ہمارے، وہ دے رہا ہے اور ہم کھا رہے۔ آپ تائیں، آپ کیا کھانا پسند کریں گے؟"

"بس چائے پلاؤ دو، تم نے تو بھاری پرائیوٹ سے ناشتہ کروا لیا ہے۔" حسن نے اظہار میں رکھتے ہوئے کہا۔

"چائے تو مل جائے گی مگر تم دونوں اتنی صبح کیسے آ گئے ہو؟" میں نے دھیرے سے پوچھا تو عامر نے میرے چہرے کی طرف دیکھتے

ہوئے قدرے حیرت سے کہا۔

"ماریہ کے جنازہ میں شرکت کرنے کے لیے، ہم نے سوچا، تمہیں بھی لیتے چلیں۔" یہی وہ کلمات تھے جن سے میں کتر کر گزر جانا چاہتا

تھا۔ مجھے اس کا جنازہ پڑھنے میں کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ وہاں ملک منیر گینگ کے لوگ ضرور ہوں گے اور کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ

میری راہ تک رہے ہوں۔ وہاں ہتتا یہ امکان تھا کہ کچھ نہیں ہوگا، اتنا جواز یہ بھی تھا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ میری بھجوری یہ تھی کہ میں ان دونوں کو اس

صورت حال کے بارے بتا نہیں سکتا تھا۔ وہ محض دنیا دکھاوے کے لیے جا رہے تھے۔ انہیں کوئی مجبوری نہیں تھی۔ حسن تو ماریہ کا کوئی گینگ تھا، اس کا

جنازے میں شرکت کرنا ہوتا تھا۔ اس کے پاس جواز تھا مگر عامر اس کا مقصد کیا ہو سکتا ہے، وہ کیوں جا رہا ہے؟ فوری طور پر مجھے کچھ نہیں آئی کہ ان

دوڑوں سے کیا کہوں۔

”کیا سوچنے لگے ہو؟“ حسن نے پوری توجہ سے میری جانب دیکھتے ہوئے کہا تو میں چمک گیا۔ میں خاموش رہا تو اس نے مزید کہا۔

شجاع! یہ نظرت اور عداوت بندے کے جیتے جی ہوتی ہے اور میرا خیال ہے کہ جو بندہ اس دنیا سے چلا جائے تو اس۔۔۔“

”بات یہ نہیں ہے، یاد۔!“ میں نے اس کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔ ”اسل میں ہم محض دنیا دکھاوے کے لیے جائیں گے اور یہ مجھ سے نہیں ہو پائے گا۔ تم لوگ اگر جانا چاہتے ہو تو جاؤ، ویسے بھی مجھے نالکہ کو اس کے دفتر چھوڑنا ہے۔“ میں نے مزید بحث سے بچنے کے لیے یونہی بے مقصدی دلیل کا بے جا سہارا لیا۔ میرا لہجہ انہیں بہت کچھ سمجھا گیا اس لیے انہوں نے مزید بات نہیں کی۔ اتنی دیر میں نالکہ نے دو کپ چائے بنا کر ان کے سامنے رکھ دی۔ چائے پی لینے تک ہم میں انجانی خاموشی چھائی رہی جیسے ہمارے پاس بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہ رہا ہو۔ میں نے کپ رکھا اور اٹھ گیا، وہ بھی میرے ساتھ اٹھ کر چل دیے۔ دلدار برتن سینٹے لگا۔ پھر گاڑی میں بیٹھ جانے تک ہم میں کوئی بات نہیں ہوئی، ان کی خاموشی میرے لیے حیران کن تھی۔ وہ دوڑوں بھی اپنی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ نالکہ جب میرے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھنے لگی تو عاثرے کہا۔

”نالکہ! میں اور حسن رات کو کھانا احرری کھائیں گے، تمہوڑا اہتمام کر لینا۔“ یہ کہہ کر اس نے کار بڑھالی۔ عاثرے کے یوں کہنے پر میں قدرے چونکا، کوئی بات تھی ضرور، ہو سکتا ہے کہ انہیں میرے اور آصف چوہدری کے تعلق بارے معلوم ہو گیا ہو اور اس باعث سب کچھ جان گئے ہوں۔ میں نے چند لمحوں سوچا اور پھر ذہن سے جھٹک دیا کہ جو بات بھی ہوگی دیکھا جائے گا۔ میں کافی دیر تک نالکہ کے دفتر میں بیٹھ کر وقت مشاغ کرتا رہا۔ مجھے یقین تھا کہ دفتر کے لوگ ماریہ کے جنازے میں شرکت کے بعد ہی آئیں گے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی مجھ سے یہ سوال کرے کہ میں اس کے جنازے میں شامل کیوں نہیں ہوا؟ خواہ مخواہ نظروں میں آنے والی بات تھی۔

میں آفس پہنچا تو بہت سارے لوگ آچکے تھے اور ماحول پر عجیب طرح کا سناٹا طاری تھا۔ میں ہر طرف سے توجہ بنا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر ہونے تک ماحول قدرے معمول پر آ گیا تھا، لوگ ماریہ کی خودکشی اور جنازے کے بارے میں باتیں کر کے تھک چکے تھے۔ میں نے سگریٹ سلگایا اور حسن کو ڈھونڈنے کی سوچنے لگا، تاکہ پریس کلب میں جائیں۔ جمعی عیدون نے معمول کی ڈاک میرے سامنے لا رکھی۔ ان میں سے کسی کو ریسروں سے بھیجا گیا ایک تعارفی میری نظروں میں آیا جس پر ”خاص ذاتی“ لکھا ہوا تھا۔ اندازاً خبر مانوس تھا، میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ وہ تعارف کھولا تو میرے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ میرے سامنے ماریہ کی تحریر تھی۔ تین صفحات پر مشتمل وہ غلط تیزی سے لکھا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے غلط کے آخر میں نام دیکھا تو وہاں ”بد نصیب، ماریہ“ لکھا ہوا تھا۔ جب میں نے پتے ہوئے دماغ کے ساتھ وہ غلط پڑھا۔

”میرے نہ بننے والے، ظالم شخص! میں تمہیں کوئی دعا نہیں دوں گی اور نہ ہی تمہیں کوئی بددعا دے سکتی ہوں۔ میں کہ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور اور بے بس عورت، میرا یہ غلط تمہیں میری خودکشی کے بعد ملے گا۔ دنیا کے یوں پر یہ سوال ہوگا کہ میں نے خودکشی کیوں کی لیکن تم جانتے ہو کہ میں خودکشی کرنے پر کیوں مجبور ہو گئی ہوں؟ تم، صرف تم نے مجبور کیا ہے مجھے، میرے لیے جینے کا کوئی جواز نہیں چھوڑا تم نے اور تم خود بتاؤ کہ میرے لیے مرجانے کے سوا کوئی اور آپشن تھا؟ میں یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میں نے تم پر قاتلانہ حملے کر دئے۔ ہاں، وہ سب میری وجہ سے ہوئے۔ میں نے اپنی

دانت میں ملک منیر کو استعمال کرنا چاہا لیکن مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے معاملے میں اس قدر جذباتی ہے۔ وہ میرا طلب گار تھا، نجانے کب سے اور میں تمہاری طرف سے کبھی بھی ہاپس نہیں ہوئی۔ تم چاہے نہ مانو لیکن میں جانتی ہوں کہ میری محبت تمہارے دل میں موجود ہے۔ یہ محض میرا گمان نہیں، پورا یقین ہے۔ اسی یقین کے سہارے میں تمہاری راہ میں ہار ہار تمہارے سامنے آتی رہی۔ مگر تم نے ایک بار بھی مجھے اس قابل نہ سمجھا کہ ٹھیک طرح سے بات بھی کر لو۔ تم نے مجھے ہمیشہ دھکارا مگر میں بے وقوف، اپنے ہی دکائے ہوئے کھوکھلے یقین کے سہارے تمہاری توجہ کی طلب گار رہی۔ کاش! تم میرا ہاتھ تھام لینے اور صورت حال یوں خون آلود نہ ہوتی۔ تم پر قاتلانہ حملوں میں میرا کتنا ہاتھ تھا؟ میں تمہیں بتانا چاہتی ہوں۔ میں اپنی صفائیاں نہیں دوگی کیونکہ جس وقت میرا یہ حلق تک پہنچے گا، اس وقت تک میں تمہاری دنیا میں موجود نہیں ہوں گی۔ اس لیے میں تمہیں سچائی بتا دینا چاہتی ہوں۔ تمہارے اور میرے تعلق کی بابت ملک منیر کو بہت پہلے سے علم تھا، اس وقت سے جب ہم میں خوشگوار تعلق تھا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ میرے بارے میں کیا جذبات رکھتا ہے، نہ ہی اس کے بارے میں سوچا تھا۔ وہ اپنے دل کی بات مجھ سے نہ کہہ سکا، پھر تم نے مجھے دھکار دیا۔ مجھے تم سے زیادہ اپنے آپ پر فخر تھا۔ ان دنوں میری ذہنی حالت کیا تھی، اس کا شاید ہی تمہیں اندازہ ہو۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی۔ میں زخم زخم تھی، میں کرب کی اس حالت میں تھی جہاں میرے فم کا داوا کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ ملک منیر میرے لیے مرہم بن گیا، اس نے مجھے سنبھالا دیا لیکن تمہارے متعلق ہم میں کوئی بات نہ ہوتی۔ مجھے امید تھی کہ تم میری دنیا میں لوٹ آؤ گے۔ مگر میری یہ امید، میرے لیے حسرت بن گئی۔ ملک منیر پر نوازشات کی بارش کرنا چلا جا رہا تھا۔ وہ مجھے ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا، وہ بڑی آسانی سے میرا ہاتھ میرے والدین سے مانگ سکتا تھا۔ مگر وہ مجھے میری رضا سے حاصل کرنے کی خواہش رکھتا تھا اور میں جانتے بوجھتے ہوئے بھی اس کی خواہش سے نظریں چھاری تھی۔ مجھے تمہاری چاہ تھی۔ آخر ایک دن ملک کے صبر کا پیمانہ بیز ہو گیا، اس نے مجھ سے صاف اظہار کر دیا اور مجھ سے جواب مانگ لیا۔ میرے پاس نہ تو کوئی جواز تھا اور نہ ہی فرار کی کوئی راہ، اس نے تو مجھ سے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر شجاع نے تمہیں دھکار دیا ہے تو پھر بھی تم کیوں اس کی راہ تک رہی ہو؟ میرے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ میں خاموش رہی، میری خاموشی کا اس نے بہت غلط مطلب لیا۔ اس نے اپنے طور پر مجھ سے بہت کچھ کہا اور خود ہی طے کرنا چلا گیا۔ پھر یوں ہوا کہ اس کے اور میرے گھر والوں کے درمیان یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ ہم ایک دوسرے کو پسند کر چکے ہیں، یہی غلط فہمی ہماری منگنی کا باعث بن گئی۔ اب میرا سب کچھ ملک منیر ہی تھا، میری زندگی اس کے ساتھ باندھ دی گئی اور وہ اپنے تعصبات کی خاطر نہ جانے کیا کچھ کرنے لگا۔ میں جگی کے دو پاٹوں میں پسے گئی۔ میرا دل تمہارے لیے دھڑک رہا تھا اور ذہن ملک منیر کو قبول کر چکا تھا۔ میں پاگل کر دینے والی نگلش میں آ پھنسی۔ پھر ایک دن اس نے تم پر حملہ کر دیا، اس نے ایسا اس لیے کیا کہ تم خوف زدہ ہو کر شہر چھوڑ جاؤ۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ تم کیا ہو، میں کبھی تھی۔ میں نے اسے ہاڑ رکھنا چاہا، اسے سمجھایا کہ ایسا نہ کرو مگر اس نے مجھے یہ کہہ کر خاموش کر دیا کہ وہ کسی بھی ایسے شخص کو زندہ نہیں دیکھنا چاہتا جو کل ہم پر انگلی اٹھائے یا ہمیں بلیک میل کرتا پھرے۔ وہ ڈر کر شہر چھوڑ جاتا ہے تو اس کی قسمت ورنہ موت اس کا مقدر ہے۔ میری مجبوری یہ تھی کہ میں تمہیں صاف لفظوں میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی تھی اور میری شدت سے یہ خواہش تھی کہ چاہے تموزے عرصے کے لیے ہی کسی تم مظر سے غائب ہو جاؤ۔ میں نے تم سے بڑا غلط رویہ اپنائے رکھا مجھے یقین تھا کہ تم مجھ سے اس بابت ضرور پوچھو گے۔ کوئی گلہ، کوئی شکوہ، کوئی شکایت کرتے تو میں تمہیں بتا دیتی۔ مگر میرے گمان نے مجھے دھوکا دیا، وہ

نہ ہو سکا جو میں چاہ رہی تھی۔ میں نے جا ہاتھا کہ تمہارے منظر سے ہٹ جانے کے باعث ملک کو تھوڑا بہت پرسکون ہو جاتا، میں اس سے شادی کر لیتی۔ پھر میں اسے سمجھا سکتی تھی مگر میں فقط ایسا سوچ ہی سکی۔ میں نے کہا نا، کہ میرا ذہن ملک منیر کی طرف اور دل تمہاری جانب تھا۔ میں لاشعوری طور پر کسی مجھ سے کے انتظار میں رہی، تاکہ تم پکمل جاؤ مگر تم پھر بنے رہے اور میں ہارتی چلی گئی۔ مجھے نہ ملک پر دسترس رہی، نہ تم پر۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ حالات یوں بھی ہو جائیں گے۔ تم کیا سمجھتے ہو، جب تم پر قاتلانہ حملے ہوتے تھے تب میں اس کا درد محسوس نہیں کیا کرتی تھی؟ یقین جانو، جو کوئی تم پر لگی تھی تو اس کا درد میں نے اپنے دل پر محسوس کیا تھا مگر میں بد نصیب تمہارے دھنوں پر مرہم بھی نہ رکھ سکی، یہ اعزاز کوئی اور لے گیا۔ مجھ سا بد نصیب بھی کوئی ہو گا کہ جس نے جسے جا ہا، اسی کی وجہ سے اس پر کوئی چل گئی۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں اور ہا، جو اس کے کہ تم میری روح تک میں سا گئے ہو، میں تمہارے لیے کچھ بھی نہ کر سکی۔ میں سرتچی رہی مگر میری یہ تڑپ کسی کام نہ آ سکی۔ میں نے ملک کو بہت سمجھا یا تھا کہ مجھ کو وہ اس تھے کو لیکن وہ ایسا ضدی تھا کہ میری ایک بھی بات نہ مانی اور تم نے بھی کون سا میری کوئی بات مانی۔ میں بد نصیب نہیں تو اور کیا ہوں۔ تم بھی مجھے اپنا دشمن سمجھنے لگے۔ میں ملک کو لے کر دور و دلیس چلے جانے کو تیار تھی، تمہاری پوجا بھی کرنا چاہتی تھی مگر کچھ بھی تو نہ کر سکی۔ جس دن ملک عاصب ہوا تھا، میں اسی دن سمجھ گئی تھی کہ اس کے دن پورے ہو چکے ہیں۔ میں کسی عورت ہوں جو کسی کو بھی نہ پا سکی۔ میں اس کی زندگی کے لیے بھیک مانگنے تمہارے پاس گئی۔ کاش اگر مجھے کچھ کہے بنا ہی واپس لوٹا دیتے مگر تم نے جو بیخبر میرے دل کے آ پار کیے، وہ میری روح تک کو گھائل کر گئے ہیں۔ ایک ایک لفظ تیر کی مانند میرے ذہن میں انگار ہا، تمہارا کوئی دوش نہیں، میں خود ہی بے باہمیت ہو کر رہ گئی ہوں۔ میں تمہیں ذرا بھی قصور وار نہیں سمجھتی، نہ ہی سمجھ سکتی ہوں اور شاید میں نے یوں مرنے کا نہ سوچا ہوتا اگر تم مجھے طعن نہ دیتے۔ تم نے مجھے طعن ہی ایسا دے دیا تھا کہ میں خود سے سمجھو نہ نہیں کر پائی۔ شجاع! یقین کرو کہ میرا خون گندہ نہیں ہے۔ میں ساری زندگی تمہاری نفرت برداشت کر لیتی مگر اب میری موت تمہیں یقین دلادے گی کہ میرا خون گندہ نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے، تم یہ جاننے کی کوشش کرو کہ میں نے خود کئی کا فیصلہ کیوں کیا۔ سنو، صرف اور صرف تمہارے اس طعن کی وجہ سے۔ تم پریشان مت ہونا۔ تم سے متعلق میں نے ہر شے ضائع کر دی ہے۔ اس خط کے پوسٹ کر دینے کے بعد میرا اس کے سوا کوئی کام نہیں کہ نہ بہنی لوں۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ میں مر جاؤں گی، میں مر رہی ہوں اور پھر مجھے مری جانا چاہیے ورنہ میں پوری زندگی لوٹھو مرنی رہوں گی۔ شجاع! خدا کے لیے مجھے معاف کر دینا، ہر جانے والوں کو معاف کر دینا چاہیے اور ہو سکے تو کبھی کبھی میری قبر پر آ جا یا کرنا۔ شاید میری روح کو سکون مل جائے۔ پلیز، مجھے معاف کر دینا۔"

"نقطہ، بد نصیب ماریہ"

"کس کا خط ہے۔؟" حسن کی آواز پر میں چونک گیا، یوں جیسے چوری کرتے ہوئے رتھے ہاتھوں پکڑ لیا گیا ہوں۔ پتہ نہیں وہ کب آ کر میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا تھا اور یقیناً میں اس وقت اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پایا تھا۔ میرے چہرے کی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ میں کچھ بھی چھپا نہیں پایا تھا۔ میں نے حسن کے چہرے کی جانب دیکھا، وہ انتہائی سنجیدگی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں کتنے ہی لمحوں تک اپنے حواسوں میں نہیں آ سکا۔ جب مجھے صورت حال کا احساس ہوا تو میں نے کچھ کہے بغیر وہ خط حسن کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے غور سے میری طرف اور پھر خط کی طرف دیکھا۔ چند لمبے اسی جاہد کیفیت میں گزر گئے۔ پھر وہ خط پکڑتے ہوئے بولا۔

”میں نے پوچھا ہے، جان جی ایہ خط کس کا ہے؟“

”خود پڑھ لو۔“ مجھے اپنی آواز کہیں کنوئیں میں سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔ حسن خط پڑھنے لگا اور میں سگریٹ سٹاک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر بدلتے ہوئے رنگوں سے میں سمجھ گیا کہ اس خط میں حسن کے لیے کئی ایک انکشافات تھے، اس کے دماغ میں کیسے کیسے پھونچال آچکے ہوں گے۔ خط پڑھ لینے کے بعد اس نے وہ ادراقی لحافے میں رکھ دیئے۔ اس کے چہرے پر سکون بھری کیفیت تھی بالکل طوقان آجانے کے بعد خاموشی کی طرح۔ ہم میں کتنے ہی لمحوں تک خاموشی جاہل رہی۔ تجسس بھی ایک غبارے کی مانند ہوتا ہے، آگیا کی سوئی جب اس میں لگ جائے تو ساری ہوائیں اٹھ جاتی ہے۔

”مجھے شک تھا کہ تم میں اور ماری میں کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہے۔ کیا ہے اور کس نوعیت کا، یہ تو میں نہیں جانتا تھا۔ اس خط سے تو اس تعلق کی شدت بھی سمجھ میں آگئی ہے، تفصیل شام کے وقت سہی۔ حسن نے لفاظی میری جانب اچھالتے ہوئے کہا۔“ صبح میں اور عامر جان بوجھ کر تمہاری طرف گئے تھے، ہم تمہارا رد عمل دیکھنا چاہ رہے تھے مگر اب تمہیں خود ہی ساری کہانی سنا دینی چاہیے۔“

”حسن ایہ ایک لمبی کہانی ہے اور اس میں اتحاد دلچسپ پہلو بھی نہیں، میں سب کچھ کہہ دوں گا تاکہ ماریہ سے متعلق باب ہمیشہ کے لیے بند ہو جائے۔ میں اسے یاد بھی نہیں کرنا چاہتا۔“

”میری جان! آج رات تمہارے نام، اس وقت تو اٹھو۔“ اس نے اٹھتے ہوئے کہا تو میں نے ماریہ کا خط سنبھالا، باقی غلطوہ راز میں دھرے اور سگریٹ ایش ٹرے میں مسلسل کراٹھ گیا۔

شام ڈھلے میں مگر چھپا چھپا تو نائلہ گن میں معروف تھی۔ سزخان کفگیر سے چھپنے کے ساتھ خیر و آرزائیں۔ میں مختلف کھانوں کی خوشبو سے خوشگوار احساس کے ساتھ گن کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔

”ایسے کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ نائلہ نے حیرت بھری سگریٹ سے کہا۔

”انقلاب زمانہ دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے کئی مصنوعی حیرت سے کہا تو سزخان بولیں۔

”بیٹا! تمہارے لیے تو یہ حیرانگی والی بات ہی ہوگی مگر یہ مجھ سے بہت ساری ڈیٹیلز سنا سیکھ گئی ہے اور وہ بھی چپکے چپکے میرا تو خیال ہے، یہ بڑا پیارا انقلاب ہے۔“ ان کے لہجے میں چاہت بھری ہوئی تھی۔

”پائل، سزخان! مجھے بہت خوشی ہوئی۔“ میں نے متاثر ہوتے ہوئے کہا تو جھٹ سے نائلہ بولی۔

”آپ پلیس، میں ولد ار کے ہاتھوں چائے بھجوا دیتی ہوں، اب یوں نظر نہ لگا دیں۔“

”ٹھیک ہے، جناب۔۔۔“ میں سعادت مندی سے کہتے ہوئے مڑ گیا تو پشت سے ان دونوں کا تہقید سنائی دیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ خوشیاں کہیں سے لائی نہیں جاتیں، خود اپنے آپ پیدا کی جاسکتی ہیں اور شرط محض غلوں کی ہے۔ صرف خوبی رشتے ہی تو زندگی میں خوشگواریت بھرنے کا باعث نہیں بنتے۔ کچھ غلوں بھرے تعلق ایسے بھی ہوتے ہیں جن سے زندگی کی خوبصورتیاں پاؤں میں آ پڑتی ہیں اور میں کتنا خوش قسمت

تھا کہ ایسے تعلق مجھے میرے تھے۔

نانکہ نے ڈنر پر خاصا اہتمام کر لیا تھا، مسز خان فیملی بھی ہمارے ہاں مدعو تھی۔ نانکہ سیاہ شلوار سوٹ میں بڑی خوبصورت لگ رہی تھی۔ اس کی شہابی رنگت مووی شمعوں کی جلتی ہوئی روشنی میں بڑی خوبانگ لگ رہی تھی۔ عام نظروں ہی نظروں میں اس پر فدا ہو رہا تھا مگر حسن خلاف توقع خاموش تھا۔ بڑے خوشگوار ماحول میں کہا ناختم ہوا تو مسز خان فیملی چلے گئی۔ ہم ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے تو عامر نے کہا۔

”نانکہ اتم آج بہت خوبصورت لگ رہی ہو۔“

”میری جان! وہ خوبصورت ہے، اس لیے خوبصورت لگ رہی ہے۔ اب اگر تم تعریف کر کے اسے خوش کرنا چاہتے ہو تو الگ بات ہے۔“ حسن نے ہنستے ہوئے کہا تو عامر سی باتوں سے ہوتی ہوئی بات اچانک اس جگہ آ پہنچی جس کے لیے وہ لوگ اہتمام سے آئے ہوئے تھے۔ تب میں نے دیر سے کہا۔

”آپ میرے دوست ہو، مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ سب باتیں اپنے تک ہی رکھیں۔ صورت حال ایسی نہ ہوتی تھی اب ہے تو شاید میں اسے کہی نہ کہتا۔“ میں یہ کہہ کر سانس لینے کے لیے رکا۔ وہ سب میری طرف متوجہ تھے، وہ خاموش رہے تو میں نے کہا۔ ”یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں لاہور شہر نہیں گیا تھا۔ بی اے کا امتحان دے کر فراغت تھی۔ میرے سونے، پڑھنے اور آوارہ گردی کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا۔ میں ان دنوں لکھنؤ پڑھا کر رہا تھا چاہے وہ انگریزی زبان میں مل جاتا یا اردو میں۔ ایسے ہی ایک دن مجھے خیال آیا کہ میں بھی کوئی کہانی لکھ سکتا ہوں۔ اس خیال نے جان نہ چھوڑی تو میں نے کوشش کی اور ایک کہانی لکھ لی۔ لکھنے کا یہ تجربہ بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس سے جولفت مجھے ملی، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ میں اپنے اس نئے تجربہ سے دوسروں کو متعارف کرانا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے دوستوں کو وہ کہانی دکھائی، انہوں نے پسند کی اور مشورہ بھی دیا کہ میں اسے کہیں شائع کراؤں۔ فیصلہ ایک ڈائجسٹ رسالے کے حق میں ہوا، کہانی بھوادوی گئی اور وہ شائع بھی ہو گئی۔ ایک فحش مندی کا احساس میرے اندر در آیا۔ یہ ایک نئی طرح کی لذت تھی جس سے میں آشیاب ہوا۔ پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔“

یہ کہہ کر میں ڈراما نمبر تو حسن بولا۔

”میرا خیال ہے تم نے تعلیم بیٹھیں لاہور ہی کے ایک کالج سے حاصل کی تھی؟“

”ہاں، بیٹھیں لاہور ہی میں پڑھا تھا لیکن کہانی، میں نے جب لکھی تھی جب میں اپنے آبائی قصبے میں فراغت کے دن گزار رہا تھا۔“

”اچھا، پھر؟“ عامر بولا۔

”نئی سے نئی کہانی کی تلاش میں لوگوں سے ملنا میرا مہذبہ بن گیا۔ میں یونیورسٹی میں پڑھنے کے لیے لاہور آ گیا۔ انہیں میری لاہور کی سرگرمیوں کے بارے میں بہک ل گئی تھی۔ بہر حال نئی دوستیاں، نیا ماحول تھا۔ میرا جی تو نہیں لگتا تھا۔ میں چونکہ کہانی لکھنے کے باعث ایک نئی دنیا سے متعارف ہو چکا تھا اس لیے تمہاری لذت بھی مجھ پر آشکار ہو گئی اس لیے میں اپنی ذات میں ہی کھو گیا۔“

”اس میں مار یہ کہاں ہے؟“ حسن نے بے صبرے پن سے کہا۔

”وہ بھی آئے گی لیکن تمہارا صبر۔۔۔ بات اگر پورے بس منظر میں سنی ہے تو مجھے کہنے دو ورنہ چند فقروں میں بھی بات ختم ہو سکتی ہے۔“
”تم کہو، یارا“

”یونہی دور میں ہی لوگ مجھے اکثر دو حوالوں سے ملتے تھے۔ ایک وہ جن سے مجھے کہانی ملتی تھی اور دوسرے وہ جو میری کہانیاں پڑھتے تھے۔“
”خود کو بھرپور محسوس کرتے ہوں گے آپ؟“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”بیرتو خیر نہیں، ایک انفرادیت کا احساس ضرور ہوتا تھا، میں فائل سپر زوے کو اپنے آبائی قصبے میں آ گیا۔ انہی دنوں مجھے ایک فون ملا۔ وہ لڑکی میری کہانیاں پڑھتی تھی۔ میں بتاؤں کہ میرا قصبہ اتنا بڑا نہیں ہے، لوگ زیادہ تر ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس لڑکی کا میرے متعلق معلوم کر لینا مشکل نہیں تھا۔ اس نے مجھے میری ہی کہانیوں پر بات کر کے حیران کر دیا، ایسی باتیں جن کا ادراک مجھے بھی نہیں تھا۔ پہلی بار میرے دل میں خواہش ابھری کہ وہ باتیں کرتی رہے اور میں مستعار ہوں پھر جب بھی اسے وقت ملا، مجھے فون کر لیتی۔ بات کہانیوں کے دائرے سے نکل کر زندگی کے مختلف حوالوں تک پہنچی۔ میں حیران تھا کہ وہ کیسی لڑکی ہے جو میرے قصبے میں موجود ہے اور لڑ بچہ کے بارے میں اتنی رسائی رکھتی ہے؟ وہ محض بی ایس سی ہی کر پائی تھی، مزید وہ اپنے طور پر گھر میں ہی تیاری کر رہی تھی۔ وہ ایک روایت پسند مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا باپ تاجر تھا اور چار بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی، آمنہ اس کا نام تھا۔ میری اس سے دوستی گہری ہوتی چلی گئی۔ میں نے اسے دیکھا تک نہیں تھا لیکن بات روزانہ ہو جانے کے باعث میں اس کی سانسیں تک پہنچانے لگا۔ ہمارے درمیان دوستی کا مقدس رشتہ استوار ہو گیا۔ میں نے کبھی بھی اس سے دو بد ملاقات کے لیے نہیں کہا ورنہ کبھی اس نے خواہش کی۔“

”جان جی! اس میں ماریہ کدھر ہے؟“ حسن نے اکتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بس تمہوڑا سا صبر اور آگے آ رہی ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”کب؟“ وہ چڑچڑ سے انداز میں بولا۔

”سنئے رہو۔“ میں نے اسی کے انداز میں کہا اور بات شروع کر دی۔ ”آمنہ سے میرا تعلق بہت الگ نوعیت کا تھا۔ ایسے ہی ایک دن اس نے مجھ سے اگلے دن کی مصروفیات کے بارے میں پوچھا تو مجھے احساس ہوا جیسے وہ میرے گھر آنا چاہتی ہے۔ میں نے کہہ دیا کہ کچھ بھی مصروفیت نہیں ہے۔ تو اس نے مجھے سارا دن گھر پر رہنے کو کہا۔ اگلے دن سہ پہر کے وقت اس نے فون کر کے تعہد ترقی کی کہ میں گھر ہوں اور پھر اگلے چند منٹ میں وہ میرے سامنے تھی۔ وہ میرے ہی محلے میں اپنی ایک کھلی کے گھر آئی، وہاں آ کر اس نے فون کیا۔ وہ میرے لیے بڑا سارا ایک اور تھوڑا لائی تو مجھے یاد آیا کہ اس دن میری ساگر تھی۔ اس نے مجھے حیران کر دیا۔ نجانے کب اس نے مجھ سے میری تاریخ پیدائش پوچھ لی تھی۔ وہ دو تین گھنٹے پہلے کہ چلی گئی۔ اس کی شخصیت میں اتنا اعتماد تھا کہ میرے گھر والوں کو وہ بہت اچھی لگی۔ اس کی باتیں، اس کا انداز اور اس کی شخصیت سب مل کر اسے حیران کن شخصیت بنا گئے تھے۔ اس رات اس نے فون پر باتیں کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ مجھے ملنے کی خواہش پوری کرتے ہوئے اس نے ان لمحوں کو یادگار بنا کر مجھے سر پر اتار دیا۔“

”وہ خوبصورت تھی۔ میرا مطلب ہے، وہ کیسی تھی؟“ عامر نے جلدی سے پوچھا۔

”ہاں، اسے اس کے مطلب کی چیز بتاؤ۔“ حسن جھٹ بولا۔

”نہیں، وہ ایسی خوبصورت نہیں تھی کہ اسے اپرا یا ایسی ہی کسی تشبیہ سے نوازا جائے۔ وہ پکی سی، سائنوئی سی اور قبول صورت لڑکی تھی مگر اس

کا سن خوبصورت تھا۔ جس نے مجھے متاثر کیا۔ میرے گھر والوں سے تو وہ حصارف تھی مگر ہمارے تعلق کے بارے میں اس کے گھر والے لاعلم تھے۔ وہ

شاید بتا دیتی لیکن ایک تو اس کا گھرانہ روایت پسند تھا، ان کے ہاں برادری ازم کو بہت زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ شروع ہی سے لاشعوری طور پر ہم میں

یہ طے پا گیا تھا کہ ہم کچھ بھی کر لیں، اپنی عزت اور اہمیت کو نہیں گھٹائیں گے چاہے ہمیں ایک دوسرے سے اجنبی ہی کیوں نہ ہوتا پڑے اور شادی کا

بندھن تو بہت دور کی بات تھی۔ ہم دونوں اسی میں خوش تھے اور ہمارے درمیان ایک مقدس جذبہ پروان چڑھتا گیا۔ پھر میں لاہور آ گیا۔ یہاں تے

ہی مجھے ایک اخبار میں جا ب مل گئی، یوں میں عملی زندگی میں آ گیا۔ اخباری مصروفیات کے ساتھ کہانیاں بھی چلتی رہیں۔ میں جب بھی اپنے آبائی

گاؤں جاتا تو آٹھ سے ملاقات ہو جاتی یہ فون پر ایک لمبی گفتگو ہوتی اور حسن اب ماریا آ رہی ہے۔“

”شکر ہے، جان جی ا“ اس نے صوفے سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

”میں ایک معروف ڈائجسٹ میں لکھتا تھا، اسی میں ماریا بھی کہانیاں لکھتی تھی۔ ایک دوسرے کا نام جاننے کے سوا ہم میں کوئی تعلق نہیں

تھا۔ ہماری ملاقات ڈائجسٹ کے صفحات پر پھلے ہوئے لفظوں ہی سے ہوتی رہی، جیسے سب قارئین کی ہوتی ہے۔ ماریا یہ کہیں لاہور کی رہنے والی

تھی۔ وہ مجھے میرے قصبے کے حوالے ہی سے جانتی تھی۔ میں نے کسی کو بتایا ہی نہیں تھا کہ میں لاہور میں ہوں اور ایک اخبار میں جا ب کرتا ہوں۔ پھر

ایک بار ہوا یوں کہ اس نے میری کہانی پر تنقید کر ڈالی۔ دوسرا سربے جا اور فضول تنقید تھی جس میں نہ کوئی منطق تھی اور نہ ہی دلیل، مجھے فطری طور پر برا

لگا۔ جا تو تبصرہ تو حوصلہ افزائی کا باعث بنتا ہے مگر تخلیق آئینہ تنقید برداشت سے باہر تھی۔ چاہے تو یہ تھا کہ میں اس کی احمقانہ حرکت پر جواب ہی نہ

دیتا، نظر انداز کر جاتا مگر میں نے ڈائجسٹ والوں کی وساطت سے ایک ذاتی نویمت کا خط لکھا جس میں بہت مناسب اور معقول لفظوں میں اسے

احساس دلایا۔ اس نے فوراً ہی جواب میں معذرت کی اور ہم میں خط و کتابت کا سلسلہ چل اٹھا۔ بہت عرصے بعد مجھے پتہ چلا کہ اس کی بے جا تنقید کا

مقصد ہی یہی تھا کہ مجھ سے رابطہ ہو جائے۔“

”وہ یہاں لاہور ہی کے ایڈریس پر تمہیں خط لکھتی تھی؟“ عامر نے پوچھا۔

”نہیں، اپنے قارئین یا ماریا سے جو رابطہ بھی تھا، وہ میرے آبائی قصبے کے ایڈریس سے ہی ہوتا تھا۔ میں گھر جاتا تو ڈاک دیکھ لیتا۔ یہاں

لاہور میں میرا کوئی مستقل ٹھکانہ نہیں تھا۔ بہر حال، اس طرح یہ سلسلہ چلتا رہا اور تقریباً ایک سال بیت گیا۔ لکھنے لکھانے کا اسے شوق تھا اس لیے

یونیورسٹی میں آتے ہی اس نے ایک انگریزی اخبار جو ان کر لیا جو ہفت روزہ تھا۔“

”آپ دونوں پانچھس آپ کے دل میں ماریا سے ملنے کی خواہش پیدا نہیں ہوئی؟“ نائلہ نے پوچھا۔

”اس نے نہ جانے مجھے کتنی بار لاہور آنے کے بارے میں لکھا، ایک بار تو اس نے ہوٹل میں میری رزرویشن بھی کروادی تھی۔ میرے بھی

دل میں اس سے ملنے کی خواہش تھی لیکن۔۔۔"

"لیکن کیا؟" عامر نے پوچھا۔

"میں نے اس سے متعلق معلومات لے لیں تھیں۔ اس کا باپ اچھا خاصا بزنس میں تھا، دولت کی ریل تھی اور ان کے رہنے سہنے کا انداز بہت علق تھا۔ اس میں اگرچہ یہ آسانی تھی کہ میں بلا روک ٹوک اس سے مل سکتا تھا، ان کے تعلقات استعمال کر سکتا تھا۔ ماریہ جیسی لڑکی کی وساطت سے بڑے فائدے حاصل کر سکتا تھا۔ بلاشبہ وہ خاصی دولت مند لڑکی تھی لیکن اپنی اتنا پسند طبیعت کو یہ گوارا ہی نہیں تھا۔ میں نے اسے دیکھا بھی تھا۔ آپ نے بھی دیکھا تھا، وہ خوبصورت اور پرکشش تھی۔"

"بات مجھ میں نہیں آئی کہ تم اس سے ملنے سے کیوں کتراتے رہے؟" حسن نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"وہ جو ایک معیار ہوتا ہے ذہن میں ایک عورت کے بارے میں یا کسی لڑکی کے بارے میں، ماریہ میرے اس معیار پر پوری نہیں اترتی تھی۔ خط و کتابت کی حد تک یا ڈائجسٹ کے صفحات کی نسبت سے کوئی نہ کوئی نانا فرڈ کیا جاسکتا تھا لیکن اس سے آگے کا تعلق نہ تو میں افورڈ کرنے کی سوچ رکھتا تھا اور نہ ہی عقل اس بات کی اجازت دے رہی تھی سو میں نے اسے خط و کتابت تک محدود رکھا اور اس کا ہم دونوں کے سوا کسی کو نہیں تھا۔"

"میں سانس لینے کو رکھتا تھا کہ دلدار سے کافی لانے کے لیے کہا۔ میں نے اپنی بات جاری رکھی۔" پھر ایک دن روٹری کلب والوں کی آواری میں گت نوٹیکر تھی، میں وہاں رپورٹنگ کے لیے گیا تو ماریہ بھی اپنے اخبار کی طرف سے آئی ہوئی تھی۔ اسے چہرہ شناسی نہیں تھی سو ہم دو از حدائی کھینے قریب رہ کر گزارنے کے باوجود اجنبی رہے۔ اس دوران میں نے اس کا رویہ دیکھا، انتہائی آزاد خیال اور انٹرارڈن لڑکی تھی۔ وہ اپنے طور پر ٹھیک تھی لیکن میرے جیسے پینڈ و بندے کے معیار پر پوری نہ اترتی۔ وہ اپنے ماحول میں نارمل تھی لیکن میں نے کہا، کہ ایک معیار ہوتا ہے ذہن میں اور ماریہ اس سے بالکل مختلف تھی۔ آواری میں اس کا کوئی خوشگوار تاثر مجھ پر نہیں پڑا۔ اس اجنبی ملاقات کے بعد میں نے بھی اپنا رویہ بدل لیا، خط و کتابت کم کر دی۔ میں یہ چاہتا تھا کہ آخر کار سلسلہ ختم ہو جائے گا ایک دم خط بند کیے تو بہانے تراشنے پڑیں گے۔ میری سرور مہری بڑی مٹی مگر اس کا اثر اٹھ ہوا۔ اس کے خطوں میں تیزی آتی گئی اور ساتھ میں وہ سرور مہری کی وجہ بھی پوچھتی رہی۔ پھر میں نے اسے لکھ دیا کہ میں اسے لڑکی سمجھ کر دوستی سمجھائے جا رہا ہوں، ہو سکتا ہے کہ کل کوئی لڑکا مجھ سے آن ملے اور بڑے شوق اور چاؤ سے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہے کہ مجھ سے ملیں، میں ہوں ماریہ پھر میرے پاس سوائے ندامت اور افسوس کے کچھ نہیں ہوگا۔ اس خط کا جواب بہت خوفناک قسم کا آیا۔ اس نے لکھا کہ میں نے اس کی تسونیت کی تو چہن کی ہے اس ضمن میں اک لسا چوڑا لنگر تھا جس میں میری مردانگی کو لٹکارتے ہوئے تھپتھک کی گئی تھی۔ وہ خط پڑھ کر مجھے بہت غصہ آیا، تاہم میں نے اس لیے برداشت کر لیا کہ اس بہانے جان چھوٹی۔ میرے خط نہ لکھنے پر کچھ عرصہ قنصل رہا۔ پھر اس کی طرف سے خطوط کا سلسلہ دوبارہ چل نکلا۔"

"یہ سلسلہ کب تک رہا؟" حسن نے دیر سے سے پوچھا۔

"یہی کوئی دو سال، اس دوران اس کی یہ خواہش بڑھ گئی کہ میں اس سے ملیں۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتی تھی، مجھ سے ملنا چاہتی تھی۔ میں اس سے کتراتا رہا۔ پھر اس نے مجھے لکھا کہ وہ ایک اردو اخبار جوائن کرنے جا رہی ہے سو میرے پاس کترانے کا کوئی جواز نہ بچا، جلد یا بدیر اسے معلوم ہو

جانا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ سو میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ ہم ایک چائیکز ریسٹورنٹ میں ملے۔ وہ اپنی گاڑی میں آئی تھی جبکہ میں ان دونوں ہانچک پر تھا۔ ہمارا آغا سا منہ ہوا۔ مجھے یہ پورا ادراک ہے کہ مجھ پر نظر پڑنے ہی خواتین کی آنکھوں میں ایک خاص قسم کا تاثر ابھرتا ہے، ان کی آنکھ کے تاثر ہی سے مجھے اندازہ ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح کی خواتین ہیں۔ ماریہ کی آنکھ میں بھی وہی تاثر واضح طور پر میں نے دیکھا اور کھانے کا تو بہانہ تھا۔ کافی دیر تک گپ شپ ہوئی۔ پھر ہم میں اک سلسلہ جل نکلا۔ طویل ملاقاتیں، لمبی بحثیں، تھانف، میرے پائے اور فون کا لیس، کوشش کر کے وہ میرے اخبار میں ہی آگئی، تب ہر وقت کا ساتھ بن گیا۔ میں یہ بات پورے وقت سے کہتا ہوں کہ مجھے معلوم نہیں ہوا، کب اس کے دل میں میرے ساتھ شادی کرنے کا ارمان اٹھا تھا۔ میں نے اسے ہمیشہ ایک دوست اور کولیگ کی حیثیت سے فریٹ کیا مگر اس کا انداز نظر بدل چکا تھا۔ اس نے مجھے ایک شوہر کی حیثیت سے دیکھنا شروع کر دیا۔

”شاید یہ سلسلہ دراز رہتا مگر ایک بار اس نے میرا آبائی گھر دیکھنے کی خواہش کی۔ وہ مجھے اپنے گھر والوں سے متعارف کرا چکی تھی اور مجھے کوئی اعتراض نہیں تھا لیکن مجھے یہی فکر تھی کہ اس کے گھر والے کیا سوچیں گے جب وہ دو چار دن میرے ساتھ رہے گی؟“

”کیا آپ کے گھر والوں کے نزدیک یوں ٹھیک تھا؟“ نائلہ بولی۔

”میرے لیے بھی اعتراض کی گنجائش تھی مگر میرے گھر والوں کو میری ذات پر اعتماد تھا، خصوصاً میرے بھوکا اور پھر میں اسے اپنے گھر لے کر جا رہا تھا، کسی ہلکے سا پٹ پر نہیں۔“

”شجاع! ذرا ٹھہرو“ عامر نے مزید کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔ ”مجھے یہ سمجھاؤ تمہیں یہ کیسے احساس ہوا کہ اس کے دل میں تمہارے ساتھ شادی کرنے کی خواہش ہو جوتھی؟“ اس کے لہجے میں سنجیدگی تھی۔

”اس کی باتوں سے، اس کے سائل سے، مستقبل کی پلاننگ کا جب وہ اظہار کرتی اور عامر! کچھ باتیں محسوس کرنے کی بھی تو ہوتی ہے۔“

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اچھا، وہ تمہارے آبائی قصبہ گئی تو پھر؟“ حسن نے سوچتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”اس کی آمد پر میرے گھر والوں نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا، یوں جیسے عام سی بات ہو، تاہم اسے اجنبیت کا احساس نہیں ہونے دیا۔ ایک دن اور ایک ات وہ بہت خوش رہی۔ اب ایسا تو ممکن نہیں تھا کہ میں قصبے جاؤں اور اپنے دوستوں سے بھی نہ ملوں۔ اگلے دن میں اپنے دوستوں سے ملنے چلا گیا، رات گئے لوٹا تو وہ انتہائی بوریٹ محسوس کر رہی تھی۔ مطلب یہ کہ میرے گھر والوں کے ساتھ اس کی کوئی ذہنی مطابقت نہیں تھی۔ اگلے دن ابھی میں سویا ہوا تھا کہ آمنہ کا فون آ گیا۔ وہ بہت خوش ہو رہی تھی کہ میرے ساتھ کوئی ساتھی کولیگ بھی آئی ہے۔ وہ مذاق کرتے ہوئے پوچھنے لگی کہ کہیں شادی کا ارادہ تو نہیں؟ یوں کافی دیر تک باتیں چلتی رہی، پھر اسی سہ پہر وہ آگئی۔ اس ملاقات کے نتیجے میں ماریہ نے اسی رات واپس جانے کا پروگرام بنالیا۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ ماریہ بہت زیادہ آمنہ سے حاسد ہوئی ہے۔ لاہور واپسی پر میں نے پوری شدت سے محسوس کیا کہ کاش! میں اسے آبائی گھر نہ لے جاتا اور اگر چلی بھی گئی تھی تو آمنہ سے ملاقات نہ ہوتی۔ ماریہ نے مجھے دلجو انداز کا خطاب دے ڈالا،

اس کا رنگ ہی بدل گیا تھا۔"

"مثلاً کیا؟" نائلہ نے پوچھا۔

"وہ میرے کردار کے مثبت پہلو کو محض ڈراما اور طبع کہنے لگی۔ خواہ تو وہ میری ذات پر کچھ اچھا سمجھتی، آمنہ کو برا بھلا کہتی۔ میرے گھر والوں کے رویے میں کیزے کے لگاتی۔ اصل میں وہ شدید حسد کے باعث اپنے طور پر ہی اوٹ پٹانگ سوچتی، اپنے طور پر نتیجہ اخذ کرتی اور پھر اسی نتیجے کے حق میں جھوٹ جج قسم کے دلائل دینا شروع کر دیتی۔ اس نے مجھے ذہنی طور پر زچ کر کے رکھ دیا۔ وہ جیسا آمنہ کے بارے میں سوچتی، مجھے اس کی گھٹیا سوچ بہت بری لگتی۔ میں ماریہ سے کہیں بہتر آمنہ کی ذات سے واقف تھا، اسے سمجھتا تھا۔ وہ اس کی ذات پر گندے الزامات لگا کر وہ باتیں بھی کہہ جاتی جو کبھی سچی بھی نہیں جاسکتی تھیں جس سے مجھے غصہ آ جاتا۔ کبھی کبھی وہ سب کچھ معاف کر کے میرے ساتھ شادی کی منصوبہ بندی کرنے لگی، آمنہ سے میرے تعلق کو بھول جانے کی بابت کہتی۔ میں حیران تھا کہ وہ آمنہ ہی کو اتنی اہمیت کیوں دیتی ہے؟ وہ میری ایک اچھی دوست تھی مگر ماریہ اس تعلق کو سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔ قصہ کہتا، میں نے ماریہ سے قطع تعلق کا فیصلہ کر لیا اور تب اس کا جو روپ میرے سامنے آیا وہ انتہائی بھیا تک اور کریدہ تھا۔"

"ایسا کیا کر دیا اس نے؟" عامر نے حیرت سے پوچھا۔

"تم پہلے اس کی اور آمنہ کی ذہنیت کا فرق سمجھ لو۔ وہ جب مل بیٹھی تھیں، تب باتوں کے دوران آمنہ کی کزن نے سوال کر دیا کہ عورت کی زندگی میں شادی کے بعد کیا انتخاب آتا ہے؟ اس پر آمنہ نے کہا کہ شادی کے بعد عورت کے پاؤں تلے جنت آجاتی ہے اور ماریہ کا تبصرہ یہ تھا کہ عورت کی زندگی بکھر جاتی ہے۔"

"اوہ، کس قدر بگوس تھی یہ، ماریہ۔" نائلہ نے تڑپ کر کہا تو میں نے اپنی بات جاری رکھی۔

"ماریہ جاتے ہوئے آمنہ کا فون نمبر لے لگی اور اسے فون کرنے لگی، میرے اور آمنہ کے تعلق پر بارے بے ہودہ بکواس کرتی رہی۔ اگرچہ اس کے والدین سمجھ دار تھے مگر گھر کے سارے افراد تو برداشت نہیں کرتے۔ آمنہ پر حساب نازل ہو گیا۔ وہی آمنہ جو ان کے لیے لاڈلی اور پیاری تھی، ایک دم ہی اچھوت کی حیثیت اختیار کر گئی۔ انہی کے خاندان کا ایک لڑکا جنم پر، نلے درجے کا لوفرا اور آوارہ گرد آمنہ کے پلے ہاتھ دیا گیا۔ وہ آمنہ جس کی ذات کی قسم میں دے سکتا تھا۔ جو اتنی پیاری تھی کہ جسے سنبھال کر رکھا جاتا۔ وہ سستی رہی، بڑتی رہی مگر اب تک نہیں کی۔ وہ ماریہ کی گندی سوچ کی بیسٹ چڑھ گئی۔"

"اوہ، میرے خدا! نائلہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مگر میرے سے انہوں نے زوہ لہجے میں بولی۔ "اب کیا حال ہے آمنہ کا؟" اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا وہ لدا کافی لے آیا۔ میں نے سہ لیتے ہوئے کہا۔

"میں اس کے حال سے بے خبر تو نہیں رہ سکتا تھا۔ جیسے خوشبو اپنا آپ منوالیتی ہے، آمنہ نے اپنی اچھی سوچ کے ساتھ جنم کو بدل کر رکھ دیا۔ پہلے اس نے جنم کے ظلم سے۔ وہ کتنا کچھ نہیں تھا، بس ماں باپ کے گلزاروں پر تھا۔ یہ آمنہ کی خواہش اور اچھی ذہنیت کا کمال تھا کہ جنم

برطانیہ چلا گیا اور آنت نے سکول کھول لیا۔ میں لاہور میں تھا لیکن میرے آبائی قبیلے میں بچپن کا دوست حیدر شاہ در پردہ اس کی مدد کرتا رہا۔ اس نے کیا کچھ اور کیسے کیا، یہ ایک الگ داستان ہے۔ بہر حال حیدر کا مجھ پر احسان ہے وہ پھر دعویٰ چلا گیا۔ مجھے آنت کی خیریت معلوم ہوتی رہتی۔ تقریباً چھ ماہ پہلے وہ بھی برطانیہ چلی گئی ہے۔ ماریہ کی بے ہودہ کہو اس نے اس کی زندگی کے قیمتی سال زہرا کو لوہ کر دیے اس لیے مجھے اس سے شدید نفرت ہوئی اور میں نے اسے دھتکار دیا۔“

”دھتکارنے کے باوجود بھی وہ کیوں تمہارے لیے سر بخشی رہی؟“ عامر نے اچھتے ہوئے پوچھا۔

”اس نے بہت کوشش کی کہ میں اس کے ساتھ شادی کر لوں۔ اس کے لیے لڑکوں کی کی تو نہیں تھی۔ امیر گمر کی تھی، جاب محض شوقہ کر رہی تھی۔ مجھے برنس کالاجی دیا۔ میری چھوٹی بڑی خواہش پر قربان ہونے کے لیے تیار رہتی مگر میں نے اسے قریب اس لیے نہیں آنے دیا کہ میں اس کی ذہنیت سمجھ گیا تھا اور وہ اس کو اپنی ہار محسوس کر رہی تھی۔ اس کے دل میں میرے لیے محبت نہیں تھی بلکہ مجھے جیت لینے کی خواہش تھی۔ وہ مجھے جیت کر اپنی ان کی تسکین چاہتی تھی۔ پھر جو کچھ بھی ہوا، وہ آپ لوگوں کے سامنے ہے۔ وہ اپنے اندر کے زہر سے خود بخود ختم ہو گئی۔“

”تو یہ تھی ماریہ کی کہانی، ویسے مجھے افسوس ہوا۔“ عامر نے افسردہ لہجہ میں کہا۔

”اور میں اب ماریہ کا ذکر سننا بھی پسند نہیں کروں گا۔“ میں نے کہا تو حسن کھڑی دیکھ کر اٹھتے ہوئے بولا۔

”اوکے، ہاں! ہم تو چلے۔ اب جا کر نیکم دانی کی ڈانٹ سنیں، عامر صاحب تو شاید یہیں رہیں رکیں گے۔“ اس نے گاڑی کی چابی جیب سے نکالی اور چل دیا۔

میں اس شام ایک سیاستدان کا انٹرویو، کاغذ پر مشغول کر رہا تھا کہ ندیم آکر بڑے اطمینان سے میرے سامنے بیٹھ گیا۔ میری توجہ بٹ گئی، میں نے اس سے پوچھا۔

”خیریت، میری جان! یوں تمہارے میرے سامنے بیٹھ رہے ہوں؟“

”ہاں ایسے ہی، آپ کے پاس بیٹھے ہوئے کافی دن ہو گئے، دل چاہ رہا تھا۔“ اس نے سکراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو رہا ہے آج کل؟“ میں نے یونہی بات بڑھانے کے لیے پوچھا۔

”فاسے رنگین دن گزر رہے ہیں، بس آپ کی مہربانی ہے ورنہ ہم کیا اور ہماری بساط کیا۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر بولا۔ ”آپ کبھی زارا کو فون ہی کر لیا کریں۔“

”مطلب، کیا کہا جا رہا ہے جو تم؟“

”وہ بڑی پریشان ہے، شکوہ کر رہی تھی کیا آپ۔۔۔“

”پریشان کس لیے ہے وہ؟“

”وہ، توخیر کاظمی اس کا پڑھا صاف کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ اس سے تم چمن گئی ہے، اس کی جگہ لڑکی فرح کو سامن کر لیا گیا ہے۔ پھر

ایک طائفہ جا رہا تھا برطانیہ، سب ٹھیک تھا لیکن میں وقت پر اس کے پروڈیوسر نے اس کا نام نکال دیا ہے اور یہ سب وہی تصویر کالمی کر رہا ہے۔
”تمہیں پورا یقین ہے کہ یہ سب وہی کر رہا ہے؟“

”بالکل، آف وی سکرین بہت ساری وجوہ ہیں، آپ زارا کو فون کر لیں، وہ آپ کو بہتر انداز میں بتا سکے گی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن اگر اسے میری مدد چاہئے تو وہ خود مجھے کم از کم فون کر لیتی۔“ میں نے ندیم کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، وہ فون کر لے گی۔“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ زارا سے میری اس معاملے میں یونہی سرسری سی بات ہوئی تھی۔ میں نے

اس سے کہا تھا کہ میں تمہارے لیے کچھ کرنا ہوں لیکن اس نے انتہائی جذباتی انداز میں مجھے مع کر دیا تھا۔ تب میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے معاملات بہتر طور پر حل کر سکتی ہے اور اب معاملہ سنجیدہ ہو جانے پر بھی اس نے فون نہیں کیا تھا۔ میں نے زارا کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

”تم زیادہ سی عاقب نہیں رہنے لگ گئے ہو؟“

”کہنا، آپ سی کی مہربانی سے بے حد مصروفیت ہو گئی ہے۔“ اس نے شوخ انداز میں کہا۔ ”آج مجھے تھوڑی فرصت تھی، اس لیے آ گیا۔“

کوئی خدمت ہو تو حکم کریں، ویسے ایک بات ہے۔“

”کیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”تصویر کالمی کی کامیابی بہر حال مجھے اچھی نہیں لگ رہی۔“ اس کا لہجہ انتہائی عجیبہ تھا۔ میں ایک لمحہ کو چونکا اور اسے غور سے دیکھا۔ ندیم

پوری طرح شوہر میں خود کو مصروف کر چکا تھا اور اب اندر کے معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگا تھا۔ اس کے معاملے میں میرا خیال تھا کہ اگر

اسے ذرا سا سہارا دے دیا جائے تو وہ تیزی سے ترقی کر سکتا ہے، میرا خیال ٹھیک نکلا تھا۔ اب اس کے لہجے میں وہ احتجاجی انداز بھی نہیں رہا تھا۔ جو

مخلص اندر ہی اندر سگتے رہنے سے اس کی شخصیت کا حصہ بن چکا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ بڑے بڑے باصلاحیت لوگ صرف اسی وجہ سے نزل جاتے

ہیں کہ انہیں انگلی پکڑ کر چلانے والا کوئی نہیں ملتا یا پھر ان کے لیے ترقی کے دروازے بند ہو جاتے تو ان کے لیے لڑنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ مجھے خوشی

ہوئی کہ ندیم اب کامیاب صحافی کے طور پر نہ صرف محنت کر رہا تھا بلکہ آگے بڑھنے کا بھرپور جذبہ رکھتا تھا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ میں نے پوچھا۔

”اصل میں اس کا طریقہ واردات غلط ہے۔ میں جانتا ہوں کہ شوہر کی دنیا میں کہاں کہاں گہرائیاں اور اندھیرے ہیں۔ تصویر کالمی ایسے

قلمی چھڑت یونہی اپنی من مانی نہیں کر سکتے۔ یہ یقیناً ایسی طاقت میں ہوتے ہیں جس سے وہ قلمی دنیا پر سکرانی کر سکنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ صرف دو

چیزیں ہی اس دنیا میں سکرانی کا باعث بن سکتی ہیں، دولت یا پھر طاقت۔ تصویر کالمی جیسے لوگ اگرچہ دولت ہی سے سکرانی کرتے ہیں، وہ دولت جو

بذات خود ایک نشہ ہے لیکن طاقت کا حصول اور اس کا استعمال اس سے بھی بڑھ کر نشہ ہے۔ ایسے لوگوں کی اصل طاقت کیا ہے، یہ اگر آپ جان جائیں

تو سبھی کچھ سمجھ میں نہ آ جائے۔“

”تم ایک چیز کو بھول رہے ہو، وہ ہے ذہانت۔“

”نہی میں کہنا چاہ رہا ہوں کہ دولت اور طاقت میرے پاس نہیں ہے اور ذہانت کا مجھے نہیں پتہ مگر آپ سے مشورہ کر کے میں کوئی راہ نکالنا چاہتا ہوں۔“

”تمہارا کام ہو جائے گا مگر اس معاملے میں میرا نام نہیں آنا چاہیے۔ اگر تم کوئی کریڈٹ لینا بھی چاہو تو اپنے تک ہی محدود رکھنا۔“
 ”ٹھیک ہے، میں اب مطمئن ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ پرسکون ہو گیا اور میں انٹرویو کھینے لگا۔ وہ کچھ دیر میرے پاس بیٹھا رہا، پھر خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔ میں نے وہ انٹرویو مکمل کیا اور پھر مطمئن ہو کر صادق گجر کوفون کیا۔ اس کا نمبر میرے پاس محفوظ تھا۔ وہ مجھے میری آواز سے نہیں بلکہ میرے نام سے پہچان گیا۔ کچھ دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے دوبارہ مہذرت کی۔

”سوری جی، میں آپ کو فوراً نہیں پہچان سکا، آپ حکم کیجیے؟“

”یار ایہ تباہ کنویر کا لگی کیسا بندہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ایسا ہی جیسے اس قسم کے بھڑے ہوتے ہیں۔“ جواب میں وہ بولا۔

”وہ آج کل جس لڑکی کو پر سوٹ کر رہا ہے وہ۔۔۔؟“

”اوہ سہیلی! اصل کام بتائیں۔ ایسی کئی آتی جاتی رہتی ہیں۔“

”میرے بات سمجھنے کی کوشش کرو، میرے دوست! وہ لڑکی جس قسم میں کام کر رہی ہے، میں اس کے قسم ساز سے ملنا چاہتا ہوں۔ کون ہے وہ؟“

”اپنا ہی بندہ ہے، کیوں، خیریت؟“

”بالکل خیریت ہے، بس ایک چھوٹا سا کام ہے۔“

”آپ حکم دیں، کام ہو جائے گا۔“

”دو تو مجھے یقین ہے کہ کام ہو جائے گا لیکن میں اس سے ملنا چاہتا ہوں، کیوں ملنا چاہتا ہوں، یہ ملاقات پر تفصیل سے معلوم ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں اس سے رابطہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں۔“

”اوکے، طے ہیں پھر۔“ یہ کہہ کر الوداعی باتوں کے بعد رابطہ منقطع کر دیا۔

اگلی شام بیگزین کے آخری صفحات پر بس میں چھپ رہے تھے اور میری مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ اس وقت میں بیگزین سرسری نظر سے دیکھ رہا تھا کہ صادق گجر کوفون آ گیا۔ اس نے قسم ساز سے ملاقات کا اہتمام کر دیا تھا، اب یہ مجھ پر منحصر تھا کہ کہاں مل بیٹھیں؟ میں سنوڈیو قطعاً نہیں جانا چاہتا تھا سو میں نے انہیں آواری میں ڈر پر بلا لیا، پھر وقت طے کر کے رابطہ منقطع کر دیا۔ میں معمول کے مطابق گھر پہنچا تو نائلا آ چکی تھی اور تھکی تھکی سی سونے پر ڈھیر ہوئی بیٹھی تھی۔

”بہت تھک گئی ہو؟“ میں نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”ہاں، تھک تو گئی ہوں لیکن یہ تھکن بڑی سکون بخش ہے۔ ایسی ہی تھکن کے لیے میں ہمیشہ خواہش مند رہی ہوں۔ اس نے مسکراتے

ہوئے کہا، کھگے ہوئے چہرے پر خوشنوار مسکان لیے ناکہ اس لمحہ مجھے بہت پیاری لگی۔

”بہت خوب، ایسے ہی منت کرنے والے لوگ ترقی کرتے ہیں۔“

”شجاع! اب میں کوئی ماوی ترقی نہیں چاہتی۔ بس میری روح کو چینن آجائے، میرا ضمیر مطمئن ہو جائے یہی کافی ہے۔“ وہ اداسی کے

حصار میں کہتی چلی گئی۔

”ہاں۔ انسان دولت کے پیچھے بھاتا ہے، ماوی وسائل کی جو جمعیت میں وہ اپنے آپ سے بچھڑ جاتا ہے۔ ان حقیقتوں کو ایک طرف

رکھو۔ اگر خود میں ہمت باقی ہو تو فوراً تیار ہو جاؤ۔ ذرے کے لیے چلیں گے۔“

”ارے، شجاع صاحب! آخرت، ایسی ذرہ دست آفریں خوشی میں؟“ وہ یہ کہتے ہوئے اس نے یکدم ہی اداسی کے حصار کو توڑ دیا۔

”آج ویسے اینڈ ہے اور صبح میری آف ہے، اسی خوشی میں۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔

”چلیں جی، ٹھیک ہے۔ کب تک تیار ہو جاؤں؟“ اس نے شوقی سے پوچھا۔

”کیا مطلب، تمہارے تیار ہونے میں ایک گھنٹہ چاہیے؟“ میرے اس طرح کہنے پر اس نے جاندار قہقہہ لگایا اور اٹھ گئی۔

ہم ٹھیک وقت پر آداری پہنچ گئے، لابی ہی سے ڈائنگ ہال میں بیٹھا صادق گھر مجھے آگیا۔ وہ اپنے سامنے بیٹھے ایک ٹیم سے بندے

کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ وہ دونوں بڑے تپاک سے ملے، عمومی باتوں کے دوران کھانے کا کہہ دیا اور پھر خوشنوار ماحول میں قلم سائز سے پوچھا۔

”بڑی خوشی کی بات ہے جی کہ آپ سے ملاقات ہوئی، تحم کریں؟“ اس نے مسکراتی آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ مجھے وہ

پہلی نظر میں ہی گھاگ لگا تھا اور ایسے لوگوں کو محض اپنے مفاد سے فرض ہوتی ہے، وہ اپنے فرض کی زبان بکھتے ہیں اور اسی میں بات کرتے ہیں۔

”میں تمہیں دیر لہر کے چکر میں نہیں پڑتا، سیدھے سیدھے وہ وجہ معلوم کرنا چاہتا ہوں، جس کے باعث آپ نے زارا کو اپنی قلم سے الگ کر

دیا حالانکہ وہ شہرت یافتہ تھی اور اس کے مقابلے میں بالکل نئی لڑکی۔۔۔“

”یہ آپ اپنے لیے پوچھنا چاہ رہے ہیں یا زارا نے آپ سے کہا؟“ اس کے لہجہ میں تجسس تھا۔

”آپ دونوں ہاتھ ہی سمجھ لیں۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا تو وہ سٹاٹا اٹھا میں بولا۔

”بات یوں ہے کہ قلم کے حساب سے ہدایت کاری ڈیماٹھ کے مطابق تو زارا ہی موزوں ہے، میں بھی یہی چاہتا ہوں کیونکہ میں تو قلم کی

کامیابی چاہوں گا لیکن درمیان میں بہت سارے معاملات ایسے آگئے ہیں۔ جن کی وجہ سے میں مجبور ہو گیا ہوں۔ اس میں زارا کا کوئی قصور نہیں ہے

۔“ اس کا جواب گول مول سا تھا۔

”میں درمیان والی وجہ ہی تو معلوم کرنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے سیدھے ہی بات کہہ دی۔

”دیکھیں، بہت سارے معاملات ہوتے ہیں کہ جن کے بارے میں بندہ مجبور ہو جاتا ہے۔“ وہ اب بھی گریز کر رہا تھا کہ صادق گھر نے کہا۔

”آپ کہہ دیں، وہ کیا مجبوریاں ہیں۔ شجاع صاحب بڑے سمجھ دار اور گل بات والے بندے ہیں۔“ صادق گھر کے یوں کہنے پر وہ چند

لمسے سوچتا رہا اور پھر اس نے ایک ایسے سیاست دان کا نام بتایا جو اس وقت حکومت میں تھا۔ فرحان علی ایک ایسا اویڑ عمر سیاست دان تھا جس کی مہم میں خاصی مقبولیت تھی۔ اس کا تعلق ایک روایتی جاگیردار خاندان سے تھا۔ میں اس سے کبھی نہیں ملا تھا لیکن خبروں کے حوالے سے اس کے بارے میں میرا ذاتی تاثر کسی بھی طرح خصوصی نوعیت کا نہیں تھا۔ چونکہ اس کی جاگیر میں قومی اسمبلی کا پورا ایک حلقہ بنا جاتا تھا اس لیے ہر الیکشن میں اس کا رکن اسمبلی ہونا لازمی تھا۔ اس وقت وہ حکمران پارٹی میں وزارت بھی رکھتا تھا، یہ سب کچھ میں نے لمحوں میں سوجا اور پھر مسکراتے ہوئے کہا۔

”جناب! اگر یہ مجبوری درمیان سے ہٹ جائے تو؟“

”مجھے ذرا کوٹھم دینے پر کوئی اعتراض نہیں لیکن میرا مطلب، یوں اگر کسی غلط طرح یا براہ راست انہیں معلوم ہو جائے کہ بات کھل گئی ہے تو خاصی مشکلات پیدا ہو جائیں گی میرے لیے۔ آپ سمجھیں، میرا مطلب تو یہی ہے۔“ ظلم ساز اجمعی خاصی پریشانی میں اُسے ریلوای بات کہتے کہتے خاموش ہو کر میری طرف دیکھنے لگا۔

”دیکھیں، آپ مجھ پر بھروسہ رکھیں۔ میں خود نہیں چاہتا کہ میرا نام سامنے آئے تو میں آپ کی ذات پر کوئی حرف کیسے آنے دوں گا؟ اصل میں مجھے ان قلمی ہنڈتوں پر اعتراض اس لیے ہے کہ وہ غلط طریقے سے جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مجھے اس ضمن میں سمجھنا چاہیے کہ اعتراض ہے۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”جی، بالکل، انہی کی وجہ سے میں بہت ڈنڈا ہو گیا ہوں، میرا نقصان ہو گیا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ نئی لڑکی کے باعث ظلم کا مہا سبب نہیں ہوگی تو وہ کیا بزنس کرے گی؟“ وہ پریشانی میں پھٹ پڑا۔

”ان کی بات نہ مانئے پراختر کیا ہو جائے گا، کیوں مجبور ہیں آپ؟“ میں نے گلی سے کہا۔

”سو طرح کی باتیں ہیں جی، میرا صرف ظلم بنانا ہی تو بزنس نہیں ہے۔ میرے دوسرے کاروبار متاثر ہو سکتے ہیں۔ کسی بھی حکومتی شعبہ کو میرے خلاف استعمال کیا جاسکتا ہے، صرف ایک ٹیکس والے ہی پیچھے پڑ جائیں تو سارا کام ہی ٹھپ ہو کر رہ جائے۔ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں نا؟“ اس نے کچھ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہنے کی کوشش کی۔ میں سمجھتا تھا کہ محض ظلم سازی کے لیے خالصتاً سرمایہ کاری نہیں ہو رہی تھی بلکہ بہت سارا کالا روپیہ سفید کرنے کی غرض سے رقم بنائی جا رہی تھی۔ چونکہ یہ لوگ بھی خود چور تھے اس لیے اپنی ہی کمزوریوں کے باعث طاقت ور لوگوں کے ہاتھوں بلیک کیل ہو گئے تھے۔

”فرحان علی اتنا مشکل ثابت نہیں ہوگا۔ آپ اطمینان رکھیں، معاملہ افہام و تفہیم ہی سے حل ہو جائے گا اور آپ کا نام کہیں بھی نہیں آئے گا۔ جن تخفقات کی آپ کو گھر ہے، میں انہیں سمجھتا ہوں اور ان کا خیال رکھوں گا۔“

”بہت شکریہ، میرا بھرپور تعاون آپ کے ساتھ ہے۔“ اس نے شروط سے لہجے میں کہا تو صادق گہرے ناکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”آپ نے ان کا تعارف تو کرایا ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ظلم ساز سے ہونے والی بات گویا ختم کر دی تھی۔ مجھے صادق گہر کی ذہانت کا

مسترف ہونا پڑا جب میں مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ نائلہ ہیں، بزنس وومن ہیں اور حال ہی میں انہوں نے اسپورٹس ایکسپورٹ کا نیا پراجیکٹ شروع کیا ہے۔ میرے بہترین دوستوں میں سے ایک ہیں۔“ میرے کہنے پر وہ قدرے حیرت سے بولا۔

”امی واہ، میں تو سمجھا تھا کہ ان کا تعلق شو بیز سے ہے اور یقیناً جانیں، اگر یہ شو بیز میں جائیں تو۔۔۔“
 ”تو انتہائی کامیاب رہوں گی، یہی کہا جا رہا ہے تھے نا، آپ؟“ نائلہ نے مسکراتے ہوئے بے تکلفی سے کہا۔
 ”یقیناً، آپ کی تو آواز بھی بہت شاندار ہے۔“ اور لوگوں کی طرح وہ بھی اس کی آواز کا مسترف ہو گیا تھا۔

”جی، ایسا ہی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ میری آواز، میرا چہرہ شو بیز کے لیے سوزوں ہے مگر کیا کروں، یہ شو بیز اپنی کچھ میں نہیں آتا۔ ہمیں تو اپنا بزنس ہی ٹھیک ہے اور میں سمجھتی ہوں کہ میں اپنے شعبے میں ٹھیک ہوں۔“ نائلہ نے بڑے اعتماد سے کہا، اس کے اعزاز سے اس کی بدلی ہوئی سوچ واضح ہو رہی تھی۔ پھر کھانا آجانے تک بزنس، سیاست اور شو بیز سے متعلق باتیں چلتی رہیں۔ خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا تو چلتے ہوئے فلم ساز نے مجھے ایک بار پھر سے یاد دلایا کہ میں اس کے تحفظات کا خیال رکھوں۔ میں نے اسے پھر سے مطمئن کر دیا۔ میں نے فلم ساز سے تو کہہ دیا تھا کہ فرحان علی مشکل ثابت نہیں ہو گا لیکن میرے لیے وہ انتہائی مشکل ثابت ہونے والا تھا۔ میرا ایک مجبوری تو یہ تھی کہ میں سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ دوسرا اس قصے میں مرکزی حیثیت ایک ایسی عورت کی تھی جو صرف عیاشی کا سامان بنتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ مردوں کے اس معاشرے میں عورت مجبور محض ہے لیکن عورت نے بھی اپنا آپ منانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ نسوانی حقوق کی کوئی آواز بلند ہوئی بھی ہے تو وہ عورتیں مشرئی سوچوں سے اپنے ذہن آلودہ کیے ہوئے ہیں۔ وہی مشرئی سوچ جس نے مشرئی عورت کی زندگی سے لے کر معاشرے تک میں بے حسی، بے فیرتی اور گھٹیا رویے جیسا زہر بھردیا ہے۔ عورت کا تقدس کہاں ہے؟ اسی تقدس کی کھوج ہی عورت کو تقدس بخشتی ہے۔ فرحان علی اس تعلق کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ یہاں تک کہ تصویر کاٹھی جیسے لوگوں سے تعلق پر اعلیٰ کا اظہار کر دینا اس کی مجبوری تھا۔ پھر صحافی لوگوں کے سامنے ایسے تعلق کا اظہار کیا اپنی طاہری نیک نامی گروی رکھ دینے والی بات تھی۔ میرے نزدیک اس کے فقط دو حل تھے۔ کسی تیسرے شخص سے کام نکالا جائے اور دوسرا سیدھے سیدھے لڑائی۔ شروعاتی اہم تر شاہی سے ہو کر انجام وقت اور حالات پر منحصر تھا۔ پہلی صورت میں بہر حال فلم ساز کے تحفظات بھی محل نظر تھے۔ حسن علی فرحان علی کی پارٹی کے بارے میں رپورٹنگ کرتا تھا، وہ بڑی آسانی اور سہولت سے بات کر سکتا تھا اور پھر جس طرح میں سوچ رہا تھا، اسی طرح وہ میرے بڑے کام آ سکتا تھا۔

اگلی دوپہر میں نے حسن سے پوری تفصیل سے بات کی۔ سارا معاملہ سن لینے کے بعد اس نے چند لمحے سوچا اور پھر بولا۔

”یہ کام اتنا مشکل نہیں ہے۔ وہ لاہور بہت کم آتا ہے، اس کے لاہور آنے کا انتظار کیا جائے یا پھر اسلام آباد جا کر بات کر لیں لیکن تم فکرنہ کرو۔ یہ بہر حال ہو جائے گا۔“

”ایک بات اور ہے، حسن؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔

”کہو۔“ وہ پوری توجہ سے میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”کیوں نہ پہلے کسی غیر صحافی کے ذریعے یہ بات اس تک پہنچا دی جائے؟“

”مطلب، ذرا کھل کر کہو؟“

”مطلب، لاہور میں بھی اس کے ایسے قریبی تعلق دار ضرور ہوں گے جن سے ہمارا بھی بڑا اچھا تعلق ہو سکتا ہے۔ پہلے اس کے ذریعے بات کرتے ہیں۔ مان گیا تو ٹھیک، دوسری صورت میں ہم اس سے براہ راست بات کر لیں گے ورنہ۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔

”لگتا ہے، تم نے اسے اتنا کا مسئلہ بنا لیا ہے؟“

”بات اتنا کے مسئلہ کی نہیں، اپنے بار کی ہے۔ نہ ہم اپنا پار ہے۔ وہ جو صحیح سمجھتا ہے، وہی ٹھیک ہے۔ مجھے ذرا اسے کوئی غرض نہیں، ہمیں نہ ہم

کا خیال رکھنا ہے۔“

”اچھا، بابا کھل شام تک کوئی نہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔“ حسن نے اطمینان دلایا تو مجھے پورا یقین ہو گیا کہ اس مسئلہ کا کوئی نہ کوئی حل نکل

آئے گا۔

اس رات میں اور نائلہ کھانا کھا چکے تھے۔ دلدار ہمیں چائے دے کر کچن میں مصروف تھا۔ ہم ٹی وی ڈرامے میں محو تھے کہ میرا فون بج

اٹھا۔ میں نے بے خیالی میں فون پیش کر کے کان سے لگا۔

”حیدر شیخ بات کر رہا ہوں۔“ دوسری طرف سے مخصوص لہجے میں کہا گیا۔

”اوائے تم، خیریت سے ہو؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”بالکل خیریت سے ہوں۔ میں نے ابھی دفتر فون کیا تو پتہ چلا کہ صاحب گھر پر ہیں۔ لگتا ہے، خاصی ترقیاں ہو گئی ہیں۔“

”جے تو ایسا ہی، تم سناؤ، کیا ہورہا ہے؟“ میں نے یونہی بات بڑھانے کے لئے پوچھا۔

”میں کل آرہا ہوں پاکستان، پہلے تمہارے پاس لاہور ہی آؤں گا۔ میں یہاں سے چوبیس بجے کے قریب نکلوں گا۔ میرا مطلب، دعویٰ کے چو

بچے۔“ اس نے لگاتار کا نمبر اور وقت بتاتے ہوئے کہا۔ ”یہ رات تمہارے پاس رہ کر اگلی صبح گھر جاؤں گا۔ اب تم آجانا انٹیر پورٹ، میں تمہاری راہ

ہی نہ دیکھتا رہوں۔“

”بچے جاؤں گا، پارا وقت پرائیمر پورٹ پہنچوں گا۔“

”تو ٹھیک ہے، پھر کل ان شاء اللہ ملاقات ہوگی، اللہ حافظ!“ اس نے فون بند کر دیا تو میں نے بھی فون ایک طرف رکھ دیا، تبھی نائلہ نے

تجسس سے پوچھا۔

”کون تھے اور انٹیر پورٹ؟“

”میرا دوست، میرا نکلویا حیدر شیخ کل آرہا ہے دعویٰ سے۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے خود گھسوں کیا کہ میرے لہجے میں بیارامت آیا ہے شاید

نائلہ نے بھی گھسوں کیا تبھی بولی۔

”لگتا ہے، بہت گہری دوستی ہے۔“

”ہاں، بہت اور پھر آمنہ کے معاملے میں اس کا احسان منہ بھی تو ہوں۔“

”وہ سیدھے آپ کے پاس آئیں گے تو رہیں گے کئی چند دن۔۔۔؟“

”وہ ہمیشہ پہلے میرے پاس آتا ہے، پھر اگلے دن قصبے جاتا ہے، کل آفس سے جلدی آ جاؤں گا۔ اسے کبھی نہیں گے۔“

”ظاہر ہے، کھانے پر بھی تھوڑا اہتمام کرنا ہوگا۔“

”تھوڑا نہیں، بہت زیادہ، دوستوں سے بھی کہہ دینا۔“ میں نے خوشی سے کہا تو نائلہ ہنستے ہوئے بولی۔

”اوکے، سہرا ہو جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گئی اور میں حیدر شیخ کے بارے میں سوچتا ہوا آمنہ کے خیالوں میں کھو گیا۔

اگلی دو پہر میں دفتر میں اپنے کویک سے گپ شپ کر رہا تھا کہ حسن آ گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھا تو کویک اٹھ گیا تب اس نے کہا۔

”فرحان علی کے تعلق داروں میں چند نام سامنے آئے ہیں۔“

”کون کون ہے؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”کئی نام ہیں اور ان میں چند ایک سے اپنا بھی یار نہ ہے لیکن ایک نام ایسا ہے جسے سن کر تم بھی چمک اٹھ گے۔“ اس نے بیچیدگی سے کہا۔

”کون سا نام ایسا ہے؟“ میں نے چونکتے ہوئے کہا۔

”بیکم شہوانی۔“ حسن انکشافانہ انداز میں بولا۔

”فرحان علی سے اس کا تعلق یا تو میت کا پتہ چلا؟“ میں نے کریدا۔

”نومیت کا مجھے نہیں پتہ لیکن بڑا پرانا تعلق ہے، وہ اس سے کھل کر بات بھی کر سکتی ہے۔“ حسن نے کہا تو میں نے جیب سے فون نکال لے

ہوئے کہا۔

”میں ابھی اس سے وقت ملے کر لیتا ہوں، پھر ملاقات پر تفصیل سے بات ہو جائے گی۔“

”جیسے تمہاری مرضی۔“ حسن نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ میں نے نمبر ملائے اور چند لمحوں میں رابطہ ہو گیا۔ دوسری طرف بیکم شہوانی

ٹھہری ہوئی ”ہیلو سائٹی وی۔“

”میں شجاع بات کر رہا ہوں۔“

”ارے تم، میرے چاکلیٹ سمائی! بڑے عمر سے بعد فون کیا؟“

”آپ کو بھی پتہ ہے، ہمارا کام کیسا ہے۔ مصروفیت در مصروفیت، اب جبکہ میں آپ سے آج شام ہی ملنا چاہتا تھا لیکن ایسی مجبوری آن

پڑی کہ کل ہی آپ سے مل پاؤں گا۔“

”خیریت، شجاع؟“

”بالکل خیریت ہے، بس ایک چھوٹی سی سفارش کرنا تھی۔ وہ میں آپ کو ملاقات پر ہی بتاؤں گا۔“

”چلو، ٹھیک ہے لیکن آنے سے پہلے فون ضرور کر لینا۔“

”بالکل تو پھر کل۔۔۔“

”اوکے، میں انتظار کروں گی۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ حسن نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے، جان جی اب رات کھانے پر ہی ملاقات ہوگی۔“

”تاکہ نہ بتا دیا تمہیں؟“

”ابھی کچھ دیر پہلے فون کیا تھا اس نے۔“ اس نے کہا اور اٹھ کر چلا گیا۔

اس شام میں ذرا وقت سے پہلے ہی دفتر سے نکل آیا مجھے حیدر شاہ کو انٹرویو رٹ سے لینا تھا۔ میں تاکہ کو لے کر گھر جانے کی بجائے سیدھا انٹرویو رٹ کی طرف چل دیا۔ کچھ ہی دیر بعد ہم انٹرویو رٹ پہنچ گئے۔ گاڑی کھڑی کر کے ہم عمارت کے اندر چلے گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ تاکہ ضرورت سے زیادہ خاموش ہے۔ میں نے پوچھی پوچھا۔

”اتنی خاموش کیوں ہو؟“

”سوچ رہی ہوں کہ کسی قدر مناسبت میں تعزیرا ہوا لکھو تا ہے لوگوں کا، شجاع ازغدی میں آنے والوں لوگ بڑے عجیب عجیب ہوتے

ہیں۔“

”تم اتنے وثوق سے لوگوں کا تجزیہ کیسے کر سکتی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم، کیوں ایسا لگتا ہے مگر میرا وجدان مجھے دھوکہ نہیں دیتا۔ آپ کا مجھے نہیں پتہ لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ اب آپ کو ہر معاملے میں

بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے، تاکہ! مگر ہمیں انہی لوگوں کے درمیان رہتے ہوئے زندگی گزارنی ہے۔“ میں نے اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی

دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ چپ رہی، شاید کچھ سوچ رہی تھی۔ تب میں نے پوچھا، ”ویسے تم آج اتنی ڈسٹرب کیوں ہو؟“ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی، میں

سامنے سے آنے والے ایک شناسا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ وہیں انٹرویو رٹ پر ایوی ایشن میں آئی، گرم جوشی سے ملنے کے بعد وہ ہمیں اپنے

آفس لے گیا پھر کپ شپ میں احساس ہی نہ ہوا کہ کب فائنٹ آئی اور مسافر آنا شروع ہو گئے۔ ہم جلدی میں اس کے آفس سے نکلے تو حیدر شاہ

تلاشی نظروں سے اوجھڑا دیکھ رہا تھا۔ میں اس کے قریب پہنچ کر بغل گیر ہو گیا، ہلکے ہلکے کے بعد وہ بولا۔

”پہلے سے کہیں زیادہ سویر ہو رہے ہو تم؟“ لہجے میں شرارت تھی۔

”اور تم مونے ہونے کے ساتھ بد معاش ہو گئے ہو۔“ میں نے کہا اور پھر تاکہ کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”تاکہ، میری بہت اچھی

دوست۔“

”نظہا ابھی ہی نہیں، بہت پیاری دوست ہیں۔ خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے سر کو ہلکے سے خم دیتے ہوئے کہا تو اس نے بھی رسی جملوں کا تالو لکھیا اور گاڑی لانے کا کہہ کر چل دی۔

”کہاں ہے تمہارا سامان؟“

”یہ ایک بیگ اور یہ ایک ہلکا سا سوٹ کیس، میں کون سا مٹھنوں رہنے آیا ہوں، زیادہ سے زیادہ تین بیگے اور اس میں پورا ایک ہفتہ تمہارے پاس رہوں گا واپسی پر۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

”خوش قسمتی ہے ہماری۔“ میں نے کہا اور پھر باتوں میں مشغول ہو گئے۔ نائیکہ گاڑی لے آئی تو ہم نے سامان رکھا اور گھر آ گئے۔ ہمارے گھر کچھ بچے تک مسز خان کیکن میں مصروف تھیں اور دلداران کی مدد کے لیے موجود تھا۔ عامر کا فون آیا تھا کہ وہ حسن کے ساتھ آ رہا ہے۔ انہیں ابھی تک ندیم دستیاب نہیں ہو سکا تھا۔ دلدار نے سامان میرے کمرے میں رکھا اور حیدر فریش ہونے چل دیا۔ اس شام میں خوش تھا کہ میرے ارد گرد میرے ذمیر سارے دوست موجود ہیں۔ کافی دیر بعد جب عامر اور حسن آئے تو ندیم کے ساتھ زارا بھی تھی۔

”یہ ندیم کہاں گم تھا۔؟“ میں نے پوچھا تو وہ بولا۔

”میں زارا کے ساتھ تھا اس کے گھر میں، کچھ دیر پہلے میں نے دفتر فون کیا تو پتہ چلا۔“ پھر خوشگوار سے انداز میں بولا۔ ”دیکھیں، ہمارے ساتھ وہ بھی تھی جو آگئی ہے زارا کی صورت میں۔“

”اگر اتنی ہی میں اسے کال کرنے کا یا وہی نہیں رہا۔“ میں نے زارا کا دل رکھتے ہوئے کہا۔

”چلیں، جناب! کسی بہانے سے ہماری آپ سے ملاقات تو ہوگئی۔“ وہ اپنے مخصوص انداز میں بولی۔

”ابھی خاصی روتی ہے، جان لی؟“ حسن نے ادھر ادھر دیکھا تو حیدر شیخ میرے کمرے سے باہر آیا۔ پھر تعارف کا مرحلہ طے ہوتا چلا گیا۔ ہم اس وقت تک باتیں کرتے رہے جب تک نائیکہ نے کھانا کھا لیا اور پھر نہیں لگوادیا جبکہ زارا ہمارے درمیان ہی بیٹھی رہی۔ انتہائی خوشگوار فضا میں ڈنر ختم ہوا تو ہم ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ ماحول میں بے تکلفی دور آئی تھی۔ کچھ دیر بعد دلدار چائے دینے آیا تو اس کے پیچھے نائیکہ تھی۔ چائے پیتے ہوئے حیدر شیخ نے کہا۔

”مجھے آپ سب سے مل کر دلی خوشی ہوئی ہے اور خدا را، اسے محض رسی جملہ مت سمجھئے گا۔ شجاع سے میری دوستی اس وقت سے ہے جب ہم سکول میں پڑھتے تھے۔ یہ مجھے ابھی طرح سمجھتا ہے اور میں اسے، اس نائے آپ بھی میرے دوست ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے خالی کپ رکھا اور سگریٹ سلگایا، مگر ایک لمبا کش لے کر بولا۔ ”میں نے چاہا تھا کہ میں اس بار پاکستان آنے کا مقصد شجاع سے اکیلے میں کہوں گا لیکن اس کے لیے آپ سب کا خلوص اور دوستی دیکھ کر میرا جی چاہ رہا ہے کہ وہ سب کچھ ابھی سے کہہ دوں۔“

”کیا یہ اتنا ہی اہم ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، بہت ہی اہم، میری بات یہ ہے کہ آپ میری بہت زیادہ مدد کر سکیں گے۔“

”جان قی! پھیلیاں ہی ڈالتے رہو گے یا بات بھی کرو گے؟“ حسن نے بے تکلفی سے کہا تو سبھی ہنس دیے۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، میری بات پھیلی ہی کی مانند لگے گی آپ کو۔ ایسا اس لیے ہے کہ جب تک میں اس کا ہنس ٹھہرتا کہہ دوں، آپ سمجھ نہ سکیں گے۔“ حیدر نے یہ کہہ کر کش لیا تو عامر بولا۔

”شجاع اور آپ میں ایک بات مشترک ہے کہ میں خطرناک ایمان کرتے ہیں۔“

”اچھی بات ہے، تاہم کہ بات پوری طرح سمجھ میں آجائے۔“ میں جلدی سے بولا۔

”چلیں جی، حیدر صاحب! آپ کہیں۔“ عامر نے گویا اجازت دے دی۔ ولداد برتن اٹھا کر لے گیا تو وہ بولا۔

”میں چار سال قبل وہی کیا تھا۔ یہ میری خوش قسمتی سمجھئے کہ میرا کفیل بہت اچھا آدمی ہے۔ میں نے وہاں سٹریٹس کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ میں نے بحر پور محنت کی یا میں ماحول کو جلدی سمجھ گیا، بہر حال میں ٹھیک ٹھاک کمانے لگا۔ مجھے پانچویں پاکستان بھانے کی مجبوری نہیں تھی، الحمد للہ سب کھاتے کھاتے ہیں۔ میرا بچے کفیل کے ساتھ اچھا تعلق بڑھا گیا۔ میں نے وہاں اپنا بزنس بھی شروع کر لیا۔ اب پچھلے تین ماہ سے میرے کفیل نے ایک نیا کاروبار تقریباً شروع کر ہی دیا ہے۔ اس کا اپنا ہوٹل ہے اور میانے درجے کا، اس نئے کاروبار میں مجھے برابر کا حصہ دار بننے کی آفر دی ہے۔“

”کام کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی بتا رہا ہوں۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے سگریٹ الٹش ٹرے میں مسل دیا۔ پھر بولا۔ ”وہاں پر ہوٹلوں میں مختلف ہالز میں تفریح کے نام پر بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہر قوم کے لوگوں کی اپنی اپنی ترجیح ہے۔ پاکستان سے عموماً اور بھارت سے خصوصاً آئے دن طائفے جاتے رہتے ہیں اور خوب کھاتے ہیں۔ یہ سارے انتظامات وہاں پر موجود ہر دوسٹ کرتے ہیں۔ میرے کفیل نے مجھے ایسا ہی ایک پرومٹو بننے کی آفر کی ہے۔ ساری سرمایہ کاری اسی کی ہوگی، کام میں لے کرنا ہے۔“

”کیسا لگا نہیں یہ کام؟“ میں نے پوچھا

”دیکھو، شجاع! قطع نظر اس سے کہ اس کے اخلاقی تقاضے کیا ہیں، میری نظر میں یہ ایک نہایت منافع بخش کام ہے۔ سرمایہ کی پروا نہیں، محض انتظامات کرنے ہیں۔ میں نہیں کروں گا تو کوئی اور کر لے گا لیکن میں اس نئے کام کے لیے اپنا پورا بزنس قطعاً نہیں چھوڑ سکتا کیونکہ میری اصل وہی ہے، میری ساکھ بن چکی ہے اور اسی میں تجربہ رکھتا ہوں۔ میں رسک لینے کے لیے قطعی طور پر تیار نہیں ہوں۔“

”آپ اگر نہیں چاہتے تو پھر کسی دوسرے کو کرنے دیں یا کام۔“ عامر نے کہا۔

”میں اپنے کفیل کی بات ٹال نہیں سکتا، اس لیے نہیں کہ وہاں مجھے کوئی قانونی مجبوری ہے۔ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بس ہمارا تعلق ہی ایسا ہے۔ وہ اس کام کے لیے پوری طرح سنجیدہ ہو رہا ہے۔ مجھے پچھلے دنوں پتہ چلا تھا کہ شجاع شو بزنس آ گیا ہے۔ مجھے اس تبدیلی کا تفصیلی پتہ نہیں لیکن میں نے تب سوچ لیا تھا کہ میں اس سے مشورہ کروں گا، اس طرح چند اور دوست بھی وہاں جا کر اچھا کما سکتے ہیں۔ اب آپ اس بارے میں بتائیں، کیا

کہتے ہیں؟" یہ کہہ کر اس نے پیکٹ میں سے نیا سگریٹ نکالا اور سلگانے لگا۔

"یہ ٹھیک ہے کہ کوئی دوسرا کیوں کمائے۔ آپ کے دوستوں کو کمانا چاہئے۔" عامر نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

"وہاں صورت حال یہ ہے میں نے چند بندے ایڈجسٹ کر دیئے ہیں۔ ایک پورا سیٹ اپ تیار ہے، بس اسے چلائے اور میں یہ ذمہ

داری شجاع کو دینا چاہتا ہوں۔"

"میں؟" میں نے حیرت سے کہا تو جلدی سے بولا۔

"ابھی کوئی بھی حتمی فیصلہ مت کرنا۔ مجھے تمہارا ہر فیصلہ منظور ہوگا مگر کسی حتمی فیصلے سے پہلے ابھی طرح سوچ لو، دوستوں سے مشورہ کر لو۔

"اس کے یوں کہنے پر زار انے پوچھا۔

"آپ نے وہاں پر سیٹ اپ کس طرح کا بنایا ہے؟"

"میں نے کہا ہے نا، کہ میرے کفیل کا اپنا ہوٹل ہے لیکن دفتر اور رہائش کے لیے الگ فلیٹ لے لیے ہیں۔ بھارت کے لیے ایک بندہ

حمیش سہہ اور ایک لڑکی کلدھپ کور ہمارے پاس کام کر رہے ہیں۔ پاکستان کے لیے شجاع کے مشورے ہی سے کسی بندے کا انتخاب ہوگا۔ یہ

فنا کاروں کو کھانے کی صورت میں روٹی لے جائے گا۔ ایک آرگنائزر ہوگا۔ وہ جس طرح چاہے، کام کو چلائے گا۔"

"آپ دونوں میں کیا بات ہوتی ہے، اس سے ہٹ کر ایک بات پوچھنا چاہوں گا کہ آپ کی نظر انتخاب شجاع پر ہی کیوں پڑی؟" حسن

نے پر خیال لہجے میں پوچھا۔

"شجاع پر میں اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا خود پر، میں چاہتا ہوں کہ یہ میرے قریب رہے۔ کاروبار ایک الگ بات ہے لیکن دکھ سکھ تو کسی

اپنے سے ہی شیئر کیا جاسکتا ہے۔ اتنا حوصلہ تو ہوا ہے کہ اجنبیوں کے درمیان میرا اپنا بھی کوئی ہے۔" حیدر شیخ نے اجمالی جذبائی انداز میں کہا تو ماحول

پر سوگواریت سی طاری ہو گئی۔ جب میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں جو بھی فیصلہ کروں، وہ ایک الگ بات ہے لیکن تمہارے مطلب کا بندہ ہمارے پاس ہے۔ وہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔"

"ایسا ہے کوئی بندہ؟" حیدر نے پوچھا تو میں نے سامنے بیٹھے ہوئے ندیم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ جہ بیٹھا ہے، یہ کرے گا کام۔"

"اچھی بات ہے۔" اس نے کہا اور پھر ایک لمحہ کو خاموش رہ کر دوبارہ بولا۔ "آپ سب دوست یہاں موجود ہیں، آپ سوچیں اور مشورہ

دیں کہ شجاع کو روٹی چلے جانا چاہئے یا نہیں؟ کوئی جذباتی فیصلہ نہیں۔ مجھے اس کا مستقبل زیادہ عزیز ہے۔"

"ٹھیک ہے، حیدر اس تمہاری آفر پر غور کروں گا۔" میں نے کہا تو اس کا چہرہ کھل گیا۔ مجھے یہ پورا یقین تھا کہ اس نے میرے ہارے میں

پورے خلوص اور محبت ہی سے سوچا تھا، میں بھی چاہتا تھا کہ اسے فوری طور پر کوئی جواب نہ دوں۔ اس نے ندیم سے پوچھا۔

"پاسپورٹ ہے تمہارے پاس؟"

”نہیں، مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ وہ میرے سے بولا۔

”صبح ہی سے کوشش کرو اور جتنی جلدی ممکن ہو، بخالو۔ میں صبح اپنے آبائی قصبے کے لیے نکل جاؤں گا اور تقریباً دو ہفتے بعد لوٹوں گا پھر چند دن یہاں رہوں گا، باقی باتیں آنے پر۔“ یہ کہہ کر اس نے بات بدل دی پھر بزنس پر ہی باتیں ہوتی رہی جس میں خاص طور پر ناکہ نے اپنے کارڈنٹس کے بزنس کے بارے میں بہت ساری معلومات لیں۔ حاصر اس کے کاروباری انداز پر مسکراتا رہا پھر ایک ایک کر کے سارے اٹھتے چلے گئے اور جب ناکہ اپنے کمرے میں گئی تو سنانا چھا گیا۔ پھر میں نے اور حیدر نے بھی جی بھر کے باتیں کر ڈالیں۔

اگلے دن ناکہ نے ناشتہ پر خاصا اہتمام کیا ہوا تھا۔ ہم آسنے سامنے بیٹھے تھے اور وہ ٹوسٹ پر کھنک لگا کر ہمیں دیتی چلی جا رہی تھی، جمی حیدر نے کہا۔

”شجاع امیری باتوں پر ذرا عقل استعمال کر کے غور کرنا۔ مجھے تم پر اعتماد ہے، یہ بات اپنی جگہ لیکن میں چاہتا ہوں کہ تم آگے بڑھو، خوب ترقی کرو بلاشبہ تم کامیاب ہو گے۔ وہاں تمہیں بزنس کا چانس ملے گا اور۔۔۔ اور بہت کچھ ہے، یارا“

”حیدر تم ٹھیک کہتے ہو۔ میں تمہیں کسی طرح بھی انکار نہیں کر سکتا مگر موجودہ حالات میں، یوں یکدم ابھی ایسا ممکن نہیں ہے۔“

”تم اپنا ذہن جانو، اسے میں حالات بھی درست کر لو۔ وہ لڑکا ندیم دیکھنے میں تو ٹھیک ٹھاک لگتا ہے، تم اسے ٹھیک سمجھتے ہو تو اس کا پاسپورٹ اپلائی کرو۔ اور ہاں تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟“

”اگر ہی ہے۔“ میں نے کہا

”وہ بھی اس کے ساتھ دے دینا، میں واپس آ کر سمجھا دوں گا کہ کیا کرنا ہے؟“

”اوکے، ہاں! اب کاروباری باتیں ختم کرو اور ناشتے کی طرف دھیان دو۔“ میں نے کہا تو وہ نکل سا ہو کر ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر ہلکی پھلکی گپ شپ میں ناشتہ ختم کر کے میں نے اور ناکہ نے آبائی قصبے کی طرف جانے والی بس کے سٹاپ پر چھوڑا، وہ روانہ ہوا تو ہم اپنے آفس چلے گئے۔

میرے لیے حیدر شیخ کا ظلم کسی دعا کی طرح تھا۔ وہ میرے جس قدر کام آیا تھا، وہ سب ایک طرف مگر آمنہ کے سلسلہ میں جو اس نے میری مدد کی تھی، میں اس کا احسان ہی نہیں اتار سکتا تھا۔ اسے مجھ پر مان تھا۔ وہ یعنی جانا یا نہ جانا، یہ میرے فیصلے پر منحصر تھا۔ یہ مجھے بھی طرح احساس تھا کہ میں وہاں زیادہ کما پاؤں گا۔ یہاں پر رہتے ہوئے میں یہ مشکل اپنے خریج پورے کر رہا تھا جو شاہانہ تھے۔ ان خوش آمدتوں کے باوجود اس طرح یکدم وہی چلے جانا میرے لیے انتہائی الجھن کا باعث بن رہا تھا اگر مجھے یہ خوشی تھی کہ ندیم جیسا بندہ غربت کے جال سے نکل کر خوشحالی میں آجائے گا تو دوسری جانب میری وجہ سے ہی ناکہ نئی زندگی کی شروعات کر رہی تھی، میں یہاں نہ رہتا تو وہ پھر سے غزاں رسیدہ سچے کی طرح بے یارو مددگار ہو جاتی۔ اب وہ ایک تحفے لے کر نئی شخصیت کے ساتھ متعارف ہو رہی تھی پھر اس کے علاوہ کئی دھندلی اور سوہوم سی دلچسپ تھیں۔ دفتر چننے ہی میٹنگ کے بعد میں نے بیگم شہوانی کو فون کیا، وہ گھر پر تھی اور میرے انتقال ہی میں تھی۔ میں جب اس کے ہاں پہنچا تو وہ والا ان میں نرم سی کھیلی ہوئی

دھوپ میں اکیلی بیٹھی اخبار پڑھ رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اخبار ایک طرف رکھا اور مجھ سے ہاتھ ملا کر خیریت دریافت کرنے لگی۔ میں اس کے سامنے دھری کرسی پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر کی گپ کے بعد میں زارا کے بارے میں ساری بات تفصیل سے کہہ دی۔ اس دوران ملازم چائے کے ساتھ اچھے خاصے لوازمات رکھ گیا۔ میں سارا معاملہ کہہ چکا تو وہ چائے کا کپ مجھے تھماتے ہوئی بولی۔

”دو چار دنوں میں وہ لاہور آنے والا ہے اگر کوئی اور معاملہ ہو تو میں اسے فون پر ہی کہہ دیتی مگر یہ ذرا عطف نوعیت کا کام ہے مگر ایسا نہیں کہ ہون سکے گا۔ زارا کو وہ فلم بھی مل جائے گی اور وہ خود کو اپنے نور کے لیے بھی تیار رکھے۔“ پھر خود اپنا کپ اٹھاتے ہوئے بولی۔ ”ویسے ان معاملات میں انا کا مسئلہ ہوتا ہے۔ وہ بندہ۔۔۔ کیا نام بتایا تھا۔۔۔ ہاں، خور کا لگی ادھیڑوں کے لیے۔۔۔ خیر چھوڑ دو دنیا میں اور بہت کچھ ہے۔“

”بیکم صاحب! مسئلہ یہ نہیں کہ وہ اس لڑکی کو پروٹوٹ نہ کرے۔ کسی کی پسند یا نا پسند پر بھی اعتراض نہیں ہے مگر کسی کو رگید کر آگے بڑھنا یہ بہر حال غلط ہے۔“

”یہ دنیا ہے نا، پیارے ایسا تو ہوتا ہے۔ صرف زن و ذرا اور زمین کے لیے ہی تو نہیں لڑا جاتا، اپنی شناخت کے لیے بھی لڑنا پڑتا ہے۔ یہاں تو محسن کشی ایک روان بن چکی ہے۔ ویسے شجاع! میں ایک مشورہ دوں تمہیں؟“ وہ دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ کیا، بیکم صاحب؟“ میں نے پوری توجہ سے کہا تو وہ پر خیال انداز میں بولی۔

”شجاع! اگر تم میں اڑنے کی طاقت ہے تو پھر تم اکیلے اڑو، اپنے پیروں کے ساتھ کوئی ایسا وزن مت باندھو جو تمہاری اڑان میں مزاحمت بن جائے۔“

”یہ تو خود فرضی ہے۔“ میں نے کھردرے لہجے میں کہا۔

”نہیں، یہ خود فرضی نہیں بلکہ میری حقیقت پسندی ہے۔ تم اونچی اڑان پر جا کر ہی نیچے زمین پر رہنے والوں کو اچھی طرح دیکھ سکو گے، پھر ان کے لیے کچھ کر پاؤ گے جن کے لیے تم کچھ کرنا چاہتے ہو۔“

”میں سمجھا نہیں، آپ کہنا کیا چاہتی ہیں؟“

”مجھے نہیں پتہ زارا سے تمہارا تعلق کس طرح کا ہے۔ وہ اپنی تحسین کردہ حدود میں کامیاب ہے مگر اب عروج حاصل کرنے کے بعد اس کا سفر زوال کی سمت ہے۔ کب تک وہ اپنی حیثیت برقرار رکھے گی جدوجہد کرتی رہے گی؟ ایسے وقت میں تم اس کی حیثیت بحال رکھنے کے لیے جتنی بھی کوشش کرو، اس کا حاصل کچھ نہیں ہوگا کیونکہ وہ منطقی طور پر زوال کی جانب محسوس ہے۔ تم اس کی مدد کر کے اپنی انرجی ضائع کرو گے۔“

”ایک دوست، دوسرے کی اسی وقت مدد کرتا ہے جب اس کی ضرورت ہو۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

”میرا خیال ہے تم میری بات نہیں سمجھتے، وہ تو اپنی جگہ کے لیے بہت کچھ کرے گی مگر تمہارا اپنا راستہ ہے۔ پہلے تم اپنے آپ پر نور کر دو تم کیا ہو، کتنی قوت رکھتے ہو تم میں اگر قوت ہوتی تو میرے سامنے نہ بیٹھے ہوتے بلکہ اپنا مفاد مار چکے ہوتے، میرے پیارے! ابھی تمہیں انتہائی کامیاب ہونا ہے اپنی ساری انرجی خود پر لگاؤ، ضائع مت کرو۔“

"شکر یہ دیکھ صاحب! آپ نے میرے لیے اچھا محسوس کیا۔" میں نے ممنونیت سے کہا

"تم ہوتی اسنے پیارے کہ تمہارے لیے اچھا محسوس کیا جاسکتا ہے۔" وہ ہونٹوں میں ہنستے ہوئے بولی تو میں مسکرا دیا۔ تب اس نے کہا۔
"زارا کے معاملے میں پریشان مت ہونا، میں تمہیں خود ہی بتا دوں گی۔" یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔ ملازم جب برتن اٹھانے آیا تو
میں نے اجازت چاہی مگر اس نے مجھے نچ تک کے لیے روک لیا۔ پھر ہم میں طویل باتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ جو میرے ہی مستقبل کے بارے میں
ہی تھیں۔

تیم شہدانی سے ملاقات کے بعد میں ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اس کا یہ فقرہ کہ اپنی انرجی ضائع مت کرو، میرے دماغ میں
تکلف قسم کی سوچیں سر اٹھانے کا باعث بن رہا تھا۔ شاید لاشعوری طور پر میرے ذہن میں ایسی سوچیں جمع ہوتی رہی تھیں جو ذرا سی شہد پا کر اپنا آپ
منوانے پر تل گئی تھیں۔ میری ہر سوچ کا منطقی انجام اس خیال پر ہوتا کہ میں واقعی اپنی انرجی ضائع کرتے چلا جا رہا ہوں مگر اس کے ساتھ یہ سوال بھی
شدت سے سر اٹھاتا گیا کہ ایسا میں جان بوجھ کے کر رہا ہوں یا حالات کا بہناؤ مجھے اپنے ساتھ بہائے لے جا رہا ہے؟ میں نے بے دردی سے اپنا
تجزیہ کر ڈالا۔ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میں کامرس رپورٹرز ہونے کے باوجود شوہر کی دنیا میں آ جاؤں گا جہاں چٹنی تیز روٹنی ہوتی ہے، اس
کے پیچھے اتنا ہی گھورانہ ہوتا ہے۔ میں اچانک ہی ان روشن اندھروں میں آن پڑا تھا۔ گھورانہ اندھروں میں سست کا یقین نہیں ہو پاتا۔ کوئی ستارہ،
کوئی ہلکی سی کرن ہی پھوٹے تھیں راستوں کا پتہ چلتا ہے۔ میں ان ہواؤں میں سنبل بھی نہیں پایا تھا کہ ماریہ کی طرف سے اضافی مئی القاد کے بھ میں
پھنس کر رہ گیا، یہی حالات مجھے اک نئی دنیا سے متعارف کرا گئے۔ میں ہندسوں اور لفظوں کی زبان جانتا تھا، تہذیب سے ہوئے میک اپ، زوہ چہروں
کے علاوہ حسد کی ماری عورت کے چھائے ہوئے جال میں پھنس کر رہ گیا۔ پھر یہ حالات ہی ایسے تھے کہ چٹنی القاد مجھ پر پڑی، قدرت کی طرف سے
رہائی کے راستے بھی خود بخود دھیر آتے چلے گئے۔ اس وقت میں جس مقام پر کھڑا تھا، وہاں سے کئی اونچے راستے میرے سامنے تھے اور میرا اپنا
راستہ حالات کی بھول بھلیوں میں گھوم کر رہ گیا تھا۔ میں واپسی پلٹ جانے کی سعی لا حاصل میں حیران و ششدر کھڑا تھا۔ میری اپنی سوچیں محمد تھیں
جنہیں کھلانے کے لیے کسی بھی مقصد کا کوئی سورج ابھی تک طلوع نہیں ہوا تھا۔ میں شاہراہ بے مقصد پر نجانے کہاں تک چلتا ہوا آ گیا تھا۔ کیا یہ
انجانے حالات مجھے کسی خاص سمت کی طرف بلا جائے لے جا رہے ہیں، کہیں کوئی مقصد میرا انتظار کر رہا ہے یا پھر میں بلا مقصد حالات کی ہواؤں
میں غزناں رسیدہ پتے کی مانند اڑتا چلا جا رہا ہوں؟ یہی سوال میری سوچوں کو پھلکا رہے تھے اور میں بے بسی سے کسی فیصلے کے انتظار میں وقتی وادیوں
میں پڑا ہوا رہا تھا۔ ماریہ والا باب اگرچہ ٹھپ ہو چکا تھا لیکن ملک منیر کے لوگ کسی بھی وقت مجھ تک پہنچ سکتے تھے۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی اس
کے قتل میں ملوث ہو چکا تھا۔ یہ ضروری تو نہیں کہ میرے ہارے میں ملک منیر نے اپنے کسی ساتھی کو کوئی بات بھی نہ بتائی ہو، ایسا ممکن ہی نہیں تھا۔ اس
کا کوئی بھی خاص بندہ کسی بھی موقع کے لیے انتظار میں خاموش بیٹھ سکتا تھا۔ آصف جو ہدیری جیسے لوگ کب تک میرا سہارا بنے رہیں گے؟ اگر ملک منیر
کے لوگوں کو اس کے قتل کا سراغ کب پہنچا دیتا ہے تو پھر مجھے ایک نئی راہ پر چلنا ہی نہیں بلکہ دوڑنا ہوگا، ایسے میں مجھے اپنے جاک جگ لڑا تھی اور کسی بھی
وقت ٹیل جگ بچ سکتا تھا۔ تب ایک نئی راہ میرے انتظار میں تھی۔ میں خود میں پراعتاد تھا مگر میں جانتا تھا کہ یہ جو کبھی لڑائی مجھے جرم کی دلدل میں

پھینکے گی۔ انہی حالات میں زارا سے ہمدردی ایک نئی سمت کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ فلمی دنیا کے ہاسی، اپنی چمک دکھ کے باعث مجھانے کن لوگوں کی آنکھوں کو خیرہ کیے ہوئے تھے اور ان لوگوں کی رسائیاں بجانے کہاں تک تھیں۔ اس دنیا میں ایک معمولی سے دلال سے لے کر فلمی چمکتوں تک کے چہروں کے پیچھے کیا اور کون موجود تھا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ کس بل میں ساپ ہے اور کہاں پر بچھو؟۔

لاہور میں جو میرے خوابوں کا شہر تھا، اس شہر میں ایسے خوابوں کی تعبیر تو میں نے نہیں چاہی تھی۔ کیا میں آنے والے حالات میں موجود طوفانوں پر قابو پاسکوں گا؟ میں جس قدر بھی سوچتا میرا جواب منطقی طور پر لٹی میں تھا لیکن انہی خستہ حالات میں مجھے سکھائی ہوئی ایک بات میرے لیے مشکل راہ ہی نہیں، مجھے حوصلہ بھی بخش رہی تھی کہ ناساز حالات میں بھی خود پر مایوسی طاری نہیں ہونے دینا، کامیابی کی جانب پہلا قدم ہے اور میں باپس نہیں ہوا تھا۔

اس وقت رات گہری تھی، میں نائیکہ کے ساتھ گھبرک کے ایک اوپن ایئر ریسٹوران میں کھانا کھا رہا تھا کہ حیدر کا فون آ گیا۔ وہ آبائی قصبے سے فون کر رہا تھا۔

”ہاں بھئی، کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے بڑے شوخ انداز میں پوچھا۔

”کھانا کھا رہا ہوں۔“

”گنٹا ہے، کہیں باہر بیٹھے ہو۔ بڑی عجیب سی آواز میں آ رہی ہیں۔“

”ہاں، ایک ریسٹوران میں ہوں۔ تم سناؤ کتنے دنوں تک بھابی کے چمنوں میں پڑے ہو گے؟“

”اوہ، جناب! اکل صبح بچھ کر رہا ہوں، تیاری کر کے بیٹھا ہوں، میں نے کہا کہ فون کر کے مطلع کر دوں۔“

”بھابی کسی ہیں، مگر میں سب خبرت ہے نا؟“

”سب ٹھیک ہیں، اللہ کا بڑا احسان ہے، ہارے ہاں، میں کیا تھا اور تمہارے گھر۔ تمہارے ”باپو“ سے ملاقات ہوئی، بہت مزہ آیا ان سے مل

کر۔ وہ تو ویسے ہی خوش مزاج، ذمہ دار اور ماشا اللہ صحت مند ہیں۔ میں نے ان سے تمہارے دعویٰ جاننے کی بات کی تھی۔ پتہ ہے، وہ کیا کہنے لگا؟“

”کہنے لگے کہ وہ تو پہلے ہی سے ”آزارو“ ہے۔ ہماری طرف سے لاہور میں رہے یا دعویٰ پر جہاں رہے، خوش رہے۔“

”باپو ہے نا، میرا پارا بس جلدی گھر کا پکڑ لگاؤں گا، چل ٹھیک ہے۔ تو صبح آ رہا ہے نا پھر؟“

”پائل۔“ اس نے حسی انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ نائیکہ بھی جاگ گئی اور ہمارے پاس آ بیٹھی۔ میں نے جب دلدار کو ناشتہ بنانے

باتوں کے دوران کھانا ختم ہوا اور ہم رات گئے آوارہ گردی کرتے رہنے کے بعد گھر آ کر سو رہے۔

اگلی صبح حیدر آ گیا، اس وقت سورج طلوع نہیں ہوا تھا۔ نائیکہ بھی جاگ گئی اور ہمارے پاس آ بیٹھی۔ میں نے جب دلدار کو ناشتہ بنانے

کے لیے کہا تو وہ کچن میں چلی گئی۔ میں اور حیدر اپنی باتوں میں کھومے۔ ہم تینوں کے ناشتہ کر لینے پر دلدار نے برتن اٹھا لیے تو حیدر سونے کے لیے چلا

گیا۔ نائیکے اخبار اٹھایا اور پڑھنے لگی۔ میں کتنی دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا، وہ اخبار میں گم تھی۔

”کوئی خاص خبر ہے؟“ میرے کہنے پر اس نے جلدی سے اخبار ہٹایا اور پھر احساس کرتے ہوئے بولی۔

”بس وہی معمول کی خبریں ہیں۔“ اس نے اخبار ایک طرف رکھ دیا تو میں اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”ناگنہ اتنی اتنی اور اس کیوں رہتی ہو۔ کوئی پریشانی، کوئی خوف مسئلہ ہے تم پر؟“

”ہنسن تو۔۔“ اس نے یوں کہا جیسے چوری چکڑی مٹی ہو۔ پھر خود پر قابو پاتے ہوئے بولی۔ ”بس یونہی ڈیپریژن ساطاری ہے“

”مجھے بتاؤ، ڈیپریژن کیسے ختم ہوگا؟“ میں نے انتہائی نرمی سے پوچھا۔

”خود بخود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”ناگنہ کوئی بھی فنسول قسم کا خیال دل میں نہ رکھا کرو، بس خوش رہا کرو۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”میں خوش تو ہوں۔“ وہ زبردستی مسکراتے ہوئے بولی۔

”میں سمجھتا ہوں، ناگنہ اتہارا مسئلہ الجھا ہوا ہے مگر ایسا بھی نہیں کہ مل نہ ہو سکے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ڈیپریژن طاری کرو۔ کوئی بات

دل میں ہے تو مجھے بتاؤ۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کسی مسئلے کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر پریشان کیوں رہتی ہو؟“ میں نے پوچھا تو وہ تکی دیر تک چپ رہی، پھر بولی۔

”میں آپ سے جھوٹ نہیں کہوں گی۔ میں پریشان ہوں، لیکن ہلنیز! ابھی آپ مجھ سے کچھ مت پوچھئے گا۔ میں آپ سے سب کچھ کہہ دوں

گی مگر چند دن کے بعد۔“ اس پر میں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بے بسی کی کیفیت طاری تھی۔ جب میں نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر کہ تم پریشان دکھائی نہیں دو گی۔“ میں نے کہا تو دھیرے سے مسکرائی۔ جب مجھے قدرے اطمینان ہوا کہ

شاید جو اندیشے اور دوسو سے مجھے پریشان کر رہے ہیں، وہ نہ ہوں۔ میں نے اس کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور اخبار اٹھا لیا۔ دوپہر کے وقت حیدر

بیدار ہوا۔ پروگرام یہی تھا کہ کھانے کے بعد ناگنہ کے آفس جائیں، پھر سپر سے ڈرا پیلے ہم اس کے دفتر جا بیٹھے۔ وہاں ایک ایسی گپ شپ ہوئی۔

حیدر نے انہیں اپنے کاروباری تجربہ بتائے، پھر انہیں ایک خاص قسم کی شرٹ کا آرڈر بھی دے دیا۔ ندیم بھی وہیں آ گیا، اس نے دو ہفتوں میں

پاسپورٹ حاصل کر لیا تھا۔

یوں اگلا پورا ہفتہ وہ ندیم کو ساتھ لیے پھرتا رہا۔ میں اسے پوری طرح وقت نہیں دے پا رہا تھا۔ ان دونوں کے بارے میں پتہ چلنا کہ کسی

سے ملتے گئے ہیں کسی یونیٹیشن سے، کسی فیشن ڈیزائنر سے۔ عامر نے انہیں گاڑی دے دی تھی۔ مجھے ان کے معاملات سے قطعاً دلچسپی نہیں تھی اس لیے

بس ان کی روداد سننے پر ہی اکتفا کرتا۔ ان کی باتوں سے پتہ چلنا کہ وہ ناگنہ سے بھی کاروباری معاملات ملے کر رہے ہیں، میرے دوستوں سے بھی

ملتے ہیں اور زارا سے تو حیدر کی دوستی خاصی زیادہ ہو گئی ہے۔ ان کے تعلق کا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب زارا نے فون پر چند ادھر ادھر کی باتوں کے

بعد کہا۔

”کیا آپ مجھے اس بات کی اجازت دیں گے کہ آپ کے دوست حیدر شیخ کے اعزاز میں ایک ڈنر پارٹی دے دی جائے؟“

”اگر تم میرے دوست کو اس قابل سمجھتی ہو تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ پھر دوستوں میں اجازت کا تکلف میری سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

”کل شام پھر ہمیں وقت دیں۔“

”ضرور، کیوں نہیں۔ میں آ جاؤں گا۔“ اس کے بعد چند الوداعی باتیں ہوئی اور اس نے فون بند کر دیا۔ میں سمجھتا تھا کہ زارا جو اہمیت حیدر کو

دے رہی ہے، اس میں تعلق سے زیادہ مفاد تھا اور نہ اس سے زارا کو کیا غرض؟ میں کچھ دیر انہی خیالات میں کھویا رہا، پھر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

اگلی شام میں گھر آیا تو نائلہ تیار بیٹھی تھی، مجھے صوفے پر پھیلتے ہوئے دیکھ کر نائلہ بولی۔

”میں نے عامر کو فون کر دیا تھا، وہ ہمیں پک کرے گا آپ بس تیار ہو جائیں۔“

”اتنی جلدی کا ہے کی ہے، چلے جائیں گے۔“

”نعمیم نے فون کیا ہے، نا، وہ ادھر ہی پہنچ جائیں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے، اتنے میں عامر بھی آ جائے گا۔“ میں نے کہا تو نائلہ میرے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہم کافی دیر تک گپ شپ کرتے

رہے۔ میں اس سے حیدر کے ساتھ کاروباری ذمے کے بارے میں پوچھتا رہا پھر عامر کے آ جانے پر میں تیار ہوا اور ہم زارا کے ہاں جا پہنچے۔ زارا کے

ہاں رونق عروج پر تھی۔ سٹی بی ماڈل لڑکیاں، بھڑکیے لباس میں بھی سیں، ہنستی اٹھلاتی، باتیں کرتی دکھائی دیں۔ سروں میں ایک دو لوگ تھے جنہیں

میں نہیں جانتا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی زارا ہماری طرف بڑھی۔

”دیکھ!“ دھمے سروں میں پھیلی موسیقی کے باعث وہ قدرے اونچا بول رہی تھی۔ میں نے اسے غور سے دیکھا وہ خاصی نکھری ہوئی لگ

رہی تھی۔ مجھ سے ہاتھ ملا کر وہ نائلہ کی طرف متوجہ ہو گئی۔ حسن آچھا تھا سو میں دوسرے لوگوں سے ملنے ہوئے ایک طرف پڑے صوفے پر حسن کے

ساتھ آ بیٹھا۔

”لگتا ہے، زارا نے اچھا خاصا حسن اکٹھا کر لیا ہے، نمائش کا اجہام ہے۔“ حسن نے اگرچہ یہ تبصرہ یونہی کر دیا تھا لیکن میرے خیال کو

تقویت دے گیا۔ زارا محض حیدر کی توجہ چاہ رہی تھی، ارد گرد چہرے صرف یہ باور کرانے کے لیے تھے کہ یہ سب اس کی دسترس میں ہیں۔ اچانک

مجھے یکم شوہانی کی باتیں یاد آئیں کہ زارا منطقی طور پر زوال کی جانب محسوس ہے، اسے کچھ نیا کرنا چاہیے۔ شاید زارا سمجھ گئی تھی کہ وہ اپنا موجودہ معیار

برقرار نہیں رکھ پائے گی اور کسی نئے راستے کی تلاش میں تھی۔ میں نے غور سے دیکھا کہ زارا، حیدر کی ہاڈو میں اپنی ہانہیں ڈال کر مختلف لڑکیوں سے

ملوا رہی تھی ہم سب سے قطعاً بے نیاز اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ دونوں ہی اپنے کاروباری معاملات میں

مصروف تھے، تجھی حسن بولا۔

”یارا عامر کے حصے میں تو نائلہ آ گئی۔ وہ دیکھو، راز و نیاز جاری ہیں، کچھ دیر بعد کوئی یہاں تمہارے پہلو میں آ جائے گی۔ ہمیں بتاؤ، ہم

کہاں جائیں؟“

”بھابھی کو بلوایا ہوں۔“ میں نے مصنوعی سنجیدگی سے فون نکالتے ہوئے کہا۔ تو وہ جلدی سے بولا۔

”ویسے کہو میں چلا جاتا ہوں۔ بوس میں ذلیل تو نہ کرواؤ۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر بڑے رازدارانہ انداز میں کہا۔ ”موصوفہ نے پینے پلانے کا بھی اہتمام کر رکھا ہے، چاہیں تو اس سے بھی آپ مستفید ہو سکتے ہیں۔“

”ارے، یار! ہم تو ظہرے نازی ان کی اتنی عارتوں کے باوجود ہاں، اگر آپ کا مٹی چاہتا ہے تو ضرور شوق فرمائیں، روکا کس نے ہے؟“

”کاش! ہم یہ شوق کر سکتے مگر پھر ہمیں سنبھالے گا کون؟ ادھر تو رنگ ہی رنگ نکھرا پڑا ہے، ترنگ میں آکر ہم ہولی ہی نہ کھیلنے لگ جائیں۔“ میں اور حسن باتیں کرتے رہے۔ کچھ ہی دیر بعد زارا نے موہبتی بند کروائی اور پھر قدرے اونچی آواز میں کہا۔

”سہرے دوستو! آج کی اس صبح دو گھر پورا اور رنگین شام کے ساتھ میں آپ سب کو خوش آمدید کہتی ہوں۔ یہ شام ہمارے دوست حیدر شیخ کے نام ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ آج ہمارے ساتھ چند ایسی فنکارائیں بھی موجود ہیں جو اپنے فن سے نہ صرف ماحول کو بلکہ دلوں کو بھی گرمادیتی ہیں۔ لہذا کیوں شان کے فن سے لطف اندوز ہوا جائے۔“ زارا کہہ رہی تھی اور اس نے کچھ مزید بھی کہا لیکن اسی وقت حسن بولا۔

”مطلب، یہ حیدر کو دکھانا چاہتی ہے کہ کون لڑکی کیسا ناچ سکتی ہے، خیر ہم بھی اسی بہانے مفت میں نکھارا کر لیں۔“

اس نے کہا تو میں نے اس پر کوئی تبصرہ نہ کیا۔ موہبتی دوبارہ شروع ہوئی اور ایک لڑکی نے ہر کن شروع کر دیا۔ جہاں لڑکی ناچ رہی تھی، وہیں تیز روشنی رہ گئی اور باقی سب مدہم کر دی گئیں۔ زارا نے ایک بال روم کا سماں پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ ماحول پر عجیب قسم کا سحر طاری ہو گیا تھا۔ اسی وقت چند لڑکیاں نرے میں گلاس رکھے آن وارو ہوئیں اور سب لوگوں میں پھیل گئیں۔ ایک لڑکی نے بڑے دلربا انداز میں نرے ہمارے سامنے کر دی۔ میں نے منع کر دیا۔ حسن پوری طرح اس لڑکی کے ناچ میں محو تھا، میں نے اسے ڈسٹرب نہیں کیا۔ مجھ سے قدرے فاصلے پر زارا اور حیدر گلاس تھامے بیٹھے تھے، ایک طرف مدہم دو تئیں لڑکیوں میں گھرا ہوا تھا۔ ماحول واقعات گرم ہو چکا تھا۔ ایک کے بعد ایک لڑکی آتی، جسم کی نمائش کے ساتھ اپنے رنگ دکھاتی اور چلی جاتی۔ شراب کے نشے کا اپنا ایک الگ سے رنگ تھا، فضا میں بے تکلفی اور بے باکی در آئی تھی۔ زارا نے بلاشبہ وہ ماحول اپنے گھر میں لاد رکھا تھا جسے یا تو اڑین فلموں میں دیکھا جاسکتا تھا یا پھر کسی میگزین میں فقط پڑھا جاسکتا تھا۔ بعض اوقات انسان اپنی خواہشوں کے اعتبار میں کس طرح پر آگرتا ہے، اسے خود معلوم نہیں ہوتا۔۔۔۔۔ حسن میرے پاس سے اٹھ کر جا چکا تھا، اس وقت نائلہ میرے پیلو میں آکر بیٹھ گئی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ خاصی مضطرب ہے۔ کچھ دیر اس کا اضطراب محسوس کرنے کے بعد میں نے پوچھا۔

”نائلہ! کیا بات ہے؟“

”مجھے یہ سب اچھا نہیں لگ رہا۔“ شاید اس کے اندر کوئی الجھل تھی جسے وہ چھپائے بیٹھی تھی۔

”کیوں؟“

”پتہ نہیں، کیوں، بلکہ شاید۔۔۔۔۔ مجھے نہیں پتہ۔“ وہ نونے لفظوں میں کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

”چلو باہر لان میں چلتے ہیں، کھلی فضا میں شاید سکون مل جائے۔“ میں نے کہا تو وہ یکدم اٹھ گئی۔ ہم دونوں لان میں آ گئے۔ جی کے

ابتدائی دنوں کی ٹھنڈک ہم نے اپنے چہروں پر محسوس کی۔ باہر سکون تھا یا شاید بہت زیادہ شور میں سے نکلنے پر میں نے محسوس کیا۔ لان ہی کے ایک طرف ویٹر کھانے کی میزیں چھڑے تھے۔ چند لمبے خاموشی کے بعد ناکہ نے کہا۔

”آپ میرے ڈیپریشن کی وجہ جاننا چاہ رہے تھے؟“

”ہوں۔“ میں نے بنگارا بھرا۔

”بات یوں ہے، شجاع اگر جس دن سے میں آپ لوگوں کے قریب آئی ہوں اسی دن سے میں اپنے مستقبل کے بارے میں بہت مایوس ہو گئی ہوں، میں سوچتی ہوں میرا کیا بنے گا، میں تو ایک کئی چنگ کی مانند ہوں، عام میرا کہاں تک ساتھ دے پائے گا وہ تو خود۔۔۔“ اس نے غمگین نظریں کر بڑے سکون سے وجہ بیان کی۔

”بس اسی وجہ سے پریشان ہو؟“ میں نے اس کی پریشانی کی اہمیت کم کرنے کی خاطر کہا۔

”کیا آپ اسے معمولی بات سمجھتے ہیں؟“

”مگر تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں نا اچھ پر احمق کرو۔“ میں نے کہا تو وہ کسی حد تک نارمل دکھائی دینے لگی، پھر خوشگوار بات سے بولی۔

”مجھے آپ پر اعتماد ہے لیکن میں نہیں چاہتی کہ آپ کا کوئی نقصان ہو۔ پہلے بھی تو گولی۔۔۔“

”میرے نقصان کو چھوڑو، بس بھروسہ رکھو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”بھروسہ ہی نہیں، یقین بھی ہے۔ اب میری جان بھی چلی جائے تو کوئی بات نہیں۔“ اس نے خوش دلی سے کہا۔

پھر ہم اسی موضوع پر کچھ دیر باتیں کرتے رہے کافی دیر بعد ہم اندر چلے گئے۔ وہاں ماحول خاصا نشیلا ہو چکا تھا۔ حسن بخیر چہنچہ ہی ایک کرسی پر ادھار با تھا۔ میں نے اس کا شانہ دیا تو چونک اٹھا، پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”یہ بے ہودگی کب ختم ہوگی، یار؟“

”چلنے دو، تمہارا کیا لگتی ہے؟“

”میں اٹھنا ہی پور ہو رہا ہوں۔ تم دونوں بھی تو راز و نیاز کے لیے باہر چلے گئے تھے۔“ اس نے چرتے ہوئے کہا تو میں پھر سے فون نکالتے ہوئے بولا۔

”میں بھائی کو بلا لیتا ہوں۔“ یہ کہہ کر نمبر دہانے لگا تو اس نے فون پکڑ لیا۔

”میں سمجھا تھا تم میرے دوست ہو لیکن آج پتہ چلا کہ تم جیسے لوگ مارا ستمین ہوتے ہیں۔ نئی بھائی عزت خاک میں مل رہے ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں وہ مجھے کس قدر متقی اور پرہیزگار سمجھتی ہے۔“

”لیکن آپ ہیں نہیں۔۔۔“

نانک نے قبہہ لگاتے ہوئے کہا تو حسن بھی ہنس دیا۔ مدہم روشنیوں میں ہم تینوں نے اپنی ہی مٹھل سہالی کافی دیر بعد ماحول تیز روشنیوں میں بدل گیا، سبھی کھانا کھانے کے لیے اٹھ گئے۔ کھانے ہی کے دوران مجھے عامر نظر آیا بد ہوش تھا۔ میں سوچتا رہا کہ وہی ٹائل اوگ جن سے میں روز ملتا ہوں، اوگ ذرا سا ماحول بدلنے پر کس طرح اجنبی ہو گئے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اندر دبی ہوئی خواہشوں کو پالنے کے بعد کس قدر بدل جاتے ہیں، ان میں کتنی تبدیلی آ جاتی ہے۔ ذرا جاو کبھی میرے ہونے پر مجھ سے الگ نہ ہوتی تھی۔ ایک لمحے کو بھی حیدر سے الگ نہ ہوتی تھی۔ ایسے ہی کئی سوال تن کر میرے سامنے آ گئے مگر احساس ہونے پر میں نے سب جھٹک دیئے۔ آخر میں کیوں ایسا قبولی انداز میں سوچ رہا ہوں۔ کوئی کیسا ہے، کیوں ہے اور کس طرح رہنا چاہتا ہے؟ مجھے اس سے کیا سروکار؟ وہ اپنی زندگی جس طرح چاہیں، جنس۔ انہوں نے مجھے تو کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ کھانے کے بعد واپس ہونا شروع ہوئے۔ حسن اور عامر دونوں نے پاس گاڑی تھی۔ عامر ڈرائیو تک نہیں کر پا رہا تھا سو میں نے اس کی گاڑی سنبال لی۔ میں نے حیدر سے قطعاً نہیں پوچھا کہ وہ میرے ساتھ جائے گا یا نہیں؟ مجھے معلوم تھا کہ وہ رات وہیں رہے گا۔ پھر رات گئے ہم گھر آ گئے، حسن چلا گیا مگر عامر میرے پاس ہی سویا۔

اگلے دن دوپہر سے ذرا بعد حیدر اور ندیم میرے پاس دفتر میں آ گئے۔ حیدر کے چہرے پر ذرا بھی تانسف نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد ندیم اپنے کام سے اٹھ گیا تو حیدر نے رات والی پارٹی کا ذکر چھیڑ دیا۔ کافی دیر کی باتوں کے بعد اچانک اس نے کہا۔

”شجاع! باتیں تو ہوتی رہیں لیکن تمہیں ایک بات سمجھا دوں۔ آئندہ ذرا سے بچ کر رہنا، بڑی ہی خطرناک صورت ہے۔ اس کے جال میں پھنسا ہوا بندہ نکل نہیں سکتا۔“ فقط اس کے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلے تھے، میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ اگرچہ اس نے یہ بات سرسری سے انداز میں کہی تھی لیکن اس کا لہجہ مجھے چونکا گیا تھا۔ وہ ذرا سے متعلق ایسی بات کر رہا تھا حالانکہ ذرا سے اس کا تعلق چند دنوں پر محیط تھا، زیادہ سے دو یا تین دن، میں نے اس کے چہرے پر اس بات کی سنجیدگی کو ٹھلا۔ وہ اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔

”ایسی بھی کیا بات ہو گئی، یا راجو تم مجھے اس سے محتاط ہونے کا مشورہ دے رہے ہو؟“

”دیکھ، شجاع! دشمن سے محتاط رہنا ایک فطری عمل ہے مگر وہ لوگ جو اپنے بن کر واد کر جائیں، ان کے ذمہ بڑے کاری ہوتے ہیں اور کبھی مندرل نہیں ہوتے۔“ یہ کہہ کر اس نے میری طرف بڑے نور سے دیکھا، پھر سکون سے سگریٹ سلگا کر بولا۔ ”تمہارے اگر اس کے ساتھ کوئی خصوصی قسم کے تعلقات ہوتے تو مجھے ذرا سی بھی ضرورت نہیں تھی کہ یوں تمہیں محتاط ہو جانے کا مشورہ دیتا اور پھر ذرا بھی اصرار کرتا رہتی، طوائف نہ بنتی تو میرے لیے ذرا بھی تشویش نہ تھی۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”تم نے مجھ سے اپنے دوست طوائف، ذرا کے سوا مجھے سب ٹھیک لگے۔ وہ کبلی نظر میں ہی مجھے پسند نہیں آئی تھی، وہ تمہاری دوست ہرگز نہیں ہو سکتی۔ میرے ان خیالات کی تصدیق اس گزرنے والی رات اس نے خود کر دی۔“

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھ سکا؟“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔

”طوائف دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک وہ جو باقاعدہ تربیت لے کر میدان میں اترتی ہے۔ اسے مردوں کو بھاننے کے سارا گرازر بر کروائے جاتے ہیں، وہ اپنی پوری زندگی ان جھکنڈوں کو آزما رہے ہوتے خود استاد بن جاتی ہے۔ اس کا اپنا ایک پورا نظام ہوتا ہے جہاں اسے ہر طرح کا تحفظ دینے والے موجود ہوتے ہیں اور وہ پورے اعتماد سے اپنی تربیت کا حق ادا کر دیتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک طویل کٹس کھینچا، راکھ ایٹھڑے میں جھاڑ کر یولا۔ ”دوسری قسم کی طوائف حادثاتی طور پر جنم لیتی ہے۔ کوئی خاص تربیت یا رہنمائی نہ ہونے کے باعث وہ پہلے لٹی رہتی ہے اور جب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ لٹ رہی ہے تو یہی وہ عالم لہہ ہوتا ہے جب اس کے رویے میں انتقام شامل ہو جاتا ہے۔ وہ پھر کسی کو معاف نہیں کر سکتی۔ ان دونوں قسم کی طوائفوں میں قدر مشترک یہی ہے کہ وہ کھڑی کی مانند ہوتی ہیں جسے صرف اپنی بھوک پوری کرنا ہوتی ہے اسے قریب آنے دیتی ہے۔“

”شاید تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں ان طوائفوں کے چنگل میں پھنس گیا ہوں۔ یہ میرا بیس، میری صحت اور میرا کیرئیر تباہ کر دیں گی؟ نہیں، میرے دوست، ایسا کچھ نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مردانگی کیا ہوتی ہے۔ ان طوائفوں کے پاس ان کا جسم ہی سب سے بڑا ہتھیار ہے اور تمہیں پتہ ہے، یہ ہتھیار کبھ پر کارگر نہیں۔“

”تم کیا سمجھتے ہو، وہ اسی ہتھیار پر اکتفا کرتی ہیں؟ میرے پیارے اور جذبات سے کھینچی ہیں۔ زارا بھی تمہاری جذباتی طور پر استعمال کرتی چلی جا رہی ہے اور اس کا تمہیں ڈرا بھی احساس نہیں۔ وہ فنکاری ہی کیا، جس کی فنکاری کا دوسرے کو پتہ چل جائے۔ اب یہ مت بوجھنا کہ مثلاً۔۔۔“

”چلو، میں نہیں پوجھتا مگر اتنے سے وقت میں دو تمہارے اتنے نزدیک آگئی کہ میرے بارے میں سب کچھ کہہ دیا حالانکہ یہ اسے بھی پتہ ہے کہ تم میرے دوست ہو؟“ نہ چاہتے ہوئے بھی لفظ میری زبان سے نکل گئے۔ وہ دوسرے سے مسکرایا اور عام سے لہجے میں بولا۔

”یاد رکھو کہ کسی بھی لاپٹی شخص کو لوٹ لینا انتہائی آسان ہوتا۔ جو جتنا لاپٹی ہوتا ہے، وہ اتنی جلدی لیتا ہے۔ بس جھوٹ بولنے کا فن آنا چاہئے۔ زارا کی سب سے بڑی کمزوری دولت ہے، وہ مجھے کسی عربی شیخ کے ہم پل دولت مند سمجھ رہی ہے کیونکہ میں نے اسے خواب ہی اتنے منبرے دکھائے ہیں۔ وہ اب ایک ایسے ریشمی جال میں آن پھنسی ہے جس سے وہ چاہے ہوئے بھی فرار نہیں لے سکتی، اور پھر شہزاد اب سانپوں سے کیلنے کی عادت ہوگئی ہے، وقت نے سکھا دیا ہے مجھے، اس نے سرد لہجے میں کہا تو وہ مجھے بہت زیادہ بدلا ہوا لگا۔ میں اسے حیرت سے دیکھ رہا تھا کہ وہ بولا، ”وہ تمہاری دوست نہیں ہے۔ میں حتی طور پر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ رات اس نے اپنے ذہن کا سارا گند میرے سامنے اظہار دیا۔ اس کی بددیوار سوجوں سے میرا دماغ تو خراب ہوا لیکن اچھا ہوا کہ میں تمہیں وقت سے پہلے خبردار کر رہا ہوں۔“

”تم مجھے وہ گندھانا پسند کر دے گے؟“

”بالکل نہیں، مجھے پتہ ہے، یارا تم کردار کے معاملے میں کیا ہو۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کیوں اتنے عرصے سے ان جنگلوں میں بھٹک رہے ہو۔ دوستوں کے جھرمٹ میں اپنی تجمائی ڈور کر رہے ہو۔ تمہارے ڈھیروں دوست بھی ہو گے، دشمنیاں بھی پالی ہیں تم نے مگر یاد رکھو، پیارے!

وہ شخص کبھی بھی تمہارا دوست نہیں ہو سکتا جو تمہیں کسی بھی طرح کی ذلتی اذیت میں مبتلا کر دے۔"

"حیدر! تم بالکل غلط سمجھ رہے ہو، نہ تو۔۔۔"

"خوفز ہی ہے تمہاری۔ جویریہ کی بے وفائی تم بھول سکتے ہو؟"

"بس حیدر! بس، کچھ میرے زخموں پر نشتر چلا رہے ہو؟"

"تم جانتے ہو، میں تمہیں کتنا اور کس قدر جانتا ہوں۔ میرے سامنے جھوٹ بولو گے تو مجھے دکھ ہوگا۔ تمہاری سب سے بڑی خوبی کو ان دنیا والوں نے سب سے بڑی کمزوری بنا لیا ہے۔ اور لاشعوری طور پر تم کمزور ہوتے چلے جا رہے ہو۔ میں نہیں کہتا کہ تم منافق بن جاؤ لیکن مصلحت پسندی، پیارے مصلحت پسندی یہ جو تم سب کچھ کرتے چلے جا رہے ہو، یہ کام تمہارے کرنے کے نہیں ہیں۔ دنیا الجھار ہی ہے اور تم اٹھتے جا رہے ہو۔ اتنی ساری زنجیریں تم نے اپنے پیروں میں خود ہی باندھ لی ہیں۔ ایسا کیوں ہے، کیا ایسا کر کے تم کوئی کفارہ ادا کر رہے ہو؟ مجھے اپنے کسی سوال کا جواب نہیں چاہئے لیکن تمہیں ضرور سوچنا ہوگا۔" یہ کہہ کر اس نے اضطرابی انداز میں نیا سگریٹ سلگایا۔ میرے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا، جویریہ کے ذکر نے ہی مجھے تنگ کر کے رکھ دیا تھا۔ اتنی ہی دیر تک خاموشی ہمارے درمیان چلتی رہی۔ حیدر جو کچھ مجھ سے کہنا چاہتا تھا، میں اسے بخوبی سمجھ رہا تھا۔ وہ فقط زارا ہی کو میرے لیے معزز نہیں سمجھتا بلکہ میرے ارد گرد دیواروں کی طرح کھڑے حالات اور میرے اطراف میں موجود لوگوں کے بارے میں پریشان تھا۔ نہ جانے وہ میرے بارے میں کتنی عمیقیدگی سے سوچتا رہا تھا، کتنے دوستوں سے کتنی گفتگو کی ہوگی۔ ہو سکتا ہے، کسی نے کوئی بھی ایک حالات اس کے سامنے رکھ دیئے ہوں۔ کچھ تھا ضرور جس سے وہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ماحول قدرے بوجھل ہو گیا تھا اور میں کوئی تفصیل بیان کر کے ماحول مزید کھردرائیں بنا تا چاہتا تھا سو میں نے کہا۔

"آؤ، باہر نکلیں کھلی گھاس چلے ہیں۔"

"نہیں۔ مجھے اندیم کے ساتھ نہیں جانا ہے۔" اس نے نرم سے لہجے میں کہا۔ "اور ہاں، زارا کی طرف سے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسے تو میں سنبھال لوں گا۔ تم بس اتنا خود کرنا کہ میں نے جو تمہارے خلاف اس سے باتیں کی ہیں، وہ تمہیں بتاتی ہے کہ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔ اس وقت میں سمجھ گیا کہ وہ اپنے ذہن و دل پر سے قہار صاف کر چکا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں بیان کو چاہئے لانے کے لیے کہتا، اندیم آن وارو ہوا۔ حیدر نے کچھ کہے بغیر ہاتھ ملا یا اور اس کے ساتھ چل دیا۔

میں حیدر سے ہاتھ کر کے میں اعصابی طور پر تھکن محسوس کرنے لگا تھا۔ اس نے تو ایک طرح سے اپنا بوجھ اتار بھیجا تھا جس سے کسی بھی طرح حالات پہلے کی مانند، اک بہاؤ کی صورت میں رہنے والے نہیں تھے، یا تو بالکل خاموشی چھا جاتی یا بھر طوفان العتاس۔ وہ تو وقت اور حالات پر منحصر تھا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے؟ حیدر نے مجھے میرا منہ میا دو لاکر اور جویریہ کا نام لے کر میرے زخموں کو پھر چھیڑ دیا تھا۔ میں وہ تمام تریا دیں اپنے اندر دفن کر چکا تھا لیکن یہ میری خام خیالی تھی۔ وہ اب بھی میرے دل میں اسی طرح بسی ہوئی تھی اور اس کی تصویر میرے ذہن پر چسپاں تھیں۔ انہی یادوں سے بچنے کے لیے میں دفتر سے گھر آ گیا تاکہ نائلہ کے ساتھ خوش گپیوں میں جویریہ کی زور پکڑتی یادیں بھول جاؤں مگر گھر میں سنانا تھا۔ ولد دار

ڈرائنگ روم میں بیٹھائی وی دیکھ رہا تھا، مجھے دیکھتے ہی اٹھ گیا تو میں نے پوچھا۔
”کہاں گئے؟“

”نالہ بی بی شاہنگ کے لیے گئی ہیں، مراد خان بھی انہی کی ساتھ ہے۔“ دلدار نے جلدی سے کہا۔ مراد خان کو آصف چوہدری نے بھیجا تھا اور وہ یہاں سیکورٹی گارڈ کے طور پر رہتا تھا۔
”کب سے گئی ہیں وہ؟“
”کافی دیر ہوگئی، دو گھنٹے تو ہو گئے ہوں گے۔“
”چلو بھیک ہے“ میں نے کہا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

”چائے بناؤں آپ کے لیے؟“ دلدار نے پوچھا۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا تو لیکن کی طرف چلا گیا۔ ماحول اور حالات کچھ اس قسم کے ہو رہے تھے کہ جن میں حدود چھٹا رہنا ہی ضروری تھا۔ کچھ بھی ممکن تھا۔ میں جتنا اس بارے سوچتا چلا جا رہا تھا، میری پریشانی بڑھتی چلی گئی۔ میرے اعصاب پہلے ہی سنبھلے ہوئے تھے، مگر آتے ہی مزید بوجھ محسوس کرنے لگا۔ تجھی مجھے خیال آیا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ میں جس قدر حالات اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کر رہا تھا، اتنا ہی وہ میرے ہاتھ سے پھسلنے چلے جا رہے تھے۔ ماریہ والا معاملہ ختم ہونے کے باوجود ایک خطرہ میرے سر پر لٹھی ہوئی تلوار کی طرح مسلط تھا۔ کبھی نہ کبھی میرا تعلق ماریہ سے ہونا ثابت ہو جائے گا اور پھر ایک نئی طرح کی لڑائی اذیت شروع ہو جائے والی تھی۔ دلدار کے چائے لانے پر میں خیالوں کے حصار سے نکلا۔ چائے پینے کے دوران میں دلدار سے باتیں کر کے اپنی پریشانی کا احساس کم کرنے لگا۔ اسی دوران فون بج اٹھا، دوسری جانب بیگم شہوانی تھیں۔ کچھ لمبے پونہی باتیں کرتے رہنے کے بعد انہوں نے کہا۔

”وہ تمہاری دوست ذرا کے بارے میں بات ہوگئی ہے۔ اب اسے ظلم بھی لیا جائے گی اور وہ برطانیہ جانے والے طائفے میں بھی شامل ہوگی۔“
”بہت شکر یہ، ویسے آپ کو زیادہ الجھن تو نہیں ہوئی؟“

”نہیں، میرا اپنا طریقہ ہے کہ میں ایسے معاملات کیسے ڈال کر کرتی ہوں۔ بہر حال، یہ یقین رکھو کہ تمہارا نام دور دور تک کہیں نہیں ہے اور ہاں، دو دستوں میں شکر یہ نہیں ہوتا۔“

”یہ آپ کا بواپن ہے، بیگم صاحبہ! کہ آپ مجھے اپنا دوست سمجھتی ہیں۔ میں اس قابل کہاں؟“
”مجھے پتہ ہے تم کس قابل ہو۔“

”میرے لائق خدمت ہو تو ضرور حکم کیجیے گا۔“

”ویسے تو ڈھیروں خدمات ہیں، پیارے ابھی وقت دو تو میں تمہیں بتاؤں۔ لیکن اہم بات ہے کہ تم اپنا خیال رکھا کرو۔“
”ضرور، کیوں نہیں، آپ جب بھی حکم دیں، میں حاضر ہو جاؤں گا۔“

”ارے اتنی بھی جلدی نہیں ہے۔ جب بھی پرسکون لمبے میسر آ جائیں، مجھے آپ لوگوں کی مصروفیات کا احساس ہے۔“ اس نے خوشگوار لہجے میں کہا اور تھوڑی دیر اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ بیگم شہوانی کی ”خدمات“ کیا ہو سکتی ہیں؟ اس خیال کے ساتھ ہی سوچ کو راست ملا تو

میں اس میں بہتا چلا گیا مگر یہ ساری سوچیں لا حاصل تھیں، اس کا احساس کرتے ہی میں نے ساری سوچیں جھٹک دیں اور زارا کا نمبر ڈائل کر دیا۔ چند لمحوں بعد اس نے اپنا نیت چھلکاتے لہجے میں کہا۔

”ہماری یاد کیسے آگئی آپ جیسے مصروف بندے کو؟“

”تم بھولتی کب ہو جو تمہیں یاد کیا جائے۔“ میں نے شوخی سے کہا۔

”یہ تو ہماری خوش قسمتی ہوئی نا!“ وہ اٹھلائے ہوئے لہجے میں بولی۔

”خیر، بتانا میں نے تمہیں یہ تھا کہا اب تمہاری جھٹی ہوئی قلم ل جائے گی اور تم پر طمانیہ بھی چلی جاؤ گی۔“

”او، کڈ، ویسے قلم والوں کی طرف سے بھی فون آیا تھا، کہہ رہے تھے کہ کوئی بات کرنی ہے۔ میں تذبذب میں تھی مجھے وہ کیا بات کریں گے؟“

”نیکیا بات کرنا چاہتے ہوں گے۔“

”ٹھیک ہو، شجاع!“ لہجے میں اپنا نیت کے ساتھ اب منونیت بھی درآئی تھی۔ تجھی میں نے بات بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

”کیا مصروفیات ہیں آج کل؟“

”بہت مصروف ہوں، قلم والوں سے بات کرتی ہے، شوٹنگ ہے، نہانے واہسی کب ہو۔ ویسے، شجاع اکوئی خاص بات ہے؟“

”بس یونہی سوچا کہ اگر تم مصروف نہیں ہو تو ڈنر کھٹھے لیتے۔“

”سوری، شجاع! میں دو دن تک انتہائی مصروف ہوں۔ جونہی فراغت ملتی ہے، میں خود آپ کو انوائسٹ کروں گی۔ ویری سوری، شجاع! اس

نے وہ چھائی دکھے لہجے میں کہا تو میں نے چند اودھائی باتوں کے بعد فون بند کر دیا اور سونے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ کتنے ہی سارے لمبے یونہی بیت

گئے۔ میں خالی الذہن ہو گیا جیسے خلاؤں میں تیر رہا ہوں۔ پھر میری آنکھ لگ گئی اور میں اس وقت بیدار ہوا جب وہ نائٹ آگئی۔ ان کے چہرے پر بشارت

تھی اور ہاتھوں میں کئی سارے بیگ پکڑے ہوئے تھے، میرے آنکھیں کھول دینے پر نائٹ نے جلدی سے کہا۔

”دیکھیں، میں آپ کے لیے کیا لائی ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چند شاپنگ بیگ میری طرف بڑھا دیے۔ ان میں کپڑے تھے ایک

جوٹوں کا مہنگا جوڑا اور شیوٹنگ وغیرہ کا سامان تھا۔

”اس شاپنگ کا مقصد.....؟“ میں نے نائٹ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”مجھے کچھ اپنی چیزیں خریدنا تھیں، خریداری میں آپ کے لیے بھی چند چیزیں لے لیں۔ اس کا کوئی بھی خاص مقصد نہیں، یونہی معمول کی

شاپنگ ہے۔“ نائٹ نے بڑے اطمینان سے لفظ چباتے ہوئے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ پھر وہ شاپنگ کی روداد سنائی چلی گئی۔ وہ کہہ چکی تو میں بولا۔

”صرف باتوں سے پیٹ نہیں بھرتا، اس کے لیے کچھ اور بھی کرنا پڑتا ہے۔“

”اکیسی بھی کیا مایوسی، حضور! میں کھانا بازار ہی سے لے آئی ہوں۔ دلدار صاحب دوبارہ سے گرم کر کے لا رہے ہیں، آپ منہ ہاتھ دھو کر

تحریر لے آئیں۔“ نائٹ نے چپکتے ہوئے کہا تو میں اٹھ گیا، پھر کھانے کے بعد چائے پیتے ہوئے ہم کافی دیر تک یونہی باتیں کرتے رہے۔

اس شام میں گھر آیا تو حیدر اور ندیم ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ان دونوں کے سامنے کافی سارے کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی حیدر مسکرا دیا اور سارے کاغذات سمیٹ کر بریف کیس میں رکھنے لگا۔ میں صونے پر بیٹھ گیا۔

”کہے، صاحب! کیا حال ہیں آپ کے؟“ یہ کہتے ہوئے وہ رازدارانہ انداز میں ہنس دیا۔

”میں تو ٹھیک ہوں، آپ لوگ ساؤ، کہاں غائب ہو دو لو؟“

”آپ کی دوست زارا کو شرف مہمانی بخش رہے تھے۔ اس نے میرے قرب کی خاطر اپنے سارے پروگرام ٹچ دیئے، یہاں تک کہ اپنے قریبی دوستوں سے بھی جھوٹ بولتی رہی۔“

”حضور اکمل کفر فرمائیں، مدعا کیا ہے؟“ میں نے پشتمے ہوئے کہا۔

”تانا صرف یہ ہے کہ تم نے جب اس سے فون پر اس کی مصروفیات پوچھی تھیں، تب اس نے صرف میرے لیے بہانہ بنا دیا تھا۔ یہ اس لیے کہا ہے کہ تم ذہن میں رکھو۔“

”یار! کس کی بات کرتے ہو، ایسا کرنا ان کے پیشے کا تقاضا ہے، تم خواہ مخواہ اسے اہمیت دے رہے ہو۔ اور سنو! میں اسے اب تک اہمیت کیوں دے رہا ہوں۔ اس کا میں احسان مند ہوں۔“

”کیسا احسان۔۔۔؟“ اس نے پوچھا تو ندیم بھی میری طرف غور سے دیکھنے لگا۔

”میں جب ڈبھی ہوا تھا تو اس نے نہ صرف مجھے ہسپتال پہنچایا بلکہ دو دن تک میری تیمارداری بھی کی۔ یہ سب جانتے ہیں۔“ میں بہت سکون سے کہا۔

”میں۔۔۔“ اس نے جلدی سے کچھ کہنا چاہا پھر لمبی سانس لے کر دھیرے سے مسکرایا اور بولا۔ ”یہ وقت ہی بتائے گا، یارا! آج ڈنر دے رہا ہوں، کل شام میری ظلمت ہے۔“

”ڈنر کا اہتمام کہاں کیا ہے؟“

”زارا نے ایک چائینیز میں بندوبست کیا ہے، میں نے سب دوستوں کو بتا دیا ہے۔ خیر، وہ چھوڑو۔ یہ لو تمہارا پاسپورٹ۔“ اس نے بریف کیس سے پاسپورٹ نکالنے ہوئے کہا۔

”حیدر! تم مجھے دعویٰ لے جانے کے لیے واقعی سنجیدہ ہو؟“ میں نے جذباتی انداز میں پوچھا۔

”میں کچھ نہیں کہتا، اپنے دل سے پوچھو۔“ اس نے سوالیہ نشان مجھ پر چسپاں کر دیا تھا۔ میں کچھ نہ بولا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔ حیدر نے مجھے ہلکے سے جذباتی کر دیا تھا۔ مجھے کمرے میں لینے ہوئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ناگہان کافی لے کر آگئی۔ میرے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی وہ پریشان ہو گئی، سائیکل ٹیبل چمک رکھتے ہوئے بولی۔

”خیریت، شجاع! بڑے پریشان لگ رہے ہیں آپ؟“

”پریشان نہیں، جذباتی۔۔۔“ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے کہا۔

”اچھا تو آپ بھی جذباتی ہو جاتے ہیں، کس نے کر دیا؟“ وہ مسکراتی ہوئی بولی

”حیدر نے، خیر تم لگزنہ کرو میں لھیک ہوں۔“ میں نے سمجیدگی سے کہا تو وہ واپس مڑ گئی۔ جمعی حسن کی آواز ڈرامائیگ روم سے آئی تو میں

نے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔

چائیزر ستوران پہنچے تو ڈائینگ ہال میں زارا ہمارے استقبال کے لیے موجود تھی۔ مجھے اس کے وہاں ہونے کی پہلے ہی سے توقع تھی۔ اس

کے پہلو میں ایک نوخیز لڑکی بیٹھی ہوئی تھی جس کی آنکھوں میں اتری ہوئی حیرت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ زارا کی دنیا میں بالکل نئی ہے کیونکہ دعوت

نکارا دوپہ ہوا لہا اس پوری کہانی کہہ رہا تھا کہ وہ کس قبیل سے تعلق رکھتی ہے۔ زارا سراپا غلوں بنی ہوئی تھی۔ جمعی حسن نے دھیرے سے کہا

”اپنا حیدر، زارا کی رنگینوں میں کھ کر رہ گیا ہے۔ گمان بھی نہیں تھا کہ اس جیسا جہانمیدہ بندہ ایک عورت کے جال میں پھنس جائے گا اور وہ

ندیم صاحب۔۔۔“

”بدگمان نہیں ہوتے۔۔۔ حیدر نے کل شام چلے جانا ہے لہذا وقت کم ہے اور اس کا بھرپور فائدہ اٹھالینا چاہتا ہے۔ تمہیں اس کے نئے

کاروبار سے متعلق پتہ تو ہے۔“ میں نے حسن کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ پھر اپنی باتوں میں کھو گئے۔ یوں خوشگوار ماحول میں رات گئے وہاں سے واپسی

ہوئی۔ اس رات مجھے احساس ہوا کہ حیدر نے کس حد تک زارا کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔

اگلے روز سہ پہر کے وقت ہم سبکی دوست ایک قافلہ کی صورت میں انٹر پورٹ پہنچے، بالکل آخری لمحوں میں حیدر نے میرا ہاتھ دباتے

ہوئے ہوئے سے کہا۔

”شجاع! کسی بھی موقع بدگمانی کو دل میں مت رکھنا، بس مجھ پر یقین رکھنا، ندیم میرے ساتھ جا رہا ہے، تم بھی جلد آ جاؤ۔ میں تمہارے

حالات سے غافل نہیں ہوں، میری تمہارے دوستوں سے ڈھیروں باتیں ہوئی ہیں۔“

”میں کوشش کروں گا، بہت جلد آ جاؤں“

”آ جانا، جا ہے سیر کے لیے ہی سہی۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ لفظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ ندیم میرے گلے لگ کے رونے لگا، میں

نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”اوسے، یہ کیا پاگل پنہا ہے؟“

”میں آپ کا احسان مند ہوں“ اس نے کہا تو مجھے خصر آ گیا، میں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”بے وقوف آدمی! چلو، جاؤ۔“ میرے اس طرح کہنے پر وہ دوبارہ مجھ سے چٹ گیا اور کافی دیر تک میرے ساتھ لگا رہا۔ میں نے

دیکھا، اس کے گمراہ لے منونیت بھری لگا ہوں سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کی فلائیٹ کا اعلان ہوا۔ وہ سب سے ملنے کے بعد ڈیپارچر لاونج

چلے گئے۔ اسی رات حیدر نے دعویٰ سے فون کر کے اپنی خیریت سے بتائی جانے کی اطلاع دی۔

اگلے دن میں حسن کے ساتھ پریس کلب جانے کے لیے تیار کمر اتھا، وہ ایک ضروری کال سننے میں منہمک تھا کہ میرا فون بج اٹھا۔ میں نے نمبر دیکھے تو اجنبی تھے۔ میں نے ”ریلا“ کہا۔

”میں دو درشاہ بات کر رہا ہوں اور آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی اور اس نے بغیر کسی تمہید کے اپنا نام عایدان کر دیا، تب میں نے اپنے لہجے کی سنجیدگی برقرار رکھتے ہوئے کہا۔

”خیریت، کون ہو آپ؟“ میں نے پوچھا

”خیریت ہی ہے، آپ سے ایک پرانا اُدھار ہے، پلیس گے تو لے لوں گا۔“ اس اجنبی نے کچھ اس طرح کہا کہ میں چونک گیا۔

”کوئی سا پرانا اُدھار ہے میں بھی تو جانوں؟“

”میں چونک آپ کا تصور اوقت لوں گا، اس لیے سوچا آپ کو فون کر لوں..... آپ مصروف تو نہیں؟“ اس کا لہجہ ٹھنڈا تھا۔

”کیا آپ اپنا تعارف نہیں کروائیں گے؟“

”ہاں یہ بہت ضروری ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے سخت لہجے میں کہا۔ ”کچھ لوگ میں منیر ملک ہوں۔“

”اوہ۔۔۔“ میرے منہ سے سرسراتے ہوئے نکلا تو اس نے فرماتے ہوئے کہا

”تم نے اپنا جو بندوبست کرنا ہے کر لو، پھر نہیں کہنا دمہو کے میں مارویا، میں تجھے اب چھوڑنے والا نہیں ہوں۔“ اس کا لہجہ سرد ہو گیا تھا۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کروں گا۔“ میں احماد سے کہا

”تو کرو، کسی بھی وقت کسی بھی جگہ۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ حسن میری طرف دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں سوال تھا۔ تو

میں نے اسے بتا دیا۔

”دو درشاہ، وہ کون۔۔۔؟“ اس نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”میں کیا جانوں، ہونکا کوئی؟“ میں نے لا پرواہی سے کہا اور قدم باہر کی طرف بڑھا دیے جب اس نے حیرت سے کہا۔

”تم اتنی آسانی سے لے رہے ہو؟“

”تو کیا کروں ابھی یہاں بیٹھ کر روڈنے لگ جاؤں؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو میری بات سمجھتے ہوئے چل دیا۔ پریس کلب جا کر بھی

اس نے بات کی۔

”کیا تمہیں اس کی کہانی پر یقین ہے؟“

”بالکل ہے، ہرے سے اس کی کسی بات کا نکار نہیں کیا جاسکتا۔“

”پھر تم۔۔۔؟“

”سب کچھ سامنے آ جائے گا، دیکھو، وقت کیا رنگ دکھاتا ہے؟“

”ہاں، وقت تو رنگ دکھاتا ہے اور یہاں بندے بھی اپنا رنگ بدل جاتے ہیں۔“

”تمہاری اس بات کا مطلب؟“

”کس پر کیا بھروسہ کریں۔ اس نے تو۔۔۔ اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟“ حسن نے کہا تو میں نے کہا

”کچھ بھی نہیں، انتظار کرنا ہوگا۔“

”اس قدر واضح۔۔۔“ حسن نے کہنا چاہا تو میں نے ہاتھ اٹھا کر بات ختم کر دی اور مزید کچھ کہنے کی گنجائش نہ رکھے ہوئے اس سے چائے

یا کافی کا پوچھ لیا۔

اس رات میں نے اور آصف چوہدری نے بڑی دیر تک اس معاملے پر ہی باتیں کیں۔ وہ کوئی بھی تھا سامنے آنے سے پہلے اپنی چور پر ختم کر دینا چاہتا تھا۔ ہم ہوا میں تو تیر نہیں چلا سکتے تھے سو آگے کیا کرنا ہے، ہم نے طے کر لیا۔ ایک لڑکے کو مجھے یوں لگا جیسے ہم بھرے گانچ کے دور میں آگے ہیں، فرق صرف یہی تھا کہ ان دنوں لاہالی پن میں پلاننگ کرتے تھے اور اس رات ہم نے پوری جمیدگی سے سوچا۔ میں لاشعوری طور پر جھٹکا ہو گیا تھا۔

میں اس رات دیر تک اس معاملے پر سوچتا رہا۔ میرے خیال اس معاملہ کے بارے عامر کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی، حسن نے اسے خود ہی بتا دیا تھا۔ اگلے دن کی دوپہر ڈھل چکی تھی اس وقت میں نے محسوس کیا کہ دباؤ مزید بڑھ گیا ہے۔ میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا جسے میں نے رات جگنے ہی کاری ایکشن سمجھا اور آرام کے لئے گھر آ گیا۔ میں نے ڈرائیونگ روم میں بیٹھا کرا ایک سگریٹ سلگائی اور سوچنے لگا کہ اس درد و شاہ تک کیسے پہنچ سکتا ہوں، دو بارہ اس نے رابطہ بھی تو نہیں کیا تھا۔ جیسے جیسے وقت گزرتا چلا جا رہا تھا، میرے سر میں دباؤ کے باعث درد بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ میں نے دلدار سے منگوا کر درد کھلو لیاں کھانی تھیں لیکن درد، خور و یسے ہی تھا۔ تین بج چکے تھے اور میری بے چینی عروج پر تھی۔ مجھے نیند آنے لگی تو میں سو گیا۔ یوں اگلا دن اسی انتظار میں گزر گیا مگر کوئی بندہ سامنے نہیں آیا۔

اگلی رات ناکہ نے کھانے پر خاصا اہتمام کیا۔ حسن اور عامر بھی آگئے۔ اس سارے ہنگامے میں رات کا پہلا پھر گزر گیا تھا۔ کھانے پینے کے بعد چائے تک حسن نے کہا۔

”شہا ج! آؤ چلیں۔۔۔“

”کہہ رہا ہے؟“ میں نے پوچھا

”ہم تھوڑا فریٹس ہو کر آتے ہیں“ وہ بولا مجھے اس پر بڑا پیارا آیا۔ میں اس وقت واقعی تازہ دم ہونا چاہتا تھا، حسن کو میرا کس قدر احساس تھا۔

تبھی عامر نے کہا۔

”ناکہ کو ساتھ لے لیں؟“

”لے لو، یارا ہم کون ہوتے ہیں روکنے والے تمہاری شے ہے۔“ حسن نے مسکراتے ہوئے کہا تو عامر بولا۔

”اسے کہتے ہیں حسد اور وطن۔“

”اچھا چھوڑو، چلو۔۔۔“ حسن نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا

گاڑی عامر ڈرائیو کر رہا تھا اس کے ساتھ نائلہ تھی۔ میں اور حسن پیچھے بیٹھے ہوئے تھے۔ کارمزک پر حیرتی، جلی جاری تھی۔ تہی میرا سلیج اٹھا۔

”تمہاری مہلت ختم ہو چکی ہے۔“

”اوہ تم دو دو شاہ، ارے کہاں ہو، میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں، بولو کہاں آؤں یا تمہیں مل سے نکالنے کے لیے مجھے کچھ کرنا ہوگا؟“ میں

نے اہتجائی طرز سے کہا۔

”تمہیں تو کچھ نہیں کرنا، جو کرنا ہے، میں نے ہی کرنا ہے۔“ وہ بھڑکتے ہوئے بولا۔

”یکو اس کر رہے ہو تم۔۔۔ اگر ہمت ہے تو آ جاؤ سا سفید بکھیں، کون کیا کرتا ہے۔ اب تم اپنی فکر کرو“ میں نے کہا

”تم اپنی زندگی کی خیر متاؤ“ وہ بولا

”میری زندگی میرے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ میں کہاں ہوں، اگر تم۔۔۔“ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ کہتا، حسن

نے فون میرے ہاتھ سے لے کر کہا۔

”میرا خیال ہے کہ تم آرام سے بیٹھ جاؤ تو اچھی بات ہے۔ میں جانتا ہوں، تمہاری رسائیاں کہاں تک ہیں لیکن تم نہیں جانتے کہ ہماری

پہنچ کتنی ہے۔ اگر تم پھر بھی نہیں سمجھتے تو تم سے جو کچھ ہوتا ہے، کر لو۔ مورتوں کی طرح مجلس دہمکیاں ہی نہ دیتے رہو؟“

یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ ہمارے درمیان خاموشی تھی۔ میں تیزی سے دو دو شاہ کے پارے میں سوچ رہا تھا کہ وہ کس رخ سے ہمیں

نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کارر کئے پرس میں اپنے خیالات سے چونکا۔ میں نے باہر دیکھا، ہم انٹر پورٹ کی پارکنگ میں تھے۔

”چلو، لکھو“ حسن نے مجھے ٹھوکا دیتے ہوئے کہا میں نے فیہر ارادی طور پر پوچھا۔

”یہاں کیسے؟“

”باہر تو لکھو۔۔۔“ حسن نے کہا۔ پھر نائلہ اور عامر نے ایک سوٹ کیس اور بیگ عامر نے، نائلہ نے کارلاک کی اور کچھ لمبوں بعد ہم ایئر

پورٹ کی عمارت کے اندر تھے۔

”یار! تم لوگ بتاتے کیوں نہیں، ہم یہاں کیسے آئے ہیں؟“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا تو حسن دھیرے سے بولا۔

”تم حیدر کے پاس دو سنی جا رہے ہو۔“

”میں۔۔۔ کیوں۔۔۔ نہیں۔۔۔“ بے اکتھیا میرے منہ سے نکل گیا۔

”ہم سب یہ چارہ ہے ہیں کہ تم وہاں جاؤ۔“ حسن نے سختی سے کہا اور گھڑی پر لگاؤ ڈال کر نائلہ کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے اپنے پرس میں

سے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ نکال کر میری جانب بڑھاتے ہوئے بولی۔

”ابھی کچھ دیر بعد ملاٹ ہے اور یہ سوٹ کس اور بیک تمہارے ساتھ جائے گا۔ اب تم فوراً اندر چلے جاؤ۔“ نائلہ نے ہلکے ہلکے لہجے میں کہا تو میں اس کا چہرہ دیکھتا رہ گیا جو سرخ ہو رہا تھا۔

مجھے وہ صورت حال بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ نائلہ کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور وہ پائپوٹ سمیت کنٹ میری طرف بڑھانے کھڑی تھی۔ میں نائلہ کے من میں اٹھنے والے جذبات کو سمجھ رہا تھا، وہ بڑے ضبط سے کام لے رہی تھی۔ میں نے اس کی طرف بھرپور نظروں سے دیکھا تو وہ لگا ہیں جھانکی۔ میں نے عامر کی جانب دیکھا۔ وہ ہم سے قدرے دور کھینچے ہوئے بچوں کو بڑے اٹھماک سے دیکھ رہا تھا اور یوں پوز کر رہا تھا جیسے ہماری باتوں پر اس کی ذرا سی بھی توجہ نہیں ہے۔ مجھے پورا یقین تھا کہ اگر میں اس سے کچھ پوچھتا بھی تو وہ مجھے کوئی معقول جواب دینے والا نہیں تھا۔ حسن میرے سامنے اپنے چہرے پر سختی جمائے میرے جانب مسلسل گھور رہا تھا۔ چند لمبے اسی گونگو کے عالم میں مگر گئے تو وہ ہلکے ہلکے لہجے میں بولا۔

”تم یقیناً ہم سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو گے مگر یہ وقت نہیں ہے۔ تمہیں جو کچھ بھی پوچھنا ہے وہ سب تمہیں حیدر بتا دے گا۔“ یہ لفظ ابھی اس کے من میں ہی تھے اور جواب میں بہت کچھ کہتا چاہ رہا تھا کہ فاروق اصغر تیز قدموں سے ہماری طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ میرا ایوی ایشن میں ایک ذمہ دار عہدے پر تھا اور ہمارا دوست تھا۔ اس نے چہرے پر مسکراہٹ سمجھاتے ہوئے مجھ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔

”اب چل بھی دو، یارا پمپلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔“ اس نے کہا تو عامر میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے میرے سینے سے لگ گیا، میرا کندھا چھتیاتے ہوئے بولا۔ ”حوصلہ رکھنا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہاں کی فکر مت کرنا، ہم ہیں ادھر۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے الگ ہو گیا

”بس دیر ہو گئی، جان جی!“ حسن نے اس کی طرف دیکھا اور بیک اٹھا کر مجھے تھما دیا۔ میں نے ایک بار پھر نائلہ کی جانب دیکھا اور آہستگی سے نائلہ کے ہاتھ سے کنٹ اور پائپوٹ تمام لیا، تمہی نائلہ نے ایک کی پرس مجھے دیا اور بولی۔

”یہ بیک اور سوٹ کس کی چابیاں ہیں، سنبھال لینا۔“

تو نائلہ سے ضبط نہ ہو سکا، ایک ہلکی سی لنگی کے ساتھ وہ میرے گلے لگ گئی۔ چند لمحوں بعد میں نے اسے خود سے الگ کیا تو وہ کرب سے بولی۔

”آپ بہت یاد آئیں گے، بہت۔۔۔“

”آ جاؤ بھئی۔۔۔“ ریٹنگ کے ساتھ کھڑے حسن نے اوپٹی آواز میں کہا جو میرے سوٹ کس سمیت وہاں پہنچ چکا تھا۔ میں نے نائلہ کی طرف دیکھا اور اس کا ہاتھ چھتیاتے ہوئے کہا۔

”تم میرے لیے دعائیں کرتی رہتا۔ ہم بہت جلد ملیں گے۔ ہم سب دوبارہ ایسے ہی ماحول میں، خوش و غرم ہوں گے۔ بس تم دعائیں کرنا۔“ میں نے فونے ہوئے بالٹھوں میں کہا اور تیزی سے حسن کے پیچھے چل دیا۔ اس نے مجھے گلے لگا لیا اور بڑے ہمائیلیوں کی طرح مجھے رخصت کر دیا۔ فاروق میرے ساتھ تھا۔ بورڈنگ کارڈ اور دیگر مراحل سے نکلے اور پھر وہ میرے ساتھ لاؤنج تک آیا۔ کچھ ہی دیر بعد میں عمارت کے باہر کھڑی بس تک جا پہنچا۔ میں یقیناً آخری سالر تھا۔ میرے پیٹھے ہی بس چل دی۔ میں نے اپنا سیل فون نکالا اور تیزی سے حیدر علی کا نمبر پیش کر دیا۔ دوسری تہل پر اس نے کال ریسیو کر لی، اس کے ہیلو کہنے کے بعد میں نے پوچھا۔

”یہ سب مجھے تمہاری طرف ددعی کیوں دیکھل رہے ہیں؟“

”اس وقت تم کہاں ہو؟“ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے اس نے سوال کر دیا۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور موجودہ صورت حال بتا دی تو وہ بولا۔ ”تو پھر تمہیں اتنی پریشانی کا ہے کی ہے۔ سکون سے آؤ، میں تمہیں ایئر پورٹ پر لینے آؤں گا۔ یہاں تم ایک گھر میں اطمینان سے رہو گے اور میرا خیال ہے، یہاں سکون سے ہاتس بھی ہو جائیں گی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گالی بھی ساتھ تھی کر دی۔ میں نے اگلی بات نہیں کہی اور فون بند کر دیا۔ تبھی مجھے آصف چوہدری کا خیال آیا، میں نے اس کے نمبر پیش کیے پھر میں نے انتہائی اختصار سے اپنے بارے میں بتایا تو اس نے کسی تاثر کے بغیر کہا۔

”میرے خیال میں تمہارے لیے یہی بہتر ہے، اس وقت تمہارا منظر سے ہٹ جانا انتہائی ضروری ہے۔“

”مطلب؟“

”مطلب مطلب کچھ نہیں، تم اطمینان سے جاؤ۔“

”مگر میرے نہ ہونے سے یہ ساری صورت حال بگڑ بھی تو سکتی ہے۔“

”کچھ نہیں ہو گا، تم حوصلہ رکھو۔“

”یار! مجھے کچھ کچھ میں نہیں آ رہا۔ تم بھی یہ چاہ رہے ہو کہ میں یہاں سے دفعان ہو جاؤں؟“

”ریٹیکس، ڈیڑہ! تمہیں صورت حال کا اندازہ نہیں۔ خیر تم جاؤ، ہوج سلیہ متاؤ، رابا پڑ ہے گا۔“

”ہاں، رابا پڑ تو رکھنا ہو گا تمہیں۔“

”وہ میں رکھوں گا۔ تم اطمینان سے جاؤ۔“ یہ کہہ کر چندا لودا می با میں کیس اور میں نے فون بند کر دیا۔ ابھی چند لمحوں میں بس رک گئی۔

وہ ددعی کے لیے براہ راست پرواز تھی۔ میں نے سیٹ بلیٹ کھول کر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیا۔ میرے ساتھ دائیں طرف ایک ادھیڑ

عمر شخص تھا، مجھے اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے روایتی انداز میں بات شروع کر دی۔ اسے میں نشانی میزبان آگئیں۔ اس نے اپنی گفتگو کا آغاز

انہی سے کیا اور پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ وہ شخص خاصا باتوئی تھا۔ وہ کچتا رہا اور میں منتہا رہا۔ اس کا قائدہ یہ ہوا کہ میں جولا ہوا نیر پورٹ تک

دفعی رہاؤں تھا، وہ بہت حد تک شتم ہو گیا۔ پھر جلد ہی اس سے آگیا گیا۔ میں نے اپنے لہجے کو انتہائی نرم رکھتے ہوئے اس سے کہا۔

”میں دو دنوں سے جاگ رہا ہوں، نیند سے میری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔ پلیز، کوئی ایئر ہوشنگی آئے تو اسے لاسٹرب نہ کرنے دیجئے گا۔“

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ آپ سو جاؤ۔“ اس نے ہمدردی سے کہا تو میں نے آنکھیں بند کر لیں اور پھر میں گہری نیند میں ڈوب گیا۔

اس وقت مجھے بڑا عجیب سا لگ رہا تھا جب کا وینٹر کے دوسری جانب کمرے ایک انتہائی کم عمر آفیسر کو میں پاسپورٹ دے چکا۔ وہ بڑے

دھیان سے میرا پاسپورٹ چیک کر رہا تھا۔ میں اپنی اس کیفیت کو سمجھ رہا تھا۔ میں ددعی آنے کے لیے ذہنی طور پر قطعاً تیار نہیں تھا اور مجھے چا کھ ہی یہ

سنز کرتا چڑھا تھا۔ پھر اس نے مجھ سے کچھ پوچھا تو میں اپنی اس کیفیت سے باہر نکل آیا۔ اس کا سوال میری سمجھ میں نہیں آ سکا تھا۔ تو قدرے اونچی آواز

میں اس نے انگریزی میں پوچھا۔ چند سوالوں کے بعد وہاں سے آگے بڑھنے کا اذن دے دیا گیا۔ مجھے اس وقت سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی تھی مگر میری جیب میں سگریٹ نہیں تھے۔ میں نے اس طلب کو نظر انداز کیا اور اپنا سامان لے کر ایئر پورٹ سے باہر آ گیا۔ فطری طور پر میں نے حیدر شاہ کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا، وہ دائیں طرف کھڑا میری طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ آگے بڑھا اور میرے قریب آ کر والہانہ انداز میں مجھ سے پلٹ گیا۔ وہ شاید کچھ کہنا چاہ رہا تھا لیکن شدت جذبات سے کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔ اس کے سرخ ہوتے ہوئے چہرے نے مجھے سب بتا دیا۔ ہم کچھ دیر وہیں کھڑے حال احوال شیر کرتے رہے۔ تبھی ایک پٹھان ہمارے پاس آن کھڑا ہوا تو حیدر نے سامان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”گل شیر! سامان رکھو۔“

پھر کچھ دیر بعد ہی سامان رکھ کر گل شیر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا۔ وہ نئے ماڈل کی ہنڈا کار ڈھکی، جلدی ہم ایئر پورٹ کی حد سے نکل آئے۔ کار کے اندر خاموشی تھی۔ میرے ذہن میں کئی سوال امنڈتے چلے آ رہے تھے اور میں ان کے جواب کے لیے بے تاب تھا۔ حیدر میرے ساتھ کچھ سیٹ پر خاموش بیٹھا ہوا تھا سو میں نے بھی خاموشی ہی کو بھرتا جانا۔ میں بائیں طرف بیٹھا تیزی سے گزرتے ہوئے مناظر دیکھ رہا تھا۔ ایک بڑے سے ایئر کیشن کے بعد ایک پل آ گیا تو حیدر نے کہا۔

”یہاں گر باور بروج ہے جو دوپہل کر یک پر بنا ہوا ہے۔ یہ کر یک ہی دوپہل کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہے، ڈیرہ ڈوبئی اور پارو دھنی، اب ہم پارو دھنی میں، جسیرہ کی طرف جا رہے ہیں۔“ حیدر کی آواز خاموشی میں گھل کر رہ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھ کر بھی ہی مسکان سے کہا۔

”اور کچھ ۹۹“ اگرچہ میں نے طہریہ انداز میں کہا تھا مگر وہ بڑی سنجیدگی سے شروع ہو گیا۔

”دوپہل جسے ”خریداروں کی جنت“ اور ”سٹی آف گولڈ“ کہا جاتا ہے، اسے اپنی موجودہ حیثیت ترقی اور خوشحالی تک پہنچنے میں کئی سال لگے ہیں۔ پہلے پہل یہ رفتار انتہائی سست تھی۔ کسی کے گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ یہاں اتنی بلڈنگیں بھی بن سکیں گی۔ شمال کی جانب اومان اور یمن کے درمیان چھارتی رابطے سے اپنی حیثیت منوائی، مشرق کی جانب سے پہاڑوں میں گھر اور شمال مشرق سے عرب کے وسیع و عریض صحراؤں کے باعث ساری دنیا سے کٹا ہوا دوپہل صرف سمندری راستے کی وجہ سے باقی دنیا کے ساتھ رابطہ رکھ سکتا تھا۔ اگرچہ یہ دیرانی اس خطے کے ہاسیوں کو کچھ بھی نہیں دے رہے تھی لیکن تاجروں اور صحرائی بدوؤں کے ملنے سے یہی دیرانی دھیرے دھیرے اس خطے کو انہم ترین بناتی چلی گئی۔ 1833ء کے لگ بھگ ”یاس“ خاندان کی ایک شاخ کے سربراہ عبید بن سعید الخدرم ابوظہبی کو چھوڑ کر دوپہل میں آگے آہا ہو گئے اور تقریباً آٹھ سو افراد پہ مشتمل لوگوں نے چھل اور موتیوں کی تجارت کا آغاز کیا۔ وہ اونٹ اور بکریوں کو پالنے کے علاوہ گھوڑوں کی بیدار پر خصوصی توجہ دیتے تھے۔ یہ کوئی وسیع پیمانے پر تجارت نہیں تھی لیکن آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ یہ علاقہ سارے گرد و نواح کے لیے چھارتی مرکز کے طور پر حصارف ہو گیا۔ 1870ء کے وسط تک یہ چھارتی مرکز کے طور پر اپنی حیثیت منوا چکا تو یہاں پر ایران، ہندوستان اور مشرقی افریقہ سے تجارت کا دروازہ کھل گیا۔ موتیوں کی تجارت دوپہل میں بنیاد حیثیت رکھتی تھی مگر 1940ء میں ”گلچر موتی“ کی ایجاد سے یہاں کی تجارت کو دوچمک لگا۔ یہ تجارت ختم ہو کر رہ گئی مگر یہ لوگ جلد ہی سنجل گئے۔ موتیوں کی جگہ سونے کی تجارت نے لے لی۔ 1966ء میں تیل کی دریافت ہوئی تو دوپہل میں معاشی اور صنعتی استحکام آ گیا۔ تیل کی دولت نے انہیں مضبوط بنیاد

فراہم کر دی اور یہاں پر دولت کی ریل تیل ہو گئی۔ دوہنی بھی برطانیہ کے قریب پیداوار عظیم کا شکار ہوا۔ 1971ء میں برطانیہ کے اخفا کے بعد ابو ظہبی کے حکمران شیخ زین بن سلطان النہیان اور دوہنی کے حاکم شیخ راشد بن سعید اللہوم کے درمیان ایک معاہدے کے تحت ریاستوں کا الحاق ہوا۔ اس طرح 22 دسمبر 1971ء میں متحدہ عرب امارات وجود میں آیا۔ ابو ظہبی وفاقی حکومت اور تیل کی پیداوار کا مرکز ہے جبکہ دوہنی تھارت کا۔ دوہنی کی آبادی تقریباً دس لاکھ کے قریب ہے، جس میں اسی فیصد لوگ غیر ملکی ہیں اور بیس فیصد مقامی باشندے۔ ایک لحاظ اندازے کے مطابق اسی فیصد غیر ملکی بھارتی ہیں اور باقی دیگر قومیتوں یا ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں کی سرکاری زبان عربی ہے، انگریزی بھی لکھی اور بولی جاتی ہے لیکن فارسی کے علاوہ سب سے زیادہ اردو ہی بولی اور لکھی جاتی ہے۔ اس اردو کو ہندی کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے اتنی تعداد میں یہاں ہونے کی کئی وجوہ ہیں۔ صدیوں پہلے یہاں جب ویرانی تھی، دوہنی محض ایک تجارتی اڈہ تھا تب ہندوستانی تاجر آتے تھے۔ تیل کی دولت سے پہلے جب انگریزوں کا تسلط تھا، اس وقت بھی گجرات اور گجلی کے سواناں کے پاس کچھ نہیں تھا۔ تب یہاں کرنسی بھی برٹش انڈیا کی چلتی تھی جو آج بھی ان کے عجائب گروں میں پڑی ہوئی ہے۔ قریب ترین ملک ایران اور ہندوستان تھا جہاں سے سامان آتا تھا۔ ہندو تاجر اور ساہوکاروں نے تب ہی سے اپنا تسلط جمانا شروع کر دیا۔ تب یہاں کے بادشاہ برائے نام بادشاہ تھے۔ وہ ہندو ساہوکاروں سے قرض لیتے اور پھر کرنسی کے بدلے میں پھنس جاتے تھے۔ دولت اور محرت دو ایسی چیزیں تھیں جنہوں نے دوہنی کی سر زمین پر ہندوؤں کو آباد کرنے میں مضبوط سہارا فراہم کیا۔ یہاں تک کہ مقامی لوگوں نے بھارت میں رشتہ داریاں قائم کر لیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسی فیصد غیر ملکیوں میں اسی فیصد بھارتی ہیں۔ ہندو ہر طرح کے کاروبار پر چھائے ہوئے ہیں۔ گجلی دو وہاںوں سے بھارت نے اپنے ملک کی معیشت کے لیے ایک نئی طرح کی جہت اپنائی ہے جس میں محرت کا استعمال بہت حد تک ہے۔ اگرچہ یہ کوئی نئی بات نہیں لیکن بھارت نے اسے نئی طرح سے دی ہے۔ یہی بھارتی جہت اب دوہنی میں بہت زیادہ دیکھنے میں آ رہی ہے۔ دوہنی ایک اسلامی ریاست ہے، اس کی روایات بھی اسلامی ہیں۔ تاہم اس ریاست میں غیر ملکیوں کے ساتھ انتہائی درجے کی روداری رکھی جاتی ہے۔ یہاں پر ہر مذہب کا فرد اپنی مذہبی روایات کے ساتھ آزادی اور سکون سے زندگی گزار سکتا ہے۔ ایک طرف اگر شراب کھلے عام کھتی ہے تو دوسری جانب خوبصورت اور پر آسائش مساجد قائم ہیں۔ نائٹ کلبوں میں جسموں کی نمائش ہوتی ہے تو حجاب پہنے خواتین بھی عام دکھائی دیتی ہیں۔ ہوٹلوں میں قہر خانے ہیں تو ہر طرح کی سملاہت سے مزین و بی اداریے بھی موجود ہیں۔ دراصل یہاں کے حکمرانوں نے ہر فرد کے لیے سب کچھ بنا دیا ہے اور فرد پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق جدھر جانا چاہے، چلا جائے۔ دوہنی ایک مسلم ریاست ہے اور دنیا بھر کے مختلف مذاہب کے لوگوں کو یوں اپنے اندر سموتا چلا جا رہا ہے کہ اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔“

حیدر ایک ماہر گائیڈ کی طرح میری معلومات میں اضافہ کرتا رہا اور میں خاموشی سے سنتا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد کار ایک بڑی سڑک سے اتر کر ڈی سڑک پر مڑ گئی اور اس کے ساتھ ہی ایک پوش رہائشی علاقہ شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دیر بعد کار ایک خوبصورت بڑے سے پتیلے کے سامنے رک گئی۔ بارن کے جواب میں فوراً ایک خوبصورت شخص نے گیت کھول دیا اور گل شیر نے کار پورچ میں جا روکی۔ میں نے دور ہی سے سلام اور اس کے ساتھ کمرے ایک مرد اور عورت کو دیکھ لیا تھا۔ میرے کار سے باہر نکلتے ہی وہ جیزی سے آگے بڑھا اور گلے لگ گیا۔ لحوں بعد میں نے اسے خود سے

انگ کیا تو اس کی آنکھوں میں نمی تھی، میں پریشان ہو گیا۔

”اے، ندیم! کیا ہوا تجھے؟“ میرے لہجے میں تشویش پاکر وہ جلدی سے بولا۔

”شجاع بھائی! میں یہاں بہت خوش ہوں، بس آپ کو دیکھ کر خوشی سے پاگل ہو رہا ہوں۔“

”یہ تمہاری آنکھوں میں نمی؟“

”خوشی سے، شجاع بھائی! خوشی سے۔۔۔“ ندیم نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا تو حیدر نے ندیم کے ساتھ کھڑے شخص کی طرف

اشارہ کیا۔

”یہ حشیش سہہ ہے۔“

”نمسکار۔۔۔!“ فوراً ہی اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا اور پھر میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔ اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی

ہوگی۔ اس نے بڑے سلیقے سے بال بنائے ہوئے تھے۔ بڑی بڑی آنکھوں پر گول فریم کی نازک سی ٹیگ، باریک باریک مونچھیں، کتے پاجامے کے ساتھ اس نے ہلکے چرمی سلپرز پہنے ہوئے تھے۔ سانولاسا شیش مہر میری جانب بڑی گہری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

”آپ کا ذکر تو میں پاکستان میں سن چکا ہوں، کیسے ہیں آپ؟“

”بہت اچھا ہوں، آپ سنائیں، سفر کیسا گزرا؟“ اس کا لہجہ پر جوش تھا۔

”بس گزر گیا۔“ میں نے دھیرے سے کہا تو حیدر نے ساتھ کھڑی لڑکی کی جانب دیکھ کر بتایا۔

”یہ کنول جیت کو رہے۔“

”جی آیاں لوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنا نازک سا ہاتھ میری طرف بڑھا دیا جس میں سونے کا کنول تھا۔ پہلی ہی کنول نے سیاہ چمنو اور

ہلکے گلابی رنگ کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی، کھلے بال کمرنگ آئے ہوئے تھے۔ وہ قدرے سانولے رنگ کی تھی مگر نین بخش غضب کے تھے شاید چڑستی جوانی میں چہرے کے نقوش ایسے ہی غضب ناک ہو جاتے ہیں۔ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور کہا۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“

”میں بھی بہت خوشی ہوئی۔ آپ کا ذکر تو بہت عرصے سے یہاں ہو رہا ہے، بڑا تحس تھا کہ آپ کو دیکھیں۔“

”پھر کیسا پایا مجھے؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”پہلی نظر میں تو بہت اچھا، ویسے آپ کے ہارے میں ہم نے سن بھی بہت رکھا ہے۔“ کنول نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے ندیم

سے پوچھا۔

”تم انٹریورٹ کیوں نہیں آئے؟“

”میں نہیں لے کر گیا تھا، یہ یہاں ڈنر کا بندوبست کر رہے تھے اور میں اپنے دفتر سے سیدھا انٹر پورٹ گیا تھا۔“ اس نے شوفی سے مسکراتے ہوئے کہا تو میں چپ ہو گیا، جی وہ بولا۔ ”آپ، حضور اگر رحمت نہ کریں تو چلیں اندر وہیں اطمینان سے بیٹھ کر گفتگو کرتے ہیں۔“ اس پر میں نے حیدر کی طرف غور سے دیکھا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دیا اور پھر ہم سب اندر چلے گئے۔ وہ بڑا خوبصورت اور آرام دہ سنگ روم تھا۔ دیوار کا پینٹ پر صوفے اور درمیان میں دھری میز، وہ کمرہ روایتی انداز میں چھایا گیا تھا۔ میں ایک صوفے پر ٹیک گیا تو ندیم سب کے بارے میں پوچھنے لگا۔ کچھ دیر یونہی باتوں میں گزری، جی حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ حضور کو کمرہ دکھا دیا جائے جہاں آپ غسل فرمائیں گے تاکہ بعد میں تناول ماحضر۔۔۔“

”تمہارے ساتھ کوئی لکھنؤ کا بندہ رہتا ہے کیا؟“ میں نے بھنا کر پوچھا تو ہنس دیا۔ پھر میں اٹھا تو ندیم نے اوپری منزل پر موجود اس کمرے تک رہنمائی کی جہاں میرا سامان پہنچا دیا گیا تھا۔ بیگ اور سوٹ کیس میرے سامنے تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس میں کیا کچھ ہے۔ میں نے جیب سے کی پرس نکالا اور سوٹ کیس کھول لیا۔ اس میں میرے کپڑوں کے علاوہ ذاتی استعمال کی چیزیں بھری ہوئیں تھیں۔ میں تیار ہو کر نیچے سنگ روم میں آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ بھوک بڑے زوروں کی لگ رہی تھی، کھانا بھی خاصا پر تکلف تھا۔ اس دوران سبھی سے ہلکی پھلکی باتیں چلتی رہیں۔ کھانے کے بعد بھلا دشیا یاد رہتی تے ہمارے سامنے کافی لار کھی، جی حیدر نے ہمیش اور کنول جیت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ دونوں بہت باصلاحیت ہیں، اب ندیم بھی ان کے ساتھ ہے۔ ان تینوں نے بہت حد تک کام سنبھال لیا ہے اب تم آگے ہو تو سب کچھ تمہیں دیکھنا ہوگا۔“ یہ کہہ کر اس نے کافی کا سپ لیا اور بولا۔ ”میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اب آپ لوگوں کے درمیان اجنبیت نہیں ڈھنی چاہئے۔“

”شجاع صاحب کم از کم میرے لیے تو اجنبی نہیں ہیں۔“ ہمیش نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ”آپ سے اور پھر ندیم سے ان کے بارے میں اتنا کچھ سن چکا ہوں کہ میں یہ تک بتا سکتا ہوں کہ ان کی پسند اور ناپسند کیا ہے۔“

”دراصل ندیم آپ کو مس کرتا رہا ہے۔“ کنول جیت نے اپنے بالوں کی لٹ کان کے پیچھے نکاتے ہوئے کہا تو ہمیش دھیرے سے مسکراتے ہوئے بولا۔

”ہاں رہی کام وغیرہ کی بات، یہ تو چننا رہے گا۔ وہ آپ کے ایک پاکستانی شاعر کے بقول۔

نکھر کیسی، اگر اللہ نے چاہا تو، قہقہے

اپنے سب کام حسینوں کی دعا سے ہوں گے“

یوں کافی دیر تک یونہی باتیں چلتی رہیں۔ پھر جب رات کافی ہو گئی تو حیدر نے ان تینوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اب آپ لوگ جا کے آرام کرو، بہت رات ہو گئی۔ صبح دفتر میں ملاقات ہوگی۔“ یہ سنتے ہی وہ تینوں اٹھ گئے۔ تو میں نے ندیم کی طرف

دیکھ کر کہا۔

”ارے تم کہاں؟“

”یہ اپنے ندیم صاحب انہی کے ساتھ رہتے ہیں۔ یہاں سے ہسپتال کے ساتھ ایک بلڈنگ کے رہائشی اپارٹمنٹ میں رہتے ہیں۔ اسی بلڈنگ میں دفتر ہے، ہم وہاں صبح جائیں گے۔“ میں سمجھ گیا کہ وہ تمہائی چاہتا ہے اور مجھے بھی ایسے ہی کسی ماحول کی ضرورت تھی۔ ان سب نے ہاری ہاری ہاتھ ملا اور چلے گئے۔ ہم بھی اوپری منزل کے اس کمرے میں آگئے جہاں میرا سامان پڑا تھا۔ ہم دونوں ایک ہی بیڈ پر بچکل گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال اس سے کرتا، اس نے درمیان میں ایٹھ بڑے رکھتے ہوئے کہا۔

”شجاع! مجھے پتہ ہے کہ تم مجھ سے کیا کچھ پوچھنا چاہ رہے ہو گے، کتنے سوال ہوں گے تمہارے پاس جن کے جواب تمہیں چاہئیں۔ میں خود بھی تمہیں آج رات ہی ساری الف لیلیٰ سنا دینا چاہتا ہوں۔ ایسا اس لیے، میری جان اگر اسی الف لیلیٰ میں نہ صرف تمہارے سوالوں کے جواب موجود ہیں بلکہ آئندہ آنے والے حالات میں تمہیں کوئی بھی فیصلہ کرنے میں آسانی رہے کیونکہ اب تمہیں بہت سارے فیصلے کرنے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالا اور درمیان میں رکھ دیا۔ پھر ہم دونوں ہی نے اپنے اپنے سگریٹ سلگائے تو اس نے بھرپور کش لے کر کہا۔

”شجاع! زندگی بڑی عجیب سی شے ہے۔ انسان اپنے فیصلے اپنی خواہشوں کے مطابق کر لیتا ہے مگر حالات اپنے اندر کیا کچھ رکھتے ہیں، اس سے بے خبر ہوتا ہے۔ فیصلے کا لہم ہوتے ہیں، ارادے ٹوٹ جاتے ہیں اور خواہشیں دم توڑتی ہیں تو جینے کے لیے انسان سہارے تلاش کرتا ہے لیکن بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ آنے والے حالات اتنا کچھ دے دیتے ہیں کہ انسان نے کبھی اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں ہوتا۔ بے شمار قسمیں مل جاتی ہیں اور یہی آزمائش کڑی ہوتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے کش لے کر میری جانب دیکھا اور پھر بولا۔ ”دوست بھی نعمت ہیں، پر غلوں دوست قدرت کا علیہ ہوتے ہیں۔ بد قسمت ہیں وہ لوگ جو دولت کے معیار پر انسانوں کو پرکھتے ہیں۔ شجاع! میں تمہارے لاہور کے دوستوں سے واقف نہیں تھا۔ میں ان کے لیے اور وہ میرے لیے اجنبی تھے۔ میں جب لاہور تمہارے پاس آیا تب ہی ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ میرے لیے سبھی محترم ہیں۔ میں جب لاہور تمہارے پاس آیا تھا میرے دو مقصد تھے۔ ایک یہ کہ تمہیں اپنے ساتھ دوڑنی لے آؤں۔ مجھے بھرپور یقین تھا کہ تم آ جاؤ گے اس لیے میں سارے بندوبست نہیں سے کر کے چلا تھا۔ دوسرا مقصد جو میرے باپ کو یہ احساس دلانا تھا کہ ہم بھی ہیں جواب تک اسے نہیں بھولے، کم از کم میں تو اسے نہیں بھول سکتا۔“

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے چہ کھتے ہوئے کہا۔

”بس سنتے چلے جاؤ، یارا ابھی تو کچھ بھی نہیں۔ اس ساری الف لیلیٰ میں بہت سے انکشاف ہیں، کہاں تک چوکتے رہو گے۔“ اس نے لمبا کش لیا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھا ہوا بولا۔ ”تم میرے سامنے چاہے جتنا مرضی انکار کرتے چلے جاؤ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جس طرح میں جویرہ کے باپ کو نہیں بھولا، اسی طرح وہ تمہیں بھی یاد ہوں گے اور اچھی طرح یاد ہوں گے۔ میں نے اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے دیا۔ اس کا باپ اپنی ملازمت کی آخری نچ پر ہے۔ ایک آدھ سال میں وہ ریٹائر ہو جائے گا۔ بہت ناچانز کمائی کی ہے اس نے، میں جانتا ہوں۔ میں نے چاہا تھا کہ تم یا تمہارے کسی صحافی دوست کے ذریعے اسے جگا کر کے رکھ دوں، مگر ایذا بردگی بات تھی۔ بس وہ ہمارے سامنے گلے تک کر صحافی مانگتا

لیکن۔۔۔ یہ الگ سی بات ہے کہ جو یہیہ کے ہاپ کے ساتھ کیا کرنا تھا یا کریں گے۔ میں نے ٹھیک اسی جگہ پلاٹ خریدیا ہے جہاں اس نے اپنی نیا جائز کمائی سے کوٹھی بنوائی ہے۔ وہاں ایک شاندار گھر کی شروعات بہت جلد ہوگی۔“

”تمہیں یہ سب کچھ۔۔۔ میں نے کہنا چاہا لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

”میں جب آبائی قبیلے سے واپس لاہور آیا تو میری ایک طویل ملاقات حسن سے ہوئی۔ وہ بہت اچھا بندہ ہے۔ میں نے نائیک اور زارا کے بارے میں تفصیلی طور پر جانا چاہا تھا۔ ان کے بارے میں جو معلومات ملیں سو ملیں، تمہارے حالات جان کر پریشان ہو گیا۔ اس نے بڑی تفصیل کے ساتھ مجھے تمہارے حالات بتائے جن میں تم پھنس کر رہ گئے تھے۔ بلاشبہ حسن تمہارا اچھا ہی قلمس دوست ہے۔“

”اس میں کوئی شک نہیں۔ وہ میرے ہر آڑے وقت میں کام آتا ہے، وہ نہ ہوتا تو میں اب تک پاگل ہو چکا ہوتا۔“

”نہیں، پاگل نہیں۔ تم اس زمین پر ہی نہ ہوتے، زندگی اور موت کا اختیار تو میرے سونے اللہ کے پاس ہے مگر اس وحرتی پر بھی تو کچھ ویسے ہوتے ہیں۔ میں یہاں بھی آ گیا لیکن میرا اس سے رابطہ رہا۔ اس نے مجھے فون پر بتایا کہ کسی دو دو شاہ وغیرہ کے ساتھ تمہاری ٹھن گئی ہے اور وہ قوت کے ساتھ تمہیں شتم کر دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ ملک منیر۔۔۔“

”یہ حسن نے بتایا تمہیں؟“ میں اس کی بات کا نٹے ہوئے پوچھا۔

”ہاں، اسی نے مجھے مشورہ دیا کہ میں تم سے بات کروں اور تمہیں سمجھاؤں۔ اس کا کہنا تھا کہ شجاع کو یا تو چند دنوں کے لیے پکس منظر میں چلے جانا چاہئے یا پھر دعویٰ بلا لوں، وہ ٹھیک سوچ رہا تھا۔“

”حسن کا ڈر بلا وجہ تھا، وہ دو دو شاہ کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔“ میں نے لا پرواہی سے کہا۔

”یہ تمہارا وہم ہے، پیارے! وہ بہت کچھ کر سکتا ہے۔ معاملہ مار یہ یا منیر ملک تک محدود نہیں تھا اس کی ٹینگ کا ہے، آصف چوہدری نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ دو دو شاہ اور اس کی ٹینگ کو شتم کر دے گا۔ یہ اس کی اپنی ہٹا کا بھی مسئلہ ہے۔“

”مگر۔۔۔ مگر حسن اور تم۔۔۔ آصف چوہدری کے بارے میں کیسے جانتے ہو؟“ میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

”تم نے حسن سے اپنے اور آصف چوہدری کے تعلق کو چھپایا۔ یہ حسن کی اعلیٰ طرفی تھی کہ اس نے تمہیں اس تعلق کے بارے میں بتایا نہیں ورنہ وہ بہت پہلے سے تم دونوں کے تعلق کے بارے میں جانتا تھا۔ اسے شک اس وقت ہوا تھا جب تم ڈھی ہو کر ہسپتال جا پہنچے تھے۔ تمہیں شاید یاد نہ رہا ہو لیکن تم نے اس کے سامنے کسی آصف نامی شخص کو اقدام قتل سے باز رکھنے کے لیے کہا تھا اور مار یہ کو اپنا مسئلہ گردانا تھا لیکن ہوا کیا؟ ملک منیر قتل ہو گیا اور پھر مار یہ کی خودکشی۔۔۔ حسن نے ساری کڑیاں ملائی اور پھر وہ تم دونوں کے بارے میں جان کر خاموش رہا۔ حسن کو ملک منیر ٹینگ کے بارے میں بھی پوری طرح واقفیت تھی۔ پھر اس نے تمہارا منہسی کو کریدنا تو سب کچھ واضح ہو گیا، اس نے اپنے ذرائع سے آصف چوہدری کے ساتھ

رابطہ کیا اور پھر تمہیں بتائے بغیر وہ اس کا بہت اچھا دوست بنا گیا۔ دراصل حسن کی جزیں ملک منیر ٹینگ میں زیادہ تھیں۔ ملک منیر کے بعد جب اس کا ٹینگ ابھرا تو وہ بھی تم سے انتقام لینے کے لیے تمہارے قتل کے درپے تھا۔ ان دنوں وہ پوری تیاری میں تھے کہ تم پر وار کر جائیں۔ انہیں سے دو دو شاہ

کی جھکی مل گئی تھی، اسی باعث تو دو درشاہ نے اچانک ہی جا رہا نہ قدم اٹھایا تھا۔" یہ کہہ کر اس نے کھس لیا اور سگریٹ الٹش ٹرے میں مسل دی۔

"یہ دو درشاہ کون۔۔۔"

"حسن جانتا ہے اسے۔ وہ ملک منیر کا بھری دوست ہے۔ کچھ سال پہلے بنگاک چلا گیا تھا۔"

"مگر یوں اچانک۔۔۔"

"اور، بابو! میں نے کہا تھا، کہ آصف چوہدری نے دو درشاہ کو قہقہہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے مگر حسن ہی نے اس سے کہا تھا شجاع کوری ٹپکس ہو جانے دو، پھر جو مرضی کر لیتا۔ اس نے فوری طور پر مجھ سے رابطہ کیا اور۔۔۔ اور چند دنوں میں دو درشاہ کا کام ہو جائے گا۔"

"مجھے اس نے احساس تک نہیں ہونے دیا؟" میں نے وحیرے سے کہا۔

"اس نے کسی کو بھی احساس نہیں ہونے دیا۔ میں جب تک وہاں رہا، وہ مجھے وحیرے وحیرے بتاتا رہا۔ میں اس کی محفل اور دور اندھیشی کی داد دیتا ہوں۔ اس نے بہت سوچ سمجھ کر مجھ سے بات کی تھی اور پھر میرے ساتھ رابطہ رکھا جس کا نتیجہ دیکھ لو کہ تم یہاں ہو اور پوری طرح محفوظ ہو۔"

"حیدر امیں مانتا ہوں کہ اس کے غلوں میں کوئی شک نہیں لیکن یوں وہاں سے آ جانا کیا ایک بزدلانہ عمل نہیں ہے، کیا دو درشاہ وغیرہ انہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے؟"

"یہ کوئی بزدلی نہیں ہے، پیارے! اسے حکمت کہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی تو تمہیں دھوکے سے مارنا چاہتے تھے، میں نے کہا تھا، جسے میرے سوجے رب نے زندگی دینی ہوتی ہے اس کے سوسیلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ وہاں تمہارے لیے حالات انتہائی خطرناک ہو چکے تھے۔ لیکن ان خراب ترین حالات میں بھی تمہاری بھلائی چاہنے والے بہت تھے۔"

"مثلاً؟" میں نے پوچھا۔

"زارا، اس نے ہمیشہ تمہاری بھلائی چاہی ہے۔"

"اب میں تمہیں پاگل کہوں گا۔ تم خود ہی۔۔۔"

"میں نے ہی تمہیں اس سے دور رہنے کا مشورہ دے رہا تھا اور وہ بھی تم سے بے اہانتائی برت رہی تھی لیکن میں تمہیں بتاؤں کہ وہ تمہارے لیے ظلم ہے، تمہیں اس نے تم سے فیروں والا سلوک کیا۔" یہ کہہ کر وہ چند لمبے میری طرف دیکھتا رہا، پھر خمیگی سے بولا۔ "یہ تو تم بھی جانتے ہو اور اچھی طرح سمجھتے ہو کہ یہ جو ظلم سارقم کے لوگ یا خصوصاً شوہر سے تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کا کسی نہ کسی گروپ، مافیا انڈر ورلڈ کے لوگوں سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ ان کے سہارے چلتے ہیں، وہ انہیں تحفظ دیتے ہیں اور یہ لوگ انہیں کیا کچھ دیتے ہیں، یہ بھی تم جانتے ہو۔ زارا اصل میں ملک منیر گینگ سے تعلق رکھتی تھی۔ جب تمہاری اس ظلم سارقم سے ان میں ہوئی تو اس کا فائدہ اٹھا کر زارا تمہارے قریب کر دی گئی۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ کسی بھی وقت اس کے ذریعے تمہیں گھیرا جاسکے۔ وہ بات تو انہی کی مانتی تھی مگر وقت کے ساتھ وہ تم سے متاثر ہو گئی۔ وہ تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہتی تھی لیکن ملک منیر کے قتل ہو جانے کے بعد وہ خوف زدہ ہو گئی سو اس نے اپنا منہ بند رکھا۔ اس گینگ کی گرفت ڈھیلی ہوئی تو کئی لوگوں نے پر پرزے نکال

لے۔ ایک ہارتھنگ منیر گینگ گھم گیا، پھر اس کا گینگ ابھر کر سامنے آیا۔ ان دنوں تم عذیم کے ذریعے اس کی مدد کر رہے تھے۔ حسن نے مجھے زارا کے متعلق بھی سب کچھ بتا دیا تھا۔ ان دنوں زارا دوبرے عذاب میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ تم پر اپنا آپ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتی تھی اور تمہیں بھی بچالینا چاہتی تھی کیونکہ انہی دنوں اس کا گینگ انتقام کے چکر میں زارا پر دھاؤ ڈال رہا تھا کہ وہ تمہیں گھیرے اور پھر کسی دیرانے میں تمہاری لاش گرا دی جائے۔ میں زارا کو کریدنا چاہتا تھا۔ مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی اور اس نے مجھے صاف لفظوں میں ساری صورت حال بتا دی۔ میرا اس کے ساتھ تعلق محض ایک ڈرامہ تھا تا کہ تم اس سے بچکر ہو جاؤ اور وہ تم ہو گئے۔ میں نے یہاں آ کر زارا سے رابطہ رکھا۔ وہ مجھے حالات سے باخبر رکھے ہوئے تھی۔ حسن اور زارا کی اطلاعات نے میرا دماغ ماؤف کر کے رکھ دیا اور پھر میں نے حسن سے کہا کہ وہ فوری طور پر تمہیں وہاں سے نکال دے، کچھ انتقامات تو مکمل تھے اور پھر تم یہاں آ گئے۔“

”حسن کتنا گہرا ہے۔“ بے ساختہ میرے منہ سے نکل گیا۔

”وہ آصف چوہدری کو اس پر آمادہ کرنے کی کوشش کرے گا کہ وہ دو شاہ کو قتل نہ کرے بلکہ ویسے ہی چھوڑ دے، اس طرح معاملہ مختفا پڑ جائے گا۔“

”مگر وہ چھوڑے گا نہیں، میں اس کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”ہاں، یہ آپشن بھی اس کے ذہن میں ہے۔ ایسی صورت میں اس کے پاس بندوبست ہے، کیا ہے؟ میں نہیں جانتا مگر ایک بات سے مجھے بہت خوشی ہوئی، شجاع!“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”تم نے اس رات جتنے بھی دوست ملوائے، سبھی تمہارے ساتھ قلعہ ہیں۔ تمہیں بھی پتہ ہے اور میں بھی جانتا ہوں کہ معاشی لحاظ سے تمہاری پوزیشن کیا ہے۔ تمہارے والدین کا کاروبار۔۔۔ وہ اپنی جگہ میں اس کی بات نہیں کرتا۔ تم نے لاہور میں رہ کر کیا کیا اور کیا خرچ کیا۔ تم سوچو کہ جس قدر گھمبیر حالات سے تمہارا واسطہ پڑا ہے، کیا تم اکیلے ان سے نکل سکتے تھے؟“

”نہیں، حیدر! بالکل نہیں۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”عامر نے تمہارے لیے بہت خرچ کیا۔ نائلہ نے بنا کچھ کہے ساری جمع پونجی تم پر لٹا دی۔ وہ مسز خان والا گھر جسے تم کرایہ پر بکھر رہے تھے، نائلہ کی ملکیت ہے اور مسز خان وغیرہ اس کے کرایہ دار ہیں مگر اس نے تمہیں احساس نہیں ہونے دیا محض اس لیے کہ کہیں انا وغیرہ کے چکر میں تم وہاں رہنے سے انکار نہ کرو اور یہ بندیم اس کے یہاں آنے کا سارا خرچ نائلہ نے دیا۔ میں نے اسے بہت متح کیا کہ میں کر رہا ہوں مگر اس نے زبردستی دیا۔ اس سے بڑھ کر اس نے ایک لمبی رقم دی تاکہ بندیم اپنے والدین کو دے جائے اور وہ اس رقم سے اس کی چھوٹی بہن کی شادی کر دیں۔ یہ سب لوگوں کی جھتیں کس وجہ سے تمہیں، میرے خیال میں کچھ عرصہ پہلے تک تم ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں ہو گے؟“

”بس کرو، حیدر! میرا دماغ چھٹ جائے گا؟“

”حوصلہ کرو، میرے دوست اور سنو کہ میں نے یہ سب تمہیں کیوں یاد کرایا ہے۔ وہ اس لیے کہ خلوص اور محبت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں لیکن مجھے یہ بتاؤ ضرورت پڑنے پر تم کسی کی کیا مدد کر سکتے ہو؟ اب یہ مت کہنا کہ جان دے دو گے۔ یہ انتہائی گھٹیا اور تھرڈ کلاس ڈائیناگ ہے، زندگی کی حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، یار۔! میں نے دھیرے سے کہا۔

”شجاع! تم یہاں رہو گے تو ہو سکتا ہے، میرے بہت سارے کاموں پر تمہیں اعتراض ہو لیکن جان لو کہ دولت ایک بہت بڑی حقیقت ہے۔ میرا یہ سب کچھ بتانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ تم یہاں رہ کر بھلے کوئی کام نہ کرو، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ جب واپس جانا چاہو، جا سکتے ہو اور مجھے پھر بھی کوئی گلہ نہیں ہوگا۔ تمام حالات تمہارے سامنے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تم یہاں رہ کر ڈیجیٹل ساری دولت کماؤ اپنے لیے، ان دوستوں کے لیے جو قدم قدم تمہاری مدد کرتے رہے اور وقت آنے پر تم ان کی بھی مدد کر سکو۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں بعد اس نے ٹیکٹ کے ایک سگرٹ، میری طرف بڑھا کر دوسری خود سلگالی۔ میں اس سے بہت کچھ کہتا چاہ رہا تھا مگر لفظ میرے ہونٹوں پر آ کر دم توڑتے رہے اور میں خاموش رہا۔ ہمارے درمیان یہ خاموشی اس قدر بڑھی کہ ہم دونوں ہی کے سگریٹ ختم ہو گئے۔ اس نے سگریٹ ایش ٹرے میں مسلا اور اٹھ گیا، پھر سلپر پہننے ہوئے گیا۔

”تم سو جاؤ، باقی باتیں پھر ہوں گی“ یہ کہہ کر وہ نکل گیا مگر اس کی کبھی ہوئی باتوں کی بازگشت تھی ہی ورنہ میرے ارد گرد کچھ بھی نہ رہتا۔ مجھے یہ یقین تھا کہ سب کے بہت کام آ رہا لیکن وہ سب میرے لئے اتنا کچھ کرتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ دباؤ کے باعث میرے سر میں پھر سے درد ہونا شروع ہو گیا ہے۔ میں نے ساری سوچیں ذہن سے جھٹک دیں اور سکون سے آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا، پھر بچانے کب میں نیند کی بانہوں میں جا کر۔

پہلی رات کا وہ کون سا پہرہ تھا ایک عجیب اور ناگوار آنے والے خواب کے باعث میں بیدار ہو گیا۔ اس خواب کا تاثر کیا تھا؟ میں اس کا تعین ہی نہ کر سکا۔ نہ کوئی خوف، نہ ڈر، نہ خوشی اور نہ ناہوشی، بس ایک خلا تھا جس میں سناٹا بول رہا تھا۔ ایک انجانی گرفت تھی جس نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ وہ خواب میرے ذہن پر اس قدر سوار ہوا تھا کہ میں نے گھڑی کی طرف بھی نہیں دیکھا۔ بس یونہی کمرے میں پھیلی نینگوں روشنی میں آنکھیں کھولے، خواب کی جزئیات کو پھر سے ذہن میں دہرانے کی کوشش کرتا رہا۔ میرے خیال میں وہ سرور یا خواب تھا۔ میں ایک کھلی سڑک پر تھاپیدل چلتا جا رہا تھا۔ میرے ارد گرد اندھیرا تھا لیکن میرے ساتھ ساتھ روشنی چل رہی تھی۔ اس روشنی سے نہایا ہوا تھا اور اس روشنی کے باعث محض چند فٹ تک ہی دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سپید می سڑک اندھیرے میں گم ہو گئی تھی اور سڑک کنارے لگے قطار میں کھڑے درخت سوکھے ہوئے تھے، ایک بھی ایسا درخت نہیں تھا جس پر ذرا سا بھی سبزہ ہو۔ میرے ساتھ چلنے والی روشنی محدود تھی جس میں ایک بے تاثر منظر میرے ساتھ چلتا چلا جا رہا تھا اور کوئی انجانی قوت مجھے آگے ہی آگے چلنے جانے پر مجبور کر رہی تھی۔ سیاہ تار کول کی سڑک اور سوکھے درختوں کی قطاریں اور محدود روشنی! میں چلتا چلا جا رہا تھا اور اس اندھیرے دیرانے میں ہر طرف سناٹا تھا۔ پھر پتہ نہیں کتنا وقت اسی طرح پیدل چلتے ہوئے گزر گیا کہ اچانک میرے پاؤں تلے سے وہ سڑک غائب

ہوگئی اور میں ہوا میں تیرنے لگا۔ میرا جسم بے وزن ہو چکا تھا۔ میں اوپر ہی اوپر اٹھنے لگا۔ وہ محدود سی روشنی وہیں پڑی ہو گئی۔ کتنی دیر تک یونہی بے کیف سناٹا رہا۔ وہ محدود روشنی پڑے پڑے پھیلنے لگی اور مزک کنارے سوکھے درختوں پر چڑھنے لگی۔ اسی روشنی سے وہ درخت چپکنے لگے اور بھران میں آگ بھڑک اٹھی۔ مجھے لگا جیسے ان درختوں سے اٹھنے والے دھوئیں سے میری آنکھیں جلنے لگی ہیں۔ یہ دھمن دھیرے دھیرے بدھتی چلی گئی، یہاں تک کہ میں آنکھیں بند کرنے پر مجبور ہو گیا۔ میں اپنے بے وزن جسم کے ساتھ کتنی دیر تک خلاؤں میں تیرتا رہا، اس کا مجھے اندازہ نہ ہو سکا اور پھر اچانک میں زمین کی طرف لوٹنے لگا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ اب نہ آگ تھی اور نہ دھواں، بس اندھیرا تھا جو نوز میرے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔ میرے پاؤں زمین پر تھے تو نیچے ریت تھی، بھر بھری ریت۔ مجھے یوں لگا جیسے میں تھک چکا ہوں۔ میں وہیں ریت پر ڈھیر ہو جانا چاہتا تھا لیکن وہی انجانی قوت مجھے سفر پر آمادہ کر رہی تھی۔ میں آگے ہی آگے بڑھتا چلا جا رہا تھا۔ ایک طویل سفر کے بعد میرے سامنے اتنی پر روشنی نظر آنے لگی۔ وہ سرخی مائل ہونے کی بجائے دودھیاتی جیسے چاند نکل آنا چاہتا ہو۔ وہ چاند نہیں، روشنی کی ایک لکیر تھی جو انتہائی سرعت سے میری جانب بڑھنے لگی۔ جس سے ہر طرف جگمگاہٹ ہو گئی۔ پورا ماحول روشن ہو گیا۔ وہ روشنی کی تیز لکیر میرے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی اور پھر اس لکیر نے میرے پورے بدن کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ میں اس روشنی کی ضد تک کے باعث ایک مردور انگیز کیفیت میں اترا نا چلا گیا، اک سکون تھا جو میرے چاروں طرف پھیل گیا۔ بجائے کتنا وقت یونہی گزر گیا۔ پھر وہ روشنی میرے بدن سے اترا کر اندھروں میں قاب ہو گئی۔ اس روشنی کے جدا ہوتے ہی میرے بدن میں تپش کا احساس ابھرنے لگا۔ جو کچھ بڑھتا چلا گیا۔ مجھے گھبراہٹ ہونے لگی اور میں پھر ایک انجانے سفر پر نکل گیا۔ ایک طویل سفر تھا جس کی کوئی منزل نہیں تھی۔ پھر صبح کے آثار پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ ہر طرف سنہری دھوپ پھیلنے لگی، تنہی میری نظر ایک ٹھنڈا پن پر پڑی۔ سنہری ریت پر ایسا تادہ بڑھ رہی ہے۔ کچھ اور پام کے درخت، گھاس بھری زمین اور چمکتا ہوا پانی کا تالاب۔ میں وہاں جا پہنچا۔ اک پرسکون کیفیت میرے اندر اتر گئی۔ میں ایک درخت کے سہارے بیٹھ کر اس ماحول کو اپنے اندر اتارنا چاہتا تھا کہ وہی دودھیاتی روشنی کی لکیر وہاں تالاب کنارے پڑی ہوئی نظر آئی۔ میں چونک گیا، روشنی کی وہ لکیر ڈھٹی تھی اور اس میں سے خون رس رس کر پانی سے بھرے تالاب میں گر رہا تھا۔ جس سے وہ تالاب آلودہ ہو رہا تھا۔ کرب کی شدت میرے ماتمدرائیت کر گئی اور میرا وجود ٹوٹنے لگا، تنہی میری آنکھ کھل گئی۔

اس خواب کے باعث ایک عجیب طرح کی بے چینی میرے اندر تیرنے لگی تھی۔ میں کتنی دیر تک خالی الذہن سا اسی کیفیت میں ڈوبا رہا۔ بے وزن سا جیسے کوئی ہوش ہی نہ ہو۔ دھیرے دھیرے میں اپنے حواس میں آنا چلا گیا۔ میں اٹھا اور کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ ابھی ٹلگیا اندھیرا تھا۔ میرا اینڈ پر لپٹنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا اس لیے میں کمرے سے نکل کر بیچے آ گیا۔ یہاں بھی سناٹا تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوچا تو کچن میں چلا گیا، فریج سے پانی نکال کر پیا اور پھر جائے بنانے لگا۔ ذرا سی توجہ ہی تو میں خواب کے تاثر سے نکل آیا اور میرے دماغ میں حیدر شیخ کی باتیں گونجنے لگیں۔ چائے بنانے کے ساتھ میں وہی کچھ سوچتا رہا۔ میں لاشعوری طور پر اس سے متعلق تھا مگر پوچھ نہیں کیوں، ایک جھجک تھی جو میرے یقین کے آڈے آرہی تھی۔ پوچھ نہیں، حیدر شیخ کے وہ کون سے ایسے کام تھے جو مجھے پسند نہیں آ سکتے تھے؟ میں چائے بنا کر صلیبک روم میں آ بیٹھا۔

حیدر شیخ میرے بچپن کا ساتھی تھا۔ ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے، ساتھ کھیلے اور سکول میں بھی ایک ساتھ رہے۔ وہ بچپن میں بہت دو جسم کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

لڑکا تھا اور میں قدرے شرارتی تھا۔ وہ دو دو جوہ کی بنا پر میرے ساتھ دوستی رکھنے پر مجبور تھا۔ ایک میری مالی حالت تھی، میرے پاس خرچ کرنے کے لیے کافی پیسے ہوتے تھے اور دوسرا کبھی لڑائی جھگڑے کی لوبت آجاتی تو میں ہی اس کا سہارا ہوتا۔ ہمارا شمار اس قبیلے کے چند کاروباری گھرانوں میں ہوتا تھا جبکہ حیدر کے والد ایک نئی ادارے میں ملازم تھے جس سے بس ان کا گزارہ چل رہا تھا۔ وہ ایسے دن تھے جب کسی طرح کوئی بھی معاشی تفاوت ہمارے درمیان محسوس نہیں ہوتا تھا، بس دوستی تھی اور چل رہی تھی اور وہ دن بھی بڑے سنہری تھے۔ یوں ہم کالج تک آپہنچے۔ ہمارے قبیلے میں صرف انٹرنٹک کالج تھا۔ زندگی کا یہ وہ سنہرہ دور ہوتا ہے جب اُمّیں گھر کرنا ان کو اپنا گرویدہ کر لیتی ہیں اور خواہشیں مکمل مکمل جاتی ہیں۔ میں قبیلے کے ان چند خورونو جوانوں میں سے ایک تھا جن کے ہارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ لڑکیاں ان میں دلچسپی رکھتی ہیں اور ایسا تھا بھی۔ ان دنوں ہمارے قبیلے میں خاصی تعداد میں فون لگ چکے تھے جن میں ستمول اور خوشحال گھرانوں کے علاوہ درمیانے درجے کے لوگ بھی شامل تھے۔ دوپرو ملاقاتوں کے علاوہ فون ہی ایسا رابطہ تھا جس کے ذریعے مجھے نہ صرف میری خورونو کا احساس دلایا جاتا کہ میں لڑکیوں کے درمیان کس قدر اور کس طرح زیر بحث رہتا ہوں۔ کن انھیوں سے دیکھنا، میرے چہرے پر نظر پڑتے ہی چونک جانا، اشارے کنایے، ہنسی مذاق یہ سب فون کے ذریعے مجھے باور کرایا گیا۔ میری کئی لڑکیوں کے ساتھ نیلی فونک دوستی شروع ہو گئی اور میں انہیں بھرپور وقت دیا کرتا تھا کالج میں آجانے سے زندگی یکسر بدل کر رہ گئی، ان دنوں میں تھا اور حیدر شیخ اور ہم دونوں کی دوستی مثالی تھی، ان دنوں کسی بھی لڑکے کے پاس بائیک "اسٹینس سبل" سمجھا جاتا تھا اور میرے پاس بائیک بھی تھی۔ وہ دن بڑے خوبصورت اور تین بڑی سہانی تھیں۔ انہی دنوں جو یہ مجھ سے آن گمراہی تھی، ہم کالج کے دوسرے سال میں تھے۔

دو فروری کے ابتدائی دن تھے۔ حیدر کو بازار سے کچھ کپڑے خریدنا تھے۔ ہم دونوں ہی شام کے وقت پیدل ہی بازار نکل گئے۔ وہ ٹھک سا بازار تھا اور اس میں قدرے رش رہتا تھا۔ ہم اپنے دوست کی دوکان میں چلے گئے، کپڑے خریدتے اور ہاتھیں کرتے کافی وقت گزار گیا۔ اس وقت ہم اٹھنا چاہ رہے تھے کہ ایک لڑکی دوکان میں داخل ہوئی تو میں اسے دیکھ کر چونک گیا۔ لمبے قد کی گوری چٹھی لڑکی جس کی رنگت میں سینہ درکھلا ہوا تھا، جدید تراش کے پیش قیمت لباس میں وہ گھمری گھمری، دکھائی دے رہی تھی۔ شانوں تک کئے ہال، گلے میں مٹلر کی طرح دو پشڈالے بڑے احماد سے وہ دوکان میں آئی تھی۔ وہ اس قبیلے میں پہلی بار دکھائی دی تھی۔ پھر وہی ہوا۔ اس کی نگاہیں بھی میرے چہرے پر ایک لمحہ کو ٹکیں وہ بھی چونک گئی اور میں دھیرے سے مسکرا دیا۔ میں نے اس کے چہرے پر سے نگاہیں ہٹائیں اور اٹھ گیا۔ میرا اور اس لڑکی کا آمنا سامنا محض چند لمحوں کے لیے ہوا تھا۔ وہ میرے قریب سے گزری تو مجھے پر غم کی مہک نے خوشگوار تاثر دیا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں پیچھے مڑ کر دیکھوں لیکن یہ میری عادت نہیں تھی۔ میں نے من رکھا تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے والے پتھر کے ہو جایا کرتے ہیں اور میں پتھر ہونا انورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ میں دوکان سے باہر آ گیا۔

"یہ کیا چیز تھی، یار۔!" حیدر نے سرسراتے ہوئے کہا۔

"جو بھی تھی تمہارے سامنے تھی۔" مجھے اپنی آواز اجنبی سی لگی۔

"پہلی بار دیکھا ہے۔" وہ بولا۔

"ہوں۔" میں نے ہنکارہ بھرا۔

”دوسری بار دیکھنے کی حسرت ہے۔“ وہ پھر بولا۔ میں خاموش رہا تو اس نے اسی انداز میں کہا۔ ”کون ہو سکتی ہے؟“ حیدر نے یونہی کہہ دیا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ میں خاموش رہا اور پھر کتنی دیر تک اس جادو اثر حسن کے زیر اثر سرور انگیز کیفیت میں ڈوبا رہا۔ وہ چند لمحے میری پوری رات پر غالب آگئے۔ اس پر ہی چہرہ کا سراپا میری نگاہوں سے ہٹا ہی نہیں تھا۔ ایک عجیب طرح کی بے چینی اور بے نام سادکہ میرے میرے وجود کو گھیرے میں لے چکا تھا۔ جیسے کوئی کنکٹیں متح کرنے کا شوقین کوئی اچھی سی کنکٹ دیکھ لے اور وہ اسے اپنی دسترس میں نہ لے سکے تو ایک اجنبی سادکہ ہوتا ہے۔ ایسی ہی کیفیت میری تھی۔ تین چار دن میں ایسی ہی الجھن میں رہا۔ میرے اندر یہ خواہش شدید سے شدید تر ہوتی چلی جا رہی تھی کس سے تلاش کروں اور پھر میں نے اپنی تمام تر کیفیات حیدر سے کہہ دیں۔ وہ میری بات سن کر چند لمحے خاموش رہا پھر بولا۔

”یارہ شجاع اسے تلاش کرنا کوئی اتنا مشکل نہیں ہے، جھوٹا ساقبہ ہے لیکن۔۔۔“

”لیکن کیا؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”حقیقی بات یہ ہے کہ وہ یہاں کی نہیں۔“ وہ پورے یقین سے بولا۔

”ہاں، یہ تو مجھے بھی یقین ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”اگر وہ کسی کے ہاں مہمان آئی تھی تو اب تک وہ چلی گئی ہوگی یا پھر جانے والی ہوگی۔ ایسے میں اسے تلاش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اگر وہ یہاں لمبے عرصے کے لیے آئی ہے تو ہمارا اس سے دوبارہ آنا سامنا ہو جانا بھی ممکن ہے۔“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”میں کہتا یہ چاہتا ہوں کہ ہمیں جمل خراب ہونے کی ضرورت نہیں۔ دوبارہ سامنے آگئی تو تم نہیں ہونے دیں گے، یوں اس سے متعلق سوچتے رہنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو، یار۔!“ میں نے جو کہتے ہوئے کہا۔

”آخر ہم بھی تو کوئی معمولی شخص نہیں، ہماری بھی پریشانی کا مسئلہ ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ توجہ لگا کر نہیں دیا۔ حیدر نے اگرچہ یونہی مذاق کیا تھا مگر بات میری سمجھ میں آئی اور میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا۔ پھر کئی دن گزر گئے اور وہ میرے ذہن سے اتر گئی۔

وہ ہنسکی ہوئی رات تھی۔ ہارٹ سرشام ہوئی تھی، تیز ہوا کو بھی قرار آ گیا تھا۔ رات گہری ہو چکی تھی اور میں پوری محویت سے ایک ناول پڑھنے میں مگن تھا۔ اچانک رات کے سنانے میں فون کی تیز آواز نے مجھے بوکھلا کر رکھ دیا۔ میرے سر ہانے پڑے فون کی دوسری تیل اگرچہ مجھے کراخت لگی لیکن مجھے پورا یقین تھا کہ اس وقت آنے والا فون یقیناً کسی لڑکی کا ہوگا، کس کا؟ یہ میں نہیں کہہ سکتا تھا۔ ایسا فون کسی بھی ٹیلی فونک دوست کا ہو سکتا تھا۔ میں نے رسیور اٹھایا اور پورے دھیان سے اپنے مخصوص انداز میں ”ہیلو“ کہا۔ دوسری جانب چند لمحے خاموشی رہی، پھر قدرے سرسراتی آواز میں لڑکی نے پوچھا۔

”آپ شجاع ہو؟“ یقیناً یہ میرے لیے اجنبی آواز تھی۔

”جی، میں شجاع ہی بات کر رہا ہوں، آپ کون؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں آپ کے بارے میں پوری انفارمیشن لے چکی ہوں۔“ اس نے طرح دیتے ہوئے نخرے سے کہا۔ ایسی لڑکیاں مجھے ہرگز کرتی تھیں اس لیے ہاوجود کوشش کے میں اپنے لہجے میں سے جتنی کونہ چھپا سکا۔

”مجھے نہیں پتہ، آپ کون جاسوس ہیں لیکن کیا آپ بتائیں گی کہ اس وقت فون کیوں کیا، کوئی انفارمیشن باقی رہتی تھی کیا؟“

”آپ تو برامان گئے، میں ابھی یہ تو نہیں بتا پاؤں گی کہ میں کون ہوں مگر فون کیوں کیا، اس بارے میں صرف یہی کہہ سکتی ہوں کہ ہاتھ کرنے کے لیے۔“

”مثلاً کیسی باتیں؟“

”کوئی سی بھی۔۔۔“ اس نے لاپرواہی کے سے انداز میں کہا، پھر اگلے ہی لمحے یوں۔۔۔ ”کیا آپ اپنے بارے میں کچھ بتانا پسند کریں گے؟“

”ابھی ایک لمحہ پہلے آپ کہہ چکی ہیں کہ میرے بارے میں آپ سب کچھ جانتے اور۔۔۔“

”وہ اس لیے جناب، کہ میں تصدیق کر سکوں کہ مجھے جو کچھ بتایا گیا ہے، وہ درست بھی ہے یا نہیں؟“

”مگر آپ کو ایسی کیا افتاد آن پڑی کہ میرے بارے میں انفارمیشن لیتی پھریں؟“

”بس دل چاہا، آپ کو دیکھ کر لگا تھا کہ یہاں صرف آپ سے دوستی کی جا سکتی ہے۔“ اس نے کہا تو میرے ذہن میں جھماکا ہوا اور وہی لڑکی ذہن میں ابھر آئی۔ تبھی میں پوری توجہ سے اس کی باتیں سننے لگا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹہ کی طویل گفتگو کے بعد میں اس سے یہ اگلا نئے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ وہی لڑکی ہے جس سے چند لمحوں کا آمناسا منا ہوا تھا۔ اس کا نام جویریہ کھلی تھا۔ اس کا باپ ہمارے قصبے میں ایک اعلیٰ انتظامی عہدے پر فائز تھا۔ وہ حال ہی میں یہاں شفٹ ہوئے تھے۔ اگرچہ ان کا تعلق اداکارہ کے نواحی علاقہ سے تھا لیکن شہر شہر جا دلے کے باعث کہیں مستقل سیٹ نہیں ہو پائے تھے۔ اپنے نواحی علاقے میں ان کی اچھی خاصی زمینیں تھیں۔ جویریہ نے جب مجھے دیکھا تھا، جب سے مجھے تلاش کرنے کی خواہش دل میں رکھ لی تھی۔ چند دن قبل اس کی امید پوری ہو گئی۔ ہمارے ہی محلے کی لڑکی اس کی ہم جماعت تھی۔ یونہی باتوں ہی باتوں میں میرا حلیہ زیر بحث آیا اور پھر اسے مجھ تک پہنچنے میں دشواری پیش نہیں آئی۔ اس نے جی بھر کے میرے ساتھ باتیں کی تھیں۔ وہ مجھے قدرے مختلف لگی۔ وہ لاہور کے ایک معروف کالج میں پڑھتی تھی اور وہاں سے چھوڑ کر یہاں آئی تھی۔ اس کی باتیں، لہجہ اور انداز بہت مختلف تھا۔ اس میں دیوبند نہیں تھا۔ وہ تیز طرار تھی، اشارے میں کہی گئی بات کو فوراً سمجھتی تھی۔ پھر اسے بات کرنے کا سلیقہ بھی آتا تھا۔

یوں بات بڑھتے بڑھتے گزرتے رہے۔ دنیا جہان کے موضوعات زیر بحث ہوتے۔ جو تھوڑا بہت تلفظ یا ججگ تھی، نجانے کب کی قسم ہو چکی تھی۔ یہ سلسلہ دراز رہا، یہاں تک کہ ہمارے امتحان آ گئے۔ ہماری باتیں تو ختم نہیں ہوئیں مگر دورانہ یہ کم ہو گیا۔ امتحانوں کے بعد فراغت ملی تو

جویریہ کی یہ خواہش بڑھنے لگی کہ ہم کہیں نہیں۔ یہ میرے لیے سب سے مشکل ترین مرحلہ تھا۔ فون تک بات ٹھیک تھی کیونکہ ہمیشہ اس نے فون کیا تھا اور اسے فون کرنے کا موقع اس لیے ملتا تھا کہ اس کا ہاپ چیتا تھا۔ رات کے ایک مخصوص وقت وہ پنی کر "ٹن" ہو جاتا اور سونے کی کوشش کرتا۔ وہ ہر طرح سے مطمئن ہو کر فون کرتی۔ میرے لیے جویریہ سے ملنا مشکل اس لیے تھا کہ قصبے میں ہر تیسرا فرد ایک دوسرے کو جانتا تھا۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم کہیں ملیں اور دوسروں کی نظروں میں نہ آئیں۔ بڑے شہروں کی نسبت ہمارے ہاں ایسی کوئی "سہولت" دستیاب نہیں تھی کہ ہم کہیں مل سکیں اور پھر سب سے بڑی بات کہ میرا حوصلہ نہیں پڑ رہا تھا کہ یوں چوری چھپے جویریہ سے ملوں۔ مجھے خود سے زیادہ اپنے خاندان کی عزت عزیز تھی۔ اس وقت یہ مل میرے ہلے صراط سے گزارنے والی بات تھی سو میں نال گیا جبکہ اس کا اصرار بڑھتا چلا گیا۔ حیدر شاہ میرے اور جویریہ کے درمیان ہر پل کی خبر رکھتا تھا۔ اس نے بھی مجھے یہی مشورہ دیا کہ اس لڑکی سے جان چھڑا لو، یہ بدنامی کا باعث بن سکتی ہے۔ پھر ایک واقعہ نے مجھے سمجھ گئی سے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ جویریہ نے فون کر کے ایک دوکان کا نام بتا کر فوراً کھینچے کو کہا۔ میں نے اس سے وجہ پوچھی مگر وہ نال گئی۔ میں اور حیدر رو دیئے گئے وقت سے تھوڑی دیر بعد پہنچے۔ اس وقت وہ بازار سے نکل کر کھڑی گاڑی میں بیٹھ رہی تھی۔ ہماری نگاہیں ملیں اور وہ چلی گئی، وہ ایسی پر ہمارے ایک شہساز شاہنگ سنٹر والے نے آواز دے کر کہا۔

"او، بیروا ذرا بات تو سن۔"

"کیا بات ہے؟" میں اس کے پاس چلا گیا اور پوچھا۔

"یہ تمہارے لیے ایک تحفہ ہے، اچھا ہوا تم ادھر ہی مل گئے ورنہ یہ میں تمہارے گھر بھجوانے والا تھا۔"

"میرے لیے تحفہ؟" میں نے حیرانگی سے پوچھا۔

"اب اتنے بھی بھولے مت ہو، ابھی کچھ منٹ پہلے یہاں ایک لڑکی چھوڑ گئی ہے اور ایسے وقت میں تمہارا بازار میں ہونا بھی کچھ میں آ رہا ہے۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے یوں کہنے پر مجھے شرمندگی ہوئی اس لیے میں نے غلطی انجان بننے ہوئے کہا۔

"تمہیں کوئی غلطی ہوئی ہوگی۔"

"نہیں، یار! اس نے مجھے تمہارا نام پتہ سمجھایا ہے تمہارا فون نمبر دیا ہے۔ وہ ہماری بہت اچھی کسٹمر ہے اس لیے۔"

"جو بھی ہے، وہ بہر حال میں نہیں ہوں، آئندہ محتاط رہنا۔" میں نے کہا اور وہاں سے آ گیا۔ وہ ایسی پر حیدر خاموش تھا۔ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے؟ اسی رات میں نے اس واقعہ کا بھاننا یا اور جویریہ کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ مجھے فون نہ کیا کرے۔ کئی دن گزر گئے مگر وہ فون کرنے سے باز نہیں آئی۔ میں اسے سمجھاتا کہ جو کچھ وہ چاہ رہی ہے، ایسا ہونا ممکن نہیں۔ میں اسے پیار سے سمجھاتا چاہ رہا تھا مگر پتہ نہیں، اس کے دماغ میں کیا سائی ہوئی تھی کہ میری بات مانتی ہی نہ تھی۔ پھر میں نے اس کا فون منٹا ہی بند کر دیا۔

انہی دنوں کی ایک شام خوشگوار تھی۔ میں اور حیدر شاہ کمر سے نکلے اور یونی گھومتے ہوئے اس چوک میں جا پہنچے، جہاں ہمارا مخصوص ٹھکانہ ہوا کرتا تھا۔ دوست احباب وہاں آ جا جاتے اور خوب گپ شپ لگتی۔ میں وہاں بیٹھے ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ پولیس وین ہانگل ہمارے پاس

آ کر کی۔ اس میں سے انسپکٹر سمیت چند سپاہی تیزی سے نکلے اور سیدھے ہماری طرف آئے۔ اس سے پہلے کہ ہم کچھ سمجھتے، انسپکٹر نے آتے ہی ایک زنانے کا تھپڑ میرے منہ پر جڑ دیا۔ ایسا ہی حال حیدر شاہ کے ساتھ ہوا، دو سپاہی اس پر پلٹا پڑے تھے۔ اس کے ساتھ ان کے منہ سے غلیظ گالیوں کا طوفان نکل رہا تھا۔ دو چار منٹ ہماری دھمکانی کے بعد ہمیں پکڑا اور گاڑی میں ڈال کر تھانے لے گئے۔ پھر میں انسپکٹر کے کمرے میں ہی لاپوشیا گیا۔ مجھے ہلکا سا شک تھا کہ یہ ساری کارروائی کیوں ہو رہی ہے لیکن یقین نہیں تھا۔ میں نے کوئی جرم نہیں کیا تھا۔ اس لیے میں نے پوچھا۔

”ہمیں ایسے کیوں لایا گیا ہے؟“ میرے یوں پوچھنے پر انسپکٹر نے گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ چند لمحوں بعد یہ طوفان تھا تو اس نے انتہائی نخوت سے کہا۔

”چوریوں کرتے ہو اور پھر پوچھتے ہو کہ کیوں لایا گیا ہے؟“ یہ سنتے ہی میرے دماغ کا لیوڈ اڈ گیا، ہم نے کوئی چوری نہیں کی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ محض اس الزام کا سہارا لے کر مجھے ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی جائے گی۔ ہو سکتا ہے کہ یہی جھوٹا الزام کسی مقدمے کی صورت اختیار کر لے اور پھر ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں۔ مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ ہمیں جیل ہو جائے گی، خوف صرف یہ تھا کہ میرے والدین کا اعتماد مجھ پر سے اٹھ جائے گا۔ وہ سزا گناہ کے کسی کے ساتھ بات نہیں کر سکیں گے اور میری وجہ سے انہیں دکھ ہوگا۔ میں نے یہ سب لمحوں میں سوچا تھا۔ جس کا رد عمل یہ ہوا کہ معاملہ میری برداشت سے باہر ہو گیا۔ مجھے یکدم ہی غصہ آ گیا، ہم پھر بھی میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”انسپکٹر! میں نے کوئی چوری نہیں کی مگر میں سمجھ گیا ہوں کہ تم مجھے یہاں کیوں لائے ہو۔ تم چاہے جتنے مرضی مقدمات بنا لو مگر اب مجھے گالی نہیں دو گے یا پھر مجھ پر ہاتھ اٹھایا تو اس کے ذمہ دار تم خود ہو گے۔“

”اوائے، ہنڈی! تم بولتے بھی ہو۔“ انسپکٹر نے حیرت سے میری طرف دیکھتے ہوئے انتہائی طنز یہ انداز میں کیا۔

”ہاں..... میں بولتا ہی نہیں، کچھ کر بھی سکتا ہوں۔ آزاد ہوں۔“

”تمہاری بولتی ابھی بند کرنا ہوں، پہلے مجھے ڈرا ایک فون کر لینے دو۔“ یہ کہہ کر اس نے فون سیٹ پر نمبر گھمائے۔ میں نے غور سے دیکھا، وہ جو میرے باپ ہی کے نمبر تھے اس نے ہم سے انداز میں مجھے پکڑ کر لے آنے کی بات کی اور مزید ہدایات کے لیے کچھ دیر دوسری طرف سے سنتا رہا۔ چند منٹ بعد اس نے ریسیور رکھ دیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہاں، تو کیا بکواس کر رہے تھے تم۔۔۔۔“ اس نے انتہائی غلیظ گالی دی۔ جس پر میں ہنسا گیا۔ میں نے اس سے بھی غلیظ گالی بک دی۔ انسپکٹری آنکھوں میں یکدم ہی حیرت اتر آئی تو میں نے کہا۔

”تم چوری کی بجائے قتل کا پرچہ کات دو۔ میں تو مجرم بن ہی جاؤں گا مگر یاد رکھنا، میری ابتدا اتنی ہی سے ہوگی۔“

”بہت اونچے سروں میں جھونکتا ہے تو۔“

”میں نہیں تم۔۔۔ تم بھونکتے ہو کسی کے گلوا ڈالنے پر۔ اس بھڑوے سے کہو، سامنے آ کر بات کرے۔ اسے کہو۔ اپنے داماد کے ساتھ اس

طرح سلوک نہیں کرتے“ میری بات سن کر وہ ہنسنے سے اکڑ گیا۔ اس نے اٹھ کر میرے تھپڑ مارنا چاہا تو میں گالیاں دیتا ہوا پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے میرے ساتھ گئی تھیل بجاتی تو فوراً ہی ایک سپاہی نمودار ہوا۔

”لے جاؤ اسے اور اچھی خاصی دھلائی کرو۔“

اس سپاہی نے آؤدیکھا نہ تاؤ، سیدھی شوکر میری پسیوں میں دے ماری۔ میں درد سے دوہرا ہوا گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا ہوا ڈنڈا میرے کندھے پر مارا تو مجھے اپنا دماغ ماؤف ہوتا ہوا محسوس ہوا پھر بھی میں نے اسی ہاتھ سے ایک تھپڑ اس سپاہی کے جلا دیا۔ گالیوں کا شور دونوں طرف سے بڑھتا گیا۔ سبھی ہمارے درمیان دھبکا مشق شروع ہو گئی۔ کمرے میں شور سن کر دو تین سپاہی اور آگئے۔ وہ مجھے کھینچتے ہوئے کمرے سے باہر لے گئے۔ برآمدے میں میرے ساتھ حیدر شیخ بھی پٹنارہا۔ انہوں نے ہمیں مار مار کر ادھ ماکر دیا۔ پھر شاید میں بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب مجھے دوبارہ ہوش آیا تو میں برآمدے میں تھا اور میرے اوپر کافی سارے لوگ جھکے ہوئے تھے۔ جن میں میرے ابو کا شفیق چہرہ بھی تھا۔ میرے ہوش میں آتے ہی حیدر شیخ کے والد نے انسپکٹر سے کہا۔

”آپ نے بچوں پر بہت ظلم کیا ہے؟“

”شکر کریں، ابھی ایف آئی آر نہیں کئی دنہاں سے بھی بری حالت کر دیتا، انہیں سمجھاؤ، اب یہ بے غیرتی نہ کریں۔“

”ہاں، اب میں تیری بیٹی کے ساتھ مشق لڑاؤں گا۔“ میں نے چھوٹے ہی کہا تو انسپکٹر ہنستا کر بولا۔

”آپ لوگ جاؤ، اسے ابھی اور علاج کی ضرورت ہے، کل عدالت میں اس کی ضمانت کروالینا۔“

”دیکھو، انسپکٹر! پارٹی مت بنو۔ ہم اسے ابھی لے کر جائیں گے اور اب نہ لے گئے تو پھر تمہاری ورنی کا ہمیں کچھ خیال نہیں ہوگا۔“ ابو کے ساتھ آئے ایک بااثر وکیل نے نرم انداز میں کہا تو انسپکٹر کو جیسے ہوش آ گیا۔ وہ چند لمبے خاموش رہا اور فون کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ اس وکیل نے فون پر ہاتھ رکھ دیا۔

”اس سے تو ہم بعد میں معاملہ طے کر لیں گے۔ تم اپنی کوہ کیا چاہتے ہو؟“

شاید انسپکٹر کو احساس ہو گیا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، غلط کر رہا ہے اور تھانے میں موجود اس وکیل اور دوسرے محرزین شہر کا اثر و رسوخ کہاں تک ہو سکتا ہے سو اس نے کوئی حراست نہیں کی اور ہم وہاں سے آگئے۔ دراصل پولیس کو مت زور کرنے میں خود عوام کا بھی ہاتھ ہے۔ عوام ہی سے چند ٹاؤٹ قسم کے لوگ پولیس کے ساتھ مل کر فریب اور بے سہارا عوام پر ظلم ڈھاتے ہیں، جس کے باعث ٹاؤٹوں اور پولیس دونوں کی چاندی ہوتی ہے۔ بااثر لوگوں کے سامنے پولیس کا رویہ تابعداری کا ہے اور بے اثر لوگوں پر ہی اپنی ساری درندگی دکھاتے ہیں۔ میرے بدن سے ٹیسس اٹھ رہی تھیں اور ایسا ہی حال حیدر شیخ کا تھا۔ میرے والد نے مجھے ایک لفظ بھی نہیں کہا اور وہ مجھے کمرے میں چھوڑ کر چلے گئے۔ حیدر کا بڑا بھائی ڈاکٹر کو بلانے گیا ہوا تھا کہ ہمیں کوئی میڈیسن دے دی جائے۔ مجھے رورہ کر جو یہ اور اس کے باپ پر فخر آ رہا تھا اور میں اپنا قصداں پر نکالنا چاہتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ انہیں فون کر کے دل کی بھڑاس نکالوں کہ بین اختر آ گیا۔ وہ حیدر کا کزن تھا اور اس علاقے میں ایک بااثر صحافی کے طور پر جانا پہچانا جاتا تھا، اس نے آتے ہی کہا۔

”واہ، میرے شیر انا ہے انسپکٹر کو خوب سنائیں اور تھپڑ بھی جلا ہے۔؟“

”ہاں، ایسا ہی ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”خیر، ہوا کیا تھا؟“ اس کے پوچھنے پر میں نے پوری کہانی سنا دی۔ وہ بڑے غور سے میرا ایک لفظ سن رہا، درمیان میں کچھ نہیں بولا۔ میں سب کچھ کہہ چکا تو وہ فون کے ساتھ شپ ریکارڈ جوڑ کر بولا۔

”گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ میں ان سب کو دیکھ لوں گا، بس تم صبر رکھنا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون سیٹ میرے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”جو یہ میرے باپ کا نمبر ملاؤ اور اپنا پورا قصہ نکال لو، ہالنگل نہیں ڈرتا۔“ میرے اندر خواہش تو پہلے ہی تھی۔ مبین اختر کے حوصلہ دینے پر میں نے فوراً نمبر ملائے۔ چند لمحوں بعد رابطہ ہوا تو دوسری طرف اس کا باپ ہی تھا۔ اس نے ”ہیلو“ کہا تو میں بولا۔

”میں ہوں، تمہارا ہونے والا دادا۔۔۔“

”کیا تم کو اس کرتے ہو۔“ وہ چونکا۔

”یقین نہیں آتا تو اپنی بیٹی سے پوچھ لو، تم نے چند کتنے بھگوا کر کیا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ تم انتظامی عہدے پر ہو، کیا اسی کا زعم ہے تمہیں؟“

”اس کا مطلب ہے تمہارا کچھ اور علاج کرنا پڑے گا۔“

”میرا علاج تو اب تمہاری بیٹی ہے، پورے شہر کو پتہ چل گیا ہے کہ مجھے تھانے کیوں لے جایا گیا۔ میں نے یہی کہا ہے کہ تم مجھے دادا بنانا چاہتے تھے۔ میں نے تم لوگوں کو دھکا رو یا ستم اوتھے ہٹکنڈوں پر اتر آئے۔“

”دیکھو، فضول ہو اس مت کرو۔ میں تمہیں معاف کر دیتا لیکن لگتا ہے تمہارا داغ اب بہت اچھے طریقے سے ٹھیک کرنا پڑے گا۔“

”ظاہر ہے، تمہاری بیٹی بھاری بھاری کے نشے میں بہت کچھ مجھے بتا چکی ہے۔ تم نے تو میرا داغ ٹھیک کرنا ہی ہے لیکن میں تمہیں معاف نہیں کروں گا۔“

”دیکھو، فضول۔۔۔“

”کہو اس بند کرو اور اپنی بیٹی سمیت اس قصبے سے جلد از جلد دھکان ہو جاؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ تم زیادہ سے زیادہ مجھے قتل کروا سکتے ہو اور تمہیں اب یہی کرنا ہوگا لیکن تم کیا سمجھتے ہو میں آسانی سے قتل ہو جاؤں گا؟“

”چلو پھر ٹھیک ہے، ایسے ہی کسی۔ اپنے قتل ہو جانے کا انتظار کرنا“ اس سے پہلے کہ میں جواب دیتا، رسیور مبین اختر نے پکڑ لیا۔ اس نے اپنا نام بتاتے ہوئے کہا۔

”تو مطلب، آپ دھمکی دے رہے ہیں؟“

”آپ یہاں کیسے؟“ اس کی آواز میں لرزش تھی۔

”یہ میرے بھائی ہیں، مجھے ابھی پتہ چلا اور میں نے تمہاری یہ گفتگو بھی ریکارڈ کر لی ہے، جس میں تم نے شجاع کو قتل کرنے کی دھمکی دی

ہے۔ تمہارے اختیارات اپنی جگہ لیکن ہم یہاں بستے ہیں۔ تمہاری یہ غلطی گروہی ہمارے سامنے ہے۔ کل ہم پوری کہانی چھاپ دیں گے۔ بیٹی مشتق کرتی ہے اور باپ غلطہ گروہی۔" وہ دوسری طرف کچھ سنتا رہا، پھر یوں لا۔ "تم جو مرضی کرو لیکن ہمیں بھی تو اختیار ہے کہ ہم جو کریں۔ میں دیکھ لوں گا۔ تم جو کر سکتے ہو کرو۔ تمہارے دل میں کوئی حسرت نہ رہے۔ ہم سے جو ہو سکا، ہم کریں گے۔" یہ کہہ کر اس نے ریمو رکھ دیا۔ پھر بیٹین اختر ہمیں کافی دیر تک حوصلہ دیتا رہا۔ اس نے ٹیپ ریکارڈنگ کیا اور چلا گیا۔ حیدر اس رات میرے پاس ہی رہا۔

اگلا سارا دن میں اس انتظار میں رہا کہ پولیس آئے گی یا کچھ بھی ہو گا مگر کچھ نہ ہوا شام ڈھلے مجھے پتہ چلا کہ ایک شہری کے ہاں جو یہ یہ کا باپ اور میرے ابو ملے وہاں چند اور لوگوں کے ساتھ بیٹین اختر بھی تھا۔ ان کے درمیان مفاہمت ہو گئی، آئندہ کچھ بھی نہ کرنے کے وعدے کے ساتھ بات ختم ہو گئی۔

اگرچہ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ تھا مگر یہ میری زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہوا۔ جو یہ یہ کے باپ کو چاہئے تھا کہ مجھ پر بڑے حد سے ڈر نہ لگے۔ جہاں اپنی بیٹی کو سمجھاتا۔ میں اگر روکنے سے باز نہ آتا تو پھر مجھے سزا ملنی چاہئے تھی۔ میں نے کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن میرے جاننے والوں میں یہ بات پھیل گئی کہ میں جو یہ یہ کے مشتق میں اس سال تک پہنچا ہوں۔ کہانی کچھ بھی نہیں تھی لیکن انسانے ڈیروں بن گئے۔ جو یہ یہ کا باپ ایک اعلیٰ انتظامی آفیسر ہی نہیں تھا بلکہ وہ ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ ان دنوں میرا اتنا وزن نہیں تھا اس لیے اتنا احساس بھی نہیں تھا، بعد میں احساس ہوا کہ یہ لوگ صرف دولت اکٹھی کرنے کے لیے سرکاری نوکری نہیں کرتے بلکہ اختیارات کی وہ طاقت حاصل کرتے ہیں جس سے عوام کو دبایا جاسکے۔ ایک ہی علاقے میں ہرن کا شکار ان کے طبقے کے لیے جائز یا حق کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ کسی بھی دوسرے کے لیے ممنوع یا جرم ہوتا ہے۔ آزادی کے فوری بعد پائیس خاندانوں کا چرچا رہا ہے جو اب تک ملکی وسائل پر قابض ہیں۔ جب سے اب تک ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہو چکی ہیں کہ اب انہیں ہلانا نہیں جاسکتا۔ پہلے وہ وسائل پر قابض تھے، اب انتظامی اور اختیاری عہدے بھی انہی کے قبضے میں ہیں۔ یہی وہ طاقت ہے جس کے تل پر یہ کالے انگریز خود کو رائل فمیلی تصور کرتے ہیں اور غریب عوام کو اپنا خدا مت گار۔ آزادی سے اب تک اسمبلیوں میں چہرے بدلے ہیں مگر خصوصاً طبقے نہیں بدلا۔

انہی دنوں بیٹین اختر میرے لیے ہیرو بن گیا۔ بچانے اس کے پاس کیا جاوے تھا، جس کی وجہ سے اسپیکل میرے پاس سفارت کرنے کے لیے آیا۔ میں نے اسے اچھائی ڈیل کیا مگر وہ سب کچھ چپ چاپ سنتا رہا اور پھر معافی مانگ کر چلا گیا۔ لاشعوری طور پر میں اس صحافی سے متاثر ہو چکا تھا۔ انہی دنوں مجھے یہ آگئی ملی کہ ان لڑکیوں کے چکر میں اچھا بھلا انسان، گمن چکر ہو کر رہ جاتا ہے۔ غلط عمل، غلط ہی ہوتا ہے۔ اسے درست کہنا ہی دراصل سب سے بڑی غلطی ہے۔ جو بھیا تک راستوں پر لے جاتی ہے۔ اگر میں جو یہ یہ سے رابطہ نہ رکھتا تو یہ سب کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہی بات بیٹین اختر نے مجھے اچھی طرح مختلف حوالوں سے سمجھائی تھی، اس نے کہا تھا۔

"دیکھو، گناہ اور ثواب کو ایک طرف رکھ دو۔ یہ بعد کی بات ہے۔ پہلے یہ دیکھو کہ آیا تمہارا یہ عمل کسی شرمندگی کا باعث تو نہیں بنتا؟ پھر تمہاری اپنی ذات ہے، تمہارا مقام ہے۔ اپنے کردار میں ثابت قدم رہو گے تو دنیا تمہاری طرف لپکی گی۔ اگر اپنے کردار میں کمزور ہوئے تو دنیا تمہیں اپنی ٹھوکروں پر رکھے گی، مجھے اچھی طرح احساس ہے کہ تمہاری عمر کے نوجوانوں میں جذبات مچھلے ہی نہیں، بھڑکتے بھی ہیں اور ان جذبات کو ہوا دینے

والا ماحول ہمارے ارد گرد موجود ہے لیکن کیا تم اتنے کمزور ہو کہ اس ماحول کے تابع ہو کر عام لڑکوں کی طرح اپنا آپ کو محالو گے؟ تمہیں تو ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔“

پھر ایک بار اس نے مجھے سمجھایا تھا۔

”دیکھو، شجاع! ہمارے نوجوان طبقے کو یہ پوچھی نہیں ہے کہ محبت اور جنس میں کیا فرق ہوتا ہے، وہ سب کچھ گنڈ کر جاتے ہیں۔ اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ان کی رہنمائی نہیں کی جاتی۔ وہ محبت کو جنس اور جنس کو محبت خیال کرتے ہیں جبکہ ایسا نہیں ہے۔ جنس محض افزائش نسل کا ذریعہ ہے، جو یہ کچھ گیا وہ اپنے آپ کو ضائع نہیں کرے گا۔ لذت کے حصول نے انسان کو گرا کر رکھ دیا ہے لیکن اگر وہ جنس کو افزائش نسل کا ذریعہ سمجھے گا تو پھر لذت بھی ایک مقصد بن جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بھی سمجھ دار اور ذی شعور انسان اپنی آئندہ نسل کے لیے برا نہیں سوچتا جبکہ محبت، انسانی سرشت میں شامل ہے۔ محبت انسان میں جمالیاتی حس کو بیدار کرتی اور اس کے من میں خوبصورتی بڑھاتی ہے۔ محبت کرنے والا انسان نہ صرف خود خوبصورت ہوتا ہے بلکہ دوسروں میں بھی خوبصورتیاں بانٹتا ہے۔ محبت کی خوشبو سے دوسرے بھی کیف آگئیں سرور حاصل کرتے ہیں۔ جس طرح جنس افزائش نسل کا ذریعہ ہے، اسی طرح محبت انسان میں اعلیٰ صلاحیتیں انسان کو اعلیٰ مقام تک لے جاتی ہیں۔ محبت خوبصورتی ہے اور اللہ خوبصورت چیزوں کو پسند کرتا ہے۔“

پھر اس کی ایک اور بات میرے ذہن میں پختہ ہو کر رہ گئی۔

”اپنے آپ سے محبت کرو، چارے ان خود سے محبت کرو گے تو تمہیں پتہ چلے گا کہ محبت کتنی بڑی قوت ہے۔“

بچپن اختر نے دھیرے دھیرے میرے ذہن میں ایسی باتیں واضح کر دیں جس سے میں اپنے اندر تہذیبی محسوس کرنے لگا۔ اس کی رہنمائی اس وقت تک چلتی رہی جب تک میرا رزلٹ نہیں آ گیا، مجھے حریف بڑھائی کے لیے قہقہے سے باہر جانا تھا۔ میرے والد نے فیصلہ کیا کہ میں لاہور چلا جاؤں اور وہیں ہاسٹل میں رہ کر پڑھوں۔ میں اپنے ساتھ حیدر کو بھی لے جانا چاہتا تھا مگر اس کے والدین انور انہیں کر سکتے تھے، یوں میں اکیلا ہی لاہور کی لٹھاؤں میں آ گیا۔ جہاں سے میری زندگی کی نئی شروعات ہوئی۔

ال دہاقل روڈ پر موجود بلڈنگ میں وہ ایک شاندار آفس تھا۔ میں جب حیدر شیخ کے ساتھ وہاں داخل ہوا تو احساس ہوا کہ اس آفس پر خاصا خرچ کیا گیا تھا۔ اشتیاقیہ کے بعد ایک ہال تھا اور پھر چند کمرے، ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے حیدر نے کہا۔

”یہ تمہارا آفس ہے۔“ میں ایک ہی نظر میں انداز لگا چکا تھا کہ وہاں ایک دفتر سے متعلق تمام سہولیات موجود ہیں۔ ایک بڑی سی میز کے صتب میں بڑی کرسی پر مجھے بٹھاتے ہوئے حیدر خاصا جذبہ پاتی ہو رہا تھا۔ میں بیٹھ چکا تو وہ میرے دائیں طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

”کیسا لگا، تمہیں یہ آفس؟“

”بہت شاندار ہے۔“ میں نے بے ساختہ اعتراف کیا۔

”تمہیں یاد ہے، شجاع! میں بچپن میں معمولی معمولی چیزوں کے لیے بھی ترسا کرتا تھا، آج سب کچھ ہے مگر میں ابھی اور آگے بڑھتا

ہے اپنے لیے اور کچھ دوسرے لوگوں کے لیے، دولت کہاں سے آتی ہے، اس پر دھیان مت دینا۔ بس یہی سوچنا کہ تمہاری کمائی دولت کتنے لوگوں کو فائدہ دے گی۔" اس کا لہجہ بیگناہ تھا۔

"تقریر ہی کرتے رہو گے یا کوئی چائے کافی بھی پلاؤ گے؟" میں نے مسکراتے ہوئے ماحول کے جوہل پینا کو دور کرنا چاہا تو وہ یکدم قہقہہ لگا کر ہنس دیا، پھر یوں۔

"تمہارے آفس میں بیٹھا ہوں، پوچھنا تمہیں چاہئے کہ میں کیا بیچوں گا؟" میں نے انٹرکام کارسور اٹھا لیا، دوسری طرف کنول جیت کی آواز پہچان کر کہا۔

"کنول! ذرا یہاں آؤ لیکن آنے سے پہلے کافی کے لیے کہتی آنا۔"

"جی سر۔" اس نے کہا تو میں نے رسور رکھ کر حیدر کی طرف دیکھا، اس نے سنا ہی نظروں سے میری طرف دیکھا اور پھر وہ مجھے اس علاقے کی اہمیت کے بارے میں بتانے لگا۔ تموڑی دیر بعد کنول جیت آئی۔ اس کا چہرہ آنکھوں سمیت مسکرا رہا تھا، اس نے آتے ہی انتہائی خوشی سے کہا۔

"جی آیاں نوں، سر۔"

"شکر یہ، کنول۔" میں نے کہا تو وہ میرے سامنے دھڑے موٹے پریشے لگی، وہ اس انتظار میں تھی کہ میں کچھ کہوں۔

"کیا سب آگئے ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"جی، آگئے ہیں۔ ہم تین ہی تو ہیں، میں، ہندیم اور حیش۔"

"میں سب کے ساتھ ایک میٹنگ چاہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے، سر! ہم کچھ دیر بعد آجاتے ہیں" یہ کہہ کر وہ اٹھی اور چلی گئی۔ کافی پینے کے دوران میری اور حیدر کی گپ شپ چلتی رہی۔ وہ مجھے معلومات دینا رہا، پھر وہ چلا گیا۔ تب وہ تینوں میرے پاس دفتر ہی میں آگئے۔

وہ لوگ ایک طرح سے آرگنائزر تھے۔ دوپٹی کی زبردگی میں جہاں لوگ خون پسینہ ایک کر کے کمائی کرتے تھے، وہاں وہ تفریح کے لیے نت نئے انداز بھی اپناتے ہیں۔ وہاں کی شامیں خاصی رنگین ہوتی ہیں۔ چونکہ وہاں پر ہر قوم کا فرد آباد ہے اس لیے وہ اپنی کیونٹی کے حساب سے تفریح ڈھونڈتے ہیں۔ جس کے پاس زیادہ درہم خرچ کرنے کی قوت ہوتی ہے، وہ اپنی شام اتنی ہی رنگین اور حسین بنا سکتا ہے۔ ہندو یا بھارتی وہاں پر زیادہ تعداد میں ہیں اس لیے ان کا کلچر زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ حیدر شیخ کے کفیل حسین سہرا موخادی کے اپنے دو ہوٹل تھے۔ ایک پار دوپٹی میں اور ایک ڈیرہ دوپٹی میں۔ ڈیرہ دوپٹی والا ہوٹل قدرے اوسط درجے کا اور پرانا تھا جبکہ پار دوپٹی ہوٹل خاصا مہنگا تھا۔ یہ لوگ پاکستان اور بھارت سے فنکاروں کو جمع کرتے اور یہاں نت نئے پروگرام کر کے دولت کما رہے تھے۔ اس وقت ان کا نیا دنیا کام تھا اور وہ صرف ہوٹل تک محدود تھے۔ اس کے چلان میں اور بہت کچھ تھا لیکن وہ بہر حال وقت کے ساتھ ہونا تھا۔ وہ سارا دن ان سے تفصیلی تعارف کرتے اور کام کو سمجھنے میں گزار گیا۔

حیش مہر مہی میں دادو کے علاقے میں پیدا ہوا۔ اس نے ایک ایسے گھر میں آنکھ کھولی جو تنگ و تنگ ایک گلیوں میں تھا اور جہاں انتہائی

غربت تھی۔ بڑی مشکل سے اس نے سکول تک کی تعلیم حاصل کی۔ کالج میں پہنچی کراسے احساس ہوا کہ دولت کے بغیر وہ تعلیم حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ چھوٹے موٹے کام کرتا رہا۔ اسے ایک ڈریس ڈیزائنر کے ہاں ملازمت مل گئی جہاں سے اسے معمول آمدنی ہونے لگی لیکن پھر جلد ہی وہ ایک فیشن فوٹو گرافر کے پاس کام کرنے لگا جو ماڈلنگ کے حوالے سے خاصا مشہور تھا۔ یہاں سے اس کے تعلقات بڑھے اور اس نے پیسہ بھی کمایا۔ پھر اسے دوستی کا چانس مل گیا، وہ دوستی آ گیا۔ یہاں کچھ دیر بٹھکتے رہنے کے بعد ایک دوکان پر سیلز مین رہا اور پھر وہ حیدر شاہ کے پاس آن پہنچا۔ کنول جیت کور بھارتی پنجاب کے ہوشیار پور کی رہنے والی تھی۔ ماں بچپن میں ہی فوت ہو گئی تو باپ نے دوسری شادی کر لی۔ وہ پڑھ لکھ کر کسی اچھی سی ملازمت کی تلاش میں تھی۔ اسے دہلی میں ایک فورسٹار ہوٹل میں جاب مل گئی، وہ اپنی قسمت آزمانے دہلی آ گئی۔ یوں ہوٹل انڈسٹری میں قدم رکھا تو اسے بہت کچھ دیکھنے کو ملا۔ وہ باصلاحیت تھی اور زیادہ سے زیادہ کمانے کا شوق تھا۔ اس نے دوستی چلے جانے کا سوچا اور پھر وہ دوستی آ گئی سو یہاں سے چند ماہ بعد ہی احساس ہو گیا کہ وہ محض ملازمت سے اتنی دولت نہیں کما سکتی جتنا وہ تصور لے کر یہاں آئی تھی، اس کے لیے اور بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ وہ ملو انٹوں اور ماڈلنگ کو دونوں ہاتھوں سے دولت میٹھے دیکھ رہی تھی لیکن اس کی اپنی بہت نہیں پڑتی تھی کہ اس راہ پر چل نکلے۔ وہ واپس جانے کا سوچ رہی تھی کہ چند دوستوں کی وساطت سے اسے سعد الموطاوی کے ہوٹل میں جاب مل گئی۔ پھر وہ حیدر شاہ کے اس نئے پراجیکٹ میں آ گئی۔ باتیں کرتے ہوئے وقت کا احساس ہی نہ رہا، دو بجے تو خدیم نے کہا۔

”چلیں، بیچ کے لیے چلتے ہیں۔“

”وہ کہاں، بھئی؟“

”ہماری طرف سے ہے، سٹیک قریب ہی ایک بہت اچھا ریسٹوران ہے۔“

”ٹھیک ہے، ابھی چلتے ہیں۔ میں ذرا حسن کو فون کر لوں۔“ میں نے کہا تو حمیش نے کہا۔

”اوسوری، سر! مجھے یاد ہی نہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے ایک سیل فون نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ آپ کا فون، سر!“

میں نے اس میں قریب قریب اہم ترین فون نمبر فیڈ کر دیے ہیں۔“

”شکر یہ حمیش۔!“ میں نے فون تمام لیا اور پھر ان سب کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یارا یہ سر، آپ جناب کچھ عجیب سا نہیں لگتا۔ ہم دوست

ہیں بھئی؟“

”یہ آپ کا بڑا بہن ہے لیکن ہم پھر بھی۔۔۔ حمیش نے کچھ کہنا چاہا۔“

”اوکم آن، یارا چھوڑو ان تنگنا کو۔۔۔“ میں نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی اور حسن کے نمبر ملانے لگا۔ وہ لوگ اٹھنے لگے۔ رابطہ

ہو جانے پر حسن نے اچھائی مسرت سے کہا۔

”کیسے ہو، جان جی؟“

”میں ٹھیک ہوں، تم ساؤ، کیسا چل رہا ہے؟“

”سب ٹھیک ہے۔“

”تاکہ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے تمہارے چلے جانے کے بعد خاصا روٹی تھی، بہت عزت کرتی ہے تمہاری۔“

”میں نے اسے غلط لگاؤ سے نہیں دیکھا، اس لیے شاید، آصف چوہدری کا سناؤ؟“

”اوہ، تو تمہیں حیدر نے بتا دیا؟ وہ ٹھیک ہے۔ بات چل رہی ہے، وہ وہ درشاہ کو چھوڑ دے گا مگر کسی کی ضمانت پر تا کہ وہ بعد میں تنگ نہ

کرے۔ بہر حال سب ٹھیک ہے، تم پریشان نہیں ہونا، سناؤ، ندیم کیسا جا رہا ہے؟“

”دوڑ رہا ہے، ایک دم ٹھیک ہے۔“

”آفس جو آئن کر لیا؟“

”ہاں، اپنے ہی آفس سے بات کر رہا ہوں۔“ میں نے بتایا تو اس نے مجھے خوش باش رہنے کو کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے قدرے اطمینان ہو

گیا تھا۔ میں آفس سے اٹھ کر باہر آیا تو وہ تینوں میرے انتظار میں تھے۔ پارکنگ میں کھڑی سیاہر سیڑی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیش نے کہا۔

”یہ کار آپ کے استعمال میں رہے گی، فی الحال ڈرائیور ہے۔“

”تو چلو پھر۔۔۔“ میں نے کہا اور کار کی طرف بڑھ گیا۔ ہمیں کوئی اتنا زیادہ وقت نہیں لگا، وہیں السطار روڈ پر ہی ایک ریسٹوران میں بڑا

مزیدار کھانا کھایا۔ اس دوران حیش ہی زیادہ باتیں کرتا رہا۔ وہ اپنی مسکمی میں گزری ہوئی زندگی کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہا۔ میں نے محسوس کیا

کہ کنول جیت لفظوں میں اتنی باتیں نہیں کرتی تھی جتنا وہ لگا ہوں سے اپنے جذبات کا اظہار کر دیتی تھی جیسے بنا کچھ کہے وہ فی رابطہ ہو جائے۔ سبھی میں

نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بہت کچھ کہنا چاہتی ہے لیکن کہہ نہیں سکتی یا کہہ دینا نہیں چاہتی۔ بے تکلفی میں کھانا ختم ہوا اور ہم ریسٹوران سے باہر نکلے تو کنول

جیت نے کہا۔

”آج شام آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”کچھ بھی نہیں، آپ کو بھی پتہ ہے۔“

”تو پھر کیوں نہ آپ ہوئی آجائیں۔ وہاں ہمارا آرگنائیز کیا ہو اور گرام چل رہا، اس طرح آپ کو وہی کی شاموں کا بھی اندازہ ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، کنول! میں نے بھی گھر میں کیا کرنا ہے؟“

”تو پھر پروگرام یہ بنا کہ آپ ہوئی آجائیں گے، آپ ہمیں وہیں اپنا شہر پائیں گے۔“ حیش نے کہا اور میری طرف ہاتھ بڑھا دیا۔

”میرے ساتھ نہیں چلو گے؟“

”میں اور کنول پیدل ہی نکل جائیں گے، اس نے کہا تو میں نے ہاتھ ملا دیا اور گاڑی میں بیٹھ گیا، ندیم بھی میرے ساتھ بیٹھا تو گاڑی چل دی۔

ہوئی گاڈ اننگ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ ایک ہی نظر میں اندازہ ہو رہا تھا کہ ان میں زیادہ تعداد بھارتی لوگوں کی تھی۔ خواتین کی

تعداد زیادہ تھی اور وہ مختلف مردوں کی عورتیں تھیں۔ وہ سارے بڑی عورت سے سٹیج پر نمودار ہو کر ایک نو عمر لڑکی کو دیکھ رہے تھے۔ اسی ہال میں مجھے ہونٹ کا میٹھ ملا، کنول جیت نے تعارف کرایا تو میں کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ وہ بھی بھارتی تھا۔ اس نے ہمارے لیے مخصوص نشستوں کی طرف رہنمائی کی، ہم وہاں جا بیٹھے۔ میں سٹیج پر رقص کرتی لڑکی کی جانب متوجہ ہوا تو میرے سامنے اس طرف بیٹھی کنول جیت نے کہا۔

”یہ گجرات کے لوگ فنکار ہیں، انہیں میں نے ہی آرگنائز کیا ہے۔“

”گڈ۔۔۔“ میں نے ستائشی انداز میں کہا اور اس لڑکی کو غور سے دیکھا۔ وہ اپنے رقص میں کوئی لوک کہانی بیان کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے سٹیج پر بیٹھے سازندے بڑی مہارت سے ساز بجانے میں محو تھے۔ گہرے رنگ کے کرتے اور سرخ رنگ کی مخصوص چٹری پہنے وہ ہارمونیم، ڈھولک، تین اور کھنکھروں سے تال ملائے ہوئے تھے۔ انہی کے درمیان پہلے رنگ کا لباس پہنے وہ نو عمر لڑکی گجراتی میں گارہی تھی۔ اس لڑکی میں عجیب طرح کا جذبہ تھا جس نے تماشاچیوں کی ساری توجہ اپنی طرف کی ہوئی تھی یا شاید اس گیت میں کوئی ایسی کشش تھی۔ مجھے وہ زبان سمجھ میں تو نہیں آ رہی تھی اس لیے میں نے خود رقص لڑکی کو بھرپور انداز میں دیکھنے پر ہی اکتفا کیا۔ اس نے فیروزہ رنگ کا لباس اگھا گھرا اور سرخ رنگ کی چٹکی دکھتی ہتھ پڑا اور سر رکھی تھی۔ بازو بھر کے چوڑیاں۔ ہاتھ اور پاؤں پر ہندی، گہرے میک اپ کے ساتھ اس نے کس کر جوئی باندھی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ گیت اور رقص میں تیزی آتی گئی۔ وہ اپنے سر پر کوریوں رکھنے لگی۔ پھر گھڑا رکھ کر تپنے لگی۔ اس نے اپنے سروں کے نیچے گلاس رکھے، گھڑے رکھے گئے اور ان کی تعداد گیارہ تک جا پہنچی۔ انہی گھڑوں کو سر پر رکھے وہ کھاروں کے درمیان رقص کرتی رہی۔ پھر اس کے سروں سے کپل اور شیشے کے ٹکڑے بھی رکھے گئے لیکن وہ رقص کرتی رہی۔ یہ صرف اعضا کی شاعری نہیں تھی بلکہ توازن میں مہارت تھی۔ یہ سلسلہ خاصا دورا دور باور پھر جب اس نے اپنا رقص ختم کیا تو گویا لوگوں کے رگے ہوئے سانس، بحال ہو گئے۔ زبردست داد کے ساتھ وہ سٹیج سے اتر گئی۔ اگلے چند لمحوں میں ایک آدی سٹیج پر نمودار ہوا۔ ذرق برق گھاگھا نمائیلا چھلا سفید پاجاما اور سر پر اسی رنگ کی پٹی باندھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ میں کھاروں تھیں۔ وہ رقص کے ساتھ ان کھاروں کو اپنی انگلیوں پر چلاتا رہا۔ اس کی پرکار مٹس کے بعد بارہ خواتین آئیں۔ جنہوں نے ہلکے پیلے رنگ کی سنہری بارڈروالی سازی اور میرون رنگ کے ہاف سلیو بلاؤز پہنے ہوئے تھے، سونے اور پھولوں کے زیورات سے لادھی چھری وہ کافی دیر تک اپنا رقص دکھاتی رہیں۔ پھر آخر میں ایک جوان رقص کا تم کی لڑکی نمودار ہوئی پہلی نظر میں وہ کوئی بت ہی دکھائی دیتی تھی۔ لانا قند، بھرا بھرا سنڈول بدن، پھنسی ہوئی سبز چوٹی کہ لگتا تھا، ابھی یہ کپڑا پھٹ جائے گا۔ گلے میں جو اس سنہری ہارے جیڑم کا میک اپ اس کے آنے پر انڈسٹری نے خوب شور مچایا تھا اور وہ شور مچا تھا، واقعی اس نے مغل لوٹ لی۔ سازندوں کے ساتھ ایک ادیب مرخانوں نے راجستانی لوگ گیت، چیمبر اتوہ ”بت“ حرکت میں آگیا وہ کوئی لوک کہانی تھی جسے گیت کے انداز میں کہا جا رہا تھا۔ لہو لہو اس میں تیزی آتی گئی۔ وہ تاجتی رہی، یہاں تک کہ لگا ہی اس پر لگتی ہی نہ تھی۔ کنول جیت میری دلچسپی دیکھ کر اس راجستانی گیت کا ملہوم بتاتی رہی۔ رات گئے تک وہ اپنے فن کے باعث اپنا آپ متواتر رہی، شوختم ہونے پر ہم اٹھے تو حیش نے ایک شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”شجاع جی اوہ سامنے ایک شخص کو دیکھ رہے ہیں جس نے کھدر کا کرتا اور سفید پاجاما پہنا ہوا ہے، وہی جس نے گول شیشوں کی

سینک لگائی ہوئی ہے اور سر سے قدرے تمباہے۔“

”ہاں، میں دیکھ رہا ہوں۔“ میں نے اس شخص کو دیکھا جو چند لوگوں میں گمراہ ہوا تھا۔

”وہ زیندہ ترپاشی ہے، یہاں بھارتی سفارت خانے میں ایک اعلیٰ عہدیدار۔ ہمارا ان سے خاصا کام رہتا ہے۔ میں انہیں آپ سے ملواتا ہوں، باقی آپ سنبھال لیجئے گا۔“

”ضرور۔۔۔“ میں نے کا تو عیش اس کی جانب بڑھ گیا اور میں ندیم اور کتول جیت کے ساتھ ان گھراتی لوک فنکاروں کے بارے میں باتیں کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد عیش کے ساتھ زیندہ آہستہ قدموں سے چلتا ہوا ہماری طرف آ گیا۔

”آپ شجاع الدین ہیں۔۔۔“ عیش نے تعارف کرایا تو اس نے ہاتھ جوڑتے ہوئے شکر کہا، پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔

”آپ سے مل کر ”بوت کھسی“ ہوں۔“

”مجھے بھی خوشی ہوئی۔“ زخمی جملوں کے تبادلے کے بعد کچھ دیر ہم اس پر وہ گرام کے حوالے سے باتیں کرتے رہے۔ وہ ان بھارتی فنکاروں سے بڑھا کر بات پاک بھارت تعلقات پر لے آیا۔

”دونوں کثیر زکوٰۃ دہتی کرنا ہوگی، خاص کر کے گلچر کے اوپر، دو ہاں ملک کی بنیاد ایک ہے۔“

”مگر ترپاشی جی اور میان میں اسے مسئلے ہیں جو مل طلب پڑے ہوئے ہیں۔ ان کا کچھ ہوگا تو دوستی کی بات بھی ہوگی۔“

”یہ تمہارا ہمارا مسئلہ تھی، بلکہ مل ایٹو سفیر (حالی مظفر) سب ٹھیک کریں گا۔“ یہ کہہ کر اس نے اس تقریر کے لیے ہر تو لٹے چاہے میں چند منٹ تک اسے برواشت کرتا رہا، جب وہ زیادہ ہی بھارت کے بارے میں مطلب المان ہونے لگا تو میں نے کہا۔

”آئیے، کہیں بیٹھ کر گپ شپ کرتے ہیں، ساتھ میں تمہوز اطلق بھی تر کر لیں گے۔“

”ہائیں، سو جاغی انہم نے تو سنت ہے کہ آپ پیچھے نہیں ہوں؟“ اس نے کہا تو میں چونک گیا، کیا اسے میرے بارے میں معلومات مل چکی ہیں، کیا میری یہاں آمد کے بارے میں دوہرے توجہ ہونے لگی ہے؟ یہ بات میں نے ایک لمحہ میں سوچی اور اسی لمحے خود پرکا پواتے ہوئے کہا۔

”آپ نے سچ سنا ہے مگر کیا ترپاشی جی اور اب سے ہی مطلق تر ہو سکتا ہے؟ اس کے علاوہ کئی تو شر وہاں ہیں۔“

”آں، ہاں۔۔۔ اصل میں یوں ہے، سو جاغی: وقت بوت ہو گیا۔ ہم کسی وحش خود آؤں گا آپ کے آفس، جب لائی گپ شپ ہوے گی۔ اس سے تو آگیا دیجیے۔“ اس نے میری جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

”چلیں ٹھیک ہے، جیسے آپ کی مرضی۔“ میں نے کہا اور باہر جانے کے لیے قدم بڑھا دیئے۔ وہ ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”بوت کھسی ہوگا کہ کوئی اصلاحیت پرش (مرد) کلنول کے مافق اٹھایا، پاکستان کو پروجیکٹ کریں گا۔ یہاں بوت کھسی (خلا کام کرنے کے لیے میدان) ہے۔ آپ کھل کر کام کرو، ہم لوگن پورا کو پریٹ کریں گا۔“

”بہت شکر یہ زیندہ جی! پھر کب آرہے ہیں آپ میرے آفس؟“

”میں عیش کو بتا دوں گا، ہم ملتے رہیں گے۔“ اس نے کہا تو اسے میں ہم ہاں کے دروازے تک آچینچے۔ میں نے اس سے ہاتھ ملایا اور ہم

الگ الگ ہو گئے۔ میرے ذہن میں ترپاٹھی کی بات گونج رہی تھی۔ کیا اس نے جان بوجھ کر یہ حوالہ دیا تھا کہ وہ میرے بارے میں جانتا ہے یا طلسمی کے ساتھ اس کے منہ سے نکل گیا؟ بہر حال جو کچھ بھی تھا، اسے میرے بارے میں معلومات فراہم کر دی گئیں تھیں۔ وہ معلومات کیا تھیں، یہ جاننا میرے لیے بہت ضروری تھا۔ میں یہی سوچتا ہوں لابی کی طرف جانے لگا تو حشیش نے کہا۔

”ہمیں اجازت، شہزادی؟“

”ارے کیوں، کیا ہوا؟ ابھی کھانا کھاتے ہیں، پھر میں آپ لوگوں کو ڈراپ کر دوں گا۔“

”وہ بات کچھ یوں ہے کہ ہم تینوں کو کہیں جانا ہے۔ شیخ صاحب سینکڑے ہوٹل میں ہیں، آپ ڈنران کے ساتھ لیں گے۔“ اس نے قدرے

جھکتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن حیدر کہاں ہے؟“ میں نے کہا تو ندم جلدی سے بولا۔

”ہم ابھی جا رہے ہیں نا لابی میں منیجر ہمارا انتظار کر رہا ہوگا، وہ آپ کو حیدر صاحب کے پاس پہنچا دے گا۔“

میں خاموش ہو گیا، چند منٹ بعد ہم لابی میں جا پہنچے۔ منیجر ہماری راہ تک رہا تھا، ہم پر نظر پڑتے ہی وہ ہماری طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر کاروباری مسکراہٹ چسپاں تھی۔ اس نے پھر مجھ سے اتنی گرجوٹی سے ہاتھ ملایا جیسے میں اس سے پہلی بار مل رہا ہوں حالانکہ وہ تو سو ڈی ڈی پر قبل مجھ سے مل چکا تھا۔ اس کے متب میں قدرے غصہ لپاس میں ایک لڑکی تھی جو مسلسل میری جانب دیکھ رہی تھی، وہ تینوں رعصت ہوئے تو منیجر نے کہا۔

”آئیے۔۔۔“ میں اس کے ساتھ چلنے لگا۔ پھر لفٹ کے ذریعے کچھ سی ڈی بعد ہم ہوٹل کی چھت پر جا پہنچے۔ ساحل سے آتی ہوئی بیگنی ہوا کی ٹھنڈک نے بدن میں خوشگواریت بھری۔ خاصی بڑی چھت پر چند سی میزیں تھیں، فاصلے پر دھری ان میزوں کی ارد گرد گھنٹی کے چند لوگ تھے جن میں مخصوص قسم کی عورتیں زیادہ تعداد میں تھیں۔ میں نے ایک ہی نگاہ میں اندازہ لگا لیا کہ اس پر سکون ماحول میں وہ سب تمھائی چاہتے ہیں۔ نیم تاریک ماحول میں ایک دوسرے سے بے نیاز ہر کوئی اپنے آپ میں گن تھا۔ ایک طرف کونے میں حیدر شیخ کے ساتھ ایک جہاں سال عربی بیٹھا ہوا تھا اور ان سے ڈرا پرے فاصلے کم لپاس میں دو لڑکیاں کھڑی تھیں۔ منیجر واپس چلا گیا تو وہ لڑکی میرے ساتھ ساتھ اس میز تک آئی، دونوں ہی نے اٹھ کر میرا استقبال کیا۔

”آپ حسین سعید موٹاوی ہے۔“ حیدر نے کہا تو موٹاوی نہایت خوشگوار انداز میں بولا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر، بڑی خواہش تھی آپ سے ملنے کی۔“ موٹاوی نے شستہ اور صاف اردو میں کہا تو مجھے قدرے خوشگوار حیرت ہوئی۔ میں نے بھی گرجوٹی سے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”میں بھی آپ کے بارے میں ایسے جذبات رکھتا ہوں۔“

”معذرت خواہ ہوں، آپ کو لینے ایئر پورٹ میں آسکا میں لیمن میں مصروف تھا۔“ یہ کہہ کر اس نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے

کہا۔ ”بیٹھے۔“

”اس میں معذرت کی کیا بات ہے، ویسے یہ آپ کا بڑا اپنا ہے کہ آپ نے ایسا محسوس کیا؟“

”شجاع! میں دوستی کا قائل ہوں۔ ٹھیک ہے، یہ سب میری کفالت میں ہیں لیکن ہم کام بھی تو کر رہے ہیں۔ سخت ماحول اچھا تاثر نہیں دیتا“ وہ جھپٹتے ہوئے بولا۔ ہمارے جھپٹتے ہی وہ لڑکیاں کھانا لگانے لگیں۔ انتہائی پر تکلف کھانا تھا، اس دوران ہاتھیں چلتی رہی جن میں کچھ ذاتی اور زیادہ تر کاروباری تھیں۔ موٹاوی نے مجھے وہاں میرے کام سے متعلق چند قانونی پہلوؤں سے آگاہ کیا۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا۔ موٹاوی کے ساتھ لشٹت خاصی مطلوبات افزا رہی، مجھے خاصا حوصلہ ہوا اور راہل مٹی جس پر مجھے چلنا تھا۔ ہم جب وہاں سے اٹھے تو رات خاصی گہری ہو چکی تھی۔ پارکنگ سے حیدر میری گاڑی میں ہی آ گیا، اس کی گاڑی ڈرائیور لے جا چکا تھا۔ حیدر نے گاڑی پارکنگ سے نکالی تو میں نے پوچھا۔

”گت ہے تمہارے معاملات خاصے پراسرار قسم کے ہیں؟“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ تھوڑی دیر بعد کیا ہونے والا ہے، اس بارے مجھے معلوم نہیں ہوتا۔“

”چند لمحوں بعد کیا ہو جانے والا ہے، یہ تو کسی کو بھی پتہ نہیں ہوتا، میری جان ایسا ہو جائے تو۔۔۔“

”میں وہ بات نہیں کر رہا، ابھی ڈنر کے بارے میں مجھے احساس تک نہیں تھا۔“

”موٹاوی نے کچھ دیر پہلے فون کر کے بتایا تھا کہ وہ فری ہے اور آ سکتا ہے۔ مجھے پتہ تھا کہ تم ادھر ہوٹل ہی میں ہو، ہمیشہ سے میرا رابطہ رہتا ہے یہ کوئی پراسرار بات نہیں، یہاں کی تیز زندگی کا ایک حصہ ہے۔“

”اور وہ تینوں کسی خاص کام کے لیے نکلے ہیں کیا؟“

”اوکم آن، یارا تمہیں آئے ہوئے صرف دو دن ہوئے ہیں۔ تمہیں سب اس لیے پراسرار لگ رہا ہے کہ تم نئے ہو، کچھ دنوں بعد یہ تمہارے لیے بھی معمول ہوگا۔“

”اوکے، حیدر! مگر ایک بات اور ہے۔“ میں نے مزید ترپانچی کی اس بات سے حیدر کو آگاہ کیا۔

”ہاں، یہ بات ہے سوچنے کی لیکن صحیح پوچھو تو یہ میرے لیے ڈرامائی حیران کن نہیں ہے۔ یہ بھی یہاں کے ایک طبقے کا معمول ہے۔“

”یہ ایک الگ بحث ہے کہ یہ معمول ٹھیک ہے یا غلط؟ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر سے میرے بارے میں معلومات دیں کس نے، کوئی ڈریہ تو رہا ہوگا؟“

”ظاہر ہے وہ ڈریہ ہمارے ارد گرد ہی ہوگا مگر اس کا مثبت پہلو تم یہ دیکھو کہ تمہاری اہمیت وہ کس قدر محسوس کر رہے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، حیدر! مجھے اگر یہاں رہنا ہوگا تو میں اپنے انداز میں رہوں گا۔“

”اب تم صحیح ٹریک پر سوچ رہے ہو، یہاں ضرورت سے زیادہ آنکھیں اور کان کھول کر رہنا پڑتا ہے اور میری جان! بڑے کام کے لیے بڑا

رہا کہ تو بہر حال لیٹا پڑتا ہے۔" اس نے کہا تو میں خاموش رہا اور روشن راہوں کو خالی الذہن سے دیکھتا رہا۔ گھر پہنچے تو میں قدرے تھکن محسوس کر رہا تھا سوچیدہ کچھ بات کہنے میں اپنے بیٹروں میں آگیا۔ تھوڑی دیر بعد میں کمرے کی خشک فضا میں سکون سے سو گیا۔

میری آنکھ معمول کے مطابق صبح سویرے ہی کھل گئی۔ میں کچھ دیر یونہی بیٹھ پڑا رہا، پھر متہ ہاتھ دھو یا اور کچن میں جا کر چائے بنانے کے لیے کمرے سے نکلا۔ میں نے جیسے ہی دروازہ کھولا بھی باہر کی تازہ ہوا کی ساتھ موسیقی کی مدہم آواز میرے کانوں میں پڑی۔ میں نے بڑی توجہ سے اس موسیقی کی سمت کا اندازہ کیا تو وہ چلی منزل کے کسی کمرے سے آ رہی تھی۔ وہ خالص ہندوستانی موسیقی تھی جیسے بھجن وغیرہ گاتے ہوئے بھائی جاتی ہے مجھے اچھا لگا ہوا کہ یہ یہاں، اس گھر میں یہ کیسی ہندوستانی موسیقی؟ بھلا وہی باورچی تو مسلمان تھا۔ وہ ایسی موسیقی سن رہا ہے یا پھر کون اور ہے؟ اسی تجسس کی وجہ سے میں مجبور ہو کر آہستہ قدموں سے چلی منزل پر آیا تو وہاں میں طرف راہداری کے ایک کمرے میں سے وہ موسیقی برآمد ہو رہی تھی۔ میں اس کمرے تک جا پہنچا۔ دروازہ ڈراما سا کھلا ہوا تھا جس سے سامنے کا مضر صاف نظر آ رہا تھا۔ کمرے میں ایک طرف پڑے ڈیک سے وہ ہندوستانی موسیقی برآمد ہو رہی تھی، جس کے روم پر ایک لڑکی بڑے جذب سے ناچ رہی تھی۔ اس لڑکی کا رخ دوسری جانب تھا اور میں اس کی پشت کی طرف کھڑا تھا۔ اس کی ساری توجہ کامرکز کرشن دیوتا کا وہ بت تھا جسے "یرنام" کہتے ہیں۔ وہ چوہنا سا بت ایک کارنس پر رکھا ہوا تھا، اس پر تازہ پھول تھے اور اگر بتیاں ہلک رہی تھیں۔ وہ تیلی لڑکی پر بے جوش اور جھون کے ساتھ ناچ رہی تھی، اسے اردگرد کا قطعاً ہوش نہیں تھا۔ اس نے بلکہ کانسی رنگ کی شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی جس پر سیاہ رنگ کی کڑھائی تھی، وہ پٹا اس نے کمر سے باندھا ہوا تھا۔ اس کی لائمی چوٹی اتنی تیزی سے ہلکورے لے رہی تھی کہ اس پر نگاہ لگتی ہی نہ تھی۔ کتنی دیر یونہی گزر گئی۔ میں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اس لڑکی نے اسی کمرے کو مندر کے ماحول میں ڈھال لیا تھا۔ اس کا ایک اچھ ٹھکر رہا تھا۔ وہ ایک بار بھی نہیں ہلٹی جیسے کرشن دیوتا کے بت سے اس کا کوئی خاص رابطہ ہو اور اگر وہ ڈراما ہی ادھر ادھر ہوئی تو وہ رابطہ ٹوٹ جائے گا۔ لہذا میرے اندر یہ سوال ابھرنے لگا کہ یہ لڑکی چہرے سے کیسی ہوگی؟ کون تھی؟ یہ سوال کہیں نہیں مضر میں چلا گیا۔ پھر اچانک میوزک ختم گیا۔ جس کے ساتھ ہی وہ بھی ساکت ہو گئی۔ اس نے بڑھ کر ڈیک آف کیا، قریب پڑی میز پر رکھی قنادی اٹھائی جس میں ایک دیاروشن تھا اور کرشن دیوتا کی صورتی کے سامنے لہرانے لگی۔ اس نے کچھ اور اگر بتیاں تھیں، بڑبڑانے کے انداز میں کچھ گاتی رہی، ساتھ میں ایک چھوٹی سی گھنٹی بھی بھاتی رہی۔ پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بڑی دیر تک ساکت کھڑی رہی۔ میں غور سے اُسے دیکھتا رہا۔ مجھے لگا جیسے آسنے سامنے بت دھرے ہوں۔ چند لمبے اسی سنانے میں گزر گئے، تبھی اس لڑکی کے بدن میں حرکت ہوئی۔ وہ اپنے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے ہلٹی اور پھر بچھ پر نگاہ پڑے ہی وہ خود بت بن گئی۔ وہ جو کوئی بھجن بڑبڑا رہی تھی، اس کے ہونٹوں ہی میں دب کر رہ گیا۔ میں بھی حیران تھا اور وہ بھی، وہ تو شاید اس لیے حیران ہوئی ہوگی کہ میں کون ہوں اور یہاں کیا کر رہا ہوں مگر میں اس کا حسن دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ زندگی میں حسین سے حسین تر لڑکیاں دیکھی تھیں، مگر بہتر حسن نظروں سے گزرا تھا مگر میرے سامنے برنی جیسی آنکھیں میں حیرانگی بھرے کھڑی لڑکی حسن و لہریب اور منفرد تھا۔ شفاف جلد پر نقوش اسنے فضا کے تھے کہ کسی ایک نقش پر نگاہ ٹھہرتی ہی نہ تھی۔ گلابی چہرے پر ہلکا ہلکا پسینہ کسی پھول پر شبنم کے ہونے کا احساس دے رہا تھا۔ آنکھوں میں قدرے حیرانگی، کچھ کہنے کے لیے لرزتے ہونٹ، تجسس سے تئی گردن، تیز سانسوں سے ہلکورے لیتا ہوا بدن، بھرپور جوانی کا احساس دلاتا ہوا وجود، کتنے ہی

لمسے یونہی گزر گئے۔ جیسی اس نے جھپکتے ہوئے میرے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر پر نام کرتے ہوئے کہا۔

”نہ سکار۔!“ اس کی کھٹکتی ہوئی آواز ہانپوں میں بھری چوڑیوں کی کھٹکنا ہٹ میں جذب ہو کر رہ گئی۔ پتلی پتلی انگلیوں اور ہنسنے سے رپے ہاتھ، پہلی بار کسی حسن نے مجھے متاثر کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ ہاتھ جوڑے میری طرف سے کسی جواب کے انتظار میں تھی، جب میں نے پوچھا۔

”کون ہیں آپ؟“

”ہم۔۔۔؟“ اس نے حیرانگی سے اپنے ہلکورے لیتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر گھبراتے ہوئے کہا۔ ”جی، ہم آرتی ہیں۔“

”آرتی۔۔۔!“ میں زرب لب بڑبڑایا۔ میری نگاہیں اس کے چہرے سے الگ نہیں ہو رہی تھیں۔ وہ بیٹا پلکیں چھپکائے مسلسل میری طرف دیکھ رہی تھی اس کے شہنی چہرے پر پھٹکی مصومیت، تازگی اور البڑہین کے باعث میں کسی چادو اور شخص کی مانند ٹھنک گیا تھا۔ حیرانگی میں ڈوبے ہوئے طویل لمسے طویل تر ہوتے چلے جا رہے تھے۔ میں خود کو یوں محسوس کرنے لگا جیسے کوئی خلا میں جا کر بے وزن ہو جائے۔ نجانے کتنے لمسے یوں گم ہو گئے، اچانک میرے ارد گرد کا ٹانا جاگ اٹھا۔ میرے احساس کے ساتھ ہی میرا شعور بیدار ہو گیا۔ کئی سارے سوال میرے ہونٹوں تک آ کے رک گئے۔ میں اس سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کبھی سوالوں کو سلسلے کے ترازو میں تو لا۔ کوئی بھی ایسا سوال نہیں تھا جس کی وجہ میری سمجھ میں آئے کہ میں وہ سوال اس سے پوچھنے کا حق رکھتا ہوں۔ وہ جو کوئی بھی تھی، ایک ایسے کمر کی محبت تھی جو جو تھی جس کا مالک میں نہیں تھا۔ مجھے اک ذرا سا بھی حق نہیں تھا کہ اس سے معلومات لیتا پھروں۔ میں نے اس کی خزاں آنکھوں میں جھی ہوئی حیرت کو غور سے دیکھا اور پلٹ گیا۔ میں راہداری پار کرتے ہوئے خالی الذہن سانسنگ روم میں آ کر ایک صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ چند لمحوں بعد شاید میری آہٹ پا کر بنگالی باورچی آن وارد ہوا۔ اس نے بڑے ادب سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ چاہتا ہے شاب؟“

”صرف ایک کپ چائے اور وہ بھی ڈرا جلدی۔“ میں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔

”ابھی لایا شاب!“ یہ کہہ کر وہ واپس چلا گیا۔

بلاشبہ اس وقت میرے ذہن پر آرتی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی بولتی ہوئی حیران آنکھیں، مصعوم شہنی چہرہ، لہرتا ہوا بدن اور خوشگوار اجنبیت جو دونوں کے درمیان آن ٹھہری تھی۔ اس کا ایک ایک خال و خد میری نگاہوں سے ہٹ ہی نہیں رہا تھا۔ وہ جو خاموشی ہمارے درمیان کچھ دیر آ کے ٹھہری تھی، اس میں کئی ساری باتوں کی ایسی شروعات تھیں جو میرے خاموش رہنے کی وجہ سے ہوا میں قفل ہو کر رہ گئی تھیں۔ ان گنت سوال، جن کے جواب تشریح تھے۔ اس وقت ایک ایسی اجنبی کیفیت مجھے اپنے حصار میں لے چکی تھی جسے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا، وہ شہنی کسک تھی یا پریشان کن سنسنی؟ میں اس بارے کچھ بھی تعین نہ کر سکا۔ اس وقت میرا تکی چادر ہاتھ کا کسی اونچے پھاڑے سے چھلانگ لگا کر ہواؤں میں تیرتا رہوں یا پھر سمندر کی لہروں سے لڑتا ہوا بے ہودم ہو جاؤں۔

”شاب، چائے۔۔۔“ بنگالی باورچی نے چائے سے لہالب کپ میرے سامنے رکھا تو میں اس کیفیت سے نکل آیا۔ چائے کا کپ خالی

ہونے تک آرتی بھی میرے ذہن سے اپنا تاثر ختم کر چکی تھی۔ میں خوشگوار موڈ میں ناشیے کی میز پر پہنچا تو حیدر کے ساتھ آرتی بھی براجمان تھی۔ میز پر اترتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ وہ میرے انتظار میں تھے۔ میں نے ان کے قریب پہنچ کر خوشگواریت سے صبح بخیر کہا اور نیکین سیدھا کرتے ہوئے بیٹھ گیا تب حیدر میری جانب دیکھ کر بولا۔

”آپ ہیں، آرتی اہاری بہت ہی محرز مہمان۔ آپ کچھ دنوں ہمارے ساتھ رہیں گی۔“ یہ کہہ کر اس نے آرتی سے کہا۔ ”ان کا فائدہ نہ تعارف تو آپ سے ہو چکا، آپ شجاع ہیں۔“

”نہسکار۔!“ اس نے ہاتھ جوڑ کر پر نام کرتے ہوئے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھا۔ جب اس لمحہ میں نے محسوس کیا کہ وہ کیفیت جو پہلی بار اسے دیکھتے ہوئے مجھ پر طاری ہوئی تھی، ویسا کچھ بھی نہ ہوا۔ اک ذرا سی لہر بھی نہ اٹھی۔

”بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر ہلکا آپ کو دیکھ کر۔“ میں نے کہا تو وہ آنکھوں سمیت مسکرا دی۔

”بہت سنا ہے آپ کے بارے میں۔ آپ کو دیکھ کر لگا ہے، آپ واقعی ایسے ہوں گے۔“

”بعض اوقات چہرے بہت زیادہ دھوکے سے جایا کرتے ہیں، اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ کسی کے ظاہر پر نہیں جانا چاہئے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے گلاس میں جوس اٹھا لیا اور بڑا سب لیا۔

”نیکین، شجاع! دوستوں کی رائے بھی تو نظر انداز نہیں کی جاسکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے نیکین لگا ٹوسٹ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے کھڑ لیا تو حیدر بولا۔

”یہ آرتی اس وقت یہاں آئیں تھیں جب تم سو گئے تھے۔ وہ جیش وغیرا نہیں کو لینے گئے تھے۔ وقت نہیں تھا اس لیے وہ لوگ تفصیل بتائے بغیر چلے گئے۔“ حیدر نے یہ کہہ کر گویا میرے سارے سوالوں کا جواب دے دیا لیکن یہ آرتی ہے کون؟ اس بارے میں اس نے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، مجھے بھی اتنی جلدی نہیں تھی۔ آخر کون؟ نے مجھے سب کچھ بتا دینا تھا اس لیے ذرا سی دلچسپی لیے بغیر میں نے ناشیے میں گن رہا۔ ناشیے ختم کر کے ہم تینوں ہی پوری کی طرف بڑھے۔ بالکل سبکی باتوں سے اجبیت قدرے تحلیل ہو گئی تھی۔ پوری میں حیدر کی گاڑی آگے کھڑی تھی۔ حیدر ڈرائیونگ سیٹ پر جا بیٹھا تو آرتی نے قدرے حیرت سے کہا۔

”کیا آپ نہیں جا رہے؟“

”نہیں، میں اپنی گاڑی میں اپنے آفس جاؤں گا ہی یو۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کی طرف بھر پور لگا ہوں سے دیکھا۔ اس کے گہرے گھسنے براؤن ہال کمر تک آئے ہوئے تھے جنہیں اس نے کھلا چھوڑ دیا تھا۔ ہلکے ہلکے ایک اپ کے ساتھ اگرچہ وہ تروتاز لگ رہی تھی مگر وہ صبح والی شہنی تازگی نہیں تھی۔ آف دائیں شلواری تھیں پہنے وہ گھری گھری دکھائی دے رہی تھی۔ ایک لمبے لمبے جانے والے کی طرح میری طرف بھر پور لگا ہوں سے دیکھا، ہاتھ ہلایا اور حیدر کے ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھی۔ میرے لیے ڈرائیور روزہ کو کھول چکا تھا۔ دفتر پہنچنے ہی میں نے حسن سے رابطہ کیا۔ وہ اپنے آفس پہنچ چکا تھا، میری آواز سننے ہی پوری سنجیدگی سے بولا۔

”اد جان جی کیسے ہو؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔ تم سناؤ، کیا خبریں چل رہی ہیں؟“ میرے لہجے میں خوشگواریت تھی۔

”بظاہر تو سب ٹھیک چل رہا ہے۔“

”اور آصف؟“ میں نے اشارتاً پوچھا۔

”ہاں، یار! اس کا معاملہ رانیئر صاحب پر ہے۔ طے تو یہی ہوا تھا کہ وہ دو شاہ کو چھوڑ دے گا مگر وہ اسکا ٹینگ گڑبڑ کر رہا ہے۔“

”وہ اتنی کھوپڑی کا بندہ ہے۔ خیر میں رابطہ کرتا ہوں اس سے۔۔۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو مگر مجھے نہیں لگتا کہ وہ دو شاہ کی تنگی سے باز آئے گا۔“

”حسن! میں اگر وہاں ہوتا تو یہ معاملہ اب تک حل ہو چکا ہوتا۔“ میں نے پوری سنجیدگی سے کہا تو وہ تیزی سے بولا۔

”نہیں، مزید بگڑ جاتا اور اس میں سراسر نقصان تمہارا ہوتا کیونکہ سارا معاملہ تمہارے گرد ہی محوم رہا تھا۔ خیر یہ دیکھیں دیکھنے کا وقت نہیں،

اب اگر معاملہ خراب ہوا بھی تو وہ دو شاہ کی بیڑے سے ہوگا۔ وہ حد سے زیادہ عقلمندی دکھا رہا ہے۔“ اس نے کچھ ایسے تشویش زدہ لہجے میں کہا کہ میں پریشان ہو گیا اور بے بسی سے بولا۔

”حسن! ادھیان رکھنا، یار۔!“

”اُو، اٹھراؤ نہیں، اللہ خیر کرے گا۔ ابھی تک تو سارا معاملہ ہاتھ میں ہے۔ درمیان والے لوگوں سے میرا رابطہ ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے

گا۔“ پھر ایک لمبے توقف کے بعد بولا۔ ”تم سناؤ، سب ٹھیک چل رہا ہے نا؟“

”ہاں، سب ٹھیک ہے بلکہ ایک دم ٹھیک۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اپنے لہجے کو خود انجمنی پایا۔ شاید ہم دونوں ہی ایک دوسرے کو حوصلہ دے

رہے تھے۔ پھر کچھ دیر باتوں کے بعد میں نے فون آف کر دیا۔ حسن کی باتوں سے میں قدرے پریشان ہو گیا تھا۔ میرے گرد ابھی ہوئی سوچوں کا

حصار تن گیا۔ میں آصف چودھری کے بارے میں خوب جانتا تھا۔ وہ اپنے اکثر فیصلے سناج سے بے پروا ہو کر کرتا تھا، پچھتائیں، کتنی دیر تک میں پاکستان

میں موجود اپنے دوستوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ اکثر کام کے بڑے میری سوچوں کا حصار توڑا۔ دوسری جانب کنول جیت کو تھی، وہ میرے پاس

آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی۔ میں نے آنے کے لیے کہہ دیا۔ کچھ دیر بعد وہ نمودار ہوئی تو اس نے ہاتھ میں ایک اور بغل میں ایک فائل دہانے وہ

میرے سامنے مسکراتے ہوئے کھڑی تھی۔

”کافی ٹھیک، سر!“ اس نے نرے میز پر رکھے ہوئے کہا پھر فائل نکال کر میز پر رکھی۔

”تمہیں کیسے پتہ چلا کہ مجھے اس وقت کافی کی شدت سے طلب ہو رہی تھی؟“ میں نے اس کا دل رکھنے کو کہا۔

”آپ کے لہجے سے مراد بت تھا، ہاں لہجہ تھا آپ کا۔“ کنول نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”اس کا مطلب ہے تم لہجہ بھی پہچانتی ہو؟“ میں نے یونہی بات بڑھائی اور گھس اپنے سامنے رکھ لیا تو وہ نہایت سنجیدگی سے بولی۔

”سر! انسانی تعلق میں، جیسے تعلق کی نوعیت کوئی بھی ہو صرف ایک شے ہے جو تعلق کو مضبوط اور محترم بناتی ہے اور وہ ہے ”انڈر سٹینڈنگ“۔“

یہ بات نہیں کہ آپ میرے پاس ہیں، میں یہاں ملازمت کرتی ہوں تو کوئی خوشامد یا چالپوسی کے لیے ایسا کہہ رہی ہوں بلکہ یقین جانیں، بہت مرے بعد آپ کی صورت میں کوئی شخص ایسا ملا ہے جس کی عزت کرنے کو، جس کا احترام کرنے کو دل چاہتا ہے۔“

”ایسا کیوں ہو گیا، کنول؟“ میں نے کافی کاسپ لیتے ہوئے اپنی حیرت چھپاتے ہوئے دلچسپی سے پوچھا۔

”ساری دنیا کے مرد کہتے ہیں کہ ہم عورت کو نہیں سمجھ سکتے یا عورت سمجھ میں آنے والی چیز ہی نہیں۔ میں کہتی ہوں کہ خود عورت کی سمجھ میں

نہیں آ رہا ہے کہ وہ کیا چیز ہے مگر تا ضرور جانتی ہوں کہ عورت میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں اور زیادہ تر عورت ان صلاحیتوں کا حقیقی استعمال کرتی ہیں۔ جب بھی عورت اپنی صلاحیتوں کو مثبت انداز میں استعمال کرتی ہے تو ہی ارد گرد کا ماحول پرسکون ہوتا ہے۔“

”کنول ایہ تو تم نے اپنی رائے دی تا، میں نے جو پوچھا ہے، وہ بتاؤ۔“

”دھی بتا رہی ہوں کہ میرے دل میں اگر آپ کے لیے اچھے جذبات پیدا ہوئے ہیں تو اس کی وجہ میں نہیں جانتی۔ بس آپ کو دیکھا تو

دل نے کہا، میں نے سن لیا۔“ پھر ایک لمبر رگ کر دھیرے سے بولی۔ ”اس میں اگر آپ کہیں کہ کوئی مخالف جنس کی کشش ہو سکتی ہے تو ایسا قطعاً نہیں ہے۔ ایسے جذبات کا کہیں دور دور تک نام و نشان نہیں ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ میرے اندر آپ کے لیے پاکیزہ جذبات ہیں، تو ہی انڈر سٹینڈنگ جیسی صلاحیت بیدار ہوئی ہے۔“

”شکریہ کنول۔“ میں نے کہا تو اس نے سامنے دھری قائل سیدھی کر لی۔ پھر بڑے ہی خوشگوار لہجہ میں بولی۔

”سر! یہ ہمارا، مطلب آپ کا اور ہمارا پہلا پراجیکٹ ہے۔ اسے میں اسٹ کروں گی، سر! میں نے ایک خاکہ بنایا ہے جو آپ سے

ڈسکس کرتا ہے۔“

”بڑی بات ہے، کنول! اب ہم کام سے لگ گئے، چلو کچھ تو مصروفیت ہوئی۔“ میں نے کہا تو وہ بولی۔

”کیوں نہیں، سر!“ یہ کہتے ہوئے اس نے قائل کھولی اور میری جانب دیکھ کر بولی۔ ”سر! یہ میڈیم زارا کے جو شوہوں گے، ان کی تفصیل

و غیرہ ہے۔ وہ آج شام پاکستان سے برطانیہ کے لیے لٹائی کر جائیں گی، وہاں انہیں دو ہفتے رہنا ہے۔ واپسی پر وہ ہمارے پاس ایک ہفتہ رہیں گی۔

میں نے انہی دنوں کو پروگرام کی صورت دی ہے۔“ یہ کہہ کر وہ تفصیل سمجھانے لگی۔ میرے کافی فہم کرنے تک وہ سب کچھ بتا چکی تھی۔ اس کا خیال تھا

کہ پاکستانی فنکاروں کے ساتھ بھارتی فنکار بھی شامل کر دیئے جائیں تو شو زیادہ کامیاب رہیں گے۔ اس کی وجہ یہاں دو عہد کی بھارتی کمیونٹی تھی، جو

بہر حال بھارتی فنکاروں کو دیکھنا پسند کرتی ہے۔ ہم یہ باتیں کر رہے تھے کہ اس دوران حمیش بھی آکر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ مگر تقریباً دو گھنٹے کی بحث

کے بعد سب کچھ طے پا گیا۔ اس معاملے کے بعد میں نے پرسکون ہوتے ہوئے حمیش سے پوچھا۔

”یہ ندیم کدھر ہے؟“

”سراسر اس کا کوئی پاکستانی دوست آیا ہوا ہے، اسی کے ساتھ ابھی تک قیادت میں ہے۔“
 ”کون ہے وہ؟“ میں نے یونہی تجسس سے پوچھا۔

”کوئی الطاف پاشا نامی نوجوان ہے، اس سے زیادہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ٹھیکری سے بولا۔ ”وہ سراسر! رات ہم آپ کو بتائے بغیر آتی کو لینے چلے گئے۔ ایسا ٹھیک تو نہیں تھا لیکن وہ دراصل۔۔۔“
 ”ڈونٹ وری، جیش! وہ کچھ بھی رہی ہو۔ آپ لوگوں نے جو ٹھیک سمجھا، وہ کیا۔“
 ”مجھے کہنے دیں، سراسر! جیش نے میری جانب دیکھ کر لہجہ سے کہا تو میں خاموش رہا۔ تب وہ کہتا چلا گیا۔ ”جب آپ فریڈرٹز پاشی سے بات کر رہے تھے، اسی وقت مجھے حیدر صاحب کا فون ملا۔ اب یہ پوری طرح یقین تھی نہیں تھا کہ آرتی وہاں ملتی بھی ہے یا نہیں؟ وقت بہت کم تھا اور پوری تفصیل کا مجھے بھی علم نہیں تھا اس لیے کسی بھی انحصار سے بچنے کے لیے میں نے بس وہاں سے نکل جانا چاہا۔ خیر، وہ ہمیں مل گئی۔ جب اسے حیدر صاحب کے ہاں پہنچا تو آپ سوچے تھے۔“ وہ کہہ چکا تو میں نے کسی بھی قسم کے تبصرے سے گریز کیا، اسی ایکٹ سے سگریٹ نکالا اور سلاکی۔
 تھوڑی دیر خاموشی کے بعد وہ بولا۔

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ آرتی کون ہیں؟“ میں نے ایک گہرا کھس لیا اور لمبی میں گردن ہلا دی۔ تب وہ دھیرے دھیرے بتانے لگا۔

”آرتی ملہو ترا میسٹی کے علاقے اندھیری کے ایک آشرم میں پلی بڑھی تھی۔ جس آشرم میں اس نے پرورش پائی وہ کرشن دیوتا کے ایک بڑے مندر کی وجہ سے چل رہا تھا۔ اسی مندر کے مہاروہت سوامی پرمانند نے اس وقت آرتی کے سر پر ہاتھ رکھا تھا جب وہ دودھ پیتا بیٹی تھی۔ اس کے ماما چاکون ہیں اور کہاں ہیں، یہ تو وہ پروہت جانے لیکن آرتی کی پرورش وہیں ہوئی، وہیں ہوش سنبھالا اور تعلیم حاصل کی۔ پھر کرشن بھگوان کی داسی بن کر وہیں اس مندر سے شلک ہو گئی۔ ایک ماہ قبل یہ دو اور داسیوں کے ساتھ روانہ آئی ہیں۔ یہ تینوں داسیاں ان خاص ہندو گھروں میں جاتی ہیں، جہاں خصوصی طور پر عورتوں کے لیے پوجا کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ ان گھروں کو ہندو دھرم کے مطابق خاص مذہبی گھل بھی کہا جاسکتا ہے۔ دوسرے گھروں میں کہا جاسکتا تھا کہ یہ ان کا مذہبی نور تھا۔ یہ کسی بھی سٹیج وغیرہ کی بجائے محض پوجا کی گھروں میں شرکت کرتی تھیں اور یہاں کی ہندو کیونٹی کو دھرم کے بارے میں بتاتی رہی ہیں۔ ایسے ہی ایک پوجا میں یہاں کے ایک ہندو چیپلر شردھیشی کو آرتی کچھ زیادہ ہی پسند آئی۔ اس نے آرتی کو حاصل کرنے کے لیے خاصی کوشش کی مگر ناکام رہا، اس نے بڑی سے بڑی قیمت لگائی مگر وہ انہیں حاصل اس لیے نہیں کر سکا کہ یہ داسیاں اپنا آپ کرشن بھگوان کی امانت خیال کرتی ہیں۔ وہ اپنی پوترا کرشن بھگوان ہی کے لیے بچا کر رکھنا چاہتی ہیں ورنہ ان کی ساری تپسناٹ ہو کر رو جائے گی۔ شردھیشی کو یہ ضد ہو گئی کہ وہ آرتی کو حاصل کر کے رہے گا۔ اس نے اپنے پورے وسائل اسے حاصل کرنے کے لیے لگا دیئے۔ جس آرگنائزرنے اسے یہاں بلوایا تھا وہ ان لوگوں کے مقابلے میں قدرے کمزور ہے۔ وہ حیدر صاحب کا دوست بھی ہے، ایسے وقت میں اس آرگنائزرنے حیدر صاحب سے مدد چاہی اور یوں آرتی اب حیدر صاحب کے پاس ہے۔“ وہ پوری تفصیل سے کہہ چکا تو میں نے اٹھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آئی، جیش؟“

”وہ کیا؟“

”وہ جو تمہارا آرگنائزر ہے وہ اس قدر کمزور کون ہے کہ شیطانی جیسے لوگوں سے ان واسیوں کو تحفظ نہیں دے سکتا؟“

”بات تحفظ کی نہیں، وہ تو یہاں کا قانون ہی اس قدر سخت ہے کہ اگر وہ آرگنائزر چاہے تو شیطانی جیسے ان عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں۔ اصل میں وہ آرگنائزر کوئی پھرت، پردہت یا دھری بندہ تو ہے نہیں، اس نے بھی کمائی کے لیے دھرم کی آڑ لی ہے اور پھر یہاں پر آنے والی کوئی سچی سادہ ساری تو ہوتی نہیں، انہی لوگوں نے شیر کے مت کو خون لگایا ہوا ہے۔ اب اگر شیطانی جیسے لوگ ان سے عورتوں کی مانگ کرتے ہیں تو اس میں ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ عیش نے قدرے تلخ انداز میں حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ ہمارے درمیان خاموشی آن ٹھہری، تبھی کنول جیت نے کہا۔

”اصل میں، سراپات یوں ہے کہ بھارت فلم کے ذریعے پوری دنیا کو اور خصوصاً ایشیا اور مل ایسٹ کو متاثر کر رہا ہے۔ یہ پرانی بات ہوگی۔ میڈیا کے ذریعے اتنا بڑا تاثر حاصل کر لینا بلاشبہ بھارت کی کامیابی ہے لیکن شروعات کے وقت ایسی کوئی سوچ نہیں تھی، سوائے دولت کمانے کی خواہش کے۔ یہ فطری ہی بات ہے کہ انسان کامیابی کے بعد کچھ اور بھی حاصل کرنے کی خواہش میں لگ جاتا ہے۔ پچھلے چند برسوں سے بھارت نے شوبز کے اس بڑے میڈیم کی بنیاد پر ایک ”گلبریا لیسٹی“ بنائی ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اسی گلبریا لیسٹی کی بدولت سفارتی اور تجارتی تعلقات کو فروغ دے۔ یہ ایک بہت بڑا یونٹن ہے۔ ظاہر ہے، اس میں عورت کا استعمال ہونا ناگزیر ہے۔ اب اسی گلبریا لیسٹی میں عورت استعمال ہو رہی ہے۔ عورت کو ایک جتنی آلہ بنا کر مختلف خلافتوں میں پیت کر پیش کیا جا رہا ہے۔“

کنول جیت! یہ مت بھولو کہ تم بھی ایک بھارتیہ تاری ہو۔ میں تمہاری۔۔۔

”ایک منٹ، عیش ایک منٹ۔۔۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا۔ ”میں بھارتیہ تاری تھی، اب نہیں ہوں کیونکہ مجھے بھارتیہ تاری ہونے پر کوئی نظر نہیں ہے۔“ کنول کے لہجے میں آگ تھی جس کی حدت محسوس کی جا سکتی تھی۔ یہ آگ کیوں تھی؟ اس کا اندازہ آنے والے وقت میں ہی کیا جا سکتا تھا اور وہ ایسا وقت نہیں تھا کہ بات کا رخ کسی اور طرف موڑا جائے۔ میں خاموش رہا، تبھی عیش نے کہا۔

”چلیں، چھوڑ دیں اس بات کو مگر میں تمہاری اس بات سے اختلاف کرتا ہوں کہ عورت کو بری طرح استعمال کیا جا رہا ہے۔ تم شاید یورپ کے وٹن میں انٹرن عورت کو دیکھ رہی ہو۔ تمہیں شاید انٹرن ماٹھالوٹی کے بارے میں زیادہ جانکاری نہیں۔ عورت، بھارتی گلبریا لیسٹی کی بنیاد ہے۔“

”میں نے شاستروں اور پرانوں کی تعلیم تو نہیں حاصل کی لیکن کالج دور میں انٹرن ماٹھالوٹی کے بارے میں جانتی ہوں۔ کیا ارنجڈ شاستر میں لکھا نہیں پڑھا کہ عورت کو بطور ہتھیار استعمال کیا جا سکتا ہے، جاسوسی کا نظام جس میں عورتوں کے ذریعے جلانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ سنو! تمہیں اگر نہیں پتہ تو وہ وہیشیا ہیں، کیا یہ انٹرن گلبریا لیسٹی میں تسلیم شدہ بات نہیں ہے کہ طوائف اس گلبریا لیسٹی کا حصہ ہے؟“

”وہ تو پوری دنیا کے ہر گلبریا لیسٹی کا حصہ ہے۔“ عیش نے جلدی سے کہا۔

”لیکن جو اہتمام انٹرن گلبریا لیسٹی میں ہے وہ کہیں نہیں، یہاں نفرت کا شائبہ تک نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کی پھر قدرے مصالحتانہ لہجے میں بولی۔ ”دیکھو، عیش امیرا تعلق بھی بھارت سے ہے۔ دھرم سے ہٹ کر بھی اگر بات کی جائے تو کچھ اخلاقی تقاضے ایسے ہوتے ہیں جنہیں بھایا جاتا

ہے، وہ انسانیت کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ تم بھی یہ جانتے ہو کہ غربت ختم کرنے کی بجائے توسیع پسنندی کے لیے زیادہ کام ہوا ہے۔ خواہش واقعی ہے، مقصد وہی لیکن چہرہ تبدیل کر لیا ہے اور اس میں بھارتیہ ناری کو طوائف بنا کر رکھ دیا ہے۔“

”مثلاً یہ بات تم کیسے کہہ سکتی ہو؟“

”کیا بھارتی فخر سے اپنی فلم کے ذریعے دوسرے ملکوں کے عوام کو متاثر کر لینے کو اپنی کامیابی نہیں گردانتے؟ میں مانتی ہوں کہ فلم ایک طاقتور میڈیم ہے لیکن کیا تم نے اس خواہش میں پاگل ہو کر اپنی عورت کو بیچ نہیں کر لیا۔ پچھلے چند سالوں کی فلموں کا موازنہ کر لو، عورت کے کپڑے کس تیزی سے اتارے گئے ہیں، یہ تو سامنے کی بات ہے، عیش و عشرت پالیسی میں کیا کیا بھیا تک پہنچے، تم سوچ کر لرز جاؤ اور شاید تم نہ لرزو کیونکہ تم عورت نہیں ہو اور نہ ہی مرد، کیونکہ مرد اپنی عورتوں کی حفاظت کرتے ہیں، انہیں بچانے نہیں کرتے۔“ کنول جیت یکدم ہی شہلہ جوالا بن گئی۔

”دیکھو ہر ملک، ہر دہائی کو اپنے وسائل بڑھانے کا حق ہے۔ بھارت اگر ثقافت کے ذریعے اپنے انسانی وسائل بڑھا رہا ہے تو یہ ایک اچھی پالیسی ہے، لوگوں کو کمانا چاہئے۔“

”تو پھر آرتی کو بھی کمانا چاہئے، اسے اپنی پوتہ بنا کر احساس کیوں ہے۔ تمہاری کلچر پالیسی اگر بھارتیہ ناری کو طوائف بنا رہی ہے تو اس میں پوتہ بنا کر سبھاؤش کہاں؟ ایک اور طوائف بن کر انسانی وسائل میں اضافے کا باعث بنے۔“ کنول نے تیزی سے کہا تو عیش چوکتے ہوئے بولا۔

”اوہ اب سبھاؤش ہمارے حصے کی وجہ، کیوں تم کلچر پالیسی کا سہارا لے کر اپنا خسر نکال رہی ہو۔ تم کیوں آرتی سے جھلس تو نہیں ہوئی ہو؟“

”بڑی گھٹیا بات کی ہے تم نے، عیش و عشرت میں اس سے کیوں جھلس ہونے لگی لیکن ہاں، میرا یہ سوال ضرور بنتا ہے کہ تم اس کی اتنی دکالت کیوں کر رہے ہو؟ مگر مجھے اس جواب کی بھی ضرورت نہیں۔“ کنول نے حصے میں کہا۔ یہی وہ وقت تھا جب بحث میں تھکی گئی جانے کا اندیشہ تھا۔ عمومی بحث سے بات ڈالنا آرتی تھی سو میں نے بات کا رخ موڑ دیا اور لٹچ کے لیے کسی اچھے ریمان کی بابت پوچھنے لگا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہم لٹچ کے لیے نکل گئے۔

کنول جیت کو رکھنا جانی پن پہلی بار میرے سامنے ظاہر ہوا تھا۔ اس کے لفظوں میں جو آگ چھپی ہوئی تھی اس کا کسی قدر اندازہ تو مجھے ہو گیا تھا۔ یکدم بھڑکنا اور بھڑک کر سہلنے رہنا کسی اندرونی خفتکار کی نشاندہی کر رہا تھا۔ تجھی میں نے اپنے طور پر یہ طے کر لیا کہ کنول سے ایک لمبی ملاقات انتہائی ضروری ہے کیونکہ کنول نے جو کچھ بھی کہا تھا، انہوں حقیقتوں کی بنیاد پر کہا تھا۔ گھجلی دہائی سے بھارت نے جو روش اپنائی ہوئی ہے، اس کی بنیادیں تسلط کی خواہش ہے۔ یہ تسلط چاہے کاروبار میں ہو یا ثقافت میں یا پھر ذہنوں پر، ہندو کی اپنی ایک خاص ذہنیت تو ہے ہی، اسے مزید سہارا یہود و عورتی سے ملا۔ بھارت اب یہودی منافقت اور سازش کے ذریعے اپنا تسلط قائم کرنے کی ازلی خواہش پر گامزن ہو چکا ہے۔ یہودیوں کو ہندوؤں کی صورت میں ایک فطری دوست بھیسرا آیا تو بھارت کی دُن ہی بدل گئی۔ یوں بھارت پرانے ہتھیاروں اور فطری ذہنیت کو نئے انداز میں سامنے لا کر عالمی سطح پر خود کو ستارہ کر دانے کی فکر میں ہے۔ دوسری جہاں پر وہ پہلے ہی سے اپنی جڑیں قائم کر چکے ہیں، وہاں ان کی مزید آجیاری کے لیے جس طرح انفارمیشن ٹیکنالوجی اور پھر عورت کو استعمال کیا جا رہا ہے، اس سے یہی لگتا ہے کہ وہ یورپ اور امریکہ کو بھی پیچھے چھوڑ جانا چاہتا ہے۔ آرتی کے

بارے میں ہمیشہ کی یہ بات میرے صلب سے نہیں اترتی تھی کہ وہ اپنی پوترا بچانے کے لیے چھپ جانے پر مجبور ہو گئی ہے۔ کیا وہ آرگنائزڈ ان داسیوں کو لے کر یونٹی دہنی آ گیا تھا، کیا دہنی کا قانون اتنا ہی بے حیثیت ہے؟ وہ اگر پوجا کی محفلوں میں یا دھرم کے معاملات کے لیے یہاں آئی ہیں تو کیا یہاں کی ہندو کمیونٹی میں ان کی کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں۔ کیا یہاں کی ہندو کمیونٹی دہنی دہنی کے لیے کوئی بھی ایسا پریشر گروپ نہیں رکھتی جو ان پنڈت، داسی یا کم از کم ہندو ازم کے لیے کام کرنے والا ہو۔ کیا دھرم کے معاملات اور آرٹس پن کا شکار ہے؟ وہ لوگ جنہوں نے ان داسیوں کو کمیونٹی سے یہاں بھجوایا ہے، کیا انہوں نے آنکھیں بند کر کے آرگنائزڈ پر یقین کر لیا اور انہیں دہنی بھجوادیا؟ اور سب سے اہم سوال کہ گھر کے خلاف میں دھرم کا پرچار؟ سوالوں کی ایک قطار تھی جو میرے سامنے آ کر ٹھہر گئی۔

اس شام میں گھر پہنچا تو میرے سر میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ میں نے ایڑی ہو کر چین لکڑ کھائی اور تھوڑی دیر کے لیے لیٹ گیا۔ میرے اندر بجلی بجلی بے چینی چھرتی رہی جس کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اس دن میں نے کنول جیت کوری باتیں بہت دیر تک سوچیں تھیں۔ سوچ کا رخ بدلا تو اس میں مختلف لوگوں کے چہرے اور ہی روپ میں دکھائی دینے لگے۔ اس میں آرتی بالکل ہی پراسرار انداز میں سامنے آن کرڑی ہوئی تھی۔ میں نے کچھ دیر تو اسے سوچا پھر اسے جھٹک کر سونے کی کوشش کرنے لگا مگر نیند نہیں آئی۔ میرا دل چاہا کہ میں کھلی فضا میں جاؤں۔ میں اپنے کمرے سے نکل کر بیچے آ یا اور پائیں باغ کی طرف نکل آیا، تھیں میری نگاہ سوئمنگ پول پر پڑی جو وہاں سے کچھ فاصلے پر پام اور بھود کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ وہاں حیدر کے ساتھ کچھ لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ حلقی ہوئی شام، سمندر کی خم آلود ہوا اور سوئمنگ پول پر رنگینی سے ماحول میں نشہ اتر آیا تھا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ رہ گئی۔ سکول کے دنوں میں چھوٹی چھوٹی خواہشوں کے لیے ترسے والا اس قدر دولت مند ہو گیا ہے کہ وہ خواہشیں بھی پوری ہو رہی ہیں جو اس نے کی ہی نہیں تھیں۔ سبھی سوچتے ہوئے میرے ذہن میں آیا کہ ان میں آرتی تو نہیں۔ اگر موجود ہے تو پھر اس کی پوترا؟ اسی تجسس کے باعث میں سوئمنگ پول کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ حیدر شیخ نے مجھے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ اس کے ساتھ دو لڑکیاں تھیں جو شرمناک حد تک مختصر لباس میں تھیں۔ ان میں آرتی نہیں تھی۔ میں وہیں کھارے پر چھٹی بید کی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا، تھیں حیدر تیرتا ہوا میرے قریب کھارے پر آ کر بولا۔

”ہاؤ جی، خیریت ہے؟“

”میرا سر درد کر رہا تھا۔ کھلی فضا میں بیٹھنے کو دل چاہ رہا تھا، تمہیں دیکھ کر ادھر آ گیا۔“

”آ جاؤ، نہر میں نہانے کی یاد تازہ کر لو۔“ اس نے آنکھ دہاتے ہوئے کہا پھر ان لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”یہ پسند نہیں ہیں تو دوسری آسکتی ہیں۔“

”اؤ نہیں، یارا تم حرا کر دو۔“

”وہ تو کر رہا ہوں۔ تم نے کوئی بیان مگر لی، چائے یا کافی؟“

”لی ہے، ہاتی دل نہیں کر رہا۔“ میرے آزدہ لہجے پر اس نے چونکتے ہوئے کہا۔

”اوائے کہیں لاہور چھوڑنے پر اس تو نہیں ہوا؟“

”حیدر ای تم جانتے ہو کہ لاہور چھوڑنے پر میں اداس نہیں ہوں۔“

”میں سمجھ گیا تم تھائی محسوس کر رہے ہو گے۔“ یہ کہہ کر وہ پول سے باہر نکل آیا۔ میرے ساتھ والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”دیکھو،

میرے یار! یہاں ہر بندہ مصروف ہے تم بھی مصروف ہو جاؤ۔ اپنے ارد گرد دیکھنی پیدا کر لو۔ یوں۔۔۔“

”تم جو سمجھ رہے ہو، وہ نہیں ہے۔ بس میرے سر میں درد ہو رہا ہے، اور کچھ نہیں۔“

”اچھا۔“ اس نے ہلکے سے کہا اور پاس پڑا فون اٹھا کر کسی سے باتیں کرنے لگا۔ دو چار جگہ بات کرنے کے بعد وہ اٹھا، فریش جوس کا

گلاس بھر کے میرے ہاتھ میں تھمایا اور خود پول میں چھلانگ لگا دی۔ میں ہلکے ہلکے سپ لیتے ہوئے انہیں دیکھتا رہا۔ کافی وقت گزر جانے کے بعد میرا

فون بج اٹھا۔ دوسری جانب کنول جیت تھی۔

”آپ کہاں ہیں، ہرا میں آپ کو یہاں حیدر صاحب کے گھر میں تلاش کر رہی ہوں۔“

”میں سوئمنگ پول پر ہوں۔“

”نہا رہے ہیں آپ؟“

”نہیں، ویسے ہی بیٹھا ہوں کیوں، خبر ہے؟“

”ٹھیک ہے، ہرا میں آ رہی ہوں۔“

”او نہیں، تم ادھر مت آنا۔ یہاں حیدر اور۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”سرا یہ میرے لیے نیا تو نہیں ہے۔ ڈونٹ وری۔۔۔“ کنول نے ہنستے ہوئے کہا۔

”مگر مجھے اچھا نہیں لگے گا تم مجھ میں آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ حیدر نے سوالیہ انداز میں دیکھا تو میں

اسے متا کر عمارت کی جانب چل پڑا۔ کنول جیت پر نگاہ پڑی تو میں چونک گیا۔ وہ صبح معنوں میں ”بختابین کڑی“ نظر آ رہی تھی۔ مٹی کٹر کے شلوار قمیص،

براؤن سلپرز، لمبا سادو پٹ، کانوں میں جھمکے اور بازو بھر چڑیاں۔ مجھے ایک دم شوگرواریت کا احساس ہوا، لاشعوری طور پر میرے منہ سے نکل گیا۔

”ہش کے بھئی، بختابی کڑی ہے۔!“ میری شوخی پر وہ شوگرواریت سے بولی۔

”تسی بختابی او۔۔۔“ (آپ بختابی ہیں)

”تے ہو رکیہ، اسس ادھر دے بختابی تے تسی ادھر دے بختابی۔“ (تو اور کیا ہم ادھر کے بختابی اور تم ادھر کی بختابین) یہ کہتے ہوئے میں

مسکرا کر بیٹھ گیا۔ جیسی میں نے کنول کا دھواں ہوتا ہوا چہرہ دیکھا، جہاں یکدم ہی ویرانی اتر آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی

جسے اس نے کمال خوبصورتی سے چھپایا۔

”آپ اردو اور انگریزی اس قدر روانی سے بولتے ہیں کہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ آپ بختابی ہیں۔“

”ہاں، بختابی، میری مادری زبان، اردو تو میری اور انگریزی بھجوری ہے۔“

”ہاں، مجبوری۔۔۔ سرتی ایہ مجبوری کیا کچھ نہیں کروادتی۔“ وہ کم ہوتے ہوئے لہجے میں کبھی کبھی یکدم چونک اٹھی۔ پھر تیزی سے بولی۔
 ”اب دیکھیں نا! انگریزوں نے کتنا مجبور بنا دیا ہے کہ گرو جی مہاراج کی جنت بھوی تک جانے کے لیے وزیر الہا پڑتا ہے۔ ٹھیک کہتے ہیں کہ لکھوں کے
 فیصلے انسان کو بہت دور تک لے جاتے ہیں۔“

”کیا تمہیں اس ایسا کا احساس ہے؟“ میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”بالکل ہے، میں بتاؤں کہ تاریخ اور وہ بھی ہندوستان کی تاریخ میرا پسندیدہ مضمون رہا ہے اور اب بھی میں اس میں خاصی دلچسپی محسوس
 کرتی ہوں۔ وہ ایک بھیا تک حقیقت تھی۔ وقت گزر گیا۔ اب ہماری قوم کے ساتھ بھی وہی کچھ ہو رہا ہے اور یہ سب ہندو ذہنیت کے باعث ہے جو
 دوسروں کو غلام بنالینا چاہتے ہیں۔“

”کنول! تمہاری دو پھروالی باتوں سے اور اب بھی ایسا لگتا ہے جیسے تم ہندوؤں سے نفرت کرتی ہو۔“

”ہندو سے نہیں، ہندو ذہنیت سے بلکہ یوں کہیں، برہمن ذہنیت سے۔ وہ دوسروں کو اپنا غلام بنا کر رکھنا چاہتے ہیں۔ اسی میں ان کی بڑھ
 ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ نفرت کے بیج سے محبت کے پھول نہیں کھلا کرتے، انسانوں کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔“
 ”تم ٹھیک کہتی ہو، سٹ جرنیل سگھ ہینڈر انوالہ کی مثال دیکھ لو، بائیس لاکھ ہی نہیں دوسری تو میں بھی ہندو ذہنیت کے خلاف لڑ رہی
 ہیں۔“ میرے یوں کہنے پر کنول جیت چونک اٹھی۔

”کیا آپ جانتے ہیں آپریشن بلیو سار کے بارے میں؟“ اس کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔

”انتہائی جتنا ذرا رخ ابلاغ سے معلومات مجھ تک پہنچی ہیں۔“ میں نے عام سے انداز میں کہا۔ پھر اچانک ہی میرے ذہن میں سوال آ گیا۔
 میں نے بلا جھجک وہ پوچھ لیا۔ ”کنول! اگرچہ یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن ہمیش ایک ہندو ہے اور۔۔۔“

”میں سمجھ گئی، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا پھر دھیرے انداز میں وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میں یہ نہیں کہتی کہ میں
 پوتر ہوں، ستی ساوتری ہوں، محسوم بیا پاک ہوں مگر ایک اپارٹمنٹ میں رہنے کا مطلب بھی نہیں کہ اس کی رسائی میرے جسم تک بھی ہو۔ آپ ابھی تک
 وہاں آئے نہیں۔ اگر آئیں تو دیکھیں گے کہ میں ایک الگ کمرے میں رہتی ہوں۔ حیدر صاحب نے بھی اس بارے میں ضمانت دی ہے کہ اگر میں ان
 کے ساتھ نہ رہنا چاہوں تو اپنی رہائش ہونٹ میں لے جاسکتی ہوں اور پھر ندیم بھی تو وہیں رہتا ہے۔ وہ ہمارے ”تعلق“ کو بڑی اچھی طرح جانتا ہے۔“
 ”اچھا، کنول! یہ بتاؤ، ہمیش اور ندیم میں کیا فرق محسوس کیا ہے تم نے؟“

”دیکھیں، جن بنیادی تصورات اور خیالات پر انسان کی سوچ پروان چڑھتی ہو اور پھر انہی خطوط پر اس کی تربیت بھی ہوگی وہ تو وہ فطرت
 بن جاتی ہے۔ ہندو ذہنیت اور مسلم ذہنیت الگ الگ ہیں اور اسی مطابق ان کا رویہ ہوتا ہے۔“

”خیر، ہم بھی کن باتوں میں الجھ گئے۔ میں نے یہ تو پوچھا ہی نہیں کہ اس وقت تم کیسے آئی ہو؟“

”ندیم صبح کا نکلا ہوا ہے، وہ وہاں نہیں آیا۔ ہمیش بھی دفتر سے جانے کے بعد اپارٹمنٹ نہیں گیا۔ میں اکیلے میں گھبرا رہی تھی۔ میں کہیں

جانے کا سوچ ہی رہی تھی کہ حیدر صاحب کا فون آگیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ کو کتنی دو سو میں ادھر چلی آئی۔

”اچھا تو بچا بن گئی مجھے کتنی دینے آئی ہے۔“ میرے یوں کہنے پر وہ تہہ لگا کر ہنس دی۔ تب میں نے کہا۔ ”تم ذرا بیٹھو، میں شاور

لے کر فریض ہو جاؤں پھر کھانا باہر چلتے ہیں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میز پر دھرا ہوا میگزین اٹھا لیا اور میں اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

میں سنتک روم میں واپس آیا تو کنول جیت کے ساتھ آتی مہیترانیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھیں کر رہی تھیں، مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو گئیں۔

”آرتی جی اکیسی ہیں، آپ؟“ میں نے خوشگوار انداز میں کہا تو وہ ہنس دی پھر بڑی ادا سے بولی۔

”ہم بالکل ٹھیک ہے، آپ سناؤ؟“

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ میں نے جواب دیا اور صوفے پر بیٹھی کنول سے کہا۔ ”تو پھر چلیں، کنول؟“

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟ مطلب، کوئی ضروری کام ہے؟“

”کام تو کوئی نہیں، بس یونہی گھومنے کے لیے جا رہے ہیں۔“

”اگر ہم کہیں کہ آپ کہیں نہ جائیں بلکہ آج کی شام ہمارے ساتھ اس گھر میں گزاریں تو کیسا ہے؟“ یہ کہتے ہوئے آرتی کے لہجے میں

تجسس تھا اور قدرے احتجاجیہ انداز تھا۔

”میں کچھ سمجھا نہیں، آرتی؟“ میں نے پوچھا۔

”آج میں نے کھانا بنایا ہے۔ خالص بھارتی کھانا، ہم چاہیں گے کہ آپ ڈنر ہمارے ساتھ لیں۔“

”اوہ، تو یہ بات ہے، آپ کھانا بنا سکتی ہو؟“

”جی کیوں نہیں، کیا بناتی ہوں، یہ تو آپ چکھ کر ہی بتائیں گے؟“ اس نے قدرے قفاخر سے کہا۔

”کیوں، کنول! یہ رسک لے لیا جائے؟“ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا تو وہ بھی تہہ لگا کر ہنس دی۔

”میرا خیال ہے غرائی کر لینے میں کوئی حرج نہیں، باقی آپ جیسا چاہیں۔“ کنول نے کہا تو میں صوفے پر بیٹھ گیا اور مجھے سے لہجے میں کہا۔

”چلیں، آج ڈنر ہمیں پہ کرتے ہیں۔“ میرے یوں کہنے پر آرتی کھل اٹھی، چمکتے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ اٹھتے ہوئے بولی۔

”آپ کو تھوڑی دیر اور انتظار کرنا ہوگا۔ اتنے میں حیدر صاحب بھی آجائیں گے۔ آپ گپ شپ لگائیں، ہم کچن میں جاتے ہیں۔“ یہ کہہ

کر وہ چل دی۔ میں نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی طرف دیکھا، بلاشبہ آرتی کا انداز شابانہ تھا۔ اسی لمحے میرے ذہن میں خیال آیا۔ کیا داسی

ایسی ہی ہوا کرتی ہے؟ اس کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔ میں نے کنول کی طرف دیکھا، وہ بڑی گہری نظر سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ پھر لگا ہیں

سلتے ہی وہ ہنس دی تو میں نے پوچھا۔

”کیا بات ہے، کنول؟“

”کچھ نہیں۔“ اس نے ہونٹوں کا ایک کون سیکھرتے ہوئے کہا۔

”کچھ تو ہے جو یوں مسکرا رہی ہو؟“ میں نے یونہی بات بڑھا دی۔

”اگر کچھ سوچنے کی بات ہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میں سوچ رہی تھی۔ انسان بھی کیا چیز ہے، کبھی انجانی معمولی باتوں سے بہل جانے

والا اور کبھی انہی معمولی باتوں کو اتنا کامستہ بنالینے والا۔“

”مجھے نہیں پتہ، کنول! کہ تم یہ کس بنیاد پر کہہ رہی ہو لیکن انسان اپنے اندر ایسی ہی رنگارنگی رکھتا ہے، کچھ بھی ممکن ہے۔“

”اچھا، شہناجی! آپ ایک بات تو بتائیں۔“ یہ کہہ کر وہ میرا عندیہ پانے کے لیے میرے چہرے پر دیکھتی رہی۔ میں خاموش رہا تو وہ

بولی۔ ”کیا آپ کے مذہب میں بھی برہمچاری کا تصور ہے؟“

”نہیں، کنول! ایسا نہیں ہے۔ جنس جیسے اہم عمل کے لیے ہمارے دین میں پوری وضاحت موجود ہے۔ اس میں کوئی ابہام نہیں، وچ نکہ یہ

ایک فطری تقاضہ ہے اس لیے دینی تعلیمات اسے انسان ہی کے دائرے میں رکھتی ہیں جبکہ دوسرے مذاہب اسے حیوانیت کی سطح پر لے آتے ہیں۔“

”پھر میں آپ سے یہ سوال ضرور کروں گی کہ آپ غورتوں سے دور کیوں رہتے ہیں؟“

”کون کہتا ہے کہ میں غورتوں سے دور رہتا ہوں۔ دیکھو تمہارے پاس نہیں بیٹھا ہوا۔“

”میرا مطلب، غورتوں سے وہ خصوصی تعلقات؟“ کنول نے بلا جھجک اپنی بات کی وضاحت کر دی۔

”اوہ، میں سمجھا، کنول! اصل میں بات یہ ہے کہ آپ ایک ہی واقعہ کو ہزار ہا دلوں سے دیکھ سکتے ہیں۔ یہ اختلاف اپنے اپنے نکتہ نظر کی وجہ

سے ہو سکتا ہے لیکن اس سے بھی ماوراء ایک اور بات ہے۔ وہ ہے تعلق کی نوعیت۔ کیا تعلق میں پاکیزگی ہے؟ ہمارا تعلق اپنی بیوی سے کیسا ہوتا ہے لیکن

اگر اس میں پاکیزگی نہیں ہے تو وہ تعلق حیوانیت کی سطح پر آ جاتا ہے۔ میں عورت کو محض ایک جسمی آلہ نہیں سمجھتا بلکہ انسان سمجھتا ہوں اور انسانی تعلقات

میں پاکیزگی کا قائل ہوں۔ ہاں یہ بات الگ ہے کہ پہلے میں ایسا نہیں تھا۔ اب عمل آگئی ہے۔“ آخر فقرہ کہتے ہوئے میں مسکرا دیا۔

”میں دیکھتی ہوں کہ سب بھوکے بیٹھنے کی طرح۔۔۔“

”روش، زمانے کی روش ہے، معمول بن چکا ہے۔ ایسے میں اگر کوئی ان جیسا نہیں ہوتا تو وہ حیرانگی ظاہر کرتے ہیں جیسے کہ ابھی تم نے

”برہمچاری“ والا سوال کر ڈالا۔ کنول! یہ جان لو کہ پوتر تاپا پاکیزگی کا تعلق روح سے ہوتا ہے۔۔۔ نہیں یہ اس سے بھی آگے کی چیز ہے۔“

”یہ کیا بات کی، آپ نے؟“

”کنول! یہ ایک بنیادی فلسفہ ہے۔ دنیا کے سارے مذاہب اسے کسی نہ کسی صورت میں مانتے ہیں۔ یہیں سے اپنے آپ کی پہچان کا

آغاز ہو جاتا ہے۔ خیر، یہ لمبی باتیں ہیں۔ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھو۔ اس وقت صرف اتنا سمجھ لو کہ ہمارے درمیان اگر پاکیزگی والا تعلق ہوگا تو

احتمالاً کس قدر مضبوط ہو سکتا ہے۔ اگر ذہن میں محض جسم اور اس کی لذتیں ہوں تو بے چینی اور بد سکونی کا گراف کیا ہوگا؟ اسی بنیادی فرق کو سمجھ لو تو

ساری بات کھم کر سامنے آ جائے گی۔“

”اور، شجاع جی! میں نہیں سمجھتی کہ آپ اس قدر موٹی موٹی ہاتھ بھی کر سکیں گے۔ یقیناً مجھے خوشی ہوئی آپ سے ایسی ہاتھ کر کے۔ یقیناً جانیں، میرے لیے یہ بالکل منفرد ہاتھ ہیں۔“

”ہمارے ساتھ رہو گی تو یونہی پیش کر دو گی۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”شجاع جی! ایک بات اور بتائیں اور وہ یہ ہے کہ ایسی ہاتھ آپ نے کبھی کہاں سے؟“

”یہ سب کچھ ہمارے اندر ہوتا ہے، کہیں باہر سے نہیں آتا۔ من میں سب کچھ موجود ہے۔ یہ ہماری سوچ ہے کہ ہم من کے خزانے سے کس بات کو پکڑتے ہیں اور اس کو اپنی خواہشوں کا مقصد جان لیتے ہیں۔ کوئی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عورت اور اس کے جسم کی لذتیں ہی سب کچھ ہے لیکن کچھ لوگ جانتے ہیں کہ یہ سب فریب نظر ہے، اپنے آپ سے دھوکہ ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت انسانیت کا احترام ہے۔ اسے میں تمہیں دوسری طرح بتا دوں کہ ہمارے دین میں نکاح سے پہلے کسی عورت سے جنسی تعلق بالکل حرام ہے لیکن جب وہ آپ کے نکاح میں آگئی تو آپ پر اس کے حقوق فرض ہو گئے۔ آپ اسے احترام دیں۔ اس کی نقطہ جسمانی ضرورتیں نہیں بلکہ ذہنی، اخلاقی اور روحانی ضرورت پوری کریں۔ عورت اس مرد کے ساتھ سکون محسوس کرے تو یہی انسانیت کا احترام ہے۔ لذت ظانوی حیثیت سے اختیار کر جاتی ہے اور سامنے رہتا ہے، انسان۔“ میں نے سگریٹ اینش ہارے میں بجھاتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ کی یہ ساری باتیں اپنی کوئی عملی حیثیت رکھتی ہیں یا بس یونہی تصوراتی ہیں؟“

”تم اپنی بات کی خودی تر دید کر رہی ہو، ایک طرف برہمچاری والا سوال اور دوسری طرف تمہارا یہ سوال، دیکھو، کیا میری دسترس میں عورتیں نہیں ہیں؟“

”بالکل ہیں، آپ کے پاس دولت ہے، آپ خود اسے سارٹ ہیں اور۔۔۔“

”اصل میں ہر انسان کا اپنا ایک دائرہ ہوتا ہے۔ اس سے تمہا ذہنی غلط بات ہے۔ میری ہاتھوں میں آ کر کوئی عورت چمیل جائے اور میں اس سے مزہ موڑ کر کہوں کہ بس یہی میری حد ہے تو یہ انتہائی ظلم ہے۔ آپ ابتدا تو کر چکے، آپ کی حد دوسرے کی ناک تک ہے۔ اس سے آگے غلط بات کی شروعات ہیں۔“ یہ کہتے کہتے میں چونک گیا۔ یہ کنول مجھے کس طرح ”پھرول“ رہی ہے۔ یہی سوچ ڈھن میں آتے ہی میں مسکرا دیا اور اس سے پوچھا۔

”کنول! آخر تم کہا کہا کیا چاہتی ہو؟“

”میں نے کیا کہا، میں تو یونہی گپ شپ لگا رہی ہوں بس، پلیز، ایک بات اور۔۔۔“ اس نے اٹلی کھڑی کرتے ہوئے احتجاجیہ انداز میں کہا۔

”بولو۔“ میں نے کہا۔

”کسی بہت بڑے مقصد کے لیے اپنی پوتر تا قربان کر دینا کیسا ہے؟“

”تم بات کو گھما کر پھر دوں لے آئی ہو۔ میں نے کہا نا کہ روحانی پاکیزگی ہی اصل پاکیزگی ہے۔ جسم قربان ہوا کرتے ہیں جب مقصد

کے لیے جسم اور اس کی لذتیں قانونی حیثیت اختیار کر جائیں۔ لیکن، کنول! کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس سوال کا پس منظر کیا ہے۔“

”ہے پس منظر، شجاع جی! لیکن ابھی اس کا وقت نہیں پھر کبھی سکے۔ یہ میں آپ سے شیئر ضرور کروں گی۔“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا اور پھر میری طرف دیکھ کر بڑی مسکرا دی۔ پھر ہم دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی اور میں نے سگریٹ سلا لیا۔ کتنے ہی لمبے یونٹی گزر گئے۔ تبھی حیدر اور اس کے ساتھ وہی دو لڑکیاں اندر آ گئیں۔ وہ ہم دونوں کو دیکھ کر حیرت سے بولا۔

”ارے، تم لوگ تو خاموش بیٹھے ہو۔ میرا تو خیال تھا کہ آپ لوگوں میں کوئی زبردست قسم کی بحث چھڑی ہوئی ہوگی۔“ میں نے حیدر کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اس کی طرف دیکھ کر ان لڑکیوں کی طرف دیکھا۔ حیدر میری نگاہوں کا مطلب سمجھ گیا اس لیے بجائے مزید بات کرنے کے وہ ان لڑکیوں کو لے کر باہر کی طرف چلا گیا۔ چند ہی لمحوں بعد دیکھتے ہوئے چہرے کے ساتھ آرتی لیکن سے وارد ہوئی۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولی۔

”یہ حیدر صاحب آئے تھے؟“

”ابھی آجاتے ہیں۔“ میں نے کہا تو مسکراتے ہوئے بولی۔

”بس کچھ دیر بعد ڈنر کرتے ہیں۔ میں فریش ہو آؤں۔“ یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے کی سمت چل دی۔ ڈنر پر ہم چاروں ہی تھے۔ کنول، آرتی، حیدر اور میں۔ میز انٹرین کھانوں سے بھری پڑی تھی۔ خوشگوار باتوں کے دوران ڈنر چل رہا۔ کھانے کے بعد سوڈا پیتے ہوئے آرتی نے بڑے مان سے پوچھا۔

”شجاع جی! کیا لگا میرے ہاتھ کا بنا ہوا کھانا؟“

”بہت اچھا، اگر ہم کسی سلطنت کے شہنشاہ ہوتے تو کہتے، جاؤ فلاں جاگیر تمہارے نام کی لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہم شہنشاہ نہیں ہیں ورنہ تمہیں کچھ دان کر دیتے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”آپ اب بھی کچھ دان کر سکتے ہیں۔“

”مثلاً؟“ میں نے یونٹی مذاق سے پوچھا۔

”بھئی ایک مسکراہٹ، ہمارے لیے بڑا تحفہ ہوگی اور۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”اور۔۔۔“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”اور ہماری ایک چھوٹی سی خواہش پوری کر سکتے ہیں لیکن آپ کہیں تو کہ مانگ۔۔۔ کیا مانگتی ہے؟“

”چلو میں کہہ دیتا ہوں کہ مانگ کیا مانگتی ہے، وہ اسی؟“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں نے سنا ہے کہ میں نے دو عینی میں ایک مندر ہے۔ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔ آپ کوئی ایسا بندوبست کر سکتے ہیں۔“ اس نے پہلے میری طرف پھر حیدر کی طرف دیکھ کر کہا۔

”دیکھو بھئی، آرتی! ہمارے تو ہاتھ کھڑے ہیں۔ تمہاری یہ خواہش شجاع جی پوری کر سکتا ہے۔ پہلے مندر تلاش کرنا اور پھر تمہیں وہاں لے

جانا۔" اس نے کمرے لہجہ میں کہہ دیا۔

"کیوں، شجاع جی! لے چلیں گے آپ؟" اس نے التجا سے انداز میں کہا تو میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، تبھی کنول بول پڑی۔

"مجھے کچھ کچھ اندازہ ہے کہ وہ مندر کدھر ہے۔ اسے میں تلاش کر لوں گی، لے کر آپ چلے جائے گا۔"

"چلیں، ٹھیک ہے، میں تمہیں مندر لے جاؤں گا۔" میں نے کہا تو آرتی کھل گئی۔ یکدم ہی اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ رات گئے تک

ہم ہاتھیں کرتے رہے۔ پھر کنول کو ذرا تیرو اس کے پارٹمنٹ چھوڑ آیا۔

اگلی صبح دفتر پہنچنے ہی سب سے پہلے میں نے ندیم کو بلا دیا۔ وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھا تو میں نے ذرا سخت لہجہ میں پوچھا۔

"یہ جناب کل کہاں غائب رہے ہیں۔ آپ کی مصروفیت اس قدر بڑھ گئی ہے کہ فون کر کے اپنے بارے میں اطلاع بھی نہیں دے سکے؟"

"سر جی! مجھے آپ کو فون کر دینا چاہئے تھا۔" اس نے مٹکھرا کہا اور خاموش ہو گیا۔

"وہ کون سا پاکستانی دوست تھا جس کے ساتھ تم نے کل کا دن گزارا؟"

"اطراف پاشا؟ سیکٹا پر اس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اچھا بندہ ہے۔ وہ آپ سے بھی ملنا چاہتا ہے۔"

"کیوں؟"

"ایسے ہی، بس میرے حوالے سے۔"

"مطلب، اتنی جلدی تم نے اسے اپنا سب کچھ بتا دیا؟"

"بتا دیا لیکن یہ کوئی اتنی جلدی نہیں، میں جب یہاں آیا تھا تب ہی سے اس کے ساتھ دوستی ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کے بارے میں

بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"حیرت ہے، پہلے کبھی تم نے اس کا ذکر نہیں کیا؟" میں نے کہا تو وہ خاموش رہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اب وہ مزید کچھ کہنے والا نہیں۔ اگر

میں اصرار کر کے پوچھوں گا بھی تو شاید جھوٹ بول دے مگر پریشانی والی بات تھی کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے، اس بندے سے اپنا تعلق کیوں چھپا رہا

ہے۔ وہ کون تھا اور کیسا بندہ تھا؟ یہ جاننا تو ضروری تھا۔ ندیم سے مجھے ایسے کسی رویے کی امید نہیں تھی لیکن حقیقت یہ تھی کہ وہ اپنا بدلہ ہوا رویہ لیے

میرے سامنے موجود تھا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ یہی سوال پوری شدت سے پوچھنا چاہ رہا تھا مگر یہ سوال میرے ہونٹوں پر ہی دم توڑ گیا۔ میں نے

ایک نظر ندیم کی طرف دیکھا اور پھر انظر کام پر کنول، حیات اور عیش کو بلا دیا تاکہ اپنے کام کے بارے میں ڈسکس کی جاسکے۔ تقریباً ایک گھنٹہ بعد ہماری

ڈسکس ختم ہو گئی۔ تب ندیم فوراً ہی اٹھ گیا۔ پھر اس کے ساتھ عیش بھی۔ شاید میرا رویہ ایسا ہو گیا تھا کہ نفا میں تاؤ آ گیا تھا اس لیے کنول نے اٹھتے

ہوئے کہا۔

"سرا میں نے اس مندر کا پتہ چلا لیا ہے۔"

"ٹھیک ہے، وہ سب ذرا تیرو کو سمجھا دو۔ مجھے تم سمجھاؤ گی تو بھی پتہ نہیں چلے گا۔"

”ٹھیک ہے، سارا“ کنول جیت نے دیکھے سے کہا اور اٹھ گئی۔ اس وقت میرے ذہن میں اندیم کارویہ تھا۔ مجھے قدرے دکھ ہوا تھا۔ اس نے ایسا کیوں کیا؟ یہی سوال بار بار میرے ذہن میں گھوم رہا تھا اور کئی سارے جواب میرے ذہن میں ایک کے بعد ایک کر کے آتے چلے گئے تاہم مطمئن کر دینے والا جواب تو اندیم ہی کے پاس تھا۔ دفتر میں کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا اس لیے میں اٹھ گیا۔

میں اپنے کمرے میں آ کر فریش ہوا اور ٹی وی آن کر کے بیٹھ گیا۔ ابھی کچھ دیر گزری تھی کہ دروازہ ہلکے سے بجا اور پھر کھٹکا چلا گیا۔ سامنے آرتی کھڑی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی سوال کرتا، اس نے پوچھ لیا۔

”آپ اتنی جلدی آگئے، طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“

”میں ٹھیک ہوں مگر تمہیں کیسے پتہ چلا کہ میں آ گیا ہوں اور وہ بھی جلدی؟“

”حیدر صاحب کا فون آیا تھا کہ آپ گھر پہنچ گئے ہیں۔ آپ نے ابھی لٹچ بھی نہیں لیا۔“ اس نے کہا تو مجھے یکدم ہی حیدر پر غصہ آ گیا۔ میں نے آرتی کو کسی قسم کا کوئی جواب دینے کی بجائے فون اٹھایا اور حیدر کے نمبر پر کال کر دی۔ رابطہ ہو جانے پر اس کی آواز ابھری۔

”جی، جناب! خیریت سے ہیں۔“

”میں تو ٹھیک ہوں لیکن تم میری جاسوس کیوں کرتے ہو۔“

”جاسوسی۔۔۔“ اس نے قدرے حیرانگی سے کہا اور پھر قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ”مطلب آرتی تمہارے پاس پہنچ گئی ہے۔ یارا مجھے تمہارا خیال نہیں رکھنا چاہئے؟“

”یارا! کیا میں دودھ پینا چاہتی ہوں۔ میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں اور پھر تم یہ غورتوں بھیج بھیج کر مجھ پر کیا ثابت کرتا چاہتے ہو، بولو؟“ یہ کہتے ہوئے میں اسے بے نقط بنا دیا۔

”یارا! اس وقت وہی گھر میں ہے اس لیے میں نے اس سے کہہ دیا۔ میں نے دفتر فون کیا تھا تو پتہ چلا تم گھر آ گئے ہو۔“

”تم مجھے میرے سب فون پر بھی کال کر سکتے ہو، براہ راست پوچھ سکتے ہو۔“

”پر سکون ہو جاؤ، یارا! میں آ رہا ہوں۔ بیٹھ کر بات کرتے ہیں۔“ اس نے دیکھے لہجے میں کہا۔

”فاک بات کرنی ہے تم نے۔۔۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ مجھے اس وقت شدت سے حیدر پر غصہ آ رہا تھا۔ میں نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ میں ایک لمحہ کو بھول گیا کہ آرتی ابھی وہیں کھڑی ہے۔

”ہم سے کچھ بھول ہو گئی؟“ آرتی نے گلہ گیر لہجے میں کہا تو میں نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ سرخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھ رہی تھی۔

”نہیں، آرتی! تم سے کوئی غلطی نہیں ہوئی۔ میری ہی سوچ کا ٹریک کسی اور سمت میں ہے۔“

”ہم کبھی نہیں۔“ اس نے کہا۔

”تمہیں کبھی کی ضرورت بھی نہیں ہے، پلیز تم جاؤ۔“ میں آپ سے تم پر اترا آیا۔

”نہیں، شہارجی! آپ ہمارے ساتھ ایسا سلوک مت کرو یا تو ہماری غلطی بتاؤ یا پھر ایسے طریقے سے بات نہیں کرو۔“ اس نے قدرے

تن کر کہا۔

”کیا چاہتی ہو تم؟“ میں نے ذرا سخت انداز میں کہا تو وہ پاس تھا بیڈ پر بیٹھ گئی اور بڑے ہی گھمبیر انداز میں بولی۔

”جس طرح آپ کے ہارے میں سنا تھا اس سے یہ تو نہیں لگتا تھا کہ آپ بزدل ہوں گے لیکن آپ اپنے رویے سے ثابت کر رہے کہ

آپ بزدل شخص ہیں۔“ اس نے ایک بڑی بات بڑی آسانی سے کہہ دی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ میری نگاہوں میں نگاہ ڈال کر

دیکھنے لگی تو میں نے پوچھا۔

”کیا کہنا چاہتی ہو تم؟“

”یہی کہ آپ تو اپنے آپ کو بارود بنانے بیٹھے ہیں جو عورت کے ذرا سا ساتھ کھنے سے بھڑک اٹھے گا۔ آپ اپنے سے ڈرتے ہیں۔

اپنی شخصیت میں کہیں کوئی خامی رکھتے ہیں جو عورت سے یوں بدگ رہے ہیں۔“ یقیناً آرتی کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ اسے سمجھانے کے لیے

ایک لمبی بحث کی ضرورت تھی مگر میں اس پر ایک لفظ بھی نہیں کہنا چاہتا تھا کیونکہ میں لفظ ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا سو میں نے چند لمبے اس کی

طرف دیکھا اور بڑے نرم انداز میں کہا۔

”تم کہہ سکتی، جو کہنا تھا یا ابھی کچھ باقی ہے؟“

”ہاں ایشیا ہے کہ اتنا ہی بہت ہے۔ اس پر اگر آپ جواب دے سکتی تو؟“ یہ کہتے ہوئے اس کا لہجہ طویہ تھا۔

”مگر میں جواب دینے کے موڈ میں نہیں ہوں، تم جا سکتی ہو اور ہاں، آج شام تیار رہنا۔ میں تمہیں مندر لے جاؤں گا۔“ میں نے کہا تو وہ

حیرت زدہ ہی رہ گئی۔ اس کے چہرے پر کس طرح کے جذبات ابھرے، میں نے یہ دیکھنے کی زحمت ہی نہیں کی اور ٹی وی سکرین پر دیکھنے لگا۔ وہ چند

لمبے ٹپٹی رہی پھر اٹھ کر چلی گئی۔ تھوڑا وقت گزرا ہو گا کہ آرتی وہ بارہ آگئی۔ اس کے ساتھ بنگالی باورچی ہاتھ میں لڑے تھے کھڑا تھا۔

”شاب! ایچ۔“ اس نے آہستگی سے کہا۔ میں نے اسے اشارے سے بیڈ پر رکھ دینے کو کہا اور ہاتھ روم میں چلا گیا۔ واپس آیا تو آرتی

میرے بیڈ پر ارجمان تھی۔ میں نے اسے ایک دلہہ کھانے میں ساتھ دینے کہا۔

”میں کھا چکی ہوں۔“ اس نے مختصر کہا اور گلاس میں پانی ڈالنے لگی۔ میں کھا چکا تو وہ دونوں برتن سینٹے لگے، چھی میں نے آرتی سے کہا۔

”ہو سکتا ہے، میری آنکھ لگ جائے۔ تم مجھے دقت پر جگا دینا۔“ اس پر آرتی نے کوئی جواب نہ دیا اور میں بیڈ پر پھیل کر لیٹ گیا۔

میں تیار ہو کر پورچ میں کھڑا تھا کہ آرتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کی ساڑھی پہنی ہوئی تھی۔ ہاف سلیو بلاؤز اور سفید سینڈل۔

عام ہندو عورتوں کی طرح اس کی کمر کھلی ہوئی تھی۔ وہ بلا جھجک جھجکی سیٹ پر آن بیٹھی تو ڈراما ٹیور نے گاڑی بڑھا دیا۔ چھی آرتی نے ڈراما ٹیور سے پوچھا۔

”کتنا وقت لگے گا؟“

”ایک گھنٹہ بھی لگ سکتا ہے یا اس سے زیادہ بھی دیکھیں، ٹریفک کیا کتنی ہے۔“ ڈرائیور نے صوب لہجے میں کہا۔ میں خاموش رہا اور پھر یہ خاموشی طویل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ ایک بڑے سے چوک سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے کہا۔

”سر! ہم سیف روڈ سے علی ابن طالب روڈ پر ہیں۔ آگے بہت زیادہ رش ہوتا ہے اور غالباً ہمیں پارکنگ کے لیے بھی جگہ نہ ملے۔ ہمیں سٹیٹس کہیں پارکنگ کے لیے جگہ دیکھنا ہوگی اور یہاں سے تھوڑا پیڈل چلانا ہوگا۔“

”ٹھیک ہے، لیکن دیکھ لو اگر کہیں قریب ترین جگہ مل جائے۔“ میں نے کہا تو وہ بولا۔

”میں دیکھتا ہوں کہ دوپنی میوزیم کی پارکنگ میں جگہ مل جائے۔“ میں نے ڈرائیور کے ساتھ وقت ایڈجسٹ کر لیا کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد وہ ہمیں لے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے ہمیں ایک مینار والی بڑی مسجد کے سامنے اتار دیا۔

مندر اسی عالی شان مسجد سے متصل ہے۔ مسجد کے دروازوں کے سامنے دوپنی میوزیم ہے۔ میوزیم کی طرف سے دیکھیں تو مسجد کے دروازے پر لگے پلیدے لکھا ہوا ہے جبکہ مسجد کا نام کہیں نظر نہیں آتا۔ مسجد کے دو دروازے مندر کی طرف ہیں۔ چونکہ مسجد کا گن کافی اونچا ہے اس لیے ان دونوں دروازوں کے باہر بھی میڑھیاں ہیں اور گن کی میڑھیوں کے بالکل سامنے مندر کی میڑھیوں۔ مندر اور مسجد کے درمیان حد قاصد شکل کے دو دو فٹ پائپ ہیں۔ مسجد کے حصے میں پائپس لگی ہوئیں ہیں جبکہ مندر کی جانب کچی جگہ ہے۔ عورتیں اور مرد پیڈل ہی مسجد کے ارد گرد سے ہوتے ہوئے مندر جا رہے تھے۔ اس وقت خاصا رش تھا۔ شمال کی طرف سے مندر کا مین دروازہ تھا اور دروازے پر بے شمار قسم کے پھولوں کے ہار لگ رہے تھے۔

”میں پوچھا کہ لیے کچھ چیزیں لینا ہے۔“ آرتی نے میری طرف دیکھ کر دھیمے لہجے میں کہا۔

”آؤ، دیکھتے ہیں یہاں سے اگر کوئی ایسی دوکان ہوئی تو؟“ میں نے کہا تو آرتی نے بوے نرم انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے اس پر ڈراما بھی رد عمل ظاہر نہیں کیا بلکہ نارمل انداز میں چنار ہا۔ چلی تپتی لگیوں میں ہوتے ہوئے ایک ایسی جگہ میں آگے جہاں بہت سی ایسی دوکانیں تھیں جن پر ہندوؤں کی پوجا پات کا سامان دھرا ہوا تھا۔ مختلف پھولوں کے ہار، گجرے، دیوتاؤں کی تصویروں، منگل سوتر، چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں، چھوٹی چھوٹی پتلی کی کٹوریاں، تھالیاں، دیئے، پرشاد کے لیے مٹھائیاں وغیرہ۔ آرتی وہاں سے کئی چیزیں اکٹھا کرتی رہی۔ ایک تھال میں پوجا کے لیے کئی کچھ سجایا۔ خاصے پھول لیے۔ میں نے ٹل دینے کے لیے پرس نکالا تو اس نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”شاید اس طرح ہماری پوجا سونیکار نہ ہو۔“ آرتی نے دے ہوئے لہجے میں کہا تو میں نے پرس واپس جیب میں رکھ لیا۔ اس نے درہم دیئے اور وہاں سے پلٹ پڑے۔ مندر انہی چھوٹی چھوٹی تپتی لگیوں کے اوپری منزل پر بنا ہوا تھا۔ میں مندر کے بوے دروازے تک آرتی کے ساتھ گیا۔ دروازے پر ہندی میں کچھ لکھا ہوا جو ظاہر ہے ہندی نہ جاننے کی وجہ سے مجھے سمجھ میں نہ آیا۔ میں دروازے پر رک گیا۔ آرتی نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا۔ اس نے نگاہوں ہی نگاہوں میں اندر پلٹنے کا کہا لیکن یونہی میرے دل میں اک کھٹکا سا ہوا، اندر جانے کے لیے میرا دل نہیں مانتا۔ جس بات سے دل میں کھٹکا ہو، دل دھڑک جائے اس سے باز آ جانا چاہئے، یہی بڑوں کی صحت ہے۔ اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا لیکن میں نے آہستگی سے چمڑا یا اور پیچھے ہو گیا۔ چونکہ وہاں رش تھا اس لیے آرتی اگلے ہی لمحے مندر کے اندر چلی گئی۔ مندر کی میڑھیوں کے سامنے لہاسا

لان تھا۔ خوبصورت سرسبز و شاداب گھاس، لان کی حد بندی کے لیے باز اور اس حد بندی میں جا بھار کئے ہوئے بیٹھے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ ماتھے پر خشک لگائے ہندو غورتیں اور مرد خاصی تعداد میں وہاں نظر آ رہے تھے۔ میں کافی دیر تک وہیں بیٹھا ان لوگوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اتنا کروہاں سے اٹھ گیا۔ آرتی کا دھیان، گیان کچھ زیادہ ہی لہا ہو گیا تھا۔ میں وہاں سے دھیرے قدموں سے چلتا ہوا لان سے باہر آ گیا۔ پھر تکی گلی سے نکلتا ہوا کٹے میں آ نکلا جہاں خوبصورت ٹانگوں سے مزین فرش تھا اور اس کے آگے صاف و شفاف نیلگوں سمندر۔ وہاں بے شمار چھوٹی چھوٹی کشتیاں تھیں اور کارگو ٹائپ لائیں۔ میں چند منٹ ان کا نظارہ کرتا رہا پھر پلٹ گیا۔ راستے میں ایک گرومری شاپ سے خوشبوئیں خریدیں اور یوں اچھا خاصا وقت ضائع کر کے میں دوبارہ سمندر کے دروازے پر آ گیا۔ جہاں ایک طرف آرتی پینس کا قہال ہاتھ میں پکڑے کھڑی تھی اور اس کے چہرے پر پریشانی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی جیسے اس کی سانس میں سانس آ گئی ہو۔ وہ تیزی سے میری طرف بڑھی۔ میں اور وہ پہلو پہلو پھٹتے چلے گئے۔ یہاں کہ مسجد کے قریب سے گزر کر شارع علی ابن طالب پر آ گئے۔ ڈرائیور روپے گئے وقت پر پہنچ جانے کو تھا۔ ہم دونوں وہیں کھڑے تھے اور خاموش تھے۔ آرتی کے ہاتھ میں پینس کا ایک قہال اب بھی پکڑا تھا۔ اس میں مٹھائی، پھول اور دیباڑا ہوا تھا۔ شاید پانی سے بھری کنواری بھی تھی۔ آرتی خاموش تھی اور میں نہیں چاہتا تھا کہ اس کی خاموشی میں دل دوں۔ میں متعین وقت پر ڈرائیور گاڑی لے آیا۔ میں نے جیسے ہی آگے بیٹھنا چاہا تو آرتی بولی۔

”آپ پیچھے بیٹھنے کا وہ ہمارے ساتھ۔“ اس کی نظروں میں الجھتی۔ میں نے پہلے اسے بیٹھنے کا موقع دیا اور پھر خود بیٹھ گیا۔ گاڑی نے ابھی کچھ فاصلے طے کیا ہی تھا کہ اس نے قہال میں سے مٹھائی اٹھا کر مجھ دیتے ہوئے کہا۔

”یہ لیں، بھگوان کا پرشاد ہے۔“ میں نے اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کھا لیا۔ وہ ایک طرح سے لندو قسم کی مٹھائی تھی۔ پھر کنواری سے پانی میرے ہاتھ پر ڈال دیا۔

”اسے پی لیں۔“ میں نے وہ پی لیا تو وہ بڑے جذبات سے بولی۔ ”بہت شکر ہے۔“ اور ساتھ ہی اپنا سر میرے کانہ سے پرکھ دیا۔ میں نے اس کا سر نہیں ہٹایا۔ کافی دیر بعد میں نے اس سے پوچھا۔

”آرتی! کیا دعا مانگی ہے وہاں پر؟“

”یہ پوچھنے والی باتیں تھوڑی ہوتی ہیں۔ بس مانگ لیا جو مانگتا تھا۔“

”مثلاً، کیا میرے لیے کوئی پراگتھنا کی ہے؟“ میں نے قدرے اصرار سے پوچھا۔

”ہوں، وہی ہے لیکن آپ یہ مت پوچھئے گا کہ کیا؟“

”چلیں، ٹھیک ہے۔ کچھ نہ کچھ تو مانگا ہے۔“ میں نے ہستے ہوئے کہا تو اس نے میرے کانہ سے سر اٹھا لیا اور دھیرے سے انداز میں بولی۔

”دیکھیں، شجاع ازنگی میں انسان کو وہ سب کچھ نہیں ملتا جس کی وہ چاہ کرتا ہے لیکن ہمیں بھگوان سے پراگتھنا کرتے رہنا چاہئے۔ نجانے کب اور کس وقت ہم پر دیا (رحم) کر دے۔ میرا یقین یہی ہے کہ وہ ہماری ضرورتوں سے بڑھ کر ہمیں دیتا ہے۔“ میں جو اہا خاموش رہا اور پھر سارے

راستے ہمارے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ جس وقت گاڑی گھر کے پورچ میں رکی تب اندھیرا اٹھل چکا تھا، ہم سنگ روم میں داخل ہوئے تو سامنے صوفے پر حیدر براجمان تھا اور اس کے ہاتھ میں سگریٹ سلگ رہی تھی۔ اس کے ساتھ کنول جیت، حمیش اور عدیم بیٹھے ہوئے تھے۔

”آئیے آئیے، سرکار! ادھر ہمارے پاس پدھارے۔“ مجھے دیکھتے ہی حیدر نے انتہائی شوخی سے کہا تو مجھے اپنے دو پہر والے حصے کا خیال آ گیا۔ یقیناً یہ اسی کا رد عمل تھا کہ وہ یہاں میرے انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھا تو عدیم نے کہا۔

”شجاع، بھائی اکافی دیر لگا دی۔“

”کیا تم لوگ باجماعت میرا انتظار کر رہے تھے؟“ میں نے طنز یا عداوت میں کہا۔

”تو اور کیا، حضور! ہم نے سمجھا، آپ کہیں گم ہی نہ ہو گئے ہوں۔“ حیدر نے یہ کہتے ہوئے میری طرف دیکھا اور تہ لب لگا کر ہنس دیا۔

”یہ لیجئے، پرشاد۔“ آرتی سب کو وہ منٹائی دے رہی تھی۔ حمیش نے انتہائی عقیدت سے وہ پرشاد لیا پھر پانی پی کر ہاتھ سر پر پھیر لیا۔ عدیم اور کنول جیت کو اپنے کے بعد وہ قتال میز پر کھ کے صوفے پر بیٹھ گئی تو حیدر نے پوچھا۔

”کہو، آرتی! کیا ہاتھ مارا مندر جاتا، آسانی سے مل گیا تھا؟“

”جی، میں شجاع جی کی شکر گزار ہوں۔ مجھے ذرا سا بھی اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔“

”یہاں پتا شجاع ہے ہی اتنا پیارا۔“ حیدر مجھے آنکھ مارتے ہوئے بولا تو میں نے بڑے ٹھہرے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”تم بدل گئے ہو یا پھر تمہیں یہاں کے ماحول نے تبدیل کر دیا ہے۔“

”مطلب، میں سمجھا نہیں؟“ حیدر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”تم میرا خیال رکھنے کے لیے کبھی کنول جیت سے کہتے ہو، کبھی آرتی سے۔ کوئی مرد نہیں ہے تمہاری نظر میں جس کے ساتھ میں بہت اچھا وقت گزاروں۔“ میں نے انتہائی خمیہ گی سے کہا۔

”میں اب بھی تمہاری بات نہیں سمجھا۔“ وہ دھیرے سے بولا۔

”میرے کہنے کا مطلب یہ ہے، پیارے! کہ مجھے عورتوں کی عقل نہ دو۔ میں یہیں گم ہو کر نہیں رہنا چاہتا۔ آئندہ میرا اس طرح کا خیال نہ رکھا کرو۔“

”ویری سوری، شجاع جی! اس طرح کہہ کر آپ ہماری سوانیت کی توہین کر رہے ہیں۔“ آرتی نے ڈرامائی سے کہا تو حیدر تیزی سے بولا۔

”نو، آرتی! تم ایک لفظ بھی نہیں کہو گی۔ میرا دوست ٹھیک کہہ رہا ہے۔ میں ہی غلط تھا اور جہاں تک توہین والی بات ہے۔ تم شاید اس بات کو

نہ سمجھو، یہ شخص کہیں زیادہ عورتوں کو احترام کرتا ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا رخ میری طرف موڑا اور معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ ”سوری، شجاع! میں آئندہ خیال رکھوں گا۔“

”یہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دیا اور بولا۔

”آج پتہ ہے یہ سارے کیوں متع ہیں یہاں پر؟“

”نہیں، مجھے نہیں پتہ۔“

”آج بھر پور ڈنرہ وگا اور بھرا چھیسی لم دیکھی جائے گی اور آج کی شام، شجاع ویر کے غصے کے نام!“ یہ کہہ کر وہ میرے قریب ہوا اور دھیرے سے پوچھا۔ ”اب تو غصے نہیں ہے نا؟“ اس پر میں نے فس دیا تو سبھی خوش ہو گئے۔ تبھی مجھے مندر کے قریب سے خریدی گئی خوشبوؤں کا خیال آیا۔ ڈرائیور ایک طرف میز پر رکھ گیا تھا، وہ اٹھا کر میں نے سب میں بانٹ دیں۔

”لہجے یہ میرا پر شاد ہے۔“ میرے یوں کہنے پر سبھی ہنس دیئے۔ میں سونے پر بیٹھا ہی تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری جانب حسن تھا۔

”ارے، او جان جی! کدھر ہو؟“ اس کے لہجے میں تھر تھرائی ہوئی شوخی تھی۔

”جہاں تم نے دکھایا تھا۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو قدرے سنجیدگی سے بولا۔

”ایک بری خبر ہے، آصف چودھری نے دو دو شاؤٹل کروا لیے۔“ اس نے ظہرے ہوئے انداز میں کہا تو میں چونک گیا۔

”دہاٹ، کب ہوایا واقعہ؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”آج دوپہر کے بعد۔۔۔“

”اور تم مجھے اب بتا رہے ہو؟“

”تو کیا ہوا، میں اس کی گینگ کا رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ بہت بھگ گیا ہے۔ وہ اپنے لوگوں کو حکم دے چکا ہے کہ شجاع اور آصف چودھری سے متعلق جو کوئی بھی شخص جہاں سے اٹھا لو یا قتل کر دو۔“

”یہ تو بہت برا ہوا۔ وہ لوگ تم تک بھی پہنچیں گے۔ عامر اور دوسرے لوگ؟“

”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔“

”کیا خاک بندوبست کیا ہوگا تم نے، یہی وقت تھا جب میری ضرورت تھی۔ میں دیکھ لیتا ایک ایک کو، میں پہنچ رہا ہوں۔ جو مجھے پہلی

فلامیٹ ٹی اسی پر آ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون بند کر دیا۔

”کیا ہوا؟“ حیدر نے پوچھا تو میں نے سب کچھ کہہ دیا۔

”فوراً میری فلامیٹ کا بندوبست کرو۔ میں لاہور جانا چاہتا ہوں۔“ میں نے تیزی سے کہا۔ اس سے پہلے کہ حیدر مجھے جواب دیتا اس کا

سیل فون بول اٹھا۔ وہ حسن کا فون ہی تھا۔ حیدر اس سے کافی دیر باتیں کرتا رہا۔ پھر فون بند کر کے بولا۔

”حوصلہ رکھو، اس نے آئی جی اور محکمہ داخلہ کے وزیم سے بات کر لی ہے۔ بندے متعین ہو چکے ہیں۔ وہاں پر کوئی چڑی بھی پر نہیں مار سکتی۔

حسن اپنے گھر میں ہے اور پولیس مگرانی کر رہی ہے۔ رہی عامر کی بات تو وہ اپنی حفاظت کر سکتا ہے۔“

”اور آصف۔۔۔“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”وہ تو اب میدان میں ہے۔“ حیدر نے کہا تو میں نے تیزی سے آصف کے نمبر پیش کر دیئے۔ رابطہ ہو جانے پر میں نے اس کی آواز سن کر کہا۔
”یہ میں کیا سن رہا ہوں۔“

”ٹھیک سن رہے ہو، وہ بہن۔۔۔ بہت تنگ کر رہا تھا۔ وہ تو وہ، اس کی گینگ کا ہر بندہ منافی نکلا۔ میں نے آج چھوڑ دیا تھا اسے لیکن اگلے گھنٹے میں انہوں نے میرے دو بندے مار دیئے۔ مجھے بروقت پہنچنا تو تم میری خبر سنئے۔ میں نے بس درمیان والے بندوں کو بتایا اور دو دو شاہ کو پار کر دیا۔“

”صورت حال کیا ہے؟“

”ٹھیک ہے، ان کی گینگ کا ایک ایک بندہ تلاش کر کے ختم کروا رہا ہوں۔ آج یا کل وہ پار ہوں گے۔“

”لیکن تم ان سب کا مقابلہ۔۔۔ آصف میں آ رہا ہوں۔ پہلی فلائینگ سے آ رہا ہوں۔۔۔ تم گھبراؤ نہیں۔ خدا کے لیے مجھے روکنا مست۔“

”تم یہاں آ کر کیا کرو گے، میری پریشانی میں اضافہ ہوگا۔ مجھے۔۔۔“

”یکو اس کرتے ہوئے تم، میں نے چوڑیاں پٹنی ہوئی ہیں یا میں ہتھیار چلانا بھول گیا ہوں۔“

”دیکھو، میرے دوست! ہر بندے کی اپنی ایک جگہ ہوتی ہے۔ تم جہاں پر ہو وہیں ٹھیک ہو۔ اگر ضرورت پڑی تو میں بھی تمہارے پاس آ جاؤں گا، میرے لیے جگہ بنا کر رکھو۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”یہ وقت تفصیلی باتوں کا نہیں ہے۔ یہ ساری پریشانیاں ختم ہو جائیں تو میں خود آ رہا ہوں دعویٰ یا کچھ دنوں کے لیے تمہیں یہاں بلاؤں گا۔“

میرے ذہن میں پورا ایک پلان ہے اور باقی رہا یہ دو دو شاہ کا گینگ، آج رات ہی اس کی خبر ستار ہا ہوں۔“

”دیکھو مجھے بہلاو سے مت دو۔“

”کم از کم میں تمہیں بہلاو سے نہیں دے سکتا۔ سارے حالات میرے ہاتھ میں ہیں، تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔“

”وہ نالہ۔۔۔“

”وہ سب لوگ میری نظر میں ہیں۔ حسن سے میرا پوری طرح رابطہ ہے۔ یہ گزری مشکل ضرور ہے لیکن اتنی بھی نہیں کہ میں بے بس ہو جاؤں۔ پولیس بھی ان کا خاتمہ چاہ رہی ہے۔ ان کے دماغ میں یہ نہیں آتی کہ جب وہ ہی نہیں رہا تو کہاں کی دشمنی۔۔۔“

”دیکھو، آصف! اگر تم لوگوں کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے آپ کو مخالف نہیں کر پاؤں گا۔“

”پاگل ہو گیا ہے، سچ تک سب کچھ پر سکون ہو جائے گا۔ ابھی تو وہ دو دو شاہ کو دھا رہا ہیں۔ تم سکون سے سو جاؤ، درد سہنا بھلی کرے گا۔“

”مجھے یوں چٹکن نہیں آئے گا۔ میں تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“ اس نے کہا اور پھر اودامی باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ میں نے فون کان سے ہٹایا تو حیدر نے میری جانب دیکھ کر کہا۔

”تو رو رہا ہے؟“

”میں رو رہا ہوں؟“ یہ کہتے ہوئے میں نے آنکھوں پر ہاتھ لگایا تو مجھے نمی محسوس ہوئی۔ میں نے فوراً آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا، ”نہیں، میں نہیں رو رہا۔ تم بہر حال میری سیٹ کا بندوبست کرو۔ حالات ٹھیک ہوتے ہی واپس آ جاؤں گا۔“

”اچھا، میں دیکھتا ہوں، آؤ کھانا کھاتے ہیں۔“ حیدر نے کہا تو مجھے نالکہ کا خیال آیا۔ میں اسے لمبے اے کال کی۔

”کیسی ہو؟“ میں نے اس کی مدد پر آواز سنتے ہوئے پوچھا

”میں بالکل ٹھیک ہوں اور اس وقت حسن صاحب کے گھر میں ہوں۔“ اس نے خوشگوار انداز میں کہا۔ پھر سکون سے بولی ”آپ پریشان مت ہوں۔ میری حسن صاحب سے ابھی تفصیلی بات ہوئی ہے میرا خیال بھی یہی ہے کہ میں آپ کو سمجھاؤں کہ آپ یہاں نہ آئیں۔“

”تم بھی نالک۔“

”میں بھی شجاع امیں بھی۔“

”ایک دو دن کے لیے۔۔۔“

”قلعہ نہیں، میں خود آ رہی ہوں دوپٹی۔ بس یہ ذرا معاملہ ٹھیک ہو جائے۔“

”حاضر؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اسے کسی امتحان میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ آگے کیا ہوگا، وہیں آ کر طے کریں گے لیکن آپ یہ یاد رکھیں کہ آپ نے واپس نہیں آنا۔“

”اوکے!“ میں نے تھی انداز میں کہا اور فون بند کر دیا۔ تبھی حیدر نے کہا۔

”شجاع اتم گھبراؤ مت۔ جس وقت تم چاہو، سیٹ اوکے ہو جائے گی لیکن اس وقت تمہارے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے ایک لاکھ روپے کا بندوبست کیا ہے۔ وہ میں حسن کو بھجوا رہا ہوں۔ پیسے کی ایک اپنی طاقت ہوتی ہے، یا ر!“ اس نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اس کے لفظ مت ہی میں تھے کہ اس کا سب فون بھا۔ وہ کچھ دیر دوسری طرف سے سنتا رہا پھر فون بند کر کے حسن کے نمبر پر کئی کیے۔ وہ کھتا رہا اور میں منتا رہا۔

”حسن میں ایک لاکھ روپے بھجوا رہا ہوں، وہ آصف چودھری پر وار دینا، ضرورت پڑی تو مزید بھجواؤں گا۔۔۔ ہاں ہاں۔۔۔ میں نے

تمہارا نمبر دے دیا ہے انہیں۔ میں نے یہاں روپے دے دیئے ہیں۔ روپے دو تھک پنچا دیں گے۔۔۔ نہیں نہیں ابھی کچھ دیر بعد وہ تمہیں کال کر لیں

گے۔ تم ان کے ساتھ ایڈجسٹ کر لینا کہ کس طرح کرنا ہے۔۔۔ ہاں یہ ٹھیک ہے، میں نے اسے سمجھا دیا ہے۔۔۔ ٹھیک ہے۔۔۔ اوکے، رابطہ رکھنا۔

اللہ حافظ۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کیا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”اڈے چل، بھائی اٹھ، کھانا کھا لیں۔ کچھ نہیں ہونے والا۔ سب ٹھیک ہے۔“

کہہ کر وہ اٹھا اور پھر ہم سب کھانے کی میز تک جا پہنچے۔ پھر کھانے کے بعد سب اپنے اپنے ٹوکے تک جا پہنچے۔

وہ رات میں نے بڑی مشکل سے گزاری۔ بار بار نیند سے چونک جاتا۔ مجھے یوں لگتا جیسے ابھی فون کی گھنٹی بجی ہے لیکن غور کرنے پر چہ

چلتا کہ میرا وہم ہے۔ یونہی سوتے جاگتے صبح ہو گئی۔ میرا سر ہلکا ہلکا درد کر رہا تھا میں ہاتھ روہ سے منہ ہاتھ دھو کر نیچے سٹنگ روہ میں آ گیا۔ پورے گھر

پر خاموشی طاری تھی۔ میں نے خود چائے بنانے کے لیے فریج کھولا تو نجانے کدھر سے بنگالی ہاورچی آچکا۔

”ہم چائے بنا تا ہے، شاپ! آپ بیٹھو۔“ میں کچن سے نکل آیا۔ تبھی راہداری میں سے بھجن کی آواز گونج اٹھی۔ یقیناً آرتی نے اپنی عبادت شروع کر دی تھی۔ میں وہ ہیں کھڑا کافی دیر تک وہ موسیقی سنتا رہا۔ ہاورچی چائے دے گیا تو میں ٹہلنے ہوئے آرتی کے کمرے کی جانب چل دیا۔ اس کا دروازہ پورا کھلا ہوا تھا۔ اس نے گدا اٹھا کر دیوار کے ساتھ لگا دیا تھا اور بھجن کی موسیقی کے ساتھ سال ملائے رقص میں ڈوبی ہوئی تھی۔ میں چائے کے پلکے پلکے سپ لیتا رہا اور اس کے قمرے کے ہونے جسم کو دیکھتا رہا۔ بلاشبہ وہ ماہر رقاصہ تھی۔ میری چائے ختم ہو گئی تو کچھ دیر بعد کیسٹ بھی رک گئی جس کے ساتھ ہی آرتی کے پاؤں ختم ہوئے۔ وہ مورتی کے سامنے اپنے انداز میں بہت کچھ کرتی رہی۔ پھر میرا احساس کر کے جلی تو مجھے سامنے پا کر کھل اٹھی۔

”آپ شجاعی! آئیے۔“ اس نے بڑی ادا سے کہا تو میں اندر چلا گیا۔ تب تک وہ گدا دوبارہ فرش پر بچھا چکی تھی۔ میں کچھ چکا تھا کہ وہ ایسا کیوں کرتی ہے۔ میں بیٹھا تو وہ بھی بیٹھ گئی، اگر تپوں سے کمرہ صیک اٹھا تھا۔ اس نے غبار آلود لہجے میں کہا۔

”گستا ہے، آپ رات بھر اچھی طرح سو نہیں پاتے ہیں۔ آپ کی آنکھوں سے اب بھی شراب ٹھک رہا ہے۔“

”ہاں، یار! ایسا ہی ہے۔“

”چلیں، کوئی بات نہیں آج آپ دفتر مت جائیں۔ سکون سے سو جائیں۔“

”ادھر کپڑا پڑا ہوا تو بے سکون رہوں گا، نیند تو پھر بھی نہیں آئے گی۔ وہاں دل بہل جائے گا۔“

”سو جانے کی کوشش تو کریں، آپ۔۔۔“

”مجھے پتہ ہے، نا، آرتی! کہ نیند نہیں آئے گی۔ من حالات میں بھلا کیسے سو سکتا ہوں۔“

”آپ ایک کام کریں۔ یہاں آرام سے لیٹ جائیں، ہم آپ کو سو جانے میں مدد دیتے ہیں۔“

”لیکن۔۔۔“ میرے لہجے پر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر آواز نکالی۔

”شی ای ای ی۔۔۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے میرے کاندھے پر دو ہاؤ ڈالا اور لٹا دیا۔ پھر بڑی آہستگی سے اس نے میرے پاؤں مسلنے شروع کر دیئے۔ اس کے ہاتھوں میں کوئی جادو تھا۔ میں آہستہ آہستہ نیند میں ڈوبتا چلا گیا۔ پھر مجھے ہوش ہی نہ رہا کہ میں کہاں ہوں میری آنکھ کھلی تو مجھے اندازہ ہوا کہ میں کہاں ہوں؟ آرتی ایک طرف یوگا کا کنول آسن بنائے بیٹھی تھی۔ وہ اٹھنائی مختصر لباس میں بے حس و حرکت بیٹھی ہوئی تھی۔ میں اتنی دیر تک اسے بیٹھا دیکھتا رہا۔ پھر جیسے ہی میں نے کروٹ بدلی، اس نے آنکھیں کھول دیں۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی، بڑے دو جیسے لہجے میں بولی۔

”کیسی نیند آئی؟“

”بھئی زبردست، تم نے کیا جادو کر دیا تھا۔“

”ہم نے کیا جاو کرنا ہے۔ بس ذرا ٹیجی تھرائی میں قدرے مہارت ہے۔“

”ٹیج تھرائی۔؟“

”ہاں، یہ بھی ویڈیوں کی ایک تعلیم ہے۔ مجھے اس کا علم دیا گیا ہے۔ بس اتنا سمجھ لیں کہ چھوٹے سے بس سے بہت کچھ ممکن ہے۔“

”کمال ہے۔“ میں نے حیرت سے کہا۔ پھر سامنے کلاک پر نظر پڑے ہی میں چونک گیا۔ آدھے سے زیادہ دن گزر چکا تھا۔ میں نے سیل

فون تلاش کرنا چاہا تو وہ ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ میں نے مس کالیں دیکھیں، ان میں ایک ہی نمبر سے کئی کالیں آچکی تھیں۔ میں اس پر رنگ کی تو فون اسی فون اٹھا لیا گیا۔ دوسری جانب ندیم تھا۔

”خیریت، ندیم؟“ میں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا۔

”کہاں ہیں، آپ؟“

”میں گھر میں ہی ہوں۔ کیوں، خیریت؟“

”شجاع، بھائی! خیریت ہی ہے۔ آپ جلدی سے تیار ہو جائیں، میں آپ کو لینے کے لیے آ رہا ہوں۔“

”میں پانچ بج رہا ہوں، خیریت؟“

”میں نے بھی یہی کہا ہے، شجاع بھائی! کہ خیریت ہی ہے۔ آپ بس تیار ہو جائیں جلدی سے۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں

سکستہ سی سے اٹھا تو آرتی نے کہا۔

”آپ فریش ہوا آئیں، میں ناشتہ بناتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔“ یہ کہہ کر میں کمرے سے نکل آیا۔ میں اپنے کمرے میں آ کر فریش ہوا اور جب نیچے آیا تو ناشتہ تیار تھا۔ اس وقت میں

جانے پی رہا تھا کہ ندیم آ گیا۔ اس نے بہترین تراش کا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں نے کپ دکھ دیا اور اس کے ساتھ چلنا ہوا ہوا۔

”یار! اتنا بھی دو آخر جانا کدھر ہے؟“

”آپ گاڑی تک چلیں۔“ ندیم نے کہا اور میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کی مسافت کے بعد گاڑی ایک بڑے

ہوٹل کے سامنے جاری جو ایرانی ہسپتال سے بالکل سیدھی روڈ پر واقع تھا۔ ندیم میرے ساتھ چلنا چلا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ لفٹ سے دوسری منزل

پر پہنچے اور ایک کمرے کے سامنے رک گئے۔ ہمارے رکتے ہی دروازہ کھل گیا۔ میرے سامنے ایک جوان رحنا قسم کا نوجوان کھڑا تھا۔ بہترین سوٹ

پہنے وہ کوئی برنس مین دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے میرے چہرے پر دیکھا اور مسکراتے ہوئے میری طرف ہاتھ بڑھا کر بولا۔

”مجھے الطاف پاشا کہتے ہیں۔ آئیے، تشریف لے آئیں۔“ یہ کہہ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ پھر ہم تینوں آسنے سامنے کی کرسیوں پر جا

بیٹھے تو وہ بولا۔

”میں انتہائی معذرت خواہ ہوں کہ آپ کو یہاں آنے کی زحمت دی جبکہ میرا فرض بننا تھا کہ میں آپ کے پاس آؤں۔“ اس نے کہا تو مجھے

قدرے غصہ آنے لگا۔ اس قدر تمس پھیلا یا جارہا ہے، آخر اس کا مقصد کیا ہے؟ تاہم میں نے اپنا لہجہ نرم رکھتے ہوئے کہا۔

”مجھے یہ سمجھ نہیں آرہا کہ یہ سب کیا ہے؟“

”بہی بات کہنے کے لیے تو آپ کو یہاں تک آنے کی رحمت دی ہے لیکن، شجاع بھائی! اس سے پہلے ماحول کی اجنبیت مٹم ہو جانی چاہئے۔ میں آپ سے صرف ایک بات پوچھتا ہوں کہ پاکستان میں آپ کا کون سا ایسا دوست ہے جس پر آپ سب سے زیادہ اعتماد کر سکتے ہیں۔“ اس نے انتہائی مودب اور نرم لہجے میں پوچھا تو میں نے بے ساختہ کہا۔

”حسن۔“

”تو حسن صاحب کے نمبر ملائیں اور ان سے میرے بارے میں دریافت کریں۔“ اس نے کہا تو میں نے حسن کے نمبر پیش کر دیئے۔ دوسری نئی پردا بٹل ہو گیا۔ میرے بیٹو کہنے کے ساتھ ہی وہ چپک کر بولا۔

”او جان جی اکیسے ہو؟“

”یہ اظہاف پاشا کون ہے؟“

”جس کے پاس تم ابھی بیٹھے ہوئے ہو۔“

”جسہیں کیسے پتہ؟“

”میری بات غور سے سنو، یہ جو کچھ بھی کہتا ہے اس پر آنکھیں بند کر کے اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ سمجھ لو کہ میرے لیے یہ تم ہو۔“

”حسن ایسے سب کیا ہے؟“

”یہی سمجھانے کے لیے تمہیں یہاں بلا یا گیا ہے۔ ان کی بات غور سے سنو۔ پھر ہر طرح سے فیصلہ کرنے کا تمہیں اختیار ہے۔ ڈس یو گنڈ لک۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے فون بند کر کے رکھا، سگریٹ سلگالی اور اظہاف پاشا سے کہا۔

”جی، جناب! فرمائیں؟ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔“

”میرا تعلق اس خفیہ فورس سے ہے جو پاکستان کے مفاد کے لیے کام کرتی ہے۔ یہاں میں ڈیوٹی پر ہوں۔ بظاہر میں یہاں کیپیٹر پارٹس کا بزنس کرتا ہوں۔ حسن صاحب کا تعلق بھی ہماری فورس سے ہے مگر وہ ایک خاص شعبہ میں ایڈجسٹ ہو چکے ہیں۔ خیر، یہ تو میرا تعارف تھا۔ حسن صاحب نے ہی یہاں ندیم صاحب سے رابطہ کرنے کو کہا اور میں اسے اپنی اصلیت بتائے بغیر اس کا دوست بن گیا۔ ابھی میں سامنے نہیں آنا چاہتا تھا۔ ابھی کچھ وقت تھا اس کے بعد میں نے اپنا تعارف کروانا تھا مگر رات کی صورت حال کے باعث ایسا آج ہی کرنا پڑا۔“ یہ کہہ کر وہ رکا۔ شاید وہ میرے چہرے پر کوئی رد عمل دیکھنا چاہتا تھا۔ میری طرف سے کوئی جواب نہ پا کر کہتا چلا گیا۔ ”آپ پاکستان میں جس قسم کا بھی خطرہ اسپتے دوستوں کے لیے محسوس کر رہے ہیں اس کے بارے میں آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، وہ سب سنبھال لیا گیا ہے۔ آصف چوہدری نے دو دو شاہ کو بھی رات ہی ٹھکانے لگا دیا ہے۔ وہ بندہ ویسے ہی ڈرگنز کے معاملے میں پاکستان کو مطلوب تھا۔ پچھل اچھی خاصی ہے لیکن وہ لوگ محفوظ ہیں۔ کوئی

کس وغیرہ نہیں بنے گا۔ آپ مطمئن رہیں۔ میرا مطلب ہے، آپ کو یہاں سے جانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”الطاف جی! الگتا ہے، میرے یہاں رہنے کا کوئی خاص مقصد ہے جو یوں۔۔۔“ میں نے فقرہ جان بوجھ کر اچھوڑ دیا۔

”جی۔ یہ ساری پلاننگ حسن صاحب کی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ملکی مفاد میں یہ ٹیک کام آپ کے ہاتھوں ہو۔ اگر آپ اپنے ملک و قوم کے

لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں تو؟“

”مطلب؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

”دیکھیں، شجاع صاحب آپ کا دوست حیدر یہاں پر غیر قانونی دھندوں میں ملوث ہے۔ ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ وہ کیسے اور

کس طرح کے دھندے میں ملوث ہے لیکن جن لوگوں کے لیے وہ کام کر رہا ہے ہمیں ان پر اعتراض ہے۔ حیدر ایک بہت بڑے نیٹ ورک کا حصہ بن

چکا ہے۔ ہمیں اس سے بھی غرض نہیں، وہ بنا رہا ہے، دونوں ہاتھوں سے دولت اکٹھی کرتا رہے لیکن آفٹر آل جسے اس سارے نیٹ ورک کا مفاد پہنچ رہا

ہے وہ ہمارے، ہماری قوم اور ہمارے ملک کے خلاف ہے۔“

”ایسا کون سا نیٹ ورک ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں پر جو غیر قانونی دھندے ہوتے ہیں ہمیں ان سے اس لیے کوئی غرض نہیں ہے کہ وہ چاہیں اور یہاں کی حکومت، یہاں کا قانون

اور قانون نافذ کرنے والے ادارے لیکن ہمیں ان کاموں کو روکنا ہے جن کے باعث ہمارے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ آپ کو شاید پتہ نہیں ہے کہ

بھارتی خفیہ تنظیم نے دعویٰ کے علاوہ مارشلس کو اپنی خفیہ سرگرمیوں کے لیے جن لیا ہے۔ دعویٰ ایک مسلم ریاست ہے مگر انڈین یہاں پر ذمہ داری

پھیلا رہے ہیں۔ میں آپ کو ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں جو کہ کارگل میں بھارت معاشی طور پر گھٹنے ٹیک رہا تھا۔ اس کی معیشت کو سنبھال دینے کی

خاطر زندگی کے ہر شعبہ سے بھارتی سامنے آ گئے۔ تاہم گھٹنے ٹیک کی مشہور گواہی نے بھارت سے دعویٰ کا سطر کیا۔ یہاں سے اس نے جو دولت سمیٹی۔

ساری کارگل کے فٹز میں جمع کرادی۔ یقیناً اس میں اگر بھارتی کیونٹی نے کچھ دیا ہوگا تو مسلم لوگوں کا پیسہ بھی ہوگا۔ دوسرے لوگوں کی طرح شو بڑ کے

لوگ اپنے ملک کی معیشت کو مضبوط کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ جنس سمیت جو ذمہ داری پھیلائی جا رہی ہے وہ ایک بالکل الگ شعبہ ہے اور آپ کو

اسی مقصد کے لیے اپنے نیٹ ورک میں لایا گیا ہے تاکہ آپ بھی یہی خلافت اپنے ہاتھوں سے لوگوں میں پھیلائیں۔“

”حیدر کہاں تک جا چکا ہے؟“

”بہت آگے تک جہاں سے اس کی واپسی ممکن نہیں ہے اس مقصد کے لیے تو اب وہ اپنے ہاپ کو بھی قائل کر سکتا ہے۔“

”الطاف! یہ کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”وہی جو ایک صحیح حقیقت ہے۔ آپ مجھ پر اعتبار نہ کریں لیکن اپنی آنکھیں اور کان کھول کر رکھیں۔ جب آپ کو یقین ہو جائے تب آپ

میری بات مان لیجئے گا۔“

”دیکھو، الطاف! اگر یہ سب کچھ سچ ہے تو تم مجھے اپنے ملک کے لیے لڑنے والا وہ سپاہی پاؤ گے جو ہر اول دستے میں ہوتا ہے۔“

”میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں اور اجماعی تقاضا رہنے کی درخواست کرتا ہوں۔ چند لوگوں سے آرتی نامی عورت آپ کے ساتھ رہ رہی ہے۔ وہ کوئی داسی وغیرہ نہیں بلکہ تربیت یافتہ ایجنٹ ہے۔ وہ صرف اور صرف آپ کو ”راہ“ پر لانے کے لیے آئی ہے۔“ الطاف نے کہا تو میرے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ رینک گئی۔

ہمارے درمیان اجنبی خاموشی آن ٹھہری تھی۔ وہ شاید میرے رد عمل کا انتظار کر رہا تھا جبکہ میری خاموشی کی وجہ وہ انکشاف تھا جو بہر حال میرے لیے تکلیف دہ تھا۔ دولت کی ہوس کا بھی مجبب نشہ ہوتا ہے۔ یہ بڑھتا ہی جاتا ہے، کم نہیں ہوتا۔ مجھے آرتی سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ وہ کس کے لیے کیا کر رہی ہے۔ اپنی وطن کے لیے جان بھٹکیا پہ لیے پھرتی ہے یا وہ بھی حصول دولت کے لیے خطروں سے کھیل رہی ہے۔ میرے لیے حیدر شیخ کا یہ نیاروپ دکھا کا باعث تھا۔ غربت سے نکلنے کی خواہش اس طرح کے حالات لے کر سامنے آئے گی، میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ اک انسانی ضمیر ہی ہوتا ہے جو انسان کو گنہ اور سیدھے راستے پر رکھتا ہے بشرطیکہ انسان اپنے ضمیر کی آواز سن لے اور پھر مان بھی لے۔ انسان جب اپنے ضمیر کو نظر انداز کرتا ہے تو پھر اس سے کچھ بھی سرزد ہو سکتا ہے۔ اپنا ایمان گروی رکھ دے، وطن فروشی کرے یا پھر ذلالت کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جائے۔ نجانے کیوں میرے اندر سے یہ آواز اٹھ رہی تھی کہ اگر حیدر شیخ نے ایسا جان بوجھ کر کیا ہے تو بہت غلط کیا ہے، اسے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔

”لیکن تمہارا اپنا ہی خیال ہے کہ دوست جو بھی کر رہا ہے، چاہے وہ دوسروں کی نگاہ میں غلط ہے۔ لیکن میرے لیے ٹھیک ہے کیونکہ وہ میرا دوست کر رہا ہے۔ ایسے میں حیدر شیخ کے اس طرز عمل پر تمہاری کیا رائے ہے؟“ دور کھنک اندر سے میرے ضمیر نے مجھے ٹھوکا دیا۔

”میں کیا کہہ سکتا ہوں؟“ لاشعوری طور پر میں بڑبڑایا۔

”کیا کہا آپ نے؟“ الطاف پاشا نے پوچھا تو میں اپنے محاسن میں آ گیا، اگلے ہی لمحے میں نے خود پر قابو پایا اور اس کی طرف مسکراتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولا۔

”سنو، پاشا! وہ اس کا راستہ ہے اور میرا راستہ اپنا ہے، بہر حال مجھے تاؤ، کرنا کیا ہے؟“

”نی الحال احمد میرا ہے، بہت گہرا احمد میرا لیکن اس احمد میرے میں بہت کچھ چھپا ہوا ہے۔ ہمیں یہ سب آپ کو بتانے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ آپ تقاضا رہیں، آنکھیں اور کان کھلے رکھیں۔“

”مطلب کہ وہ جو کچھ بھی کر رہے ہیں، ہمیں اس سے۔۔۔“ میں نے کہا جا تا تو الطاف نے میری بات قطع کر دی۔

”وہ یہاں بہت کچھ کر رہے ہیں لیکن ہمیں اس سے سروکار نہیں۔ ہمیں صرف یہ دیکھنا ہے کہ پچھلے دو ماہ سے جو یہ لوگ اکٹھے ہوتے چلے جا رہے ہیں، ان کا مقصد کیا ہے۔ ہمیں صرف تصدیق کرنا ہے کہ وہ کھنک پاکستان دشمن عزائم تو نہیں رکھتے، ایسی کچھ معلومات ملی بھی ہیں۔“

”کیسی معلومات؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ ابھی ابتدائی قسم کی معلومات ہیں اور محض اندازہ ہے۔ جیسے ہی کچھ یقینی معلومات ملیں تو میں وہ آپ ہی کو بتاؤں گا۔“ اس نے قدرے پے کسی سے کہا۔

”دیکھو، الطاف! اگر میں کسی طرح بھی اپنے ملک اور قوم کے لیے کچھ کر سکتا ہوں تو مجھے روحانی خوشی ہوگی، بلا لالچ اور غیر مفاد کے، آپ مجھ پر اعتماد کر سکتے ہیں۔“

”ہوسکتا ہے، شہان بی! کہ آپ ہی میں لیڈ کریں اور یہ بھی ممکن ہے کہ آپ ہی میں بتائیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا، پھر اس نے بات بدل دی۔ اس نے تفصیل سے مجھے آرتی کے بارے میں بتایا۔

آرتی کبھی بھی مذہبی نہیں رہی تھی۔ وہ چند سال پہلے اچانک ہی ماڈل گرل کے طور پر سامنے آئی تھی۔ اس دنیا میں آنا اور پھر قاصد ہو جانا بس ایسے ہی تھا جیسے بجلی کا کوندرا۔ وہ زیادہ دیر نہیں ٹھہری تھی۔ اسے ظلموں میں کام کرنے کا جنون کی حد تک شوق تھا اس لیے داور سے اندھیری ایسٹ کے درمیان مثل کاک بنی رہی۔ مبینی ہی کے یہ دونوں مختلف علاقے اپنا الگ الگ ماحول رکھتے ہیں جبکہ غربت اور امارت کا اپنا طہرہ ہی کچھ ہوا کرتا ہے۔ داور کا علاقہ اور اس میں سمجھان آباد محلہ جس کی بوسیدہ اور تنگ دتار یک گلیوں میں رہ کر آرتی نے بڑے بڑے خواب دیکھے۔ ان خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کی خواہش اس وقت شدت سے بڑھ گئی جب وہ کالج میں آئی، وہ ماڈلنگ کے راستے سے ہالی وڈ سٹورس تک پہنچنا چاہتی تھی مگر اسے گمان تک نہیں تھا کہ جس ہلکے دمک کی طرف وہ بڑھ رہی ہے، اس کی راہ میں کس قدر بھیا تک اندھیرے ہیں۔ بلاشبہ وہ حسین تھی، اس پر غضب یہ تھا کہ وہ ایک پرکشش جسم کی مالک تھی۔ میرا چاہے مٹی میں پڑا ہوا ہو وہ میرا ہی ہوتا ہے۔ ایسا مٹی میں پڑا ہوا ہے اگر کسی جوہری کے ہاتھ لگ جائے تو اس کی اصل قدر و قیمت کا پتہ چلتا ہے۔ وہ سادھنا نامی ایک عورت کی لگا ہوں کا مرکز بن گئی۔ اس نے پوری لگن سے آرتی کو ”گمز“ دیا۔ وہ ماڈلنگ میں کچھ ہی آگے بڑھی تھی کہ ایک صنعت کار نے اسے رکھیل کے طور پر رکھ لیا۔ اس میں کئی فائدے تھے، سادھنا اور خود اسے معقول آمدنی میسر آگئی تھی۔ اندھیری ہی میں موتی لال پارٹمنٹ میں وہ ایک پارٹمنٹ کی مالک بن گئی۔ یہاں رہ کر اس نے ہالی وڈ کی فلمی دنیا میں قدم رکھنے کا سوچا اور پوری طرح محنت شروع کر دی۔ وہ داور میں موجود اپنے گھر والوں کو بھول چکی تھی اور پوری توجہ سے ان راہوں کی تلاش میں لگ گئی جو اسے ہالی وڈ سٹورس تک پہنچا دیتے۔ اس نے اپنی کوشش جاری رکھی لیکن اسے نہیں معلوم تھا کہ ہالی وڈ میں انڈر ورلڈ کا راج کتنا اور کس قدر ہے۔ آرتی انڈر ورلڈ کے لیے بہترین خام مال تھی اور ایسے ہی خام مال کے لیے بہترے گماتے لگائے ہوئے ہوتے ہیں۔ آرتی کو اس دنیا میں راجندر ورمنا نامی ایک لڑکا ملا جس نے سنبھرے خوابوں کے انبار لگا دیئے۔ وہ اس صنعت کار کو بھی بھول گئی مگر کچھ عرصہ ساتھ رہنے کے بعد اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ سٹورس تک جانے والی راہوں سے دور بھٹک گئی ہے۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ وہ اپنی منزل نہیں پاسکے گی تو اس نے اپنی راہ ہی بدل ڈالی۔ راجندر ورمنا نے اسے ایک نامت کلب میں ڈانسز کے طور پر زبردست آفر دی۔ آرتی نے وہاں چند دن ڈانس کیا اور پھر وہ قاصد ہو گئی۔ دو سال تک اس کا کہیں پتہ نہ چلا۔ وہ کوئی اتنی اہم شخصیت نہیں تھی کہ اسے یاد رکھا جاتا۔ سوائے ان چند لوگوں کے جو شبلی چہروں کو یاد رکھتے ہیں اور ان کا وقت بہت اچھا گزرا ہوتا ہے۔ دو بارہ جب وہ نظر آئی تو سوامی پرمانند کے آشرم میں تھی۔ ہوسکتا تھا کہ لوگ اس بات پر یقین کر لیتے کہ آرتی نے نوجوانی میں دنیا تیاگ دی ہے اور عام لوگوں کے لیے وہ اداسی ہی تھی لیکن وہ لوگ جو نظر دیکھنے والے تھے، وہ جان گئے کہ ایسا کچھ نہیں ہے۔ وہ ان لوگوں کے درمیان آگئی تھی جو ایک خفیہ تنظیم کے مفادات کے لیے کام کر رہے تھے۔ آرتی کے بارے میں شاید ہی خیال کیا جاتا کہ وہ دوغنی میں

اپنے دھرم کی سبوحائی کے لیے وارد ہوئی ہے مگر اس نے شردھنیشی کے بارے میں جو کہانی سنانی تھی، وہ ضرورت سے زیادہ جھوٹ پر مبنی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والی دوسری دو لڑکیاں بھی قانع ہو چکی تھیں۔ آرتی کا حیدر شیخ کے پاس آنے کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟ یہی مقصد جان لینے سے ان کے منصوبے کے بارے میں معلومات یقینی ہو سکتی تھیں۔ اظاف پاشا کی خواہش تھی کہ میں آرتی کے قریب ہو جاؤں یا پھر وہ کس مقصد کے لیے سرگرم ہے، یہ جاننے کے لیے ایسا ضروری تھا۔ تقریباً چار گھنٹے کی طویل بات چیت کے بعد میں کافی حد تک مطمئن ہو گیا تھا کہ میرے گرد مٹے ہوئے حالات کوئی بچوں کا کھیل نہیں ہیں۔ کسی بہت بڑے مقصد کے لیے میں گہری سازش کے حصار میں ہوں۔ میں نے رب کا شکر ادا کیا اس نے مجھے اندھیرے میں نہیں رکھا بلکہ روشنی سے نوازا دیا۔ اب میں قنات تھا اور کسی ان دیکھی کہانی میں گرنے سے بچ سکتا تھا۔ اظاف پاشا سے جب رخصت ہوا تو میرے ذہن سے بوجھ ہٹ چکا تھا۔ اس نے بڑی اپنائیت سے ہمیں الوداع کہا۔

اسی شام جب میں مگر پہنچا تو آرتی سینگ روم میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں ایک امریکی فیشن میگزین تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔ اس نے سفید ٹائٹس قسم کا پاجاما اور ہلکے سبز رنگ کی سلویس شرٹ پہنی ہوئی تھی، درمیان میں سے ماتک نکال کر بال کس کے بانہ سے ہوئے تھے اور چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ وہ دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور بڑے جذب سے آنکھیں بند کر کے تسکین کیا۔

”کیسی ہو، آرتی؟“ میں نے اپنائیت سے پوچھا۔

”ایک دم ٹھیک، آپ کیسے ہیں؟“ وہ میرے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے بولی۔

”میں بھی ٹھیک ہوں۔“ میں نے اس کے سامنے دھرے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا تو وہ اپنا چہرہ دائیں بائیں بھراتے ہوئے تشویش زدہ لہجے میں بولی۔

”بالکل بھی نہیں لگتا کہ آپ فریض ہیں۔ لگتا ہے، آج آپ نے بہت کام کیا ہے جیسی تھکن آپ کے چہرے سے نظر آ رہی ہے“

اس کا لہجہ ہنوز تشویش زدہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ آرتی کا یہ نفسیاتی حربہ ہے۔ مگر اس کے بارے میں مجھے مسلم نہ ہو چکا ہوتا تو شاید میں اسے حقیقت ہی خیال کرتا۔ اس دن میں نے جسمانی طور پر کچھ بھی نہیں کیا تھا لیکن ذہنی ریاضت خوب ہوئی تھی..... میں مسکرا دیا اور ہولے سے بولا۔

”آرتی! تمہیں کیسے پتہ چلا آج میں نے بہت کام کیا ہے؟ یقین جانو، بہت تھکن ہو رہی ہے۔“

”کوئی بات نہیں، آپ یوں کریں کہ شادو لے کر فریض ہو جائیں۔ آج میں نے بڑی مزیدار ڈش بنائی ہے۔“ اس نے تیزی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

”حیدر کہاں ہے؟“

”شاید وہ نہ آئیں، انہوں نے فون کر کے بتایا تھا کہ اطمینن جا رہے ہیں۔“ آرتی زریب مسکراتے ہوئے بولی۔

”چلیں جی، ٹھیک ہے۔“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا۔ میں جب فریض ہو کر واپس آیا تو وہ کھانے کی میز پر میرا انتظار کر رہی تھی۔ کھانا واقعی ہی لذیذ تھا۔ کھانے کے دوران ہم میں ہلکی ہلکی باتیں چلتی رہیں، کھانا ختم ہوتے ہی آرتی سو ڈالے آئی۔

”کاش! ہم کہیں گھومنے پھرنے چلتے۔“ آرتی نے ایک ہلکا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔

”ہاں، تم ٹھیک کہتی ہو، مگر یومی خواہاؤ اور عطرہ مول لیتا میرے خیال میں عقل مند ہی نہیں ہے۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے فیر چڑھتی لہجہ میں کہا تو اس پر گویا اوس پڑ گئی۔ کچھ دیر بعد بولی۔

”کیوں نہ کوئی اچھی سی فلم لگا کر دیکھیں؟“

”میں تھکا ہوا ہوں، اب سونا چاہوں گا تم انجمائے کرو۔“ میں نے جان بوجھ کر اٹھتے ہوئے کہا۔

”کیا آپ مجھے کہنی نہیں دیں گے؟ پلیز، تھوڑی سی دیر کے لیے ہی سہی۔۔۔“ اس نے لہجہ سے کہا تو میں سونے پر ڈھیر ہوتے ہوئے تقریباً ایٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ فلم لگا کر میرے قریب بیٹھ گئی۔ وہ باتیں کرنا چاہ رہی تھی لیکن میری سوچیں ابھی ہوتی تھیں۔ ہاں، ہاں کے دوران میں نے سارے خیالوں کو ذہن سے جھٹکا اور سو گیا۔

چلتی ہوئی زندگی ایک ایسے موڑ پر آ گئی تھی، جہاں سے ایک راستہ خود غرضی کی سمت بھی جاتا تھا۔ حیدر فتح کی زندگی میرے سامنے تھی۔ معمولی معمولی سی نا آسودہ خواہشوں سے لے کر فیر متوقع خواہشوں کے پورا ہوجانے تک یہ خود غرضی کی راہ تھی، جس پر وہ چلا۔ بس ایک ضمیر کی آواز اس نے نہیں سنی۔ ایک نظر سے دیکھا جائے تو حیدر نے جو کیا، ٹھیک کیا۔ میں اسے دوش نہیں دے سکتا تھا۔ اس کے لیے اس سسٹم میں کوئی ایسی راہ نہیں تھی جس پر ایمان داری سے چلتے ہوئے وہ اپنی طے شدہ منزل پالیتا۔ یہاں ابھی ہوئی زندگی میں قدم قدم پر استحصال ہو رہا ہے۔ منزل تک دوڑ لگانا باہت لوگوں کا کام ہے لیکن اس دوڑ کا کیا کیا جائے جب کوئی جیت والی منزل تک پہنچے تو وہاں کوئی اور میں میڈل پہنے اپنی جیت کا اعلان کر رہا ہو۔ یہ لا حاصل دوڑ کس طرح کے جذبات پیدا کرے گی۔ سامنے کی بات ہے یا پھر ماحول کسی گھنے جنگل کی مانند ہے۔ جہاں محض خوف ہوتا ہے اور درندوں سے پناہ تلاش کی جاتی ہے۔ خوف، استحصال، بے انصافی اور ظلم میں صاف اور سیدھی راہیں کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں؟ ایسے میں اس قوت کا حصول ضرورت بن جاتا ہے، جس سے اپنی اپنا ممکن ہو سکے۔ ہمارا ماحول ایک گھنا اور تاریک جنگل ہے اور اس میں ہم اپنی جگہ کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ زندگی کے اس موڑ پر ایک اور راستہ بھی تھا جس پر چلتے ہوئے یہ احساس سکون دیتا ہے کہ میں صرف اپنی ہی جگہ کی جنگ نہیں لڑ رہا بلکہ ان کے لیے بھی ہے جو میرے ساتھ وابستہ ہیں، جنہیں میری ضرورت ہے اور میں ان کے کام آ سکتا ہوں۔ یہ تعلق محض رشتے ناتوں تک ہی محدود نہیں رہتا بلکہ کئی ایک قرض اتارنے کا باعث بھی بن جاتا ہے۔ ان میں سب سے اہم اس مٹی کا قرض تھا جو میری ذات سے وابستہ ہو چکا تھا۔ اب یہ چوٹس میرے لیے تھی کہ میں کون سی راہ اپناتا؟ ایک طرف مجھے وہ سارے لوگ بھولنا تھے جو قدم قدم پر میرے کام آتے رہے اور اگر دوسری راہ پر جاتا تو پاکستان میں موجود دوستوں کی طرف سے اطمینان میرا آنے کے علاوہ اپنی مٹی کا قرض اتارنے کے قابل ہو جاتا۔ میں جب کبھی اپنا تجزیہ کرتا ہوں تو یقینی طور پر اپنے بارے میں میرا یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ میں ظلم کا ساتھ نہیں دے سکتا بلکہ لاشعوری طور پر میرا عمل ظلم کے خلاف ہوتا ہے۔ الطاف پاشا نے جو صورت حال میرے سامنے رکھی تھی، ایسے حالات میں نا چاہتے ہوئے بھی میں اس کا ساتھ دینے پر مجبور تھا۔ حیدر فتح کیسا بھی تھا، اسے اس کے چنگل سے نکالنا تھا اور وہ مقصد جو بھارتی دوغنی کی سر زمین پر لے کر آئے تھے، اسے سبوتاژ کرنا تھا۔ الطاف پاشا کی یہ بات مجھے بہت اچھی لگی

تھی کہ وہ لوگ دوہنی میں جو چاہے کریں، ہمیں اس سے غرض نہیں۔ یہ ان کا اور دوہنی کے حکام کا معاملہ ہے لیکن اگر وہ یہاں رہتے ہوئے پاکستان کے خلاف کسی سازش میں ملوث ہیں تو ان کا راستہ روکنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ ایسے وقت میں جبکہ مجھے کسی اہم فیصلے تک پہنچنا تھا، میرے ذہن میں سوچ ابھری کہ کیا میرا دوہنی آنا قسمت میں لکھا ہوا تھا؟ میں نے اپنے ہائی کونٹال تو حالات کی کڑیاں اسی سمت نکالنے کی کوشش کی، حالات ایک سیل رواد کی طرح مجھے بہاتے رہے، پرسکون زندگی میں اچانک ہی ہنگامے بھر گئے۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ سلیم فارانی سے شروع ہونے والا قصہ یہاں تک آن پہنچے گا۔ شاید حالات مجھے کسی خاص سمت میں دھکیل رہے تھے اور میں وہاں تک آن پہنچا تھا جس کے لیے یہ ساری ہنگامہ آرائی تھی؟ میں نے خوب سوچا اور پھر فیصلہ کر لیا کہ مجھے اپنے وطن کے لیے لڑنا ہے، اس گمنام سپاہی کی طرح جسے انعام کا لالچ نہیں بلکہ اپنے فرض سے لگن ہوتا ہے۔ میں نے اپنے طور پر طے کر کے حسن کو فون کر دیا، تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد میں نے پوچھا۔

”حسن! کیا الطاف پاشا پر اعتماد کیا جاسکتا ہے؟“

”بالکل، اور وہ بھی آنکھیں بند کر کے، انہیں بھی ایسا ہی کرنا ہوگا کیونکہ جب تم اس کھیل میں شامل ہو گئے تو پھر وہ محض قماشائی ہوں گے۔ سارا کھیل جنہیں کھیلنا ہے، جب انھما رہی تم پر ہوگا تو پھر بد اعتمادی کہاں ہو سکتی ہے؟“

”اور وہ آصف چوہدری کا تحفظ؟“ میں نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”میں جنہیں بتاؤں کہ تم اطمینان رکھو، آصف پوری طرح محفوظ ہے۔ ان کا ٹینک بھی غائب ہے، وہ بھی اب نظر نہیں آ رہا۔ باقی سب دوست ٹھیک ہیں، ان کے بارے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں ہوں نا یہاں۔“ حسن نے اعتماد سے کہا تو مجھے حوصلہ ہوا۔

”چلو ٹھیک ہے، میں فکر مند نہیں ہوتا۔“ میں نے کہا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دیا، پھر بولا۔

”یہ جو تمہارے ذمے کام لگا یا جا رہا ہے، اس کا فیصلہ کس عام لوگوں میں نہیں ہوا۔ بہت اعلیٰ سطح کے لوگ ہیں وہ، جان تھی! اور ہاں، جو کچھ بھی کرنا ہے، پورے دھیان سے۔ باقی ساری فکر مجھ پر چھوڑ دو۔“ یہ کہہ کر وہ مجھ سے مزید باتیں کرتا رہا اور پھر فون آف کر دیا۔

میں سہ پہر کے قریب چائے پی رہا تھا۔ عظیم، کول اور حمیش جا چکے تھے۔ میں یونی انٹرنیٹ سے کھیل رہا تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا، وہ حیدر کی کال تھی۔

”بیارے! کیا کر رہے ہو؟“ لہجے میں خوشگوار بیت تھی۔

”چائے پی رہا ہوں۔“ میں نے سرسری سے انداز میں کہا۔

”پھر کیا پروگرام ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”جو حکم دو، پاس؟“ میں نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا تو اس نے نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔

”جلدی سے گھر پہنچو، میں انتظار کر رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میری سٹے ہنسی اس نے فون آف کر دیا۔ میں نے اطمینان سے چائے شکر کی نیب، آف کیا اور آفس سے نکل آیا۔ پورچ میں دو لینڈ کروزر اور ایک ہنڈا کار ڈیکھ کر کہہ کر کہ کچھ معمول سے ہٹ کر ہے۔ کیا ہے؟ یہ انداز جا کے ہی معلوم ہو

سکتا تھا۔ سنگ روم میں حیدر کے ساتھ ایک یورپین لڑکی بیٹھی ہوئی تھی، سفید چھڑی کے علاوہ اس میں کوئی خاص بات بھی تھی کہ اس کے منہ سے ہال کنڈھوں تک بکھرے ہوئے تھے اور اس نے انتہائی مختصر لباس پہنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ لہسا سا یورپی لڑکا تھا۔ دوسرے صوفے پر آرتی کے ساتھ ایک ہندو لڑکی تھی جو ماتھے پر تلک کی وجہ سے پہچانی جا رہی تھی۔

”بس جی، آگے وہ جن کا شدت سے انتظار تھا۔“ حیدر نے مجھے دیکھتے ہی غرور لگانے والے انداز میں کہا۔

”طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟“ میرا لہجہ تشویش زدہ تھا۔

”ارے، میری جان آج ہم وہاں جا رہے ہیں جہاں مستی ہوگی، اتنی مستی کہ خواہ مخواہ بہک جائے کوئی چاہے۔“ حیدر نے دائیں آنکھ

دہاتے ہوئے مخصوص انداز میں کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ موج مستی کے موڈ میں ہے۔ میں نے پھر بھی آرتی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”آج کچھ خاص تو نہیں کھلا دیا ہے؟“

”ارے نہیں، ہم ایسے نہیں کر سکتے۔“ اس نے شوخی سے کہا۔ تو حیدر یورپی جوڑے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

”یہ الگس ہے اور اس کے ساتھ سون“ پھر ہندو لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ اوشا ہے۔“ میں نے باری باری سب سے

ہاتھ ملایا تو آرتی اٹھتے ہوئے بولی۔

”آئیں، شجاع! میں آپ کو تیار ہونے میں مددوں۔“

”بھیکن جلدی۔“ حیدر نے تاکید کی۔

”مگر، آرتی ایسی کیا تیاری کرنی ہے، کیسے سطرہ جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”آپ آئیں تو، میں بتاتی ہوں۔“ اس نے کہا تو میں اس کے ساتھ اپنے کمرے میں چل دیا۔

اس وقت شام ہونے لگی جب ہم لینڈ کروڑ میں بیٹھے شہر سے باہر جا رہے تھے۔ حیدر شیخ، بھارتی لڑکی اوشا اور دو ملازم ہم سے آگے

جانے والی لینڈ کروڑ میں تھے جبکہ دوسری میں ڈرائیو کر رہا تھا۔ میرے ساتھ آرتی تھی اور چھلی سینٹ پر الگس اور سون تھے۔ ان کا پروگرام صحرا میں

رات گزارنے کا تھا جسے وہ ڈیزرٹ ٹائٹ، سفاری یا ایسے ہی دوسرے ناموں سے پکارتے تھے۔ وسیع صحرا میں کھلے آسمان کے نیچے رات کے

اندھیرے میں مستی کا تصور لے کر جانے والے کیا کچھ کرتے ہوں گے، یقیناً اس کا جواب بھی ہو سکتا ہے کہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں۔ شہر کی حدود ختم ہوئی

تو سورج بھی صحرائی اوٹ میں غروب ہونے کی کوشش میں تھا۔ میں حیران تھا کہ آرتی اب تک چپ کیوں ہے جبکہ وہ تو بات کہنے کا موقع ڈھونڈ کر آتی

تھی۔ یورپی جوڑا بھی خاموشی سے کھڑکی کے باہر جھانک رہا تھا، شاید صحرانے ان پر جا دو کر دیا تھا۔ میں نے آرتی کے چہرے کی طرف دیکھا جو

آنکھیں بند کیے، سستے ہوئے چہرے کے ساتھ نجانے کیا سوچ رہی تھی۔ میں چند لمبے اس کی طرف دیکھا رہا اور پھر اپنی توجہ ڈرائیو تک پر لگا دی۔ کتنے

ی لمبے یونٹ می گزر گئے۔ اس وقت جب ہم بڑی سڑک سے اتر کر کچے راستے پر آئے تو آرتی نے خود گامی کے سے انداز میں کہا۔

”کس قدر خوبصورت دیرانی ہے۔“

”آرتی ای تو وہی لفظ ہے جو چاند پر اترنے والے خلا باز نے کہے تھے۔“ میں نے جیسے ہوئے کہا۔
”ہمیں اس سے بھی زیادہ اچھے لفظ کہنا چاہئے تھے۔“

”مثلاً؟“

”وہ تو چاند ہے جہاں چاندنی نکمری ہوئی ہے یہاں دیکھیں، سونا پھیلا ہوا ہے۔“ اس نے پھر سے خود دکھائی کی۔
”آرتی اتم نے یہ کیسے سوچا؟“

”مطلب؟“ آرتی نے میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”مطلب یہ کہ تمہیں یہ محسوس ہوتا ہے یا ان مناظر سے انسپاز ہو رہی ہو۔ میں تمہاری اس بات کو کس انداز سے لوں؟“ میں نے پوچھی بات
بڑھائی۔

”ہماری بات اور ہم۔۔۔“ آرتی نے معصومہ خیر انداز سے کہا۔ ”کیا حیثیت ہے ہماری، آپ اسے جس انداز سے بھی لے لیں، ہمیں
کون سا کوئی گلہ شکوہ ہوگا۔“ اس کا بات کرنے کا انداز ایسے تھا جیسے وہ کہتا تو بہت کچھ چاہ رہی ہے لیکن کہنے سے کچھ حاصل نہ ہونے کی وجہ سے، کہہ
نہیں پاری۔ میں اس سے باتیں کرنا چاہ رہا تھا، اس لیے بات بڑھاتے ہوئے بولا۔

”آرتی ان چند دنوں میں میں نے تمہیں اتنا پریشان اور ڈپریشن نہیں دیکھا۔ آج کیا بات ہوئی؟“

”نہیں، شجاع جی! ہم پریشان نہیں ہیں۔ بس سوچ رہے کہ بعض اوقات انسان کو کس قدر متضاہ حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ جیسے یہ ویرانی
ہے۔ انسان ویرانگی سے وحشت محسوس کرتا ہے، دور بھٹکتا ہے لیکن ہم صحرائی ویرانگی میں محسوس کرتے ہوئے اپنا وقت اچھا گزارنے کی خاطر اس
طرف جا رہے ہیں اور جیسے۔۔۔ جیسے آپ اور ہم۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رک گئی۔

”کہو نا، آرتی! کیا کہنا چاہتی ہو؟“ میں نے اسے حوصلہ دیا۔

”بیکاری بات ہے۔ آپ کتنے کے، کیا بے سرو پا باتیں کر رہی ہے۔“

”ہات تو ہے نا۔۔۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کا تو مزید عجیبہ ہوتے ہوئے بولی۔

”ہات تو تب اہم ہوا کرتی ہے جب کہنے والا کسی کے لیے اہم ہو، غیر اہم منبری ہاتیں بھی کرے تو وہ مٹی جیسی ہوتی ہیں۔“

”میں اب بھی نہیں سمجھا، آرتی اتم آخر کہا کیا چاہ رہی ہو؟“ میں نے انجان بٹنے ہوئے کہا۔

”ظاہر ہے، جب ہاتیں ہی اہمقا نہ ہوں گی تو ان کی سمجھ کہاں سے آئے گی۔ جب ہم ہی آپ کے لیے اہم نہیں تو ہماری باتوں کی کیا
حیثیت؟“

”او، آرتی اتم غلط سوچ رہی ہو۔“ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔ ”ایسی بات نہیں ہے۔ تم میرے لیے بہت محترم ہو، بڑی
اہم ہو کیونکہ تم میرے دوست کی بہت اچھی دوست ہو۔ یہ تعلق۔۔۔“

”اب آپ غلط کہہ رہے ہیں۔ کیا ہمارا اہم ہونا آپ کے دوست کی وجہ سے ہے۔ ہمارا وجود کچھ حیثیت نہیں رکھتا، کیا ہم کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتے؟“

”معاف کرنا، آرتی! مجھے نہیں پتہ کہ تم سونا ہو یا مٹی لیکن اپنے دوست کی وجہ سے میں تمہیں جانتا ہوں اس لیے تم میرے لیے مسخر ہو تعلق کا یہی اعتبار ہی دراصل رویے کی بنیاد ہوتا ہے، یہی تعلق کی وجہ ہے کہ تم ہو تمہاری اہمیت ہے، اس وقت ہمارا ساتھ ہے اور آرتی! تم بھی سمجھتی ہو کہ ہر تعلق کی ایک حد ہوتی ہے اور میں اپنی حدوں میں رہنا پسند کرتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

”کہیں آپ یہ تو نہیں کہتا چاہ رہے کہ ہم دونوں میں اگر دوستی ہو جائے تو حیدر جی برا محسوس کریں گے یا انہیں اچھا نہیں لگے گا؟“ بالآخر اس نے وہی بات کہہ دی جو میں اس سے اگلا ناچاہتا تھا۔ میں نے بڑے اطمینان سے سننے کے بعد ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

”بات یہ نہیں ہے۔ وہ تو چاہتا ہے کہ میں اس طرح کے تعلقات بناؤں۔ اس کی نگاہ میں ہر عورت بس ایک عورت ہے اور۔۔۔ میں نے کہتے ہوئے فخرہ جان بوجھ کر ادھورا چھوڑ دیا۔

”شجاع جی! اہم تو حیدر جی کی داشت ہیں اور نہ رکھیں، وہ ہم پر کوئی اوسر کا نہیں رکھتے۔ یہ چند دن جو ہم ان کے پاس ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ ہمارے جسم و جاں کے مالک ہیں اور پھر کیا آپ اور حیدر جی کے درمیان اتنا کبھی اعتماد نہیں کہ وہ ہمارے تعلق آپ کو ٹھیک ٹھیک بتا سکیں؟ ہم تو چند آپ کے پاس ہیں، چلے جائیں گے۔ ہمیں یاد رہے گا تو آپ کا وہ یہ جو بہر حال ہمیں دکھ دے گا۔“

”میرا نہیں خیال کہ میں نے تمہارے ساتھ غلط رویہ رکھا ہوا ہے؟“

”کیا نظر انداز کر دینے ٹھیک نہیں ہے؟“ اس نے تیزی سے کہا۔

”تمہیں تمہارے جسم کو یا تمہاری ذات کو؟“ میں نے قدرے سخت لہجے میں پوچھا۔

”ہم اور ہمارا جسم ہماری ذات سے الگ ہیں؟“ اس نے جواب کی بجائے سوال کر دیا۔

”تم یوں نہیں جان پاؤ گی، آرتی! فخرہ، آؤ، آج سے ہم دوستی کرتے ہیں۔“ میں نے ہائیں ہاتھ سے شیرنگ سنبھالتے ہوئے دائیاں ہاتھ بڑھا دیا۔ اس نے حیرت زدہ چہرے کے ساتھ میری طرف دیکھا اور اپنا رنگ بھئی ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے اس کی طرف بھر پور نگاہوں سے دیکھا تو اس کے چہرے پر خوشگوار عیت اتر آئی۔ وہ دھیرے سے میرے قریب ہوئی اور اپنا سر میرے کندھے پر رکھتے ہوئے بولی۔

”ہمارے لیے اپنا ہی کافی ہے کہ آپ ہمارے دوست ہو۔“ جہاں میں نے کچھ نہیں کہا البتہ دائیں ہاتھ سے بڑے پیار سے اسے سمیٹ لیا، گویا اپنے مقصد کے حصول کے لیے سمندر میں چھلانگ لگادی۔ اب حالات کی لہریں کہاں لے جاتی ہیں، کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ یہ لہریں کہیں ڈبو دیتی ہیں، کسی انجان ساحل سے آشنا کرتی ہیں یا ان دیکھے جزیرے پر اترتی ہیں، جہاں سے واپسی کا راستہ ممکن ہوگا بھی یا نہیں؟ میں نے نہیں سوچا۔

ہمارے سفر کا اختتام صحرا میں نصب عارضی چار دیواری کے پاس ہوا۔ تھانے وہ صحرا کا کون سا حصہ تھا اور ہم کہاں تھے۔ ایک طرف پارکنگ تھی، جہاں کافی ساری گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں اتر تو کھلی فضا نے طبیعت میں یکدم ہی خوشگوار عیت بھردی، حیدر نے میری طرف دیکھا اور

سکراتے ہوئے کہا۔

”آئیں، حضور! آگے بڑھیں۔“ میں اس کے ساتھ چلتا ہوا عارضی طور پر اپنی چادر یواری میں داخل ہو گیا۔ اندر کا منظر بڑا ہی ہوش ربا تھا، بیش و عشرت کے سبھی سامان موجود تھے۔ کہیں گوشت بھونا جا رہا تھا اور کہیں ملا جا رہا تھا۔ شراب، شباب اور خوشبو کی وافر مقدار موجود تھی۔ عین درمیان میں قالین بچھے ہوئے تھے جن کے کناروں پر گاؤ بچکے دھرے ہوئے تھے، درمیان میں نیم عریاں رقا ماز و انداز دکھا رہی تھی۔ کمانوں کی خوشبو، عریاں جسم اور مقامی موسیقی کے ساتھ میزبانی کا مقامی انداز۔۔۔ یوں لگا جیسے الف لیلہ کے کسی منظر میں اتر آئے ہیں۔ یقیناً یہ سب انگ انگ میں مستی بھر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں یہ سب دیکھ رہا تھا کہ حیدر نے میرے کانہے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اسے غور سے مت دیکھو، میرے پار ابھی تو شروعات ہیں جبکہ ہمیں تو یہاں رات گزارنی ہے۔“

”کیا ہوش رہے گا؟“ میں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ہوش ہونے کے لیے تو آئے ہیں۔“ اس نے اوشاکو اپنے ساتھ لپٹاتے ہوئے کہا۔ شاید وہ کچھ اور کہتا کہ ایک مقامی عربی اس کی طرف بڑھا۔ اس کے ساتھ چند لوگ تھے، وہ مقامی انداز میں ملنے رہے اور پھر مقامی زبان میں حیدر سے باتیں شروع ہو گئیں۔ مجھے ان کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ یہی وہ صاحب ہیں جو یہاں ہمارے میزبان ہوں گے۔ وہ ہمیں لے کر ایک طرف بچھے قالین پر بیٹھا گیا۔ ہمارے بیٹھے ہی کھانے پینے کا سامان سجایا گیا۔ حیدر نے ہمارا تعارف کروایا اور وہ اپنی باتوں میں لگ گئے۔ کچھ دیر کھانے پینے سے لطف اندوز ہونے کے بعد حیدر نے کہا۔

”آج کی یہ رات اور یہ ماحول آپ کے لیے ہے، اس سے جس طرح چاہیں لطف اندوز ہوں۔“ اس نے یہ انگریزی میں کہا تو یورپی جوڑا اٹھ گیا۔ اوشاکو پہلے ہی حیدر کے قریب بیٹھی تھی، مزید جڑ گئی تو آرتی نے میرے کانہے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ بولی۔

”آئیں، کچھ سرگوشیاں ہم بھی کر لیں۔“ وہ مسکراتی آنکھوں سے بہت کچھ کہہ رہی تھی، جب میں نے کہا۔

”سرگوشیاں ہی نہیں، آرتی! میں تمہاری خاموشیاں بھی سنوں گا، آؤ“ ہم اٹھ گئے اور وہاں آکر رک گئے جہاں وہ رقا ماز سج رہی تھی۔ بڑا جہان خیز رقص تھا۔ اس نے ایسی سرکٹ پہنی ہوئی تھی جس سے بدن کھلا محسوس ہو رہا تھا۔

”یاں بیٹھیں یا تمہاری میں چلیں؟“ آرتی نے اپنے اٹلی کی پوریں میری گردن پر پھیرتے ہوئے پوچھا۔ میرے بدن میں چوٹیاں ریٹکنے لگیں، میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جیسے تم چاہو، آرتی۔۔۔“

”یہ ہماری خوش قسمتی ہوگی۔“ آرتی نے شمار آلود لہجے میں کہا اور میرے ساتھ خود کو لپٹائے ہوئے چل دی۔ وہ سپردمی اس سٹال پر گئی جہاں مختلف برانڈ کی شراب کی بوتلیں دھری ہوئی تھیں۔ اس نے وہاں سے ایک بوتل اٹھائی اور چل دی۔ میں اس کے ساتھ چلتا رہا۔ اس نے مختلف جگہوں سے کھانے پینے کا سامان لیا اور اس پنڈال سے قدرے قاصطے پر گئے خمیوں کی طرف بڑھ گئی۔ میں اس کے انداز سے سمجھ گیا کہ وہ پہلے بھی ایسے ہی کسی ماحول سے آشنا ہے۔ وہ ایک خمیے کے پاس رک گئی۔ وہ خالی تھا۔ اس کے اندر قالین بچھا ہوا تھا اور اس کے اوپر نشی چادر بچھا گیا

تھا۔ ماحول کو مزید خوب ناک بنانے کے لیے موسیٰ ٹھیس چلائی گئیں تھیں۔ ایک طرف مراچی اور بلوچریں جام دھرے ہوئے تھے۔ ہوا کی لہروں پر سوار چنڈال سے مقامی موسیقی اور مراچی چاندنی، یہ سارا ماحول عقل گم کر دینے کے لیے کافی تھا۔ میں جاتے ہی گدے پر لیٹ گیا۔ آرتی نے سارا سامان ایک طرف رکھا اور میرے جوتے اتارنے کے لیے بیڑھی۔

”ارے، یہ کیا کرتی ہو؟“ میں نے پاؤں سکھتے ہوئے کہا۔

”مت منع کیجئے ہمیں۔“ اس نے میری سنی آن سنی کرتے ہوئے کہا اور میرے پاؤں سے جوتا اتارنے کے لیے بیڑھی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا جلدی سے اپنے جوتے اتار کر ایک طرف رکھ دیئے تپ وہ قدرے مایوسانہ انداز میں بولی۔

”کیا ہوتا جو ہم جوتے اتار دیتے۔“

”بات ہونے یا نہ ہونے کی نہیں، آرتی اتنی کوئی خادمہ تھوڑی ہو۔“ میں نے یونہی بات کہہ دی۔ تو وہ خود کلامی کے سے انداز میں بولی۔

”ہاں بھی اور شاید نہیں بھی۔۔۔“

”کتنی پرسکون ٹھہرائی ہے۔“ میں نے بات بدلنے ہوئے کہا۔

”یہ تو ہے۔“ وہ میرے قریب بیٹھنے ہوئے بولی، پھر سر سراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”شجاعی انڈر ماحول کو سمجھیں۔“

”ضروری نہیں کہ ہر چیز کو سمجھا جائے، کبھی کبھی بغیر کبھی ہی سب کچھ سمجھ لیا جاتا ہے؟“ میں نے دھیرے سے کہا تو وہ مسکرا دی پھر ہمارے درمیان یونہی یہاں کے ماحول کے بارے باتیں چلتی رہیں۔ اس دوران اس نے کھانے پینے کا سامان نکول لیا۔ میں ہاتھ دھونے خیمے سے باہر نکل گیا، واپس آیا تو آرتی نے دو جام بنا کر رکھے ہوئے تھے۔

”آرتی! تمہیں پتہ ہے کہ میں پینا نہیں ہوں۔“

”کیوں؟“ اس نے یوں پوچھا جیسے میں کسی بہت بڑی نعمت سے محروم ہوں۔ پھر اگلے ہی لمحے وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ”آپ اپنے دھرم کی وجہ سے تو منع نہیں کر رہے؟“

”ہات دھرم کی نہیں۔ جو چیز ٹھیک نہیں ہے، وہ ٹھیک نہیں ہے اور پھر اس کے پینے سے بندے کو اپنے آپ کا ہوش نہیں رہتا۔“

”کبھی کبھی مد ہوش ہو جانا چاہئے، ہر دور کی لذتوں سے آشنائی حاصل کرنے کا تجربہ ہی سہی۔“ اس نے میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا یہ ضروری ہے کہ مد ہوش ہونے کے لیے شراب ہی کا سہارا لیا جائے، کسی کا ساتھ بھی تو مد ہوش کر دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔“ میں نے خمار آلود لہجے میں کہا جس پر اس کا چہرہ مزید گلابی ہو گیا اور نجانے کہاں سے خمار اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔

”ٹھیک ہے ہم بھی نہیں پیتے۔“ اس نے پھر اہوا جام اٹھا کر اٹھانا چاہا۔

”دیکھو، میری وجہ سے اپنی سستی عمارت مت کرو۔ اب اسے پھرا ہے تو پنی جاؤ۔“

”لیکن ہم نے تو دو دھرمے ہیں، ایک آپ کا اور ایک ہمارا۔“ اس نے قدرے مصہوبیت سے کہا۔ جو یقیناً مصنوعی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور
- ✦ ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”تمہیں مجھ سے پوچھنا چاہئے تھا، آرتی!“ میں نے اپنی انگلیوں سے اس کے گال چھوتے ہوئے کہا تو وہ جیسے پھل گئی۔ اس نے کوئی بات نہیں کی اور جا سا اپنے حلق میں اظہار لیا۔ میں نے فن پیک سوڈا اکھول لیا۔ کھانے کے دوران وہ اصرار کر کے مجھے کھلاتی رہی۔ جب ہم کھانی چکے تو اس نے اپنا سر میرے زانو پر رکھ دیا اور گدے پر پھیلتے ہوئے بولی۔

”شجاع جی! کبھی سوچا تھا آپ نے کہ میرے جیسی لڑکی یوں تمہائی میں ایک رات آپ کے ساتھ بسر کرے گی؟“
 ”زندگی پانچک کا نام تو نہیں ہے کہ جو پان کر لیا، سو ہو گیا۔“ میں نے یونہی طرح دی۔
 ”نہیں، یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔“ اس نے میرے بازو پر ہاتھ بھیرتے ہوئے کہا۔

”کچ پوچھو، آرتی! تو نہیں سوچا تھا۔“

”مگر ہم نے سوچا تھا۔“ اس نے تیزی سے کہا۔

”ہم نے چند دن پہلے سوچا کہ کاش ایسا ہو جائے اور ہماری خواہش پوری ہوگی۔“

”جن کی خواہشیں پوری ہوں، یقیناً وہ خوش قسمت ہوتے ہیں۔“

”یقیناً، شجاع! ہم خوش قسمت ہیں اگر ہمیں آپ کا پیار میسر آ جائے۔“

”آرتی! تمہارے نزدیک پیار کا مفہوم کیا ہے، محض جسم کی تسکین؟“

”نہیں، شجاع“ وہ میرا ہاتھ مضبوطی سے چکراتے ہوئے بولی۔ ”ایسا ساتھ جو انوث ہو، اس میں ضروری نہیں کہ بدن بھی شامل ہو۔“

”ایسا انوث ساتھ کیسے ممکن ہے؟“

”ہم ملے ہیں تو یہ دن جو ہمیں میسر ہیں، اتنے بھر پور ہوں، اتنے بھر پور ہوں کہ اگر ہم ساتھ نہ بھی رہیں تو ذہنوں میں، یادوں میں یہ سب

تازہ رہے۔“

”انسان ہوں نا، آرتی! میں بھی کسی کا ساتھ چاہتا ہوں۔ شاید تم سے بھی زیادہ۔۔۔“ میں نے اس کے چہرے پر انگلی کی پور بھیرتے

ہوئے کہا۔ ”بلشبہ تم حسین ہو۔ یہ تمہاری کاجل بھری آنکھیں، یہ سرخ ہونٹ، یہ دلچسپی گال اور پھر یہ تمہارے خوبصورت ہال، یہ کسی کو بھی گھاس کر

دینے کے لیے کافی ہیں۔ میں رو بہت نہیں ہوں، میں بھی جذبات اور احساسات رکھتا ہوں مگر آرتی! میں نے کہا نا، کہ ہماری حدیں ہوتی ہیں اور ہم

ان حدود میں رہنے پر مجبور ہیں۔“

”کیسی حدیں؟ یہ ساری خود ساختہ باتیں ہیں، بہانے ہیں شجاع! ہم اس وقت آپ کے پاس ہیں، آپ کی دسترس میں ہیں۔ ہم چاہ

رہے ہیں کہ کوئی ہمیں پیار کرے، ہمیں ہماری مرضی سے توڑ پھوڑ ڈالے تو۔۔۔ تو شجاع! یہی حقیقت ہے، ہاں سب افسانے ہیں۔“ آرتی نے

کرب سے کہا اور جام کا کلف کیے بغیر بول مڑ کولگالی۔

”تم جذباتی ہو رہی ہو۔“ میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں بھیرتے ہوئے کہا۔ ”سنو احدیں کیا ہوتی ہیں۔ سامنے کی حقیقت کو تو ہر کوئی

مان لیتا ہے لیکن وفا کے کہتے ہیں؟ بلاشبہ تمہارا بدن میری دسترس میں ہے۔ اسے خوبصورت، سڈول اور گدازدن سے انحراف ممکن تو نہیں لیکن تم میں اور مجھ میں ایک وعدہ آن رکا ہے، مجھے اس کا پالن کرنا ہے۔" یہ کہہ کر میں ایک لمحہ کو رکا اور پھر بولا۔ "آرتی! کیا تم نے کسی سے محبت کی ہے؟"

"نہیں، شاید محبت ہم جیوسوں کے لیے بنی ہی نہیں۔" اس نے لاپرواہی سے کہا۔

"میں تمہارے بدن کی پکار کا جواب بھی دوں تو میں پھر بھی تمہارا نہیں ہو پاؤں گا۔ میرا ذہن، میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہوگا۔ اپنے ہی وعدوں پر لکیر کھینچ کر اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گا۔ آرتی! مجھے یہ بتاؤ کہ کسی کی تپیل یا ریاضت نشت ہو جائے تو کیا یہ اچھی بات ہے؟"

"نہیں، شجاع! ہم ایسا کبھی نہیں چاہیں گے۔" اس نے میرے سینے پر اپنی ہتھیلی پھیلاتے ہوئے کہا۔

"تو بس یہی ہماری حدیں ہیں۔ ہم دونوں کے درمیان سے ایک جسمانی تعلق نکال دو، یہی ہماری مضبوط دوستی کی بنیاد ہوگا۔" میں نے کہا تو جواب میں وہ خاموش رہی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلاتے ہوئے کہا۔ "تم اتنی پیاری ہو، تمہیں اتنا پیار کیا جا سکتا ہے کہ اس کے لیے زندگی بھی کم ہو۔ تم اسے اپنے عورت پن کی توہین مت سمجھتا۔ میں مجبور ہوں، آرتی! اپنے کہے ہوئے لفظوں کی ذنجیروں کا قیدی، مجھے معاف کر دینا۔"

"نہیں، شجاع! آپ بہت اچھے ہو مگر آپ کو ایسا نہیں ہونا چاہئے تھا۔" اس نے انتہائی جذباتی لیکن خودکلامی کے سے انداز میں کہا۔ پھر بولس سے چند گھنٹے لیے اور منہ صاف کرتے ہوئے بولی۔ "نہیں، آپ کو ایسا ہی ہونا چاہئے تھا۔ یہی انفرادیت ہی تو ہمیں مکمل کر گئی ہے۔ سبھی میرے بدن کو بھونکی لگا ہوں سے دیکھتے ہیں۔ میں شاید مردار ہوں اور باقی سارے گدھے ہیں یا پھر۔۔۔ پھر ایسی لاوارث شے جسے کبھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ایک آپ۔۔۔ شجاع! ایک آپ ایسے ہیں جس کی لگا ہوں میں ہوں نہیں ہے۔ میں نے سمجھا، یونہی پوڈ کر رہے ہیں مگر آپ سچے نکلے، شجاع! میں دل سے آپ کا احترام کرتی ہوں۔" بھرائی ہوئی آواز میں کہتے ہوئے اس نے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیا۔ پھر وہ دیر تک روتی رہی۔ میں نے اسے رونے دیا۔ جب اس کی گرفت بولس پر ختم ہو گئی تو میں نے اسے خود سے جدا کر کے لٹا دیا، بولس ایک طرف رکھی اور دوسرے کنارے پر خود لیٹ گیا۔ نیند میری آنکھوں سے ناپا بھئی تھی۔ اس وقت وہ ایک ڈش کے روپ میں میرے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ ہم دونوں ہی میدان جنگ میں تھے، وہ اپنی چال میں کامیاب ٹھہری جبکہ میں ایک بڑا حملہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر میں شاید سو گیا تھا یا ابھی گہری نیند میں تھا کہ سیل فون بجنے سے میں اپنے حواسوں میں آ گیا، دوسری جانب حیدر تھا۔

"ہاؤ جی اارات کیسے گزری؟"

"بہت اچھی۔" میں نے شمارا آؤد لہجے میں کہا۔

"چلو آؤ، چلیں۔ پارکنگ تک پہنچو" اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے فون آف کر کے آرتی کی طرف دیکھا، وہ بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ اس کا چہلکتا ہوا بدن میرے سامنے تھا، سانس کے زیر و بم سے ہی اس میں زندگی کا احساس کیا جا سکتا تھا اور نہ تو وہ ساکت پڑی تھی۔ میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں ہلکی سی کزنگی تھی جیسے کوئی بے زار ہو۔ کہتے ہیں کہ کسی کے اندر کے احوال کا جائزہ لینا ہو تو اسے سوتے ہوئے دیکھو۔ اس وقت جو اس کا چہرہ کہہ رہا ہوگا وہ اس کے اندر کا احوال ہوگا۔ میں نے آرتی کو جگایا، کچھ دیر کوشش کے بعد وہ اٹھ کر میرے ساتھ چل دی۔ شاید اس کا نشہ

نہیں اتر تھا، وہ میرے ساتھ لگ کر چل رہی تھی۔ میں جب پارکنگ کے پاس پہنچا تو حیدر وہاں پر موجود تھا، اس نے بہت غور سے ہم دونوں کو دیکھا۔
 وہ ایسی پردوں گاڑیوں ڈرائیور چلا رہے تھے، میں اور آرتی کچھل نشست پر تھے اور ڈرائیور کے ساتھ اوشا بیٹھی ہوئی تھی۔ گھر پہنچے تو سورج اُبھرایا تھا اور
 اس کی روشنی چاروں طرف کھیل چکی تھی۔ میں نے آرتی کو اس کے کمرے تک پہنچایا تو وہ جیسے مجھ سے چٹکتی ہوئی گئی۔
 ”اگر ہی سو جائیں آپ۔۔۔“ وہ بڑبڑائی۔ تو میں نے اس کے بالوں میں ہاتھ بھرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم اطمینان سے لیٹ جاؤ، میں یہیں ہوں۔“ یہ کہہ کر میں اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ پھر مجھے بھی ہوش نہیں رہا کہ میں کہاں
 ہوں۔ میری آنکھ کھلی تو میں کمرے میں اکیلا تھا۔ میں نے وقت دیکھا، شام کے سائے ڈھلنے والے تھے۔ میں اٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ باہر سناٹا
 تھا۔ میں سٹپ روم سے ہوتا ہوا اپنے کمرے میں آیا تو برشے سلیقے سے رکھی ہوئی تھی۔ افراتفری کا وہ عالم نہیں تھا جو میرے ہونے کی وجہ سے وہاں
 ہوتا تھا، میں دھیرے سے مسکرایا اور ہاتھ روم میں گھس گیا۔

اس رات ڈنر پر میں اور آرتی تھے، حیدر نے کہاں چلا گیا تھا۔ بھوک چوٹکے زوروں کی لگی ہوئی تھی اس لیے ساری توجہ کھانے پر رہی۔
 خوب ڈٹ کر کھانے کے بعد میں اور آرتی باہر کھلی فضا میں نکل آئے۔ میں نے مسکرتے ہوئے اس سے پوچھا۔
 ”میرا کمرہ کس نے ٹھیک کیا تھا؟“
 ”جس نے بھی ٹھیک کیا، وہ آپ اسے کوئی سزا دینا چاہتے ہیں؟“ وہ شوخی سے بولی۔

”نہیں، جناب! ہم نے یونہی پوچھنے کی گستاخی کی ہے۔“ میں نے بھی عام سے لہجے میں کہا۔ ہم دھیرے دھیرے قدموں سے چلتے
 ہوئے سوئمنگ پول تک جا پہنچے۔ آرتی وہاں دھری ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر ڈھیر ہو گئی تو مجھے بھی بیٹھنا پڑا۔ ہم روشنی میں ارد گرد کے سارے
 منظر خواہیدہ سے تھے۔ پرسکون پانی کا ٹکس ٹھہرا ٹھہرا سا تھا، کھلے کھلے لباس میں آرتی میرے سامنے تھی اور میں اسٹیم میں گھر اس کے سامنے بیٹھا
 تھا۔ اگر کوئی من جاہا سانس ہوتا تو یہ رومان پرور ماحول مدہوش کر دینے کے لیے کافی تھا۔ چاند کی چاندنی بھی جوہن پر نہیں آئی تھی، کچھ دیر بعد وہ بھی
 اس ماحول میں نشہ گھول دینے والی تھی۔ میں نے آرتی کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں میرے لیے پیار لکھوے لے رہا تھا۔ دکھ کی ایک لہر میرے اندر
 سرایت کر گئی۔

”کیا دیکھ رہے ہیں آپ؟“ آرتی نے اک ادا سے پوچھا۔

”تمہارا حسن دیکھ رہا ہوں، اگر کوئی مخبر بھی تمہاری طرح حسین ہوتا تو میں بڑے آرام سے اپنی گردن اسی مخبر سے کٹا لیتا۔“

”آپ ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے لہجے میں کہا، پھر ادا سے بولی۔ ”اچھا چھوڑیں ان باتوں کو، یہ بتائیں، رات
 نشے میں کچھ زیادہ ٹھگ تو نہیں کیا آپ کو؟“

”کیا تمہیں احساس ہے کہ تم نے ٹھگ کیا تھا؟“

”مطلب کوئی اوٹ پٹا ٹھگ حرکت، کوئی فضول بات؟“ آرتی ڈیر لب مسکراتے ہوئے بولی۔

”او نہیں، یارا“ میں نے کہا اور بات بدلنے ہوئے اچھا۔ ”آرتی اتم داسی ہو، اپنی پوتر تاجپانے کے لیے حیدر کے پاس چھپی ہوئی ہو۔“

پھر بھی تمہارا مجھ سے ایک خاص مطالبہ رہا یہ متضاد رویے ہیں، ایسا کیوں؟“

”ہمیں احساس تھا کہ آپ کسی بھی وقت ہم سے یہ سوال ضرور کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ قدرے سنجیدہ ہوئی اور پھر کہتی چلی گئی۔ ”ہماری

حیثیت اگر ایک داسی کی ہے تو یہ بعد کی بات ہے، پہلے ہم ایک عورت ہیں۔ ہماری اپنی خواہشات، ہمارے جذبات اور تعلق ہے۔ ہم آشرم میں تھے تو وہاں کے ماحول کے مطابق جیون گزارا اور اب آشرم سے باہر ہیں تو ہمارا من چاہتا ہے کہ ہم بھی عام لوگوں کی طرح جیون بتائیں۔“

”آرتی ایہ تضاد کیوں؟“

”آپ کو یہ تضاد نظر آتا ہے مگر جب آپ اسے ہماری نگاہ سے دیکھیں گے تو کچھ بھی ابہام نہیں ہوگا۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی، میں چپ

رہا تو وہ بولی۔ ”آپ نے محض جسم کی پکار کو بنیاد بنا کر یہ سوال کیا ہے تو شجاع جی امندر میں یا آشرم میں ایک داسی کو یہ خدمت بھی کرنا پڑتی ہے، دھرم کے انوسار (مطابق) یہ خدمت کر کے بھی ہم پتر ہیں اور اس وقت بھی ہم پتر ہیں جب کوئی من چاہا مل جائے جسے ہمارا من چاہے۔ شردھتھی سے

ہمارا من نہیں ملا، ہم نے اس سے خود کو بچا لیا اور آپ کو دیکھا تو لگا جیسے آپ کسی دیوتا کے دیوتا ہیں۔ پھر ہمارے پاس ہے ہی کیا، یہی ایک جسم!“

”آرتی مجھے تمہاری باتیں بالکل بھی سمجھ نہیں آ رہیں۔“

”ایسا اس لیے ہے، شجاع جی! کہ آپ اپنے دھرم کی ٹینک سے مجھے دیکھ رہے ہیں۔ آپ کے نزدیک یہ سب کیا ہے، میں اس سے غرض

نہیں۔“

”ہو سکتا ہے، تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اگر میں تمہارے اس فلسفے کو سمجھتا ہوں تو۔۔۔“

”ہم شاید نہ سمجھا پائیں کیونکہ ایک داسی کا دھرم یہ ہے کہ وہ خاموشی سے خدمت کرتی چلی جائے۔“

”آرتی! تمہارے اس خدمت کے عمل کا درس دینے کے لیے کوئی بنیادی فلسفہ ہوگا، جو مطمئن کروے؟“

”ہم کب کہتے ہیں کہ ایسا فلسفہ نہیں ہوگا۔“

”کچھ ایسا ہو سکتا ہے کہ میں اسے سمجھ سکوں؟“ میں نے کہا تو وہ قدرے جوش سے بولی۔

”ہاں، یہ نہیں دوسری میں ایک چھوٹا سا آشرم ہے جہاں سوائی بری داس ہوتے ہیں، وہ گرد و جنش کے سچے ہی دکار ہیں، وہ سب جانتے ہیں۔“

”کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”کیوں نہیں مگر ہمیں یہ پتہ نہیں کہ وہ آشرم ہے کہاں، معلوم کر لوں گی تو بتا دوں گی۔“

”ٹھیک ہے، آرتی! میں ان سوائی جی سے ضرور ملنا چاہوں گا۔۔۔“ میری بے تابی میرے لہجے سے عیاں تھی۔

”اتنی بھی کیا جلدی، مہاراج! ابھی تو آپ کی داسی، آپ کے سامنے موجود ہے۔“ آرتی نے غماز آلود لہجے میں کہتے ہوئے اٹھرائی لی۔

میں مسکرا کے رہ گیا، وہ میری طرف دیکھتی رہی تو میں نے کہا۔

”آؤ، آرتی! چلیں مجھے کچھ فون کرنا ہیں۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ پھر ہم دھیرے قدموں سے چلتے شنگ روم میں آ گئے۔ میں سونے پر بیٹھا اور آرتی کو چائے بنا کر لانے کا کہہ دیا۔ وہ ہلٹی گئی تو میں اس بدنام زمانہ شخص کے ہارے میں سوپنے لگا جو کہ روزِ جنیش کے نام سے شہرت پا کر پھر وقت کے اندھیروں میں گم ہو گیا تھا۔

یوں تو ہندوستان کی سرزمین پر بہت سے ایسے لوگ ہوئے ہیں جنہوں نے ہندو دھرم پر کسی نہ کسی طرح اثر ڈالا مگر جنیش نامی شخص نے ہندو دھرم میں ایسی جہت متعارف کرائی جس سے ہندو دھرم ایک غلیظ اور کریہہ صورت میں سامنے آیا۔ روزِ جنیش بنیادی طور پر سنیا سی تھا۔ اس کے خیالات نہایت وحیدہ اور پراسرار دھم کے تھے جو اس نے مذہبی روحانیت میں لپیٹ کر پیش کیے۔ اس نے اپنے خیالات و افکار کا پرچار بھارتی شہر پونا کے ایک چھوٹے سے آشرم سے کیا، بہت جلد لوگ اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ اس کے گرد جو لوگ جمع ہوئے، ان کا تعلق دولت مند گھرانوں سے تھا۔ جبکہ اس کے چیلوں میں انتہائی دوامدہ قسم کے لوگ شامل تھے۔ اس نے دھرم میں ایک نئی طرح کی بنیاد رکھی اور گورو جنیش اور روزِ جنیش دھماکے نام سے بھی پکارا گیا۔ دراصل یہ شخص جنسی سرریض تھا۔ عورت و شراب اور دولت اس کی فطری کمزوریاں تھیں۔ یوں دھرم کی آڑ لے کر اس نے روحانیت کے ریشمی کپڑے میں اپنے خیالات پیش کیے جو سراسر بے راہ روی پڑتی تھے۔ اسی بے راہ روی کو اس نے ”انسان کی فطری آزادی“ کا نام دے رکھا تھا۔ اس نے مادہ پرست آزادی کو روحانیت کی اعلیٰ سطح قرار دے کر اس کے لیے ناممقول دلیلوں اور گھٹیا جواز کا انبار لگا دیا۔ دنیا بھر سے پراسرار علوم کی تلاش میں بھارت آنے والے اور وہ لوگ جو روحانیت میں دلچسپی رکھتے تھے، گورو جنیش کے بچھائے ہوئے جال میں پھنستے چلے گئے۔ بھارتی پنڈت گورو جنیش کی اس شہرت سے خائف ہو گئے۔ انہوں نے اپنی حیثیت و مقام بچانے اور اپنے دھرم میں نئی جہت کو ختم کرنے کے لیے باقاعدہ محاذ شروع کیا۔ جس کے نتیجے میں روزِ جنیش کے خیالات و افکار پر پابندیاں لگنے لگیں، یہاں تک کہ اس پر بھارت کی زمین تک ہو گئی اور وہ امریکہ چلا گیا جہاں اسے اور آزادی میسر آ گئی۔ اس کے پاس کون سی قوت تھی جس کے زیر اثر لوگ اس کے ارد گرد جمع ہوتے تھے؟ یہ بحث موضوع نہیں تاہم انہی خیالات و افکار کے باعث اس کے گرد چیلوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا، دولت کے انبار لگ گئے۔ سڑک کے لیے لاقعد اور اس راس کار میں، رہائش کے لیے عالی شان مکان، دنیا کی عمدہ ترین شراب اور خوب رو جان لڑکیاں اسے میسر تھیں۔ روزِ جنیش بنیادی طور پر غلیظ اور کریہہ انسان تھا۔ اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ جیسا ملک جہاں جنسی بے راہ روی اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی ہے، اس حکومت نے 1985ء میں اس کی تعلیمات کی وجہ سے اسے گرفتار کیا۔ اس پر متعدد مقدمات ہوئے اور اسے امریکہ سے نکال دیا گیا۔ وہ واپس بھارت آ گیا۔ غالباً 1990ء کے لگ بھگ وہ انتہائی گمنامی میں مر گیا۔ زندگی کی روشن خیالیاں اپنی جگہ لیکن روشن حقیقت سے من موڑنے والا گہری کھائی میں گرتا ہے۔ دراصل اس نے بھی برہمن ازم کے خلاف اٹھائی تھی اور انہی کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔ میں حیران تھا کہ جس کی تعلیمات اتنی غلیظ اور کریہہ تھی اور وہ اپنی موت آپ مرتی تھی، وہ ہمارے کس طرح زندہ ہو کر سامنے آ رہی تھی۔ وہ تعلیمات جنہیں بھارتی برہمنوں نے اپنی ہزیمت خیال کیا تھا، انہوں نے کس طرح اس کے پرچار کو زندہ چھوڑا؟ اب بھی اگر روزِ جنیش کے چیلے، اس کے خیالات کے پرچار کو موجود تھے تو یہ نہایت خطرناک بات تھی۔ مادیت پرست لوگ اس جال میں کپے

دعا کے سے بندھے چلے آتے ہیں۔ مجھے سوائی ہری داس سے ضرور ملنا تھا۔ میں یہ دیکھتا جا رہا تھا کہ وہ دوہنی میں کیسے عزائم لے کر بیٹھا ہے۔ میں یونہی مضطرب ہو گیا۔ سوائی ہری داس تک پہنچنے کے لیے واحد راستہ آرتی کی صورت میں تھا اور میں اسے کسی شرط بھی کھونا نہیں چاہتا تھا۔

”جناب احریہ ارچائے پیش خدمت ہے۔“ آرتی کی آواز پر میں چونک گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور بیانی پکڑ کر میز پر رکھ دی۔ اس نے بھی اپنی بیانی پکڑ پر رکھی اور میرے سامنے ایک ٹانگ سیٹ کر اور دوسری صوفے سے نکال کر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو وہ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے میری جانب دیکھ رہی تھی۔ نجانے کیوں مجھے وہ ان لہجوں میں اجنبی لگی، اتنی اجنبی کہ بس اس سے نفرت کا احساس نہیں ہوا۔ ایسا احساس کا جس میں شناسائی کی رمت بھی نہیں ہوتی۔ میں نے اس احساس سے جان چھڑانے کی خاطر چائے کی بیانی اٹھائی۔ چند سپ لیتے ہوئے میں مسلسل سوچتا چلا جا رہا تھا کہ مجھے اپنے سر میں درد کی شدت بھری لہر محسوس ہوئی۔ انہی لہجوں میں جانا کہ جب بھی کوئی واقعی ریاضت کرتا ہوں تبھی یہ درد آن و آ رہتا ہے تو کیا یہ درد عمومی نوعیت کا نہیں جسے میں اب تک نظر انداز کرتا چلا جا رہا ہوں؟

”شجاع جی کیا بات ہے، آپ اتنے پریشان کیوں لگ رہے ہیں؟“ آرتی نے مجھے چونکا دیا۔

”آرتی امیرے سر کا درد بہت شدت سے اٹھتا ہے اور پھر تھوڑا تھوڑا بہت دیر تک رہتا ہے، اب بھی اچانک لہر اٹھی ہے۔“

”کیا یہ اکثر ہوتا ہے؟“ اس نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”ہوں، اکثر ہو جاتا ہے، غفلت یہی رہی کہ اب تک ڈاکٹر کو چیک نہیں کروا پایا۔“

”آپ ابھی پریشان مت ہوں، چائے پی لیں، ابھی آپ کے سر کا درد ختم ہو جائے گا۔“ آرتی نے مسکرتے ہوئے کہا۔

”مطلب، وہی سچ تمہاری؟“ میں نے پوچھا۔

”جی، بالکل، بس آپ جلدی سے چائے پی لیں۔“ آرتی نے کہا اور اپنی چائے ختم کرنے لگی۔ میں بیانی خالی کر چکا تو انہیں ایک طرف

رکھ کر میرے پیچھے آ کر بیٹھ گئی۔ پھر دیر سے اس نے میرا سر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ تھوڑی دیر تک اپنی انگلیوں سے میرے سر اور ماتھے پر ہلکا ہلکا مساج کرتی رہی، حیرت انگیز طور پر چند منٹوں میں میرے سر کا درد ختم ہو گیا۔

”یہ کیسا جاود ہے، آرتی؟“

”جاود نہیں، ایک معمولی سا فن ہے جو ہمیں آشرم میں سکھایا گیا ہے۔“ وہ دیر سے سے بولی۔

”اب مجھے سکون سے نیند آئے گی۔“

”کیا آپ ابھی سے سو جائیں گے؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”تو اور کیا؟“ میں نے مصنوعی حیرانگی سے کہا۔

”ابھی تو شام ڈھل چکی ہے، ابھی سے سو کر کیا کریں گے آپ؟“ پھر ایک لمحہ بعد سوچنے والے انداز میں بولی۔ ”چلیں، کوئی اچھی سی فلم

دیکھتے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے دیر سے سے میرا سر اپنی ران سے ہٹایا اور اٹھ گئی۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس رات میں نے سر درد کے بارے میں سمجھ بھگتی

سے سوچا اور فیصلہ کیا کہ پہلی فرصت میں چیک اپ کروانا ہوں۔ میں یہی سوچ رہا تھا کہ میرا اسل فون بچا تھا، دوسری طرف حسن تھا۔
 ”کیا ہو رہا ہے، جان تھی؟“ اس نے خوشگواریت سے پوچھا۔

”تھی رہے ہیں، پر وہ کسی بندے کا کیا ہے؟“ میں نے یونہی چھینڑنے والے انداز میں دھیرے سے کہا۔
 ”اوائے، او اس ہو گئے ہو یا کوئی اور بات ہے؟“ حسن یکدم حق سنجیدہ ہو گیا۔

”ارے نہیں، میں تو یونہی کہہ رہا تھا۔ یہاں تو ہر طرح کی حواشی ہے، یہاں کون او اس ہو سکتا ہے، تم سناؤ، کبھی خبریں چل رہی ہیں؟“
 ”ٹھیک ہے سب، ہر طرف سکون ہو گیا ہے، دو دو شاہ کے بڑے بیٹے سے بات ہو گئی ہے، وہ ہر طرح کے سمجھوتے پر راضی ہو گیا ہے۔ وہ خود بھی کسی صحیح چھندے میں نہیں آنا چاہتا۔ اس کی گینگ کے لوگ بھڑے ہوئے تھے، انہیں بھی اسی نے سنبھالا ہے۔ اس نے تسلیم کیا ہے کہ غلطیاں اس کے باپ سے ہوئی ہیں۔“

”چلو، یہ تو معاملہ ختم ہوا، ناکہ کیسی ہے؟“

”ٹھیک ہے۔ نیچھی ہے میرے پاس۔“

”ارے واہ“ میں نے کہا تو اس نے فون ناکہ کو دے دیا۔

”کیسے ہیں آپ؟“ اس کے لہجے میں سکون تھا۔

”میں ٹھیک ہوں تم ٹھیک ہونا؟“ میں نے بڑے ٹھہرے لہجے میں کچھ دیر حال احوال کے بعد میں نے پوچھا۔ ”عامر کیسا ہے؟“

”پتہ نہیں، کئی دن ہوئے، ملاقات نہیں ہوئی۔“

”خبر ہے؟“

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا کہ میں اب اسے استحقاق میں نہیں ڈالنا چاہتی۔“

”پھر کیا سوچا ہے تم نے۔۔۔؟“

”ابھی تو کچھ بھی نہیں، بس اپنا کارڈ منٹس کا برنس دیکھ رہی ہوں اسی سے فرصت نہیں ملتی۔“ اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ وہ تمہائی محسوس کر رہی ہے۔ میں نے کچھ دیر اسے تسلی دی اور پھر حسن سے باتیں کر کے فون آف کر دیا۔ ایک آسودگی میرے من میں اتر گئی تھی۔ میں نے فون ایک طرف رکھا تو آرتی کا احساس ہوا، وہ میرے سامنے بیٹھی میرے چہرے کی طرف دیکھے چلی جا رہی تھی۔ اس نے قدرے رندھے ہوئے گلے سے پوچھا۔

”شہارحی! ایک بات تو بتائیں؟“

”پوچھو۔“

”آپ نے ہمیشہ اپنے دوستوں سے بات کی ہے، ان کے لیے پریشان ہوتے ہیں، انہی کی خوشی میں خوش رہتے ہیں۔ آپ نے اپنے خاندان کے کسی فرد کے ساتھ کبھی بات نہیں۔ ایسا کیوں؟“

”بڑی بات ہے کہ تم نے یہ محسوس کیا۔ دراصل، آرتی! بات یہ ہے کہ میرے گھر والوں کے ہارے میں کوئی خیر نہیں تو مطلب ”سب اچھا“ ہے۔ انہیں پتہ ہے کہ میں کہاں ہوں، انہیں کوئی معاشی مسئلہ نہیں کہ میری طرف دیکھیں۔ بس میرے ہاپو کو یہ آس ہے کہ میں کب گھر لوٹا ہوں، منہ سے وہ بھی مجھے آنے کے لیے نہیں کہتے۔“

”مطلب، کہیں ناراض؟“

”ارے نہیں، بس ایک ذہنی رابطہ ہے اور وہ چل رہا ہے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو وہ بھی بے ربطا سانس دی پھر بڑی بے دلی سے اس نے ریووٹ سے قلم چلا دی۔ ہم دونوں بیٹھے دیکھتے رہے، تجمرہ کرتے رہے۔ جب رات بھیک گئی اور قلم بھی ختم ہو گئی تو ہم دونوں ہی اپنے اپنے کمروں کی طرف چل دیئے۔ میرے ذہن میں کہیں تھا کہ شاید آرتی ایک ہی کمرے میں سونے کی ضد کرے مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ رات گزار گئی۔

میں دفتر پہنچا تو کافی لیٹ ہو چکا تھا، کنول جیت میرے انتظار میں تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

”کنول! خیر ہے؟“

”بالکل خیر ہے، آپ تو پریشان ہو گئے؟“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

”وہ اس لیے کہا کرتی تھی۔ مجھ سے براہ راست بات ہو جاتی تو ٹھیک تھا، اب فون آرتی نے سنا تو اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔“

”آج سب فائل کرنا تھا، میں نے یہی کھڑم کرنا تھا کہ آپ دفتر آ رہے ہیں یا نہیں؟“

”تو، کنول! میرے سب فون پر کال کرنا تھی۔“ پھر اس سے پہلے کہ وہ سواری وغیرہ کہتی، میں نے جلدی سے کہا۔ ”آئندہ براہ راست مجھے

کال کر لیا کرو۔“

”ٹھیک ہے، ہر“ یہ کہتے ہوئے اس نے فائل کے ساتھ دھرے کاغذ اٹھانا چاہے تو میں جلدی سے بولا۔

”ارے، کنول! سارا دن یہ کام ہوتا رہے گا۔ پہلے ڈرا آئیسی کافی پلاؤ، ڈراموڈ بنے تو کام ہو۔“

”گنتا ہے ہر! آپ نے اچھی خاصی جھنسی منائی ہے۔“ اس نے سنی خیر لہجہ میں کہا تو میں مسکرا دیا۔

”کون جانے، کون کس عذاب سے گزارا ہے۔“ میں نے ہم انداز میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنس دی اور اٹھ گئی۔ وہ لگی تو ندیم آ گیا۔ میں

نے اہمائی مختصر انداز میں اسے پچھلے دن کی روداد سنائی اور کہا۔

”سو امی ہری داس کے بارے میں الطاف پاشا سے پوچھو، اس کے بارے میں کچھ معلومات ہوں تو مجھے بتاؤ۔“

”وہ کوئی خاص آدمی ہے؟“ ندیم نے پوچھا۔

”یہ تو اس سے ملنے کے بعد ہی معلوم ہوگا، ہو سکتا ہے، یہ اہم آدمی ہو۔ مجھے اس سے ملنا ہے۔“

”ہم کوشش کرتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ میز پر دھری کنول کی فائل دیکھنے لگا۔ پھر اٹھے ہی چند لمحوں میں کنول کافی نے کرا گئی، تبھی ندیم ہنستے

ہوئے بولا۔

”یہ کنول تو آپ کو پوری طرح اسسٹ کر رہی ہے اور تو اور، ہماری گل کی چھٹی بھی غارت کروادی اور خود بھی رات گئے تک نہیں سوئی۔“ اس نے کہا تو کنول جیت لاشعوری طور پر پنجابی میں بولی۔

”او، جناب! کم وی تے مکا ناسی۔“ (او جناب کام بھی ختم کرنا تھا۔)

”جی، کنول! کام ختم کرنے سے ہی ختم ہوتا ہے۔“ میں نے انگریزی میں کہا تو وہ ہنس دی۔

”یہ بندیم بھی تو لا ہو رہی کے ہیں؟“ وہ بولی۔

”جی، اور کبھی موقع ملا تو پاکستان میں موجود سارے گرو دارے پھر ادوں گا۔“ ندیم نے قدرے شرح ہوتے ہوئے کہا۔

”بڑی سہرابانی جناب کی۔“ کنول نے باقاعدہ ہاتھ ماتھے پر لے جاتے ہوئے کہا، پھر میرے سامنے کرسی پر بیٹھے ہوئے بولی۔ ”گنما بات

کہوں، شجاع جی! یہاں کام کوئی بھی نہیں ہے لیکن آپ لوگوں کے ساتھ دل لگ گیا ہے، ذرا بھی وطن کی یاد نہیں آتی۔ مجھے لگتا ہے جیسے ہم کمر میں ہی ہوں۔“

”جھوٹ کہہ رہی ہوتی۔“ میں نے معنوی سمجیدگی سے کہا تو وہ جھٹ سے بولی۔

”ندیم، جھوٹ تے نہیں کہہ رہی۔“ پھر قدرے ہوش سے بولی۔ ”پر آپ غلطیاد آتے ہیں نا۔۔۔!“

”چلاؤ آج یہ سارا فائل کر کے سچ نہیں کرتے ہیں، بولو، کیا کھلاؤ گی؟“

”دھن بھاگ میرے، شجاع جی! جو کہیں۔۔۔“

”آلوکی بھیا اور پراٹھے، پودینے کی چٹنی اور لسی۔۔۔“ میں نے جھٹ کہا تو وہ اسی تیزی سے بولی۔

”حاضر ہوگی۔۔۔“ یہ کہہ کر اس نے جلدی سے فائل کنول لی۔ ندیم نے انٹر کام پر تیش کو بولا لیا، کچھ دیر بعد سب فائل ہو گیا۔ کنول سب

کچھ سیٹے ہوئے بولی۔ ”میں جا رہی ہوں، مجھے مارکیٹ بھی جانا ہوگا۔ آپ وقت پر پہنچ جائیں۔“

”یہ بندیم تمہارے ساتھ مدد کے لیے جائے گا۔“ میں نے کہا تو وہ فوراً تیار ہو گیا۔ وہ لوگ گئے تو میرے پاس تیش رہ گیا۔

”خاصے مصروف ہو گئے ہو۔“ میں نے اس سے یونہی بات بلا جانے کے لیے کہا۔

”اصل میں کنول نے میرے ذمے پہلی لگا دی ہے، نکت اور پہلی کو میں نے دیکھتا ہے۔ وقت تھوڑا ہے اور اس حساب سے کام زیادے

اس لیے مصروف تو ہونا ہی تھا۔“

”ہاں، یارا میں بھی آتے ہی ایک دائرے میں بند ہو کر رہ گیا ہوں، ہا ہر نکلا ہی نہیں۔ نہ کوئی پارٹی، نہ کوئی ڈسکو۔“ میں نے اس کی طرف

دیکھ کر کہا تو وہ زرب لب مسکرا دیا۔ پھر دیر سے بولا۔

”آپ خود ہی ہا ہر نہیں نکلتے ورنہ کیا کیا رہینیاں یہاں پر نہیں ہیں۔ یہ میڈم زارا کے ٹور پر دیکھئے گا، کیسے کیسے لوگ ملتے ہیں۔“

”تیش! ہنگامے کبھی کبھی اچھے لگتے ہیں، لطف تو سکون اور شائق میں ہی آتا ہے۔“ میں نے سگریٹ سگاتے ہوئے کہا۔

”ایسا بھی بہت کچھ ہے، آپ وقت تو دیں۔“ وہ اسی لہجہ میں مسکراتے ہوئے بولا۔

”وقت کہیں سے جا کے لانا ہے، اپنا ہی تو ہے۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ گیا۔ اسے کچھ فون کرنا تھے اور اس نے نیٹ پر اپنی پسندیدہ سائٹ کھول لی پھر میں نے لگا اس وقت جب کنول جیت کا فون آیا کہ لٹچ تیار ہے۔ میں نے کپڑے اتارے اور تھیش کو لے کر اس کے پارٹمنٹ چلا گیا۔ کنول جیت میرے لیے قدرے معزز تھی۔ جب تک الطاف پاشا نے مجھے صحیح صورت حال کے بارے میں آگاہ نہیں کیا تھا۔ جب تک اپنے ارد گرد موجود لوگوں کے بارے میں میرا ذہن لگاؤ کچھ اور تھا لیکن جیسے ہی آگئی ہوئی سب کچھ بدل گیا۔ پہلے میں کنول جیت کو اک شعلہ جوالا قسم کی لڑکی سمجھتا تھا جو بس بھڑک اٹھنے کو تیار بیٹھی ہے۔ اس میں وقت اور حالات کے کئی آپشن ہو سکتے تھے لیکن اب میں خود سمجھتا جا رہا تھا کہ وہ کیا ”جیز“ ہے؟ اس سے متعلق ڈیڑھ سو سال ذہن میں آتے مگر حتمی جواب کوئی بھی نہیں تھا، اندازے ہی ہو سکتے تھے۔ حیدر شاہ کے ساتھ تھیش جیسے شخص کا ہونا تو صاف تھا، کنول جیت بھی ان کی طرح ہی تھی۔ ظاہر ہے، انہوں نے بہت سوچ بچ کر انہیں اپنے ساتھ ملایا ہوگا۔ غالب امکان یہی تھا کہ وہ بھی ان کی طرح عظیم ہی سے متعلق تھی۔

میں پہلی بار ان کے پارٹمنٹ گیا تھا۔ ندیم سنگ روم میں ٹی وی دیکھ رہا تھا جبکہ کنول جیت کچن میں مصروف تھی، ہمیں دیکھتے ہی بولی۔

”تی آ یا نوں، آپ پہلی بار یہاں آئے ہیں۔“

”ہاں، کنول اپنی بار۔۔۔“ یہ کہتے ہوئے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ جلد ہی کنول نے کھانا میز پر لگا دیا۔ گرم گرم پراٹھے، آلو کی بجیا، پودے کی چٹنی، رائیسا اور لسی دیکھ کر طبیعت خوش ہو گئی۔ کھانا کھاتے ہی ندیم اٹھ گیا۔

”مجھے تو اجازت دیں، بڑے کام پڑے ہیں کرنے والے۔“ اس نے کہا تو تھیش بولا۔

”میں بھی چلا ہوں۔“

”چلیں، ٹھیک ہے، ہمارے لیے تو کوئی کام نہیں ہے، ہم ابھی کچھ دیر بیٹھیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ دونوں چلے گئے۔ کنول جیت برتن سینٹے لگی۔

”کنول! تمہارا کمرہ کون سا ہے؟“ میں نے ہانک لگائی۔

”یہ ساتھ والا۔“ اس نے اشارے سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے کمرے میں چلا گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی جو سب سے پہلی چیز اپنی طرف متوجہ کرتی تھی وہ ہاگرونا تک کی ایک بڑی سی رنگین تصویر تھی جس پر کچھ تازہ اور کچھ پرانے پھول چڑھے ہوئے تھے۔ اس کے قریب ہی دیوار اور اگر بتیاں وغیرہ تھیں۔ ایک بڑا سا میٹرز زمین پر بچھا ہوا تھا۔ کچھ کتابیں، پرانے اخبار اور میگزین، زنانہ استعمال کی چیزیں اور کپڑے بکھرے ہوئے تھے۔ مجموعی طور پر کمرے کی حالت افراتفری کی عکاسی تھی۔ وہ میرے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

”کنول! تم سنگھ لڑکی نہیں ہو۔“

”یہ بالکل ٹھیک کہا آپ نے، مگر وہ صاف سٹرا ہو اور ہر شے سلیقے سے رکھی ہو تو مجھے پریشانی ہونے لگتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے میٹرز پر

پڑی چادر ٹھیک کی اور یوں "آئیں، تشریف رکھیں۔ میں جائے بنا کر لاتی ہوں۔"

"چھوڑو جائے، کو، ابھی کسی پٹی ہے۔ تم بیٹھو یہاں۔" میں نے کہا تو بالکل میرے سامنے آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ میری نظر پھر سے گردنا تک کی تصویر پر پڑی تو میں نے بے ساختہ کہا۔

"کنول! میں جب بھی گردنی کی تصویر دیکھتا ہوں تو مجھے انہی کا ایک شعر یاد آ جاتا ہے۔"

"کون سا؟" اس نے انتہائی اشتیاق سے پوچھا۔

زمیلا، زرد حنڈلا، زرد بھگوا، زرد کج

تاک لالو لال ہے، سچے رتا، سچا

"آپ کو یہ شعر کہاں سے یاد ہے؟" وہ انتہائی خوشی سے بولی۔

"پتہ نہیں، کب سے یاد ہے۔ میں نے ایسے ہی کہیں پڑا تھا، شاید میگزین یا کوئی اخبار تھا۔" میں نے کرتے ہوئے کہا تو وہ آنکھوں سمیت ہنس دی، پھر بڑی سچا سے بولی۔

"چلو یاد تو ہے نا!" یہ کہتے کہتے وہ اچانک بولی۔

"لگتا ہے، آپ کو کچھ دھرم کے بارے میں دلچسپی ہے ضرور آپ اس دن آپریشن بلیوسٹار کے حوالے سے بھی کچھ کہنا چاہتے تھے۔"

"نہیں، کنول! اصل میں پڑھنے کی لت بچپن سے پڑ گئی۔ سو جو سامنے آیا، پڑھتے چلے گئے۔ پھر کام ہی لکھنے پڑھنے کا شروع کر دیا۔ اصل میں ہمارے ارد گرد ہونے والے واقعات اپنا اثر تو چھوڑتے ہیں ذہنوں پر، یاد رہ جاتے ہیں۔ تم مٹی ہو گئی پاکستان؟" میں نے آخری فقرہ کہتے ہوئے بات بدل دی۔

"بہت بچپن کی بات ہے تب مجھے اتنا ہوش نہیں تھا۔ ہمارا پورا پر یوار گیا تھا، دھنڈلا دھنڈلا سا یاد ہے، پھر حسرت ہی رہی۔"

"اگر کبھی موقع ملا تو میں پاکستان میں تمہارا میزبان ہوں گا، تمہم نے جو آج مذاق میں بات کہی ہے، ہو سکتا ہے کہ وہ کج ہو جائے۔"

"یہ تو واہ گردنی کر پاہوگی۔" اس نے آنکھیں بند کر کے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا، پھر آنکھیں کھول کر بولی۔ "میں اور کیا سبوا کروں آپ کی؟"

"ارے کنول! اس دیار غیر میں دو اجنبی اگر کچھ وقت گزار لیں تو اس سے بڑھ کر اور کیا عیاشی ہوگی؟"

"ہاں، یہ تو ہے۔" یہ کہہ کر کنول جیسے یادوں میں کھو گئی۔ پھر کتنی دیر تک وہ اپنے کالج اور اپنی سہیلیوں کے بارے میں بتاتی رہی، اوٹ

پناگ، باتیں شرارتیں اور یادیں، جب اس کی آنکھیں سچکے لگیں تو میں نے کہا۔

"کنول! اب بس جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ بالکل پنجابی کڑی بن جاؤ۔ پھر کافی پینے کے لیے نکلیں۔"

"یوں اچانک؟" اس نے قدرے حیرت سے کہا۔

"ہمیں کسی کی اجازت درکار ہے کیا؟" میں نے کہا اور اٹھ کر سٹنگ میں روم میں آ گیا۔ پھر کافی دیر بعد ہم دونوں وہاں سے نکل پڑے۔

اپارٹمنٹ سے نکل کر جب میں گاڑی الواصل روڈ پر لے آیا تو چاچک احساس ہوا کہ کنٹرول جیت ایک عورت ہے جس کی مثال اخروٹ سے دی جاسکتی ہے۔ وہ ٹوٹے ٹوٹے ٹونے کی لیکن اوپر سے جتنی مشکل ہے، اندر سے اتنی ہی آسان ہے۔ مجھے بھی جلدی نہیں تھی۔ یہ سوچتے ہوئے میں زیر لب مسکرا دیا۔ دوران سفر ہم یونٹی ادھر ادھر کی کپ شپ لگاتے رہے۔ اسی روڈ پر خاصا آگے جا کر ایک کافی شاپ پر کنٹرول جیت نے گاڑی رکوائی۔ گاڑی پارک کر کے ہم اندر جا بیٹھے۔ وہاں جا کر مجھے احساس ہوا کہ یہ کافی شاپ نام ہی کی کافی شاپ تھی ورنہ وہاں سب کچھ ملتا تھا، زیادہ تر اٹرین تھے۔ کافی اور اسٹیکس کا آرڈر دے کر ہمیں وہاں بیٹھے بمشکل دس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک سکھ لوجوان ہمارے قریب آ کر رک گیا اور اسے دیکھ کر کنٹرول حیرت سے کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں جب اچھی طرح مل چکے تو کنٹرول نے اسے بیٹھے کو کہا، پھر میرا تعارف کراتے ہوئے بولی۔

”یوں سمجھ لو، میرے پاس یہی ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ میری طرف متوجہ ہوئی۔ ”یہ دلپ سنگھ ہے، ہمارے ہی محلے میں رہتا تھا۔ آخری بار دو سال پہلے میری ملاقات ہوئی تھی اس سے، اس کی بڑی بہن میری کلاس فیوٹی۔“

”بڑی خوشی ہوئی دلپ، آپ سے مل کر۔“ میں نے اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا جو اس نے مضبوطی سے چھاتے ہوئے کہا۔

”مجھے بھی، اور اتنی خوشی ہو رہی ہے کنٹرول دیدی کو دیکھ کر کہ بتائیں سکتا۔“

”ویسے تو آیا کب سے ہے یہاں؟“

”ہمارے کہاں ٹھکانے، جتنی پھل کھٹی میں چاب کر بیٹھے ہیں، ادھر ادھر ہی پھرا رہے ہیں۔“

”چل ابھی تو تو کافی پی، پھر گھر چلتے ہیں، خوب باتیں ہوں گی۔“

”باتیں کیا کرنی ہے، دیدی! روٹا ہی ہے، بنا، بیٹھے کے، مجھ میں اب ہمت نہیں۔“ دلپ نے انتہائی دکھ سے کہا تو کنٹرول نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

”نہیں، میرے ویرا ایسی باتیں مت کر، ابھی جینا ہے۔“ اس نے ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”سوری، شجاع جی۔۔۔۔۔۔“

”نہیں، کنٹرول! ایسی کوئی بات نہیں۔“ پھر میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔ ”دلپ! یہ بڑے مزے کا اتفاق ہے۔ آج ہی کھلی دلفہ ہم کافی پینے کے لیے باہر نکلے ہیں اور تم سے ملاقات ہو گئی۔“ میں نے ماحول خوشگوار بنانے کی خاطر یونٹی بات کہی۔

”میں چند دن پہلے ہی دوئی آیا ہوں۔ میرے پاس دیدی کا ایڈریس تو نہیں تھا لیکن یہ پکا پکا تھا کہ یہ دوئی ہی میں ہیں۔ یہ نہ بتائیں تو میں انہیں ڈھونڈ لیتا۔“

”وہ کیسے؟“ کنٹرول نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں ایک بڑا بھونپو لے کر ٹیکسی پر بیٹھتا اور اعلان کرتا پورے دوئی میں پھرتا، کہیں نہ کہیں تو آپ میرا اعلان سن لیتیں۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ پھر یونٹی ادھر ادھر کی باتوں میں کھو گئے۔ جب کافی پی چکے تو میں نے گاڑی کی چابیاں کنٹرول کو دیتے ہوئے کہا۔

”لو، کنول! تم لوگ گاڑی رکھو، صبح ملاقات ہوگی۔“

”او نہیں، بھائی! تم میرے پاس گاڑی ہے۔“ دلپ جلدی سے بولا۔ ”کنول دیدی میرے ساتھ جائیں گی، اگر آپ برا محسوس نہ کریں تو۔۔۔“

”ارے نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، اور ہاں کل لٹچ میرے ساتھ کرنا۔“ میں نے کہا تو وہ مسکرایا۔

”جی، ضرور، کیوں نہیں۔“ میں ان سے ہاتھ ملا کر وہاں سے نکل آیا۔

میں چابی انگلی میں گھماتا ہوا سٹنگ روم میں آیا تو حیدر سامنے بیٹھا ہوا تھا، میری طرف دیکھ کر مسکرایا اور بڑے خوشگوار لہجے میں بولا۔

”اب تو اکیلے گاڑی لے کر نکل پڑے ہو.....؟“

”یہ آپ ہی کی کرپا ہے، مہاراج۔“ میں اس کے قریب بیٹھتا ہوا بولا۔

”لگتا ہے، آرتی کے قرب کا اثر ہونے لگا ہے۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے تہہ مارا۔ تو میں نے ایک آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

”یار اداقتی سوئی کڑی ہے۔“ وہ میری بات سن کر بولا۔

”اوائے، شجاعت اشکر ہے، تیرے رنگ ڈھنگ بھی بدلے۔“

”یار! میں نے سوچا، اتنی رنگینیاں ہیں تو کیوں شان سے لطف لیا جائے۔ یونہی خشک خشک رہنے سے فائدہ، اپنی جان کیوں جلاؤں؟“

”یہی چارون تو ہیں زندگی کے، خوب مزے کر رکھل کس نے دیکھی۔“ حیدر نے لاپرواہی سے کہا تو میں نے پوچھا۔

”یہ اپنی آرتی کدھر ہے؟“

”ہائے رام۔“ اس نے ناک پہ انگلی رکھ کر زنانہ انداز میں کہا اور پھر گل کے ٹس دیا۔ میرا تہہ اس سے بھی بلند تھا۔ تبھی اچانک ہی آرتی

نمودار ہوئی، مجھے دیکھتے ہی بولی۔

”آگے آپ؟“

”جناب! آگے۔“ میں نے صدقہ واری ہوتی ہوئی لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”جائے لاؤں آپ کے لیے؟“ وہ پوچھنے لگی۔

”ارے نہیں، آرتی! میں نے ابھی تھوڑی دیر پہلے کافی پی ہے، ابھی دل نہیں چاہ رہا۔“

”یہ ابھی کچھ نہیں پیئے گا، کچھ دیر بعد سوئٹنگ پول پر جوس پیئے گا اور تم بھی ہمارا ساتھ دو گی، کیوں؟“ اس نے میری طرف دیکھ

کر کہا تو میں نے رضامندی میں کاندھے ہلا دیئے۔

”کیا ہو گیا آج میرے لعل کو جو کبوں ماننا چاہا ہے، اڑیل ٹوٹی طرح ضد نہیں کر رہا؟“

”وقت پڑنے پر جب تیرے جیسے بندے کو باپ بنا لیا ہے تو کہاں کی ضد۔“

”اچھا تو تو مجھے گدھا کہہ رہا ہے؟“

”کہہ کیا رہا ہوں تم ہوئی گدھے۔“ میں نے کہا اور نائیکس پہاڑ کر صوفے پر لیٹ گیا۔

اس وقت شام ہو رہی تھی جب میں حیدرہ آرتی اور دو لڑکیاں سوئمنگ پول کے کنارے تھے۔ آرتی آخر میں وہاں پہنچی تھی اور جیسے ہی اس نے گاؤن اتارا تو میں اسے ہاتھ کا شیوہ میں دیکھ کر مہوٹ رہ گیا۔ اس کا جسم ایسے سا چمچے میں ڈھیلیا ہوا تھا کہ پہلے ایسا جسم نظر سے نہیں گزرا تھا۔ مجھے جھرجھری آئی۔ آرتی میری لگا ہوں سے اندر کا حال جان چکی تھی وہ میری طرف مسکراتی لگا ہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔

”پہلے آپ کو یوں گے یا میں؟“

”دونوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اسے بازو سے پکڑا اور پول میں چھلانگ لگا دی۔ میں اور آرتی دیر تک نہاتے رہے۔ حناثر ہو جانے کا لہر آ کے گزرا چکا تھا، اب وہ میرے سامنے تھی اور اس کے خال و خد، سانپ اپنے رنگوں اور ملائمٹھ میں بڑا خوبصورت ہوتا ہے لیکن اس کے اندر چمپا زہر انسانی زندگی ختم کر دینے کی قوت رکھتا ہے۔ پتھینا میں اس جنگل میں قدم رکھ چکا تھا جہاں ہر لہر کسی نہ کسی دشمن سے واسطہ پڑنے کی توقع تھی۔

اس رات ڈنر کے بعد حیدر کہیں چلا گیا۔ نہانے سے خاصی تھکن ہو گئی تھی اس لیے آنکھوں میں نیند اتر آئی تھی۔ میں اپنے کمرے میں آ کر لیٹ گیا۔ اسے ہی کی خشک ہوا مجھے تھک رہی تھی کہ میرا سیل فون بج اٹھا، دوسری جانب ندیم تھا۔

”آپ نے جو کام ذمے لگایا تھا، وہ معلومات مل گئی ہیں۔“ اس نے اچھائی ٹھکانا انداز میں کہا۔

”کیسا پایا اسے؟“ میں نے غنودگی میں کہا۔

”خاصا بڑا کام ہے، تفصیل دفتر میں مل جائے گی۔“ اس نے گریز یا غفلتوں میں کہا۔

”ٹھیک ہے، آرام کرو۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ اک تھمس تو بہر حال تھا کہ وہ معلومات کیا ہوگی تاہم اس وقت میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے بڑے سکون سے سو گیا۔

میں معمول کے مطابق ہی دفتر پہنچا تھا۔ روٹین کے کام نبھانے کے بعد ندیم کو بلا دیا، اس نے آتے ہی کہا۔

”شجاع بھائی! اک گل نما گھر ہے جس میں وہ رہتا ہے۔ بہت مخصوص قسم کے لوگ اس کے پاس آتے جاتے ہیں، خصوصاً شام کے وقت خاصے لوگ ہوتے ہیں جنس وہ بھاشن دیتا ہے۔ سیکورٹی خاصی سخت ہے، خصوصی ریفرنس کے ساتھ ہی وہاں جایا جاسکتا ہے۔“

”کوئی مزید معلومات؟“

”فی الحال تو یہی ہے۔ چونکہ یہ پہلی بار سامنے آیا ہے اس لیے فوری طور پر کچھ میسر نہیں مگر جلد ہی بہت کچھ معلوم ہو جائے گا۔“

”میں چند دنوں میں اس سے ملنے والا ہوں، یہ بھی ممکن ہے کہ ایک آدھ دن میں ہی یہ بندوبست ہو جائے۔ یہ بات الطاف کو بتا دینا اور ہاں، ایک لڑکا دلپ سنگھ آج کل تمہیں کنول جیت کے ساتھ نظر آئے گا، اس سے متعلق معلوم کرو۔“

”کنول جیت کے بارے میں بھی اس سے زیادہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ بھی ان لوگوں کے لیے اک نیا ہتھی ہے جسے وہ اپنے طور پر استعمال کرنا چاہتے ہیں، بالکل اسی طرح جیسے میں اور آپ یہاں پر موجود ہیں۔ حیدرہ کے ایک انڈین دوست کی وساطت سے وہ یہاں پہنچی ہے۔“

”یہ معلومات۔۔۔؟“

”اطراف اور اس کے دوسرے ”دوست“ خاصا ہوم ورک کر چکے ہیں۔“ تمیم نے دھیرے سے کہا۔ میں حزیہ بات کرنا چاہتا تھا کہ جسٹس آگیا تب بات بدل دی گئی۔

اس دوپہر میرے سامنے دلپ سنگھ اور کنول جیت بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم اس وقت یہی سوچ رہے تھے کہ کچھ کہاں لیا جائے؟ دلپ کا خیال یہ تھا کہ بسیں کچھ منگوا لیا جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ وقت آپ کی باتوں میں گزر جائے۔ ہوٹل آنے جانے میں جو وقت ضائع ہونا تھا، وہ بچ جائے۔ جبکہ میں چاہ رہا تھا کہ دلپ سے پہلی ملاقات ہے اس لیے اسے اچھا سا کھانا کھلانا چاہئے۔ ہم میں یہ طے نہیں ہو رہا تھا کہ کیا کریں؟ کنول اس معاملے میں بالکل الگ بیٹھی ہوئی تھی کہ اسے میں آرتی کا فون آگیا۔

”جی فرمائیں؟“ میں نے انتہائی نرم لہجہ میں کہا۔

”آپ کہہ رہے تھے کہ آپ سوای ہری واس سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”ہاں یاد آیا۔۔۔ بالکل، میں نے کہا تھا“ میں نے اپنے لہجے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”ہم نے ان کے بارے میں معلوم کر لیا ہے اور ان سے وقت بھی لے لیا ہے۔“

”بہت اچھی بات ہے، کب جانا ہے ان کے پاس؟“

”ابھی کچھ دیر بعد، شام کے وقت تو ان کے پاس مصروفیت ہی بہت ہوتی ہے۔ ہم آ رہے ہیں، آپ کو دفتر سے پک کر لیں گے۔۔۔“

”آرتی ابھی تو میرے پاس مہمان بیٹھے ہیں، میں ان کے ساتھ کچھ لینے والا ہوں۔ کم از کم دو گھنٹے بعد فراغت ہوگی۔“

”پھر تو دوبارہ وقت لینا پڑے گا؟“

”اچھا تم گھر پر ہی رہو، میں تمہیں دوبار ملتا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے فون رکھ دیا۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، کنول جلدی سے کہہ

اٹھی۔

”خیریت، شہارجی! کوئی امیر جنسی؟“

”اؤ نہیں، ایک سوای سے آرتی ملوانا چاہ رہی تھی۔ ابھی کچھ دیر بعد اس نے وقت لے لیا ہے اور اب اصرار کر رہی ہے کہ میں ابھی اس

کے ساتھ چلوں، آؤ پلتے ہیں۔ اس سے پھر کسی وقت مل لیں گے۔“ میں نے اٹھتے ہوئے کہا تو دلپ بولا۔

”شہارج صاحب! میں آج دیدی کے پاس ہی ہوں۔ آپ اطمینان سے جائیں، ڈنر آپ کے ساتھ لے لیں گے۔ اس میں اتنا پراہم کیا

ہے؟“ اس نے سادہ سے انداز میں کہا تو وہ مجھے اچھا لگا۔

”دلپ، یار! کیا سوچو گے تم؟“

”سوچنا کیا ہے۔ کچھ نہ سہی، ڈنر ہی اب ڈرا لیتے ہوٹل میں کر لیں گے۔“ اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ تو میں بھی ہنس دیا ”یہ سوای

جی کون ہیں۔ ادھر دہنی میں ہی ہیں یا۔۔۔؟“ کنول نے پوچھا۔

”ادھر دہنی میں ہی ہیں کوئی سوامی ہری داس۔“ میں نے لاپرواہی کے سے انداز میں کہا اور آرتی کے نمبر ملانے لگا۔ رابطہ ہو جانے پر میں نے اسے آجانے کو کہا اور کولڈ ڈرنک کے ساتھ اسٹیکس منگوا لیے ابھی ہم کھانی ہی رہے تھے کہ آرتی کا فون آ گیا۔

”میں گراؤ ڈھنگ پر ہوں، آجائیں آپ۔“

”بس میں دو منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔“ یہ کہہ کر میں نے ریسیور رکھ دیا اور اٹھ گیا۔ میں نے ولیپ سے ہاتھ ملانے کے بعد جب کنول سے ہاتھ ملایا تو میری نگاہ اس کے چہرے پر پڑی۔ اس کا چہرہ مٹھا ہوا آنکھیں کسی گہری سوچ میں ڈوبی ہوئیں تھیں۔ مجھے لگا، اسے میریوں جانا اچھا نہیں لگا مگر یہ وقت کسی بھی قسم کی کوئی بات کہنے کے لیے سوزوں نہیں تھا۔ اسی لمحے میں نے سوچا کہ ات ذرا پر خوب جی بھر کے باتیں کروں گا اور ان لمحات کا ازالہ کروں گا۔ کبھی سوچتے ہوئے میں گراؤ ڈھنگ پر آ گیا۔ آرتی ایک طرف کھڑی نظر آئی۔ ہم دونوں چلتے ہوئے گاڑی تک آئے، ہمارے پیٹھے ہی ڈرائیور نے گاڑی بڑھا دی۔

وہ ایک عالی شان رہائش گاہ تھی۔ اس کی طرز تعمیر سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس پر خاصی دولت خرچ کی گئی ہے۔ مین گیٹ کے عین ساتھ ایک ریسیپشن بنی ہوئی تھی، گاڑی رکھنے ہی آرتی اترتی اور سیدھی وہاں چلی گئی۔ چند منٹ بعد ہمیں جانے کی اجازت دے دی گئی۔ ایک بڑے سے پورچ میں گاڑی رکھی، ہم دونوں اتر آئے۔ بڑے سے دروازے کے ساتھ سیکورٹی کے لوگ تھے، وہاں اسکریننگ ہو گئی اور ہم ایک عالی شان قسم کے سٹنگ روم میں جا بیٹھے۔ اس وقت وہاں پر کوئی نہیں تھا۔ اگلے چند لمحوں میں نو عمر خادمائیں نظر آنا شروع ہو گئیں۔ ہمیں وہاں بیٹھے چند منٹ ہوئے تھے کہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت وہاں آئی، اسے دیکھتے ہی آرتی کھڑی ہو گئی اور ناچار مجھے بھی کھڑا ہونا پڑا۔ اس کا سر سفید لیکن جلد نوجوان لڑکیوں کی طرح تھی۔

”پدھارو، بالک۔۔۔!“ اس نے ایک ہاتھ بڑھاتے ہوئے نرم سے انداز میں کہا اور پھر ہمارے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ ہم بیٹھے تو اس نے کہا۔ ”سوامی جی کے پاس ابھی کچھ لوگ ہیں، ابھی وہ انھیں کے تو آپ کی ملاقات ہو جائے گی۔“

”بڑی کرپا ہے، ماتائی! آپ نے اتنی جلدی وقت لے لیا۔“

”تم نے کہا ہی کچھ اس طرح تھا کہ مجھے ایسے ہی کرنا پڑا۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے گہری نظروں سے میرا جائزہ لیا۔ تو میں چونک گیا۔ وہ عورت جس مذہب سے بھی تعلق رکھتی تھی، اپنی عمر لباس اور شاید مرتبے میں تعلق کا اظہار کر رہی تھی۔ صرف ایک لمحوں میں سمجھ گیا کہ وہ سب کچھ اسی لہجے سے ظاہر ہو رہا ہے، بس دکھاوا ہے اور اندر سے وہی ازلی تھنڈ عورت ہی ہے کیونکہ میں نے اس کی نگاہ میں پسندیدگی کی وہی رشت دیکھی تھی، جو مجھے دیکھتے ہی اس طرح کی عورتوں کی آنکھوں میں اتر آتی تھی۔ وہ جو اک دہاؤ یہاں کے ماحول کی وجہ سے میرے ذہن پر تھا، یکدم ہی ختم ہو گیا اور میں انتہائی پرسکون حالت میں آ گیا۔

”سوامی کب تک مل سکیں گے ہمیں؟“ میں نے براہ راست اس عورت کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا تو وہ بھی قدرے چونک گئی۔

ہو سکتا ہے، کسی نے اس سے اس انداز میں بات نہ کی ہو مگر اس کے چہرے پر کوئی ایسے آثار نہیں ابھرے جس سے مجھے یہ احساس ہو کہ اس نے برا مانا یا

مل جائے تو حاصل پانی ہی رہتا ہے اصل یہ ہے کہ من جب پوتر ہے تو سب پوتر ہے، من کی کھٹک ہی پاپ ہے۔ پوتر جسم میں اگر من پوتر ہے تو ہر عمل پوتر ہے۔“

”مخالف سمجھنے گا، یہ کوئی معیار نہیں ہے، نہ تو میں بحث کرنے آیا ہوں اور نہ ہی کسی مذہب کا مقابل کرنے، میں یہ فلسفہ سمجھنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا

”آخر کیوں، بالک؟“ اس نے کہا تو میں نے آرتی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”یہ میرے نزدیک آنا چاہتی ہے، یہ اس کا تقاضہ تھا مگر میرا من نہیں چاہا۔ کیا اس کا عمل پوتر کہلائے گا جب کہ اس کے دھرم کے انوسار یہ مجھے ہاتھ بھی لگائے تو اس کا دھرم بھر شٹ ہو سکتا ہے؟“

”یہ تم وہ باتیں کر رہے ہو جو مذہبی لوگوں نے تم تک پہنچائی ہیں، مگر وہ جنس ہی اسی خاطر اپنا جیون تیاگ گئے۔ ہندو کی سب سے بڑی غلطی یہی رہی اور آج بھی ہے کہ وہ خود کو مکھا سمجھتا ہے اور باقی سب ٹھلے درجے کے لوگ، انہوں نے نفرت بائنی ہے۔ یہ سب برہمن سراج کی پیداوار ہے۔ وہ سب کو غلام بنا لینا چاہتے ہیں پھر صرف ہندو دھرم ہی میں نہیں، سارے ہی مسلح جواخلاقیات کا دوسرے دیتے ہیں، انہوں نے مذہب کو نفرت کی بنیاد بنا ڈالا۔“

”مطلب، آپ کے نزدیک مذہب نفرت پیدا کرتے ہیں؟“

”لیبل مذہب کا لگ جاتا ہے لیکن عمل تہذیبی ہوتا ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں کتنے مذہب ہیں لیکن سب تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، یوں جو مذہب مطالبہ کرتا ہے، وہ تو پورا نہ ہوا جس سے انسان زہر آلود ہو جاتا ہے۔ آسمان نے دیکھا، تاریخ گواہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی جہرت اسی خطے میں ہوئی، ابورنگ جہرت، یہ مذہب کا نہیں، تہذیب کا ککراؤ تھا۔“

”سو امی می! شاید ہم موضوع سے ہٹ رہے ہیں۔“

”میں موضوع سے نہیں ہٹ رہا بلکہ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ قوت جو انسانیت کی بھاکے لیے ضروری ہے، کیا ہم اسے پہچانتے ہیں؟ وہ ہے، محبت، یہ کئی باہر نہیں پڑی ہوئی، ہمارے اندر موجود ہے۔ ضرورت ہے اسے باہر لانے کی، جب یہ آئے گی تو ہی ایک انسان دوسرے انسان کے قریب آئے گا۔ دل تک پہنچنے کا راستہ محبت ہے۔ اور یہی وہ قوت ہے جو انسان کے اندر کے زہر کو ختم کر سکتی ہے۔ اب دیکھو، آرتی نے تم سے قریب ہونا چاہا تو اس کے من میں کوئی دھرم، کوئی زہر، کوئی نفرت، کوئی تعصب نہیں تھا۔ اگر کچھ تھا تو وہ محبت تھی۔ جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔۔۔۔۔“

”یہ ایک الگ موضوع ہے، ہم اس پر پھر کسی وقت بات کریں گے، میں کہتا یہ چاہ رہا ہوں کہ جب من دھل جائے اور کوئی میل نہ رہے تو کیا وہ پوتر نہیں ہوگی؟ یقیناً وہاں پوترتا ہے۔“ اس نے کہا تو میں سمجھ گیا کہ یہ جنس کی حمایت میں دلیلوں کے ڈھیر لگائے گا، سو کہا۔

”خیر، میرے سوال کا جواب آپ نے دے دیا۔ اب اجازت چاہوں گا۔“

”لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہارے من کے شخصے سے میل اب بھی نہیں اترتا تم مطمئن نہیں ہوئے؟“

”سوای جی! میں کوئی پہلی یا آخری بار تو آپ کے پاس نہیں آیا، میں آؤں گا، بار بار آؤں گا جب تک میں مطمئن نہ ہو جاؤں۔“

”میں خوشی ہوگی۔ تمہارا جب جی چاہے، یہاں آ جانا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک خاص بات سے نکتہ اٹھایا اور بھاشن دینے لگا۔ اس کی باتیں جذبات کو کھڑکانے اور پہچان پیدا کرنے والی تھیں۔ جس میں جنس کی حماقت میں کئی طرح کی دلیلیں تھیں جب کہ میرا دماغ اس کی پہلی باتوں میں الجھا ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سے پوچھوں، کیا یہ حقیقت ہے کہ مذہب ہی محبت کی راہ میں رکاوٹ ہے، کیا جنس ہی انسانی ضرورت ہے؟ میں سمجھ گیا کہ جس طرح ہندو دھرم کی اپنی کوئی بنیاد نہیں، بالکل اسی طرح اس سوای کے خیالات کی بھی کوئی بنیاد نہیں تھی۔ بحث یا مباحثہ بالکل ہی فضول تھا۔ آرتی بہر حال خوش تھی کہ اسے پورا تا کا جواز میرے سامنے مل گیا ہے۔ کافی دیر بعد اس کا بھاشن ختم ہوا تو ہمیں اجازت ملی۔ آرتی اس وقت سوای جی کے خیالوں سے غمور ہو رہی تھی جبکہ میرے اندر غصے کی ہلکی ہلکی لہر اٹھ رہی تھی جسے میں نے مصلحت وقت کے تحت دبا لیا۔ وہاں سے نکلے تو وہی ادبیز مہر خاتون سامنے آئی، اس نے آرتی کو گلے لگا لیا اور پھر میرے گلے پر انگلیوں کی پور رکھ کر بولی۔

”میں تمہارا انتظار کروں گی تاکہ تمہیں پھر سے خوش آئیے کہہ سکوں۔“ اس بار اس نے انگریزی میں کہا لیکن جیسے ہی اپنی انگلیاں میری گردن سے ہٹائیں۔ میرے بدن میں عجیب سی سرسراہٹ دوڑ گئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ کیا ٹن ہے؟ وہ شاید میرے چہرے پر کوئی رد عمل دیکھنا چاہتی تھی، کوئی ایسا تاثر نہ پا کر اسے مایوسی ہوئی۔ ہم وہاں سے آگئے۔ واپسی پر اچانک آرتی نے کاندمے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”کیسا پایا آپ نے سوای جی کو؟“

”آرتی! یہ ان کے اپنے خیالات ہیں، ضروری نہیں کہ ہر شخص اس سے متعلق ہو۔“ میں نے کہا۔

”مگر پھر بھی اپنے دھرم کے انوسار تو انہوں نے جو کہا ٹھیک کہا۔“ آرتی دھیرے سے بولی۔

”میں کب کہتا ہوں کہ لفظ کہا، مگر یہ الگ سی بحث ہے۔“ میں نے پیار سے اس کے سر پر ہتھکی لگاتے ہوئے کہا تو وہ میرے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ جی میں نے ڈرا بیور سے کہا۔

”یار! مجھے دفتر ڈراپ کرو دینا۔“

”نہیں، بالکل نہیں، سیدھے گھر چلو۔“

”ابھی گھر جا کے کیا کرنا ہے، مجھے دفتر میں کام ہے۔“

”ہوتے رہیں گے کام اور جا کے کیا کرنا ہے، میں ادھر جا کر بتاؤں گی۔“ وہ بولی تو میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”لیکن آج کی شام میری کنول جیت کے ساتھ ملے ہے، تب اس طرح خدمت کرنا۔“

”چلیں، نہیں کرتی۔“ اس نے کہا اور اپنا سر میرے کاندمے پر رکھ دیا۔

شام ڈھلے تک میں گھر میں ہی رہا، مجھے معلوم تھا کہ آرتی محض یونہی گھر لے جا رہی ہے۔ اس نے سوائے باتوں کے اور کچھ نہیں کیا، بس ایک بار مزیدار قسم کی چائے پلائی تھی۔ میں نے فریٹش ہو کر کنول جیت کو فون کیا۔ وہ اپارٹمنٹ میں ہی تھی فون نمبر نے اٹھا لیا تھا۔

”خیریت سے ہیں آپ؟“ کنول نے سڑکی بجائے یہ فقرہ کہا۔

”میں بالکل ٹھیک، تم ٹھیک ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں۔“ اس نے اطمینان بھرے لہجے میں کہا۔

”دلیپ کہا ہے، کیا پروگرام ہے، کس ہوٹل جانا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ اپنے قلیت گیا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا پروگرام بتانے لگی۔

”چلو ٹھیک ہے، میں آ رہا ہوں تمہیں پک کرنے، دلیپ سے کہو، وہ وہیں آ جائے۔“ میں نے ملے کیا اور فون بند کر دیا۔

میں کنول کے پارٹمنٹ پہنچا تو وہ میرے انتظار میں تھی۔ وہ میرے ساتھ پینجر سیٹ پر بیٹھے ہوئے ہوئی۔

”شجاع جی! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہوں گی۔“

”کہو۔“ میں نے عام سے انداز میں کہتے ہوئے گینر لگا دیا۔

”یہ کہتے ہوئے مجھے اپنا بہت کچھ واؤ پر لگانا پڑے گا، کیا آپ میرا خیال رکھ سکتی ہیں؟“ اس نے انتہائی سنجیدگی سے کہا تو میں نے اس کی

طرف غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ مجھے احساس ہوا کہ کوئی اہم معاملہ ہے، اس لیے بہت غصہ ہوئے لہجے میں کہا۔

”کنول! میں نہیں کہتا کہ میں بہت تمہارا ہوں لیکن اتنا تو کر سکتا ہوں کہ دوسروں کا مان رکھ لوں۔ اگر تم مجھ پر اعتبار کر رہی ہو تو میں

تمہارے ساتھ کونٹریس نہیں پہنچاؤں گا۔“

”تو پھر جان لیں، شجاع! آپ ایک بہت بڑے جال میں پھنس رہے ہیں اور یہ ایسا جال ہے جس سے کوئی نکل نہیں سکتا۔“

”مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

”آرتی! آپ کو جس راہ پر لے کر چلی ہے، وہ اندھی کھائی کی طرف جاتی ہے۔“

”تمہارا مطلب سوامی ہری داس یا آرتی؟“

”سوامی ہری داس ایک بہت بڑا زہر پھیلانے والا منصوبہ لے کر آیا ہے، انسانیت کو قتل کر دینے والا زہر۔۔۔“ کنول نے انتہائی زہر آلود

لہجے میں کہا تو میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ کنول میری جانب سوچتی ہوئی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ تھکا ہوا تھا، میں اس کی حالت کا اندازہ

لگا سکتا تھا۔ وہ مجھے بالکل بے خبر سمجھتے ہوئے باخبر کرنے کے لیے بہت بڑا رسک لے چکی تھی۔ کنول جیت کے اس عمل کے پیچھے دو ہاتھ ہی ہو سکتی

تھیں۔ اگر وہ ان لوگوں میں سے تھی جو حیدر شاہ کو اپنی راہ پر لائے تھے تو یقیناً انہیں مجھ پر شک ہو گیا تھا اور اپنی تسلی کے لیے کنول کے ذریعے ہمدردی

کی آڑ میں کوئی نئی جال چل رہے تھے۔ مقصد تو واضح تھا کہ وہ مجھے ہر صورت میں اپنی راہ پر لائے استعمال کرنا چاہتے تھے۔ میں اگر ان کی خواہش کے

مطابق سرخم کر دیتا تو ٹھیک تھا، ورنہ وہ اپنی توانائی مجھ پر کیوں ضائع کرنے لگے۔ ایسی صورت میں یا تو مجھے واپس ہٹنی جانا تھا، بصورت دیگر یہیں کہیں

سوت میری منتظر تھی لیکن اگر کنول جیت مخالفین کے گروہ میں سے تھی تو اتنا بڑا رسک لینا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اسے کیا معلوم کہ میرے ذہن میں کیا

ہے، میں کس نوج پر سوچ رہا ہوں اور مستقل میں میرے ارادے کیا ہیں؟ ہو سکتا ہے کہ میں حیدر شاہ کے نیٹ ورک میں شامل ہوں، ایسے میں کنول جیت کے دن پورے ہونے کا پورا یقین تھا۔ آخر اس نے اتنا بڑا رسک کس بل بوتے پر لیا اور وہ مجھے ہی اس منصوبے سے کیوں آگ کر دینا چاہتی ہے؟ اسی ایک لمحے نے مجھے میرے ذہن میں برقی رو دوڑا دی۔ میں نے اپنی سوچوں کو سمجھا اور توجہ بڑا کر پر لگا دی، مگر چند لمحوں بعد میں نے پوچھا۔

”یہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو، کیا اسے سمجھ بھی رہی ہو؟“

”بالکل، میں سمجھ بھی رہی ہوں اور آپ کو سمجھانا بھی چاہتی ہوں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اسے سمجھ سکتے ہیں یا نہیں؟“ اس نے اعتماد سے کہا تو مجھے لگا جیسے وہ اپنے بکھرے ہوئے خیالات پر قابو پا چکی ہے۔

”میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے ایسا کیوں کہا لیکن یہ سوال ضرور کروں گا کہ مجھ سے ہمدردی کی وجہ؟“

”کہنے کو تو میں بہت سارا جھوٹ کہہ سکتی ہوں مگر میرا اپنا یقین ہے کہ جہاں تعلق میں پاکیزگی ہو، وہاں پر کچھ بھی غلط نہیں ہونا چاہئے لہذا ابھی میں اس بارے کو کچھ بھی نہیں کہہ سکی اور پھر میں نے بھی آپ سے کچھ بھی نہیں کہا، محض آپ کو خبر دیا گیا ہے۔“ اس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

”کنول! جس ماحول میں ہم رہ رہے ہیں، اس میں ایسی باتیں تو زندگی سے ہاتھ دھونے کے مترادف ہوتی ہیں۔“ میں نے اسے سمجھاتے ہوئے بات جاری رکھی۔ ”یہ تمہاری سہرا بانی ہے اور تمہارا اچھا پن ہے کہ تم نے میرے لیے ہمدردی محسوس کی لیکن۔۔۔“

”میں اپنے ضمیر سے مطمئن ہوں، شجاع جی، اور یہی زندگی، تو پہلے ہم کون سا مٹی رہی ہیں؟“ اس کے لہجے میں نفرت اٹل رہی تھی، تبھی میں نے جانا کہ یہ بحث طویل ہو سکتی ہے جو سرسراقت ضائع کر دینے والی بات تھی اس لیے میں نے بات بدلتے ہوئے کہا۔

”چلو چھوڑو ان باتوں کو تم ہری اس کے منصوبے کا ذکر کر رہی تھیں؟“ میں نے کہا تو وہ میری طرف دیکھ کر مسکرا دی پھر اطمینان سے بولی۔

”یقیناً آپ یہ منصوبہ تکمیل سے جانا چاہیں گے؟“

”یہ تو ہے، کنول جیت!“ میں نے پرسرت لہجے میں کہا۔

”تو اس کے لیے بس وہاں پہنچنا ہے جہاں ویلپ سگھ ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔“ وہ بولی۔

”مطلب، ویلپ بھی؟“ میں نے خوشگوار حیرت سے پوچھا۔

”پوری تفصیل کے ساتھ آپ کے ہر سوال کا جواب دیا جائے گا۔“ اس نے قدرے شوخی سے کہا اور سیٹ کی پشت کے ساتھ اپنا سر لگا دیا۔

میرے ذہن میں لاتعداد سوال ابھرائے مگر کسی کا جواب بھی ان لمحوں میں میسر نہیں تھا۔ یہ راز کیا ہے؟ یہ کچھ وقت بعد کھٹنے والا تھا سو میں نے پوری توجہ ڈرائیونگ پر مبذول کر دی۔

خالد بن الولید روڈ پر ایک اظہارین ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے تو چند لمحوں بعد ویلپ سگھ نظر آ گیا۔ وہ ہمارا انتظار تھا، اسی لیے وہ دروازے کی سیدھ میں بیٹھا ہوا دیکھ رہا تھا۔ لگا ہی ملتے ہی اس نے ہاتھ ملایا۔ وہ قدرے گوشے میں دھری ہوئی میز پر بیٹھا تھا۔ ہمارے قریب بیٹھنے ہی وہ کھڑا ہو گیا، نہایت گرم جوشی سے یوں ہاتھ بلا یا جیسے ہم پہلی بار مل رہے ہوں۔

”دلپ از یادہ بریت تو نہیں ہوئی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”نہیں، بس ابھی پانچ منٹ پہلے ہی پہنچا ہوں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے سامنے والی نشست پر بیٹھ گیا۔ کنول جیت میرے دائیں طرف کرسی سنبھال چکی تھی۔ ہم ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے کہ وینٹر آرڈر لینے کے لیے آ گیا، تب میں نے کنول جیت سے کہا۔

”یہ شہید تمہارا ہے۔ جو مجھ میں آئے، منگوا لو۔“

”جی، بہت اچھا۔“ اس نے مینو کارڈ سنبھالتے ہوئے کہا اور آرڈر دینے لگی، وینٹر چلا گیا تو اچانک دلپ سگم نے ڈرامائی انداز میں پوچھا۔

”آپ کو پتہ ہے کہ میں کیا کام کرتا ہوں؟“ اس نے پوچھا تو مجھے احساس ہوا کہ اب تک مجھے معلوم نہیں کہ وہ کام کیا کرتا ہے۔ میں نے لمبی میں گرون ہلائی تو وہ ہنس دیا، پھر بولا۔

”بنیادی طور پر میں فارماست ہوں اور میں نے اس کی تعلیم کینڈا سے حاصل کی ہے۔ فارماست، یعنی ادویات کی جانچ پڑتال کرنے والا۔“

”یہاں بھی؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں، میں نے اپنی کمپنی سے طویل عرصہ لی ہوئی ہے اور اب یہاں ایک دوسری دوائیوں کی کمپنی میں کام کرتا ہوں۔“

”یہ سب کیوں؟“ میں نے تجسس سے پوچھا۔

”یہ میں آپ کو بعد میں بتاتا ہوں لیکن پہلے میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آپ دوائیوں کے بارے میں تصور ابھرتے جانتے ہیں؟“

وہ میرے چہرے پر دیکھتے ہوئے غمخیز لگی سے بولا۔

”مثلاً کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”بچی کہ ان کے سائیکل لفٹ وغیرہ ہوتے ہیں؟“ اس نے کہا۔

”بالکل، یہ بات تو ہر شخص جانتا ہے۔“ میں نے عام سے لہجے میں جواب دیا۔

”یعنی مقبول عام طریقہ علاج ایلو پیتھک میں ایسا ہوتا ہے، ہر شخص جانتا ہے۔ اس کے علاوہ ہومیو پیتھک طریقہ علاج بھی ہے اور ”ہربل ادویات“ ہیں جنہیں ہم لوگ دیکھی یا یونانی طریقہ علاج بھی کہتے ہیں، وہ نیا بھر میں اور خصوصاً برصغیر میں ایلو پیتھک ادویات آنے سے پہلے اسی طریقہ دیکھی یا یونانی طریقہ علاج پر بھروسہ کیا جاتا تھا اور اب بھی اسے قبولیت عام حاصل ہے۔ اس طریقہ علاج کے بارے میں عمومی تاثر یہ نہیں ہے کہ اس کی سائیکل لفٹ بھی ہوں گے لیکن اس کے بھی منفی اثرات ہوتے ہیں۔“

”یہ کہہ کر وہ راسا رکا، میں خاموش رہا تو وہ کہتا چلا گیا۔ ”نظاہر ایک دوائی جو کسی خاص بیماری کے لیے بنائی جاتی ہے، اس کی دیگر نتائج بھی ظاہر ہوتے ہیں۔ یا لگ بات ہے کہ وہ جلد سامنے آ جائیں یا قدرے دیر سے، موافق ہری داس بنیادی طور پر ایک سنیا سی ہے اور آپ کو پتہ ہوگا کہ بھارت میں یہ سنیا سی لوگ کیسی کیسی عجیب و غریب قسم کی دوائیاں تیار کرتے ہیں۔ ہری داس کا سنیا سی کوئی معمولی نوعیت کا نہیں۔ جنگوں، بیابانوں کی خاک چھانسنے کے بعد اور اپنے گرو کی سدا سے دوائیوں کے بارے میں اسے جو معلومات ملی ہیں، وہ اپنی جگہ کمال کی ہیں لیکن اس کے علاوہ وہ کچھ ایسی صلاحیتوں کا مالک بھی بن گیا ہے جسے عام لوگ چمکار دیکھتے ہیں۔“

”دلیپ! بری داس کی تعریف بعد میں کرنا، پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ اس کا منصوبہ کیا ہے؟“

”وہی بتا رہا ہوں نا!“ یہ کہتے ہوئے وہ قدرے مسکرا دیا۔ ”وہ ایک ایسی دوا بنانے میں کامیاب ہو چکا ہے جو اس کے زہریلے منصوبے میں موثر جھیلاؤ کے طور پر کام دینے والی ہے۔ بلا ہر وہ دوائی عام قسم کی اعصاب کو طاقت دینے والی دوا ہے لیکن اصل میں وہ انسانی بدن میں ان جگہوں پر اثر انداز ہوتی ہے جس سے جنسی خواہش تیز تر ہو کر شدت اختیار کر لے۔ وہ اس دوا کو پوری دنیا میں پھیلا دینا چاہتے ہیں لیکن فی الوقت ان کا ہدف دوغنی اور پاکستان ہے۔“

”وہ شاید ہی ایسا کر سکیں۔“ میں نے تجمل سے کہا۔ ”ہر ملک میں دوائیاں چیک کرنے کے لیے لیبارٹریاں موجود ہیں۔“

”یہ اس کا پتلا ہے، یہی اس کے سنیاں کی حکمت ہے۔ وہ ایسی دوائی تیار کر چکا ہے اور اسے مختلف لوگوں پر آزما کر اس کے نتائج دیکھ رہا ہے۔ میں نے خود اس دوا کا تجربہ کیا ہے۔ اگر میرے ذہن میں یہ ہوتا کہ اصل میں یہ دوا کس مقصد کے لیے بنائی گئی ہے تو میں کبھی بھی اس تک نہ پہنچ پاتا۔ میرے سسٹمز نے بھی اس کے ٹسٹ لیے ہیں، نتیجہ وہی کہ اعصاب کو طاقت دینے والے نسخے سے بات آگے نہیں بڑھی لیکن جب اس کا عملی مشاہدہ کیا گیا تو اس کے نتائج وہی نکلے جو میں بتا چکا ہوں۔ اعصاب کو سکون ضرور دیتا ہے، بندہ خود کو پہلے سے بہت بھتر بھی محسوس کرتا ہے لیکن کچھ وقت بعد جنسی خواہش شدت سے کرتا ہے۔“

”دلیپ! نگہ کیا دوا تھی ایسا ہو چکا ہے؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”جی، شجاع تھی! ایسا ہو چکا ہے اور یوں جانیں کہ تمام تجربات کامیاب بھی ہو چکے ہیں۔ یہ کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں رہے گی، اب دیکھا تو دل کے مریضوں کے لئے بھلا تھا، استعمال کہاں ہو رہا ہے۔ بری داس کی اس دوا کو اب تو بس اسے خوبصورت پیکنگ دے کر مارکیٹ میں لانا باقی رہ گیا ہے۔ اب یہ پتہ نہیں کہ وہ اس دوائی کو یہاں دوغنی سے لانا چاہتا ہے یا ہمارے سے امپورٹ کریں گے، دوائیوں کی نئی تکنیکی متعارف کروائیں گے یا کسی مشہور معروف کمپنی کا سہارا لیں گے۔ بہر حال جو بھی ہوگا، آپ ڈرا یہ تصور کریں کہ جب یہ دوائی عام ہاتھ میں پہنچے گی تو کیا نتائج سامنے آئیں گے؟“

”بہت بھیاںک۔۔۔“ میں نے مستقبل کا تصور کرتے ہوئے کہا، پھر۔ ”دلیپ! کیا اور بھی ایسا دوائیاں مارکیٹ میں ہیں؟“

”جی، مگر اتنی شدید نوعیت کے نتائج والی نہیں اور وہ زیادہ تر دوائیوں کے روپ میں بھی نہیں، آرائش حسن اور ایسی ہی دیکھ چیزوں میں ہیں۔ وہ اپنے عمل میں اتنی اثر انگیز نہیں رکھتیں، اس لیے ان کا احساس نہیں ہوتا۔“ دلیپ نے کہا تو ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ ایک افسردہ سی خاموشی جس نے ماحول کو آرزو کر دیا۔ دنیا میں کئی مافیاسرگرم ہیں جن میں ڈرگ مافیا بھی پوری قوت اور شدت سے انسانیت کے لیے زہر پھیلا رہا ہے۔ جہاں زندگی بچانے کے لیے ادویات تیار ہو رہی ہیں، وہاں زندگی کے خاتمے کے لیے بھی ڈرگ بنائی جا رہی ہیں۔ ”یابا“ نامی ڈرگ جو تھائی لینڈ اور اس کے گرد و نواح کے ممالک میں تیزی سے پھیل رہی ہے، وہ بھی تو بلا ہر دوائی ہے لیکن نشکی ایک نئی قسم کے طور پر مقبول ہو رہی ہے۔ مافیا کا انجکشن بھی تو دوائی ہی ہے لیکن اس کا غلط استعمال انسان کو زندہ روگور کر دیتا ہے۔ ممنوعہ ادویات کے بارے میں آئے روز سنا اور چھا جا رہا ہے۔ ایسے

حالات میں ہری داس کا یہ "کارنامہ" نہ تو غیر معمولی نوعیت کا تھا اور نہ ہی حیرت زدہ کر دینے والا کہ انسانیت دشمن لوگ کیا نہیں کرتے۔ انہی بجلی دوئیاں تو رہیں ایک طرف، بجلی دوئیاں انسانی رگوں میں اتاری جا رہی ہیں۔ ایسی دوئیاں جو ایکسپاز ہو چکی ہوتی ہیں، انہیں مارکیٹ میں لا کر مریضوں کو دیا جاتا ہے۔"

"کہاں کہو گئے آپ؟" کنول جیت نے پوچھا تو میں اپنے حواسوں میں آ گیا۔ تب میں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے دلچسپ لہجے سے پوچھا۔
"یہ سب تمہیں کیسے پتہ چلا، کس طرح تم نے دوئی تک رسائی حاصل کی۔"

"میں بتاتی ہوں۔" کنول جیت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا تو اس کے چہرے پر کرب پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سوچتی ہوئی لگا ہیں مجھ پر ڈالیں اور پھر کہتی چلی گئی۔ جسے میں نے بہت غور سے سنا تھا۔

ان دنوں کنول جیت کالج میں پڑھتی تھی۔ وہ جوانی کی پر بہار وادی میں قدم رکھ چکی تھی۔ اس کے ارد گرد خوشیاں تھیں، زندگی تھی اور قہقہے تھے۔ وقت بچے سے پرسکون انداز میں گزر رہا تھا۔ وہ چار بہن بھائی تھے۔ ایک اس سے بڑا، ایک چھوٹی بہن اور پھر بھائی۔ اس کا بڑا بھائی امرتسر میں جاب کرتا تھا اور خالصتان تحریک کا زبردست حامی تھا، یہی جرم تھا جو اس کی زندگی کے خاتمے کا باعث بنا۔ وہ ان دنوں امرتسر سے ہوشیار پور آیا ہوا تھا۔ کنول جیت جب کالج سے واپس آئی تو گھر میں ماں سمیت تینوں بھائی بہن قتل کیے جا چکے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں سے اپنے پیاروں کے لاشے لہو سے تر دیکھے تھے۔ وہ بھی ایک مظہرہ برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو گئی۔ بھائی قتل کی وجہ ڈیکھتی ہی تھی لیکن چند دنوں بعد ہی اسے اور اس کے باپ کو معلوم ہو گیا کہ یہ خالصتان تحریک کے حمایت کرنے کی سزا ہے۔ چارہ باپ یعنی ہوشیار پور میں نہیں رہ سکے، وہلی آگے جہاں اس نے اپنی زندگی کا آغاز نئے سرے سے کرنا چاہا اور اس میں وہ کامیاب بھی ہو گئی۔ اس نے اپنی زندگی کا یہ مقصد بنا لیا کہ جب کبھی بھی اس نے اپنی طاقت حاصل کرنی کہ اپنے ان دیکھے دشمنوں سے انتقام لے سکے تو ضرور لے گی۔ وہلی جو اس کے لیے دیار غیر سی تھا، وہاں سیٹ ہو جانے میں ان لوگوں نے بھرپور ساتھ دیا جو خالصتان تحریک کے پر جوش چیلے تھے۔ کنول جیت نے بہت محنت کی، صرف دو سالوں میں وہ اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی لیکن اس دوران اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ وہ تحریک کے ان لوگوں سے وابستہ رہی تھی جو پوری جان سے اس تحریک کو انتہائی درد نگاہ سے کھلا گیا تھا۔ اس درد نگاہ میں وسعت آئی تو وہ لوگ جو خالصتان تحریک سے وابستہ تھے، دوسرے ملکوں کا رخ کرنے لگے۔ اس طرح انہیں دو قاصدے ہوئے۔ ایک تو انہیں پناہ مل گئی، دوسرا وہ اپنی تحریک کو زیادہ مضبوط بنانے کے لیے ملکی سطح پر آ گئے۔ اس تحریک کی آبیاری میں جہاں مذہبی جذبات کی شدت کار فرما تھی، وہاں مادی وسائل کی دستیابی میں رکاوٹیں فہم ہونے لگیں۔ وہ بھی انہی لوگوں کے کہنے پر وہی آ گئی، سارا بندہ دست ان لوگوں ہی نے کیا تھا۔ اب اس نے اپنا آپ تحریک کے لیے وقف کر دیا ہوا تھا۔ اس نے انتہائی اختصار سے کہا اور پانی سے لبا لب گلاں اٹھا کر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا، چند گھنٹے لینے کے بعد اس نے گلاس رکھ دیا اور بولی۔

"میں نے یہاں آ کر قدرے سکون محسوس کیا۔ مجھے ایک ایسے ہوٹل میں ملازمت مل گئی جہاں بھارتی سفارتی وفد ٹھہرتے تھے۔ میں اپنی جاب کے ساتھ تحریک کے لیے بھی کام کرتی رہی۔ اس احتیاط کے ساتھ کہ کسی کو شک نہ ہو۔ انہی دنوں میری زندگی میں جسویر سنگھ نامی شخص آیا۔ وہ

اکثر اسی ہوئی میں ٹھہرا کرتا تھا۔ ہلا ہر وہ کھیلوں کے سامان کا تاجر تھا لیکن اصل میں وہ "را" کا بہترین ایجنٹ تھا۔ یہ مجھے اتفاق سے ہی معلوم ہوا تھا۔ اس روز اس نے بے تحاشائی ہوئی تھی اور اول فول بک رہا تھا۔ اس نے اپنے منہ سے یہ بات کبھی نہیں بتائی لیکن میں نے بعد میں تصدیق کر لی۔ مجھے اس میں دلچسپی ہو گئی لیکن میں نے اپنا آپ بچائے رکھا۔ ایک دن میں اس کے پاس گئی تو خاصی تھکی ہوئی تھی۔ اس نے اعصاب کو طاقت دینے اور پرسکون ہو جانے کے لیے ایک محزون قسم کی دوا کھلائی اور دوا تھی کچھ دیر بعد میں پرسکون ہو گئی جیسے کبھی تھکاوٹ ہوئی نہ تھی۔ اس نے دوا دیا مجھے دے دی، میں نے اس سے خاصا سکون محسوس کیا لیکن چند دن بعد میں خود اسے تلاش کرتی ہوئی اس کے پاس پہنچی تھی اور اپنا سب کچھ اس کے حوالے کر دیا۔ "یہ کہتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئی۔ چند لمحوں میں اس نے خود پر قابو پایا اور پھر یولی۔" جسویری سے مجھے اس دوا کا پتہ کار بارے معلوم ہوا۔

"کیا تمہیں سوامی ہری واس سے متعلق معلوم تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، ہم کئی بار وہاں گئے تھے۔ جسویری نے مجھے سے شادی کا وعدہ کر لیا تھا اور وہ اس میں غلط بھی دکھائی دیتا تھا مگر وہ یکدم غائب ہو گیا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اسے بھارت جانا پڑا یا ایک طرح سے اچھائی ہوا تھا۔ میں جو اپنے حواسوں میں نہ رہی تھی، آہستہ آہستہ اس پائل پین سے باہر آنے لگی اور پھر میرے دوستوں نے مجھے سنبھال لیا۔" کنول جیت کہہ چکی تو دلچسپ لگنے لگا۔

"میں کنول دیدی سے بہت چھوٹا ہوں۔ ہم انہی کے محلے میں رہتے تھے بلکہ میں انہی کے آگن میں کھیلا ہوں۔ میرے پر یار کو بھی سبھی سزا ملی۔ اب یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ کون یہ سب کرتا رہا اور کن کے کہنے پر یہ سب درندگی ہوتی رہی۔ یہ ایک لمبی کہانی ہے۔ خیر، میں دہلی میں ہی پڑھتا تھا۔ اس لیے قفا گیا۔ میرا دیدی سے رابطہ تھا۔ ان کے دعویٰ آنے سے پہلے ہی میں کینڈا اچھا گیا۔ پھر ہماری ملاقات تو نہ ہوئی لیکن رابطہ باہر ان کے ساتھ جو سامعہ ہوا، مجھے معلوم ہو گیا۔ میں نے وہ دوا کینڈا منگوائی۔ ان کی کیفیات کے بارے میں جان کر کچھ دوا میں سمجھاؤں جس سے یہ خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئیں اور اس دوائی کے اثرات بھی زائل ہو گئے۔ یہ بھارت واپس جاتا چا رہی تھیں لیکن وہاں کون تھا؟ میں نے تحریک کے ساتھیوں کی مدد سے انہیں ہمیں روکے رکھا۔"

"میری احتیاط ہی میرے کام آئی۔ تحریکی ساتھیوں سے رابطے کا کسی کو گمان تک نہیں تھا لیکن جسویری سے تعلقات، ہری واس کے ہاں آنا جانا اور دوسرے لوگوں سے ملاقات کے باعث میں آسانی سے ان کے نیٹ ورک میں آ گئی۔ جسویری پہلے ہی میری لاطمی میں مجھے "را" کے لیے استعمال کرتا رہا تھا سو میں ان لوگوں کی نظروں میں تھی۔ مجھے سعد الموطاوی کے ہوٹل میں جا ب کی آفر ہوئی اور پھر حیدرآباد کے ساتھ کام کرنے کو کہا گیا۔" کنول جیت نے مزید تفصیل بتائی تو دلچسپ بولا۔

"مجھے دو ہفتے ہو گئے ہیں یہاں آنے ہوئے۔ دیدی سے میرا فون پر رابطہ رہا، احتیاط کا قضا تھا کہ میں ان سے نہ ملوں سو نہیں ملا۔ اس دن دیدی نے مجھے فون کیا تو باتوں باتوں میں بتایا کہ یہ آپ کے ساتھ کافی پینے جاری ہیں، یوں ملاقات ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ چند لمبے رکا، پھر گہری سنجیدگی کے ساتھ بولا۔ "اب رہی یہ بات کہ ہم نے یہ سب کچھ آپ ہی سے کیوں کہا؟ معاف کیجئے گا، شجاعی! ہمیں معلوم نہیں کہ آپ کون ہیں اور آپ کا پس منظر کیا ہے۔ میں یہاں اسی امکان کا جائزہ لینے آیا تھا کہ ہری واس کے منصوبے کو کس طرح غارت کیا جائے لیکن مجھے روک دیا گیا۔"

میرے تحریر کی دوستوں نے بتایا کہ اس پر کام ہو رہا ہے اور یوں آپ سے متعارف ہوئے۔ مجھے نہیں پتا کہ کس کا، کس سے کیا رابطہ ہے مگر مجھے یہی کہا گیا ہے کہ یہ ساری صورت حال آپ کو بتا دوں۔ اسے آپ کیسے کریں گے، ہمیں یہ بھی نہیں معلوم لیکن سب آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں۔" اس نے یہ سب گہری سچیدگی سے کہا تھا۔ میں نے اس تناؤ کو ختم کرنے کے لیے خوشگوار لہجے میں کنول جیت سے کہا۔

"تم نے مجھے احساس ہی نہیں ہونے دیا؟"

"آپ مجھ سے جیسی چاہیں قسم لے لیں، مجھے تین دن پہلے تک آپ کے بارے میں قطعاً علم نہیں تھا۔ میں آپ کو اسی ٹیبل ورک کا ایک حصہ سمجھتی رہی لیکن نجانے کیوں میرا سن آپ ہی کی طرف کھینچا چلا جاتا تھا اور مجھے آپ کا احترام کرنے پر مجبور کرنا تھا۔ میں باوجود آپ کو دشمن سمجھتی ہوئے آپ کا احترام کرتی رہی اور ہو سکتا ہے، یہ سلسلہ کچھ دن اور چلا مگر آتی ضرورت سے زیادہ اپنا فرض ادا کر رہی ہے۔ اس کی تیزی سے ہی ہمیں وقت سے پہلے سب کچھ بتا دینے پر مجبور کر دیا اور نہ ہی معلومات آپ کو کسی اور انداز سے معلوم ہوتیں۔"

میں دلپ سے پوچھتا چاہ رہا تھا کہ اگر وہ بری داس کے منصوبے کو غارت کرتے تو کس طرح کرتے لیکن وہ بڑھکانے لگا گیا۔ میں خاموش رہا وہ کھانا رکھ کے چلا گیا تو میں نے کہا۔

"دیکھو بھئی، اس وقت رزق سامنے آ گیا ہے۔ سب کچھ چھوڑو اور اطمینان سے کھاؤ۔ پھر باتیں ہوتی رہیں گی۔" میرے یوں کہنے پر کشیدہ ماحول قدرے خوشگوار ہو گیا۔ ان دہلوں کے چہروں پر مسکان بھی تو مجھے لگا کہ میں ایک دم ہلکا پھلکا ہو گیا ہوں۔ ایک دوسرے کی دلچسپیاں، چھوٹی چھوٹی، پسند و ناپسند جیسی ہلکی چٹکتی باتوں کے خوشگوار ماحول میں کھانا ختم ہوا۔ میری کوشش تھی کہ دو بارہ حلاجی یاد میں نہ دہرائی جائیں، اس لیے میں نے دلپ سگھ سے پوچھا۔

"یار! مجھے تپاؤ، یہ ہری داس ایجنٹ کبھی اس منصوبے سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں، اصل میں ان کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟"

"ایک سیدھی سی بات جو بالکل سامنے کی ہے، یہی ہو سکتی ہے کہ یہ لوگ دولت کمانا چاہتے ہیں۔ اس پراجیکٹ کی کامیابی کے لیے مضبوط ٹیبل ورک اور زبردست پشت پناہی کی ضرورت ہے اور وہ ہری داس کو حاصل ہے۔ اس کا ایک بدنام تنظیم سے گٹھ جوڑ بھی معمولی نوعیت کا نہیں ہو سکتا، یقیناً یہ ایک گہری سازش ہے۔ یہ سازش وہ کس مفاد کے لیے کر رہے ہیں، یہی نکتہ تلاش کرنا ہی دراصل اس کے خلاف کسی کارروائی کی بنیاد بن سکتا ہے۔"

"یہ سب کچھ اتنا مشکل نہیں ہے۔" کنول جیت نے جلدی سے کہا۔

"یہ سب معلوم ہو جانا ممکن ہے، ذرا سی محنت سے وہ لوگ بھی بے نقاب ہو جائیں گے جو اس سازش میں شریک ہیں لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ لوگ بہت زیادہ مضبوط ہیں، اسی لیے تو وہ اتنی دیدہ دلیری سے اپنا کام کرتے چلے جا رہے ہیں اور ہم ان کے سامنے آن نہیں سکتے۔" دلپ نے باپوسانانہ انداز میں کہا۔

"اتنا باپوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے، پیارے! اگر ان بے ضمیروں کی غارت گری لکھی ہوئی ہے تو ایسا ہو کر رہے گا، تم ٹھہراؤ نہیں۔"

میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

”ہاں، سبکی تو میں آپ سے کہنے والا تھا کہ ہم سب تو تمنا شائی ہو کر رہ گئے ہیں۔ اکھاڑے میں آپ اتر چکے ہیں۔ دیکھیں، اب نتیجہ کیا نکلا ہے؟“ وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولا۔

”رب سوہنا اچھا سی کرے گا، یارا!“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا وہ یکدم ہی خمیرہ ہو گیا۔

”شجاع، دیر! یہ مت بھگنے گا کہ آپ اس جنگ میں تباہ ہیں۔ ہم آپ کے ساتھ ہیں، اس میں بھلے ہماری جان چلی جائے۔ ہمیں ان بے غیرتوں سے انتقام لینے کا موقع ہی اب ملا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے دھیرے سے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”اعتماد کرو، میری جان!“ میرے یوں کہنے پر دلپ اور کنول کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ ماحول پھر سے حزن آلود ہونے لگا۔ اس لیے میں نے اٹھ جانا ہی مناسب سمجھا۔ پارکنگ تک آتے آتے ہمیں کچھ وقت لگ گیا اور پھر دلپ سنگھ اپنی راہ ہو لیا، میں کنول جیت کو ڈراپ کر کے گھر آ گیا۔

میری توقع کے عین مطابق آرتی سنگھ روم میں بیٹھی ہوئی قسم دیکھ رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی مشرقی انداز دلربائی کے ساتھ میری طرف بڑھی، یوں جیسے عرصہ ہوا ہم ایک دوسرے سے ملے نہ ہوں۔ اگرچہ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی لیکن میرے من میں نخرت اسٹڑ رہی تھی۔ میں نے اس کے گریاں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دھیرے سے بچھے بیٹایا تو اس کی ہنسی جلد سے مجھے یوں گمان ہوا جیسے میں نے کسی سانپ کے بدن پر دکھ دیا ہو۔ طبیعت یکدم ہی مکدر ہو گئی، تاہم اس کا چہرہ سامنے آجانے تک میں نے خود پر قابو پالیا اور پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر پوچھا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“

”آپ کے انتظار میں ہم فلم سے دل بہلا رہے تھے۔“ اس نے میرا بازو پکڑتے ہوئے کہا۔ میں اسے لیتا ہوا صوفے پر بیٹھ گیا، تب اس نے بڑے ناز سے پوچھا۔

”جائے چلے گی؟“

”نہیں، سادہ پانی۔“ میں نے اس کی ٹھارہ لودھکا ہوں میں جھاکتے ہوئے کہا تو وہ اٹھ کر پانی لے آئی۔ میں صوفے پر پچھل کے بیٹھ چکا تھا۔ میں نے پانی پی کر گلاس اس کی طرف بڑھایا تو اس نے پوچھا۔

”پھر خوب وقت گزارا کنول جیت اور اس کے کزن کے ساتھ؟“

”اصل میں یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ میں انہیں دوپہر کے وقت ہی کھانا کھلا دیتا لیکن تمہیں سوامی جی کے ہاں جانے کی جلدی تھی، بس اسی وجہ سے شام غارت ہو گئی، بہت بوری تھے وہ لوگ، اپنی کہے گئے۔ کنول اگر کوئی لگ نہ ہوتی تو میں انہیں چھوڑ کر آ جاتا۔“

”کیا ہے اس کا کزن؟“ اس نے تجسس سے پوچھا۔

”جیسے عام لکھنؤ جو ان ہوتے ہیں، کینڈا کی ایک ملٹی پیٹرنل کمپنی میں جاب کرتا ہے۔ بس اچھا ہے، اس کی سوچ بھی دولت کمانے تک محدود

ہے۔“

”اوہ جو کوئی کسی چیز کو چاہتا ہے وہی اسے نہیں ملتی جیسے ہم محبت کے طلب گار۔“ اس نے فخر و ادھر اچھوڑ کر میری طرف دیکھا اور قہقہہ لگا کے ہنس دی۔

”آرتی اکیا تم اسے محبت نہیں سمجھتیں کہ میں اس وقت تمہارے پاس ہوں؟“

”ہاں ہے لیکن ہم تو مدہوش ہو جانا چاہتے ہیں۔“ اس نے غماز آلود لہجے میں کہا۔

”انتظار کرو، کبھی نہ کبھی تو تمہاری مراد پوری ہوگی۔“ میں نے کہا تو وہ صوفے پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی، یونہی ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اچانک اس نے کہا۔ ”ہم آپ کو ایک گیت سنائیں۔“

”گیت اور تم؟“

”ہاں ہائیں بہت سارے گیت آتے ہیں لیکن اس وقت ہم ایک ہی سنائیں گے، آج شام ہی سے ہمیں بہت یاد آ رہا ہے۔“

”اچھا، سناؤ۔“ میں نے کہا تو وہ آنکھیں بند کر کے جذب سے گانے لگی۔

”من میں چلتی امن

اُوہ جاناں امن میں چلتی امن

خیون صحرا قسمت ٹھہرا۔۔۔ آبلہ پانی کے دکھ سہنا

دکھ دریا کے پار اترنا۔۔۔ سادون رُت میں تر سے رہنا

ہر منظر سے چھڑے رہنا۔۔۔ تیری چاہ میں چلتے رہنا

جیسے روشن دیا!

اُوہ جاناں امن میں چلتی امن

چمن چمن چمنیں، دل آگن میں۔۔۔ بانہ کے محقر وہ نو نے چنے

سرنگیت کی سب تانوں میں۔۔۔ بنگلی یاد سلگتے وعدے

میرے گیتوں کے شہدوں میں۔۔۔ تیری چاہت کے رنگ اترے

چاہ میں تیری ڈوب گئی ہوں

جیسے کچا گڑا!

اُوہ جاناں امن میں چلتی امن

اُوہ جاناں امن میں چلتی امن!“

آرتی نے یہ گیت بڑے جذب سے گایا تھا۔ اس کی آواز بھی اچھی تھی۔ اس لیے اس گیت کا تاثر کچھ دیر تک رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھول

کے میری آنکھوں میں دیکھا۔ نہ جانے وہ کیا ڈھونڈ رہی تھی، میں نے بہر حال اس کی تعریف کی۔

”بہت پیارا گیت گایا تم نے، بہت اچھا لگا۔“ میں نے کہا تو اس نے اپنی ہتھیلی میرے سامنے پھیلائے ہوئے کہا۔

”تو لائیے ہمارا انعام۔“

میں نے چند لمبے سوچا اور پھر اس کی ہتھیلی تھام کر اس کے ماتھے پر اپنے لب رکھ دیئے۔ میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اس وقت میرے جذبات ذرا مشتعل نہیں ہوئے، مجھے ایسے لگا جیسے کسی برتن کے ساتھ لب لگا دیئے ہوں۔ وہ حیرت زدہ ہی میری طرف دیکھنے لگی۔ پھر وہ کھلی اور سمٹ کے میرے ساتھ لگ گئی۔ وہ کتنی دیر تک یونہی چھوٹی موٹی سی میرے ساتھ کھلی رہی، وہ شاید سکون محسوس کر رہی تھی لیکن میرے اندر بے سکونی کا دھواں پھیلا جلا جا رہا تھا۔ وہ کتنی دیر تک بے حس و حرکت رہی۔ جب میرے لیے دھواں کی کڑواہٹ کا قابل برداشت ہو گئی تو میں نیند آنے کا بہانہ کر کے اٹھ گیا۔

میں اپنے بیلے پر آ کر لیٹا تو میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ وہ انکشاف، انجیز اور مصروفیت بھرا دن میرے لیے حیرت سے زیادہ اضطراب کا باعث بن رہا تھا۔ سوچوں کا اک حصار تھا جس نے مجھے اپنی لپیٹ میں لیا ہوا تھا، ذہن بار بار رسوا می ہری داس کی باتوں اور اس کے خوف ناک منصوبے کی طرف چلا جاتا۔ دلپ سے جب میں نے یہ پوچھا تھا کہ آخر وہ اس منصوبے سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس نے محض سطحی سی بات کی تھی، اسے شاید اندازہ ہی نہیں تھا کہ جنسیت، قوموں کو تباہ حال کر دیتی ہے۔ کسی بھی قوم کو ذہنی، اخلاقی اور معاشرتی طور پر تباہ حال کرنا تو تو اسے جنسی آزادی دے دی جائے۔ کیونکہ یہی آزادی بے راہ روی پیدا کرتی ہے، جس سے اخلاقی اقدار کا جنازہ تو لگتا ہی ہے، بے راہ روی کی ایسی ایسی بھیجا تک صورتیں سامنے آتی ہیں کہ انسانیت بلبلا اٹھتی ہے۔ جنس ایک فطری عطیہ خداوندی ہے، ایک قوت ہے۔ اس کا جائز اور صحیح استعمال ہونے سے فطرت ان ثمرات سے نوازتی ہے جس مقصد کے لیے یہ قوت انسان اور حیوان کو روایت کی گئی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جس قوم یا قبیلے نے جنسی قوت کو مہمانداری میں نہیں رکھا اور اسے اس کے فطری تقاضوں کے ساتھ نہیں نبھایا، وہ تباہ و برباد ہو گئی۔ دنیا بھر کے مفکرین جو انسانیت کی فلاح چاہتے ہیں۔ جو انسان کو انسان خیال کرتے ہیں، ان کے نزدیک جنسی بے راہ روی انسان ذہنی صلاحیتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ انتشار کی وجہ سے یکسوئی جیسی نعمت اس سے چھین جاتی ہے۔ جب خیالات ہی پرانگندہ ہو جائیں، وہاں اچھی اور عقلی سوچ کہاں پیدا ہوگی؟ یہاں احتیاط کا مطلب راہبانیت نہیں بلکہ جنس جیسی قوت کا جائز اور فطری استعمال ہی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے لیے ضروری ہے۔ میڈیکل سائنس اور طب یونانی کے تمام مفکرین اس بات پر متفق ہیں کہ جنسی بے راہی سے انسانی صلاحیتوں کی نشوونما رک جاتی ہے، ہوس کی تباہ کاریاں انسان کے ”تصور“ کو تباہ کر دیتی ہیں اور انسان اپنے ہاتھوں خود ہی قتل ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

ہو سکتا ہے یہاں یہ سوال اٹھے کہ اگر جنسی بے راہ روی ہی ذہنی صلاحیتوں کی قائل ہے تو پھر یورپ اور امریکہ اتنے اوج کمال تک کیسے پہنچی گیا۔ حالانکہ ہاں جنسی بے راہ روی بھی اپنے عروج پر ہے؟ ایسا سوال کو تاہ نظری، ذہنی پستی اور بیمار سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ اگر یورپ اور امریکہ نے مادی ترقی کی ہے تو کیسے؟ یہی نا، کہ بس ماندہ ممالک کو برباد کیا۔ آلات قتل پھیلائے، مٹھی ساڑھیں کیں بد امنی، ذہنی انتشار، بھوک اور عدم تحفظ کا

احساس دیا۔ کسی کا گھر برباد کر کے اپنا محل خوبصورت بنانا، دنیا کا انتہائی ذلیل اور گھٹیا ترین عمل ہے۔ ایسا وہی کرتے ہیں جن کی سوچ بنا اور حقیقی ہوتی ہے۔ انسانیت کا نقل کیسے کیا جاتا ہے، یورپ اور امریکہ کی ترقی کے گن گانے والے، کیا ان کے معاشرے میں موجود اخلاقی قدروں کے بارے میں جانتے ہیں؟ وہ جو اپنی "تہذیب" کو عظیم ثابت کرنے کے لیے دن رات پسماندہ ممالک کے لوگوں کے ذہنوں میں قطرہ قطرہ پروپیگنڈا کا نشر پکارتے رہتے ہیں۔ کیا واقعی یورپ اور امریکہ کی تہذیب ایک "عظیم تہذیب" ہے، کیا ایسی تہذیب کو عظیم کہا جاسکتا ہے جس میں انسانیت سوز واقعات اپنے عروج پر ہیں؟ مادہ پرست لوگ ایک دوسرے سے بیزار ہیں۔ ناجائز اولاد ان کے لیے رستا ہوا سوراخ بن چکی ہے۔ جہاں یوزھوں کو معاشرے کا کھرا سمجھ کر اولاد ہاؤس کے کونوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ جہاں جنسی وحشت ایک کھیل کی حیثیت اختیار کر گیا ہو۔ جہاں ہم جنس پرستی اس قدر غالب ہو کہ ہم جنس سے شادی تک کا قانون پاس کر لیا جائے۔ جن کے سائل ننگ دھڑنگ لوگوں سے انے پڑے ہوں اور پھر سے وحشی ہو جانے کی ترپ جن میں موجود ہو۔ سیکس فری ایریا میں انسان جاؤں سے بھی بدترین صورت حال میں پائے جائیں تو قہ ہے ایسی "عظیم تہذیب" اور اس کے گن گانے والوں پر۔ جہاں انسانوں سے ہٹ کر جاؤں سے جنسی اختلاط کے متعلق ہوں۔ ایسی عقلمندی پر اور ایسی تہذیب کو عظیم کہنے والوں پر، کیا ایسا معاشرہ ایسی تہذیب، حقوق انسانی کی ظہیر دار ہو سکتی ہے۔ کیا وہ دنیا اور خصوصاً پسماندہ ممالک کی راہنمائی کر سکتے ہیں؟ ہاں، وہ لٹھن جوان کے معاشرے میں پیدا ہو کر ناقابل برداشت ہو چکا ہے، اُسے ریشمی کپڑے لپیٹ کر ان پس ماندہ ممالک میں پھینکا جا رہا ہے جنہیں اپنی تہذیب، اپنی معاشرت، اپنے دین اور اپنی روحانی قدروں کا پتہ نہیں۔ جن کے نزدیک ماویت ہی سب کچھ ہے، وہ اس گند کو بڑے احترام سے اپنے گھروں میں لا کر اپنی اولاد میں بانٹ رہے ہیں۔ جنسی بے راہ روی معاشرے میں کیا کیا انسانیت سوز مظاہرے ہوتے ہیں۔ اس کی صرف ایک مثال ہی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہوگی لیکن اس کے لیے جو ڈراما محفل رکھتا ہے۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ "ایڈز" کا جراثیم عورت اور بندر کے ملاپ سے پیدا ہوا۔ کون نہیں جانتا کہ ایڈز امریکہ پیدا ہوئی۔ اسی محفل کے لیے اتنا سوچ لیا ہی کافی ہے کہ وہ کون ممالک میں پھیل رہی ہے اور کیوں؟ یہی صحت مند سوچ سبھی رازوں سے پردہ ہٹا دے گی۔ کون نہیں جانتا جنوبی ایشیا کے ممالک میں غربت، انفارمز، بیماری، غیر صحت مندانہ رجحان، خشیت، جنسی بے راہ روی، افلاس، یہ سب کن کی پیدا کردہ ہے۔ اس خطرے کے لوگوں کو چاہئے تو یہ تھا کہ برطانیہ کے چلے جانے کے بعد اپنی نسل نو کے لیے ایسی خرابیوں کے خلاف مصروف عمل ہو جائے لیکن ہوا کیا؟ تاریخ شاہد ہے کہ یہی خرابیاں موجود ہیں۔ (اسی محفل رکھنے والا یہ شخص یہ بھی جانتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے! کولمبس کے امریکہ دریافت کر لینے کے بعد امریکہ میں آباد ہونے والے اولین لوگ جرائم پیشہ تھے۔ اپنے مستقبل کو محفوظ بنانے کے لیے یہ جزیرہ موزوں ترین تھا۔ یورپ تب بھی ذلت کے انتہائی گھٹیا درجے میں گرا ہوا تھا جیسے اب ہے۔ ایسے میں یہودی نے اپنی تجارت کے فروغ اور اپنے مذہب کو بچانے کے لیے اسی جزیرے کو محفوظ ٹھکانے کے طور پر چنا لہذا یہودیت نے اپنے مفاد کی خاطر امریکہ اور یورپ کی تہذیب کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا، یہ سب کے سامنے ہے۔ اس جدید ترین دور میں بھی وہ اپنی اس صدیوں پرانی روایت کو کیوں نبھارے ہیں کہ وہ غیر یہودی سے شادی نہیں کرتے۔ یہ الگ بات ہے کہ بڑے مقصد کے لیے وہ اپنی نسل کو محفوظ رکھا اور یہی نسل تقاضا نہیں دینا پر عملرانی کرنے کے مقصد کے لیے سرگرم رکھے ہوئے ہے۔ انہیں اس سے غرض نہیں کہ وہ عددی لحاظ سے تھوڑے ہیں۔ کوئی غیر یہودی ان کا مذہب

قبول کرنا چاہے تو وہ اسے بطور یہودی اپنے مذہب میں جگہ نہیں دیتے۔ وہ اس سوچ پر بھی پوری طرح عمل پیرا ہیں کہ غیر یہودیوں کو ان کے اپنے مذہب پر رائج نہ ہونے دیا جائے۔ انہی اہداف کو حاصل کرنے کے لیے ان کے پاس تقریباً پانچ سو سالہ تجربات موجود ہیں اور اس میں شادیت کثرت ترین راستہ کسی قوم کو چاہا حال کرنے کے لیے اس میں جنسی بے راہ روی پیدا کرنا ہے۔ یہودیوں نے اہل ہند کو اپنے استعمال شدہ تیر بہدف تجربات سے نوازا۔ جنسی بے راہ روی پیدا کر کے یہودیوں نے جو نتائج حاصل کیے وہ اہل ہند کو بتائے، اسی سوچ کے سہارے بھارتیوں نے ”گچر پالیسی“ کو عام کرنے کے لیے کمر بستہ کس لی۔ بھارتی یہ جنسی بے راہ روی کیوں پیدا کرنا چاہیں گے، ان کے مقاصد کیا ہوں گے؟ صاف اور سیدھی بات ہے کہ جو گڑھ دینے سے مر جائے، اسے زہر دینے کی کیا ضرورت ہے۔ کھوکھلے مادہ پرست جنس زدہ پار سوچ رکھنے والے اجسام جو صلاحیتوں سے عاری ہوں، ان پر گولیاں ضائع کھین کی جاتیں۔ بلکہ اپنے من پسند خیالات ان کے ہاتھ میں ٹھما دیئے جاتے ہیں۔ وہ اپنے ملک میں غیر ہندوؤں کی سوچ کو نہ دیکھ رہے ہی نہیں دینا چاہتا۔ جبکہ خود ہندو اور ہندومت کی تعلیمات جنس کی تعلیم دیتی ہے۔ آرتھوا، دھرم، کاما (فن، مذہب اور جنس) ہی ان کے مذہب کی بنیاد ہے۔ شاید بھارت اپنی ازلی بزدلی کے باعث اتنا حوصلہ کر لینے میں وقت لیتا لیکن یہودی گڈ جوڑ سے جو گچر پالیسی سامنے آئی ہے۔ وہ ایک تیر سے کئی لاکھ لے لینے والے بات ہے۔ عام سی بات ہے کہ کوئی وقت تھا، فلم چوری چھپے دیکھی جاتی تھی اور ایسا کرنے والے کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ آج ہم اپنی ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کے ساتھ جینے کر بھارت کی جنسی جذبات بھارتی والی فلموں کو بڑے اطمینان سے دیکھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مگر تو کمر، سز بھی محفوظ نہیں رہا۔ کیا یہ اہل ہندو کی کامیابی ہے؟ نہیں قطعاً نہیں۔ یہ ہماری بدترین ناکامی ہے۔ کوئی ہندو آکر ہمیں فلم نہیں دھماتا، ہم خود یہ تقصیر اپنے گھروں میں لے جاتے ہیں۔ ذرا تصور کریں کہ وہ شخص جس نے پاکستان کی تحریک میں دیوانہ وار حصہ لیا ہو، جس نے اپنی بیٹی کو اس لیے کھوئی میں دکھیل دیا کہ اس کی عصمت محفوظ رہے اور کافروں کے ہاتھوں برباد نہ ہو۔ وہ بیٹی جس نے اپنی عزت کے لیے اپنی جان دے دی، یہ لوگ اگر زندہ ہو کر دوبارہ ہمارے ماحول میں آجائیں اور ہمیں اجتماعی طور پر ایسی حالت میں دیکھ لیں کہ ہم ہندوؤں کی جنسی جذبات بھارتی والی فلمیں رغبت سے دیکھ رہے ہیں تو ان کا احساس کیا ہوگا، وہ اپنی قربانی کے متعلق کیا خیال کریں گے؟ اس تقصیر کی سزا اہل ہندو سے ظاہر ہونا شروع ہو گئی ہے۔ تصور کریں اس وقت کا جب ہماری آنے والی نسلیں اس گند کو بھگتیں گی۔ کیا ہم نے کبھی سوچا کہ اس بدترین تہذیب کی چھوڑی ہوئی رسوم کو گلے لگا رہے ہیں یا ہم اہل ہندو کے اکٹھے بھارت والے خواب کی تکمیل کر رہے ہیں؟ ان سوالوں کا جواب ہم نے کبھی سے بھی نہیں لیا، بس ذرا گردن جھکا کر اپنے آپ سے سوال کرنا ہے۔ وائرس وہیں پھیلتا ہے، جہاں قوت مدافعت کم ہو اور اس کے پھیلنے کی گنجائش ہو۔ جنسی بے راہ روی وہیں پھیلتی ہے جہاں بے مقصدیت، بے شعوری، بے عملی اور نادیت پرستی ہوگی۔ کیا ہم ہمیشہ قوم خود کو ناسور کا شکار کر لیں گے؟

”نہیں،“ میرے اندر سے کوئی زور سے پکارا۔ ”نہیں، جہاں تک میری دسترس ہوگی، میں پوری شدت سے اس کا مقابلہ کروں گا۔“ میں یکدم اضطرابی کیفیت میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میری یہ کیفیت لاشعوری تھی، میرے تصور نے مجھے بڑی سمیٹا تک تصور دکھائی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ سب اپنے خون آلود کھیلے بچوں اور تیز دماغوں سے ہماری آئندہ نسل پر حملہ آور ہونے والے ہیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے میں تہاں میدان میں ان کے سامنے

کھڑا ہوں۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ اور سوچتا، میرے دماغ میں ٹیس اٹھی۔ درد کی شدت اتنی تیز تھی کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو پاری تھی۔ میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر انتظار کرنے لگا کہ یہ درد کب کم ہوگا۔ ایسا ہونا ہی تھا۔ وقتی ریاضت ہی اس درد کا باعث بن چاہا کرتی تھی۔ اچانک اٹھنے والا درد دیر سے دیر سے کم ہو جاتا تھا۔ پھر کوئی بھی عام ہی ٹین کلر لے لینے پر وہ درد دھو جاتا لیکن اس وقت وہی تیز کیفیت تھی، کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک یونہی سرد ہائے بیخار باہر تک کہ اسے ہی کی خشک ہوا میں بھی مجھے پینت آ گیا۔ مجھے لگا جیسے میں بے بس ہو رہا ہوں، میرا شعور جیسے میرا ساتھ چھوڑ جائے گا۔ یہ ایک خطرناک صورت حال تھی۔ ایسے لمحات میں مجھے کچھ اور سمجھائی نہ دیا، بس اپنا سیل فون اٹھایا اور نمبرم کے سیل فون کے نمبر پر کال کر دی۔ کچھ دیر بعد کال ریسیو کر لی گئی۔

”جی، شجاع بھائی! اتنی رات گئے؟“ اس کے لہجے میں غنودگی تھی۔

”تم فوراً آؤ، میری طبیعت بہت زیادہ خراب ہو رہی ہے۔“ میں نے تیزی سے کہا۔

”آپ ہیں کہاں؟“ وہ گھبراہٹ میں بولا۔

”گھر میں۔۔۔“ مجھ سے اتنا ہی کہا گیا اور نڈھال ہو کر بیڈ پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر ایسے احساس کا دور آیا کہ وہ سوچتا تھا کہ وہ تو میں بے ہوش ہوا اور نہ ہی پوری طرح حواسوں میں تھا۔ کافی دیر بعد دروازہ زور سے بچنے کی آواز آئی، اس کے ساتھ ہی آرتی کی آواز سنائی دی جو اونچی اور تیزی آواز میں مجھے پکار رہی تھی۔ دروازہ اندر سے لاک تھا، میری ہمت نہیں ہو پاری تھی کہ اٹھ کر دروازہ کھول سکوں۔ بمشکل تمام میں وجود کو دکھایا اور دروازے تک پہنچ کے کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی آرتی نے مجھے تمام لیا اور انتہائی تشویش سے بولی۔

”کیا ہوا، بولنے، کیا ہوا آپ کو؟“ میں اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن لفظ گنگ ہو گئے، بولا ہی نہیں گیا۔ میں نے اشارے سے اپنے سر کی طرف اشارہ کیا اور پھر بے جان سائیڈ کی طرف بڑھا۔ وہ شاید کچھ بھیجی تھی کہ وہی پرانا درد جاگا ہے۔ اس لیے وہ مجھے اچھی طرح لٹا کر اپنی بیچ تھراپی آزمانے لگی مگر شاید یہ درد اب اس کے بس کی بات نہ رہی تھی وہ ویسا ہی رہا۔ وہ اپنی پوری کوشش کر رہی تھی اور میں اس درد کو برداشت کر رہا تھا۔ اس دوران میرا سیل فون بج اٹھا، میں نے آرتی کو اشارہ کیا کہ وہ من لے۔ اس نے سنا اور پھر مجھے بتانے لگی۔

”ندیم کا فون تھا۔ پوچھ رہے تھے کہ کیا ہوا ہے، ہم نے بتا دیا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ایوب لینس پہنچنے والی ہوگی اور وہ راستے میں ہیں۔“

میں نڈھال ہو رہا تھا اور آرتی مجھے اپنی گود میں لیے مسلسل اپنی صلاحیت آزما رہی تھی، درد تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ میں بے بس ہو رہا تھا اور پھر مجھے ہوش نہ رہا۔ مجھے ہوش آیا تو میرے ارد گرد ڈاکٹر اور نرس موجود تھیں، لگا ہوں کہ سامنے سے دھندہ ہی تو شعور نے بھی احساس دلا دیا کہ یہاں کوئی موجود ہوں۔ میرا دھیان اپنے سر درد کی طرف گیا جواب نہیں تھا لیکن ایک بے وجہ سی سنسنابٹ تھی جیسے ویران صحرا میں پاگل ہواؤں کا شور ہو۔ میری آنکھیں کھلتے ہی ڈاکٹر نے انگریزی میں پوچھا۔

”کیا محسوس کر رہے ہو؟“ اس کے پوچھنے پر میں نے اپنی کیفیت بتائی۔ تب اس نے میرا کندھا چھو پھرتے ہوئے کہا۔

”نوجوان! ابھی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے لیکن درد کی علامات بتا رہی ہیں کہ خطرہ بھی ہو سکتا ہے۔ حتمی رپورٹ کچھ ٹیسٹ ہوں گے،

تب تک آپ ہسپتال میں رہیں گے اور ہاں ایک بات اور، زیادہ سوچنا نہیں ہے۔ لہجک ہے نا؟“ اس اور جیڑ عمر ڈاکٹر نے شفقت سے کہا۔ پھر کچھ دیر بعد مجھے ایک اور کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ اگلی شام تک میں مختلف ٹیموں کے مراحل سے گزرتا رہا۔ اس دوران حیدر شاہ بھی آچکا تھا اور ہاتی لوگ بھی موجود تھے۔ شام ڈھلے مجھے اسی ڈاکٹر کے آفس میں لے جایا گیا جہاں حیدر کے ساتھ سعد الموطاوی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ میں جا کر بیٹھا تو ڈاکٹر نے انتہائی نرم مسکراہٹ سے مجھے خوش آمدید کہا، کچھ دیر باتوں کے بعد ڈاکٹر نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”نوجوان! میں تمہیں تمہاری بیماری سے متعلق بتا کر خوف زدہ نہیں کرنا چاہتا لیکن بہر حال تمہیں اپنی بیماری کے بارے میں آگاہ ہونا چاہئے۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کورا، پھر بولا۔ ”تمہارے یہ سر کا درد ایک طرح سے برین ٹیومر ہے۔ میری تشخیص کے مطابق یہ ابھی انتہائی ابتدائی سطح پر ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ درد پیش کی ایک کیفیت ہو لیکن بہر حال ہم اسے دواؤں سے ختم کرنے کی کوشش کریں گے اور مجھے پورا یقین ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔“ وہ ڈاکٹر کافی دیر تک مجھے اس سے متعلق مختلف احتیاطیں اور دوا کے باقاعدہ استعمال کے بارے میں بتاتا رہا، پھر ہم وہاں سے اٹھ آئے۔ سعد الموطاوی اپنی گاڑی میں چلا گیا اور حیدر مجھے گھر لے آیا۔ گھر پہنچے تو سبھی موجود تھے۔ حمیش، کنول جیت، آرتی اور ندیم۔ کچھ دیر ان کے درمیان رہا اور پھر اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ ندیم میرے پاس تھا، وہ میرے ساتھ ہی بیڈ پر بیٹھ گیا اور میرا سر دبانے لگا۔ میں مسکرا دیا۔

”چھوڑو، یا ر! یہ کیا کر رہے ہو؟“

”ایسے ہی، میرا دل چاہتا ہے۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

”اوہ جیل چھوڑو، سیدھا ہو کر بیٹھا اور مجھ سے باتیں کرو۔“

”ڈاکٹر نے آپ کے لیے یہ احتیاط۔۔۔“

”یہ ہسپتال نہیں، گھر ہے۔ میں باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اگلے ہی لمحے مجھے الطاف پاشا کا خیال آیا تو میں نے اس سے متعلق پوچھ لیا۔

”ہم رابطے میں ہیں۔ اسے آپ کے متعلق پتہ ہے۔ دلپ ننگہ سے ہونے والی ملاقات اور اس میں ہونے والی باتوں سے بھی آگاہ ہے۔“

”اسے کیسے پتہ ہے؟“ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔

”پاکستانی لوگوں کا بھی پورا نیٹ ورک ہے یہاں پر لیکن وہ کوئی حتمی کام نہیں کرتے، بس پاکستانی مفادات کی گمرانی کرتے ہیں جو حق ہے۔ ایٹنی اٹری یا لوگوں سے بھی ان کے روابط ہیں۔“

”ندیم! اس طرح تو ہو سکتا ہے، بات نکھیل جائے ہو سکتا ہے ان لوگوں کے اندر بھی۔۔۔“

”نہیں، یہ فقط چند لوگوں تک محدود ہے۔ زیادہ سے زیادہ پانچ یا چھ لوگ ہیں جو انتہائی قابل اعتماد ہیں۔ ایسا اس لیے کیا گیا کہ انتہائی احتیاط اور خفیہ انداز سے اس مسئلے سے ہٹا جائے۔ آپ اس معاملے میں بے فکر رہیں۔“

”ہاں، بظاہر ہے۔ اگر اس معاملے میں ذرا سی بھی جھٹک نکل گئی تو سارا معاملہ ٹھپ ہو کر رہ جائے گا۔“ میں نے کہا۔

”بس آپ جلدی سے تندرست ہو جائیں۔ تاکہ آئندہ کالاجھ عمل ٹھایا جائے۔“ ندیم نے خوشگوار لہجے میں کہا اور اپنے سیل فون پر نمبر پیش کر دینے، پھر فون سیٹ میری طرف بڑھا کے بولا۔ ”یہ الطاف سے بات کریں۔“

راہلہ ہو جانے پر ہم کافی دیر تک ہاتھیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے دلیپ اور کنول جیت کے تعلق کے بارے میں بتایا اور آئندہ کیا کرنا ہے، اس بارے میں ہلکا سا اشارہ دیا۔ میں بہر حال مطمئن ہو گیا اور پھر فون بند کر دیا۔ میں شاید ندیم سے کچھ دیر اور باتیں کرتا کہ آرتی آگئی، اس کے ہاتھ میں میری دو انکس تھیں۔

”یہ لیس، یہ کھائیں پہلے۔۔۔“ اس نے پانی کا گلاس بھی میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے وہ دو انگلی اور گلاس اسے واپس کر دیا، جب ندیم بھی اٹھ گیا۔

رات کے پچھلے پہر میری آنکھ کھلی تو میرے بیڈ کے ساتھ ہی نیچے فرش پر گدا بچھائے آرتی لیٹی ہوئی تھی۔ میں چند لمحوں تک اسے دیکھتا رہا اور پھر بے آواز قدموں سے اٹھ کر دہانہ چلا گیا، واپس آیا تو آرتی اٹھ کر بیٹھ چکی تھی۔ جب میں نے کہا۔

”سوری آرتی امیں نے کوشش تو کی تھی کہ تم ڈسٹرب نہ ہو لیکن۔۔۔“

”ہم سوئے کب تھے، جاگ رہے تھے ہم۔“ اس نے کہا، پھر اٹھ کر میرے قریب آگئی اور بولی۔ ”آپ سو جاؤ۔“ اس کے کہنے پر میں نے سو جانا چاہا لیکن نیند نہ آئی۔ ہم دیر تک باتیں کرتے رہے۔ پھر نجانے کب بیو نے بھاری ہونے لگے اور میں سو گیا۔ میں بیدار ہوا تو دن چڑھے خاصا وقت ہو گیا تھا۔ میں منہ ہاتھ دھو کر اپنا سیل فون تلاش کر رہا تھا کہ آرتی آگئی۔ اس صبح وہ خاصی تروتازہ لگ رہی تھی۔ نجانے کاش سے موٹے کے پھول مٹھوا کر اپنے بالوں میں سجائے ہوئے تھے، ان پھولوں سے ایک خوشگوار تاثر ابھر رہا تھا۔ وہ میری طرف دیکھ کر آنکھوں سمیت مسکرا دی پھر دھیرے سے پوچھا۔

”کیسے ہیں آپ؟“

”ایک دم ٹھیک۔“ میں نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ”وہ میرا سیل فون کدھر ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے الماری میں سے نکال دیا۔ وہ آف تھا، میں نے اسے آن کیا اور چارج پرنگاد دیا۔ وہ واپس سڑگئی۔ ناشتہ کر لینے کے بعد میں نے دفتر فون کیا۔ عیش نے فون رسبو کیا۔ اس سے مطمئن ہوا کہ وہ کبھی آئے ہوئے ہیں۔ میں نے آنے کے بارے میں کہا تو وہ بولا۔

”آپ آرام کریں، یہاں کوئی انتظام کام تو ہے نہیں۔“

”یہاں اکیلے میں بد ریت ہوگی، باروہاں آپ لوگوں کے ساتھ دل تو لگا رہے گا۔“

”کیا آرتی گھر نہیں ہے؟“ اس نے مستحق خیر لہجے میں کہا تو میں نے اس کی بات کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا اور آنے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ میں اٹھنے لگا تو آرتی نے حیرت سے پوچھا۔

”کہاں جا رہے ہیں آپ؟“

”آفس، اور کہاں؟“ میں نے عام سے انداز میں کہا۔

”آپ بیمار ہیں اور۔۔۔“

”اور میں اگر صحت مند بھی ہوا تو یہ احتیاطیں مجھے بیمار کر دیں گی۔“ میں نے کہا اور اٹھ کر باہر آ گیا۔

زارا کی آمد چوتھے دن شام کے وقت تھی۔ ٹکٹ بکنے کے رجحان سے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کے شو کا میاب ہو جائیں گے۔ خود زارا،

کنول جیت کے ساتھ رابطے میں تھی، مختلف جگہوں پر ریپرسل وغیرہ چل رہی تھی سوان شوز کے لیے پورا اطمینان تھا۔ ہر کوئی اپنے کام سے مطمئن تھا۔ گپ شپ کے انداز میں کام بھی ہوتا رہا بلکہ دوپہر کے وقت آرتی کا فون آ گیا۔

”دوئی کھالی آپ نے؟“

”نہیں تو۔۔۔“

”آپ کو پتہ ہے کہ دو وقت پر لٹنی چاہئے اور آپ کھانسیں گے بھی کہاں سے، وہ ادھر گھر میں پڑی ہے۔“

”چلو، واپس آ کے کھاؤں گا۔“

”ابھی آرہے ہیں یا ذرا سیر کے ہاتھ بھراؤں؟“

”میں آجاتا ہوں تمھوڑی دیر بعد۔“

”جلدی آجائیے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔ میرے لبوں پر مسکراہٹ رہ گئی، ذہن میں یہی خیال تھا کہ اگر یہی سب کچھ وہ

کسی کے لیے پورے خلوص سے کرے تو۔۔۔ اس سے آگے کئی آپشن تھے، جن پر سوچا جا سکتا تھا۔

اس شام میں پوری طرح فریض تھا۔ حیدر شیخ اور آرتی سے یونٹی گپ شپ چل رہی تھی، ہم باتیں کر رہے تھے کہ حیدر کے سیل فون کی بھل

گئی۔ اس نے ایک نظر اسکرین پر ڈالی اور فون کان سے لگا لیا۔ کچھ لمبے باتیں کرنے کے بعد اس نے فون بند کر دیا، پھر آرتی سے کہا۔

”ماتاجی آ رہی ہیں، بس گیٹ کے پاس ہیں۔“

”اوہ۔!“ یہ کہہ کر وہ مستعدی سے اٹھ گئی، پھر میری طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپ آشرم میں ماتاجی سے ملے تھے نا!“ اس کے یوں کہنے پر

میں نے اثبات میں سر ہلادیا تو اس نے مزید کہا۔ ”وہ آ رہی ہیں اور وہ بھی آپ کے لیے۔“

”ارے واہ، اپنی یہ اہمیت۔“ میں نے قدرے کچھ سمجھتے ہوئے خوشگوار انداز میں کہا، پھر ان کے ساتھ ہی اٹھ کر چل دیا۔ ابھی آرتی نے

صدقے داری ہو جانے والے انداز میں کہا۔

”آپ کی اہمیت کتنی ہے، کوئی ہم سے پوچھے۔“ اس کے یوں کہنے پر حیدر تہمت لگاتے ہوئے بولا۔ ”گناہ ہے آرتی تم اس پر عاشق ہو گئی ہو۔“

”یہ تو وقت بتانے کا کہ ہم ان کے لیے کیا ہیں۔“ میں نے کچھ نہیں کہا، بس یہی سوچ کر رہ گیا کہ سانپ کیا کر سکتا ہے، وہی آرتی کرے

گی۔ یہ الگ بات ہے کہ اب مجھے سانپوں سے کھینے کی عادت پڑ گئی تھی۔ ہم تینوں برآمدے میں کھڑے تھے۔ کچھ ہی لمحوں بعد گیٹ سے لگژری جیکو اور

آئی دکھائی دی اور پھر اگلے چند لمحوں میں وہ پوری میں آرکی تو اس میں سے "ماتا جی" برآمد ہوئیں۔ وہی سفید سلک کی ساڑھی، برف کی مانند سفید ہال، بچوں کی طرح جلد اور دو شیزہ کی طرح سرخ گال۔ انہوں نے ایک ہاتھ سے ساڑھی کا پلو سنبھالا جبکہ دوسرے ہاتھ میں سیاہ رنگ موتیوں والی مالا پکڑی ہوئی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی مالا والا ہاتھ بلایا۔ ہمارے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا، وہ آئیں تو آرتی کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ پھر حیدر شاہ کی گردن اور کندھا تھپتھپایا اور پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولیں۔

"تو یہ ہیں۔" انہوں نے گونجتے ہوئے لہجے میں کہا اور میری طرف گہری نظر سے دیکھا۔ میں ان کی نگاہوں میں وہی ازلی تکتہ عورت دیکھ رہا تھا۔ وہ میرے قریب ہوئیں اور مالا والے ہاتھ کی انگلیاں میری گردن پر رکھ دیں۔ میں پہلے ہی ذہنی طور پر تیار تھا۔ اس لیے وہ سنسنہ مٹ جو پہلی بار میرے بدن میں ہوئی تھی، نہیں ہوئی۔ کوئی ہلکی سی تبدیلی نہ پا کر "ماتا جی" کے چہرے پر ایک رنگ آیا اور لہجہ میں گزر گیا۔ میں سسکا ہوا اور کہا۔

"اب نہیں ہوں؟"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو، بالک؟" ماتا جی نے اسی گونج دار لہجے میں کہا۔

"آئیں، ماتا جی اندر پدھاریں۔" آرتی فرش راہ ہوتی ہوئی بولی۔

کچھ دیر بعد سنگ روم میں ہم اطمینان سے بیٹھ چکے تھے۔ میرے سامنے والے صوفے پر "ماتا جی" اور اس کے ساتھ آئی ایک لڑکی تھی جو بالکل روایت کی طرح لگ رہی تھی، اس نے بھی ویسا ہی لباس پہن رکھا تھا۔ میرے دائیں طرف حیدر اور آرتی تھے۔

"یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ آپ یہاں تشریف لائی ہیں۔" حیدر نے نہایت ممنونیت سے کہا تو وہ دھیرے سے بولیں۔

"یہ بالک آیا تھا آشرم، بڑا مضطرب لگتا تھا۔ ہم نے اسے جب بھی کہا تھا کہ یہ آشرم شانتی دان کرتا ہے مگر ان کے لیے جو شانتی چاہیے ہیں۔ پھر آج ہی آرتی نے بتایا کہ یہ بالک بیمار ہے۔ ہمیں اسے دیکھنا تو تھا۔ تمہیں پتہ ہے کہ جو ہمارے پاس آجائے، ہم اسے بھولا نہیں کرتے۔" کہنے کو تو وہ کہہ گئیں کہ یہ وہاں ٹھیک نظر یہ لے کر نہیں گیا، اس لیے اس کی یہ حالت ہوئی ہے۔ میں ان کی تین الفاظ بات سمجھ گیا تھا لیکن خاموش رہا۔

"آپ دھن دان ہیں، ماتا جی! یہی آپ کا بڑا نعمت ہے۔" آرتی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"ڈاکٹر نے جو رپورٹ دی ہے، وہ ہم آرتی سے سن چکے۔ کیا تم اس پر یقین رکھتے ہو بالک؟" انہوں نے براہ راست میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں یقین نہ کرنے والی کون سی بات ہے۔ وہ بہت قابل ڈاکٹر ہیں۔ اب انہوں نے جو کہا ہے، وہ تو ماننا ہی پڑے گا۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

"مطلب تمہیں دوشواں ہے بھی اور نہیں بھی۔" انہوں نے فک کا بیج میرے ذہن میں ڈال دیا۔

"کہہ لیں آپ۔" میں نے مزید بحث سے بچنے اور فقط ان کی سننے کے لیے ہاں میں ہاں ملا دی۔

"اگر ہم کہیں کہ تمہارا علاج بغیر کسی دوا کے ہو جائے اور چند دنوں میں تمہارے سر کا یہ درد ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے تو اس پر تم کیا کہو گے؟"

”کیا ایسا ممکن ہے؟“ میں نے آرتی کی ٹیچ قمرانی کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہا جواب اثر انداز نہیں ہوتی تھی۔

”اس دنیا میں کیا ممکن نہیں ہے، ہاں! بس من سے رابطہ ہو تو لگا ہوں کے سامنے پڑے ہوئے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں۔ چند دنوں کی ریاضت ہے جو تمہیں آشرم کے پورا ماحول میں کرنا ہوگی۔“ انہوں نے کہا تو حیدر شیخ جلدی سے بول اٹھا۔

”اگر ایسا ممکن ہے تو میرے خیال سے آشرم میں چند دن گزار لینے میں کوئی قباحت نہیں۔“ اس کے یوں کہنے پر میں ذریعہ مسکرا دیا۔ ان لوگوں کی چند نہیں کیا نیت تھی لیکن آشرم میں جانے کا مطلب میرے نزدیک یہ تھا کہ مجھے وہاں اپنا آپ ان کے حوالے کرنا پڑے گا۔ وہ میرے بدن اور ذہن کی کیا حالت کرتے ہیں، اس سے قطع نظر پہلی بات جو کچھ میں آتی تھی، وہ یہی تھی کہ یہ لوگ مجھے اپنے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں یا پھر چاہتا چاہتے ہوں کہ میں ان کے لیے کارآمد ہوں بھی یا نہیں؟ یہی جمود میں بھی توڑنا چاہتا تھا۔ میں نے ابھی یہ سوچنا تھا کہ وہ کون سی راہ ہے جس پر چل کر میں ان کے لیے دیوار بن سکتا ہوں لیکن وہ راستہ خود چل کر میرے سامنے آ گیا تھا۔ قدرت کے اس عطیہ پر میرے اندر اعتماد بڑھ گیا۔

”کس سوچ میں پڑ گئے آپ؟“ آرتی نے پوچھا تو میں نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے ماتامی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”میں روحانیت کو مانتا ہوں اور مجھے یہ احساس بھی ہے کہ روحانیت کے ذریعے یا راہ سلوک میں انسان بہت اعلیٰ مدارج طے کر لیتا ہے مگر یہ بات آپ بھی مانتیں گے کہ بعض مسائل ایسے ہوتے ہیں جنہیں مادی ذرائع ہی سے حل کرنا ممکن ہوتا ہے۔ یہ حقیقت۔۔۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ بعض اوقات بات کچھ اور ہوتی ہے اور انسان اسے کچھ اور ہی خیال کرتا ہے۔ جو تم سمجھ رہے، ہاں! وہ نہیں ہے اور جو ہم سمجھ رہے ہیں، یہ وہی ہے۔ ڈاکٹر نے اپنے حساب سے اندازہ ہی لگایا ہے، ہم اسے اپنی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں تمہارا یہ انداز ہی بتا رہا ہے کہ جو ہم نے سوچا ہے، وہی ٹھیک ہے۔“ ماتامی نے بات ختم کی۔

”یار! تم نے علاج کر دانا ہے اور مجھے یقین ہے کہ جب ماتامی خود آ کر کہہ رہی ہیں تو تمہارا یہ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ چند دنوں کی تو بات ہے۔“ حیدر نے میری طرف دیکھ کر سنجیدگی سے کہا۔

”ڈائیر! میں انکار تو نہیں کر رہا، بس ایک ذرا تذبذب ہے کہ۔۔۔“

”کچھ نہیں ہوتا۔“ یہ کہہ کر اس نے ماتامی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ”یہ کب آجائے آشرم؟“

”چاہے تو ابھی چلے۔“ انہوں نے مسکراتی آنکھوں سے کہا۔

”میں ابھی کچھ دیر بعد آشرم آ جاتا ہوں۔“ میں جلدی سے بولا۔

”ٹھیک ہے، ہم تمہارا آشرم میں انتظار کریں گے۔“ انہوں نے شاہانہ انداز سے کہا اور اٹھ گئیں۔ ہم سب بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ اگلے چند لمحوں میں ان کی گاڑی گیٹ کر اس کے نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ مجھے پوری طرح احساس تھا کہ وہاں وہ سب کچھ ممکن ہو سکتا ہے، جس کی توقع کی جاسکتی تھی۔ اس کے پاس وہ تمام چکنڈے تھے جن سے کسی بھی شخص کی ذہنی کیفیات کو اپنی مرضی کے تابع کیا جاسکتا تھا۔ شکاری نے مجھے اپنے

جال میں پھانس لیا تھا یا میں رضا و رغبت سے اس جال میں خود بخود بچھنس گیا تھا۔ میں سٹنگ روم میں بیٹھنے کی بجائے اپنے کمرے میں آ گیا۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے اپنے سبیل فون پر ندیم سے رابطہ کیا اور اسے موجودہ صورت حال سے آگاہ کیا۔

”یہ چند دن کتنے ہو سکتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”پتہ نہیں، لیکن گمان یہی ہے کہ جب تک میں پوری طرح ان کے زیر اثر نہیں آ جاتا۔“

”تو مت جائے وہاں، بہانہ کر دوں گا بھی آپ ڈاکٹر کے زیر علاج ہیں۔ اگر کوئی افاقہ نہ ہو تو پھر دیکھیں گے۔“

”میں ایسا کہہ سکتا تھا لیکن میں خود چاہتا ہوں کہ ان کے نزدیک جاؤں۔ یہ ایک موقع ہے جو انہوں نے خود مجھے فراہم کیا ہے ورنہ پھر ہو

سکتا ہے کہ میں کوشش بھی کروں اور ان تک نہ پہنچ سکوں۔ برائی کا سرچشمہ ہیں پر ہے اور مجھے ان تک پہنچانا ہے۔“

”وہ کچھ ایسا نہ کر دیں کہ آپ کی ذہنی حالت۔۔۔“ ندیم کہتے کہتے رک گیا۔

”اللہ خیر کرے گا۔“ یہ کہہ کر میں نے تفصیل سے سمجھایا کہ کیا کرنا ہے، مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے ایک بیگ میں چند جوتے

پکڑے اور دیگر ضرورت کا سامان رکھا۔ ایسے ہی تیاری کرتے ہوئے سورج غروب ہو گیا۔ میں نے وضو کیا اور جائے نماز چھجا کر اپنے رُپ کے حضور

کھڑا ہو گیا جو خالق کائنات ہے اور تمام قوتوں کا منبع ہے۔ میں نے پوری عاجزی سے اس کے حضور اپنا آپ پیش کر دیں پورے جذب سے دعا مانگی۔

”اے میرے مالک! تو نیتوں کے مجدد جانتا ہے، تیرے سامنے وہ خیال بھی عیاں ہوتے ہیں، جنہیں ہم خود سے بھی چھپالینا چاہتے ہیں

۔ اے اللہ! میری رہنمائی فرما۔ میں اگر اپنی نیت میں سچا ہوں اور جو کام میں کرنے جا رہا ہوں، انسانیت کے لیے فلاح رکھتا ہے تو مجھے قوت عطا فرما۔

مجھے وہ اعتماد بخش دے جس کے ثلے ہوتے پر میں شیطانیت پر غلبہ پا لوں۔ اے میرے اللہ! مجھے فتح و نصرت سے ہمکنار کر کہیں تک میں تیری مدد کے بغیر

کچھ نہیں کر سکتا۔“ میں نے اپنے رُپ کے حضور دل سے دعا کی، پھر جائے نماز لپیٹ کر ایک طرف رکھی اور بیگ اٹھا کر نیچے آ گیا۔ حیدر اور آرتی

میرے انتظار میں تھے، آرتی نے بڑھ کر بیگ میرے ہاتھوں سے لے لیا۔ ہم خاموشی سے چلتے ہوئے گاڑی تک آئے۔ حیدر ڈرائیونگ پر بیٹھ گیا،

گاڑی گیٹ سے نکلی تو حیدر نے خوشگوار انداز میں کہا۔

”آرتی! یہ تمہارے چہرے پر اتنا دکھ کیوں پھیلا ہوا ہے؟“

”نہیں تو۔۔۔“ وہ دھیرے سے بولی۔

”تمہیں کیا خبر ہوگی، دیکھ تو ہم رہے ہیں۔“ اس نے ہاتھ صحت کرنے والے انداز میں کہا۔

”چلیں، ہوگا۔“ اس نے گویا تھمیا روال دیئے۔

”یہی تو پوچھ رہا ہوں کہ ایسا کیوں ہے؟“ حیدر نے پوچھا تو وہ خاموش رہی۔ جب اس نے چند لمبے جواب نہ دیا تو حیدر نے بات آگے

بڑھائی۔ ”مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ تم شہار سے اس قدر دل لگا بیٹھو گی۔ سوئی ایہ محض چند دنوں کے لیے جا رہا ہے، واپس آ جائے گا۔ یہ تو جیسے تیسے

گزر جائیں گے لیکن جب تم بھارت چلی جاؤ گی تب کیا ہوگا؟“ حیدر نے اسے احساس دلایا۔

”تب کی بات جب ہوگی۔“ اس نے کہا اور میرے ساتھ جڑ کر بیٹھ گئی۔ بلاشبہ آرتی ایک اچھی اداکارہ تھی۔ وہ تو ہالی وڈ میں اسے کسی نے پوچھا نہیں اور انڈیا اور لنڈن مافیا کے ہتھے چڑھ جانے کے باعث سلور سکرین تک نہ پہنچی سکی۔ اگر اسے کسی ظلم میں کامل جاتا تو یقیناً وہ اچھی اداکارہ ثابت ہوتی۔ میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہا۔

”آرتی اتم اپنے بھگوان سے پراختنا کرنا۔ میں صحت یاب ہو کر واپس آ جاؤں تو کچھ ایسا کریں گے کہ تم ادھر ہمارے پاس ہی رہو۔“

”لیکن اس کے لیے اسے ایک بار تو ہمارت واپس جانا پڑے گا۔۔۔۔“

حیدر نے کہا اور امیگریشن کے قانونی تقاضوں کی تفصیل بتانے لگا اسی ہی باتوں میں سفر کتنا چلا گیا اور ہم اس عالی شان پینٹلے کے سامنے جا پہنچے۔ وہاں پارکنگ میں خاصی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہی وقت سوامی ہری داس کے بھاشن دینے کا ہوتا ہے۔ سیکورٹی وغیرہ کے مراحل سے گزر جانے کے بعد ہمیں اسی کمرے میں بٹھایا گیا، جہاں ہم پچھلی بار بیٹھے تھے۔ کچھ وقت گزرنے کے بعد چند خادماؤں کے جلو میں ”ماتاجی“ وہی سفید رنگ ساڑھی، ہاتھ میں کالے موتیوں کی مالا لیے نمودار ہوئیں۔

”مجھے پوری امید تھی کہ تم آ جاؤ گے، بالک اب کسی چٹا کی ضرورت نہیں۔“ انہوں نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا اور سامنے صوفے پر بیٹھ گئیں، ابھی آرتی نے انتہائی ادب سے پوچھا۔

”ماتاجی! یہ مجھے پوچھنا تو نہیں چاہئے لیکن پھر بھی شجاعی کے صحت مند ہونے میں کتنے دن لگیں گے؟“

”بہت جلد۔۔۔“ ماتاجی نے بڑے تمہییر لہجے میں کہا اور پھر حیدر سے باتیں کرنے لگیں۔ یہ باتیں نہایت مختصر تھیں۔ سوامی ہری داس کا بھاشن سننے کے لیے لوگ آئے ہوئے تھے۔ سو مصروفیت کے باعث وہ زیادہ وقت نہیں دے پائیں۔ کچھ دیر بعد حیدر اور آرتی چلے گئے اور میں وہیں اس کمرے میں بیٹھا رہا۔ پھر چند خادماؤں نے وہاں آگئیں، ان میں سے ایک نے کہا۔

”آئیے۔۔۔“ میں اٹھ کر ان کے ساتھ چلنے لگا۔ میرا ایک ایک اور لڑکی نے اٹھا لیا اور باقی لڑکیاں ہمارے پیچھے چلنے لگیں۔ میں ان کے جلو میں مختلف راہداریوں میں چلا گیا۔ وہ لڑکی ایک کمرے کے سامنے رک گئی اور دروازہ کھول کر اندر چلی گئی۔ کافی کشادہ اور جدید ترین انداز میں سما ہوا بیڈروم تھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا، میں ارد گرد دیکھی رہا تھا کہ اس ایک لڑکی کے سوا باقی سب چلی گئیں جس کے ساتھ چلا ہوا میں یہاں تک آیا تھا۔

”آئیے، پدھاریں۔“ اس لڑکی نے کہا تو میں ایک طرف پڑے صوفے پر بیٹھ گیا اور وہ میرے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ ”مجھے رکنی کہتے ہیں، ماتاجی نے آپ کی دیکھ بھال کرنے کی ذمہ داری مجھے دی ہے۔ یہ کمرہ آپ کا ہے اور آپ یہیں رہیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ مجھے وہاں کے ماحول کے بارے میں معلومات دینے لگی۔ اس دوران میں نے اسے غور سے دیکھا، خاصی جاندار لڑکی تھی۔ خوشگوار چہرہ، پرکشش جسم اور باتیں کرنے کا دلکش انداز۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا، وہاں بہت زیادہ سکون تھا۔ اتنا گہرا سکون جیسے کسی برقیلی علاقے میں جھے ہوئے پانی کی جھیل ہو۔ اس نے محسوس کیا کہ میں اسے گہری نگاہوں سے دیکھ رہا ہوں، اس نے بھی میرا جائزہ لیا اور چلی گئی۔ میں بیڈ پر پھیل گیا۔ کچھ وقت گزرا ہوگا کہ رکنی آ گئی۔ اس بار اس کا لباس قدرے مختصر تھا۔ جیسے لباس کے نام پر چند جھیاں جسم پر لپیٹ لی گئی ہوں۔ اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی جس میں ایک گلاس

دھرا ہوا تھا، اس نے وہ رے سائیز ٹیبل پر دکھی اور بڑے درسان سے بولی۔

”اسے پی جائیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا، بھراٹھ کر اس گلاس گولوں سے لگا لیا۔ بہت ہی خوش ذائقہ مشروب تھا۔ میں نے خالی گلاس واپس رکھا تو اس نے انتہائی ہمارا لود لہجے میں کہا۔

”آئیں، چلیں۔“

میرے جی میں آئی کہ اس سے پوچھوں، کہاں جانا ہے لیکن میں خاموش رہا اور چپ چاپ اس کے ساتھ چل دیا۔ بھرکئی راہداریاں پار کرنے کے بعد وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جو نیم تاریک سا تھا اور اس کے سین درمیان میں ایک چھوٹا سا حوض پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں موج و پانی کا رنگ گدا تھا اور اس کی سطح پر پھول تیر رہے تھے۔ کمرے کے نیم تاریک ماحول میں ایک ایسی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جس نے میرے دماغ میں تازگی بھروی تھی۔ رکنی سرد و ہی میری قمیص کے بٹن کھولنے لگی۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا جو کسی بھی قسم کے جذبات سے عاری تھا۔ دھیرے دھیرے اس نے مجھے لباس کی قید سے آزاد کر دیا، یہاں تک کہ ستر پوشی کے لیے ایک انڈر ویئر میرے جسم پر وہ گیا۔ ایک خوبصورت اور گدا زبان لڑکی میرے سامنے تھی جس کے جسم پر انتہائی مختصر لباس تھا۔ نیم تاریک ماحول اور سکون تھا۔ اچانک ہی پر سکون ماحول میں ہلچل ہوئی، میری سانسیں تیز ہوئیں تو میں نے رکنی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میرے ہاتھ رکھتے ہی اس نے آنکھیں بند کر کے ایک سکاری لی، کندھے پر رکھے ہوئے ہاتھ سے چکنی جلد کا احساس ہوا جس سے آرتی کا بدن میرے شعور میں در آیا۔ اس کے ساتھ ہی سانپ کی پستک میرے ذہن میں گونج کر رہ گئی۔ اس کی بازگشت اس قدر تیز تھی کہ میں پورے وجود سے مل گیا۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں اور میرا دھیان ان باتوں کی طرف چلا گیا جو کبھی مجھے جینن اختر نے سکھائی تھیں۔

”جذبات انسان کے اپنے کنٹرول میں ہوتے ہیں، شجاع! ایسا اس لیے ہے کہ ہم ان کے، الگ ہیں، یہ ہمارے جسم میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ ہماری اجازت ہی سے ہلکتے ہیں اور ہم ہی انہیں سرور کر سکتے ہیں، بس ذرا سی توجہ چاہئے۔ یہ جذبات بالکل اس سدھائے ہوئے کتے کی مانند ہیں جنہیں ہم چاہیں تو اپنی رکھائی کے لیے رکھیں یا پھر شکار کرنے کے لیے یا پھر چر پھاڑ کرنے کے لیے اور میرے بھائی! جان لو کہ رکھائی بھی اپنی ہوتی ہے، شکار خود ہونا ہوتا ہے اور چر پھاڑ بھی اپنی ہی ہوتی ہے۔“

مجھے یوں لگا جیسے جینن اختر میرے قریب بول رہے ہوں، ایسے جیسے وہ میرے من کے اندر موجود ہوں۔ اگلے ہی لمحے حیرت انگیز طور میں اپنے جذبات پر قابو پا گیا، یوں جیسے تاریک کمرے میں بٹن آن کرنے کی ہلکی سی ٹک سے ہر طرف روشنی پھیل جائے۔ میں نے دھیرے سے اپنا ہاتھ اس کے کندھے سے ہٹا لیا۔ تو وہ مجھے حیرت سے دیکھنے لگی۔ چند لمحے یوں ہی گزر گئے تو وہ حواسوں میں آ گئی۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور حوض کنارے پڑی ہوئی دری پر لٹا دیا، میں لیٹ چکا تو وہ اٹھ کر دیوار میں بیٹھ گئی، وہاں سے اس نے کانچ کی بوتل اٹھائی اور میرے نزدیک آ گئی۔ اس میں خوشبو دار تیل تھا، نجانے کیسی مہک تھی جسے میں نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ کسی باہر مشاطہ کی طرح مساج کرنے لگی۔ جس سے پہلے تو میرے بدن پر ہلکی ہلکی جلن ہوئی اور پھر ڈھیروں پسینا جانے سے دھیرے دھیرے سکون ہوتا چلا گیا۔ وہ کافی دیر تک

ساج کرتی رہی اور پھر اس نے مجھے اٹھا کر اس خوشی میں اتار دیا۔ وہ پانی بھی نہایت خوشبودار تھا۔ میں گرون تک ڈوب گیا۔ وہ خوشی کے کنارے یوں بیٹھ گئی کہ اس کی پنڈلیاں پانی میں ڈوب گئیں۔ پھر وہ برتن بھر بھر کے میرے سر پر اڑھنے لگی۔ پینے نہیں، کتنا وقت یونہی بیت گیا۔ میں سب کچھ دیکھ اور سن رہا تھا لیکن میرا دماغ من ہوتا چلا گیا۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر خوشی سے باہر نکالا اور ساتھ ہی بنے ہوئے ایک بڑے سے حمام میں لے گئی۔

”آپ خوب اچھی طرح نہالیں۔“ میں شفاف پانی سے نہانے کے بعد باہر نکلا تو اس نے مجھے سفید رنگ کی دو چادریں دیں، ایک میں نے دھوئی کی طرز پر باندھ لی اور دوسری کاغذوں پر پھیلا لی۔ پھر وہ مجھے انہی راہداریوں سے لیتی ہوئی واپس بیڈروم میں لے آئی۔ میں نے جب تک بال نہائے اور ہاتھ دھو کر صوفے پر بیٹھا تب تک دوسری خادیاں کھانا لگا چکی تھیں۔ کھانا نہایت لذیذ تھا، میں نے ذائقہ کھا پایا۔ وہ برتن اٹھا چکیں تو پھر سے مجھے مشروب پلایا گیا جس سے ایک خوشگوار تاثیر میرے بدن میں اتر گیا اور حیرت انگیز طور پر مجھے سگریٹ کی طلب نہیں ہوئی۔ میں کمرے میں چھا تھا اس لیے میں بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس وقت مستی اور سرور مجھ پر چھا چکا تھا۔ پھر چند نہیں کتنا وقت گزرا ہو گا کہ کئی کمرے میں آئی۔ اس نے بڑے، سٹائل سے مجھے اٹھایا اور پھر اپنے ساتھ چلنے کو کہا، وہی راہداریاں گھومتے گھومتے نکلتے نکلتے کھڑے ہوئے۔ اچانک ایک کمرے میں داخل ہو کر وہ تہہ خانے میں اترنے لگی۔ کافی ساری سیڑھیاں اترنے کے بعد وہ مجھے ایک کمرے میں چھوڑ کر واپس پلٹ گئی، تجھی روشنی ہو گئی اور میرے سامنے ”ماتاجی“ آلتی پالتی مارے ایک چوکی نما جگہ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے اپنے سارے سفید بال اوپر کی طرف جوڑے کی صورت میں باندھے ہوئے تھے، بدن پر پیلے رنگ کی دو چادریں تھیں جس پر ہندی زبان میں جا بجا کچھ ایسا لکھا ہوا تھا جیسے ڈیزائن بنا ہوا ہو اور سامنے ایک برتن میں نوبان سلگ رہا تھا، جس کی خوشبو نے پورے کمرے کو مضر رکھا تھا۔ ان کے ایک ہاتھ میں وہی کالے موتیوں والی مالا تھی، وہی ہاتھ بلند کر کے انہوں نے مجھے اپنے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے انگریزی میں کہا۔

”آؤ بیٹھو۔“ ان کی گونج دار آواز کمرے میں پھیل گئی، ان کے سامنے بیٹھ گیا تو وہ بولیں۔ ”میرا نام شیو تیا ہے، میں لوگوں کے لیے ماتاجی ہوں لیکن تمہارے لیے صرف شیو تیا۔“

”کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ مجھ پر یہ مہربانی کیوں؟“ میں نے براہ راست ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”اس لیے کہ تم مجھے پسند آ گئے ہو اور مجھے میں پسند کر لیتی ہوں، اس کی ہر خواہش پوری کرنے کی کوشش ضرور کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔

”مجھ میں ایسی کون سی خوبی ہے جو تمہیں پسند آ گئی؟“ میں نے بھی اس کی سطح پر بات کی۔

”ایک نہیں، کئی ساری خوبیاں ہیں تم میں جو وقت آنے پر میں تمہیں بتاتی چلی جاؤں گی۔“

”پھر بھی، میں ایک آدھ تو جانا چاہوں گا تا کہ مجھے اندازہ ہو جائے کہ تم کس کس نچ پر سوچ رہی ہو؟“

”ہاں، یہ بات تو ہے۔“ پھر چند لمبے خاموش رہ کر بولی۔ ”انسان جذبات میں گنہگار ہوا ہے۔ انسانی سرشت سے جذبات الگ کر دیئے

جائیں تو پھر باقی کچھ بھی نہیں بچتا۔ بہت کم لوگوں میں یہ قوت ہوتی ہے کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ ایسے لوگ دنیا میں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ دولت، طاقت اور عظمت ان کی لوطی بن جاتی ہے ورنہ جو لوگ جذبات کے مستزور طوفان میں بہہ جاتے ہیں وہ حالات کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ رکنی نے مجھے تمہارے متعلق بتایا ہے اور میں سمجھ گیا مگر تم واقعی نابالغ ہیرو ہو لیکن اس کی قدر و قیمت کا تمہیں احساس نہیں۔

”میں خود میں ایسی کوئی خوبی نہیں پاتا۔“

”ایسا اس لیے ہے کہ تمہیں اپنے بارے میں پتہ نہیں۔ ہیرے کو اپنی قدر و قیمت کا احساس کہاں ہوتا ہے اُسے تو جہاں رکھ دیا جائے پڑا رہتا ہے۔ اتنی گہری نظر والا کوئی شخص تمہیں نہیں ملا ہوگا جو احساس دلا سکے کہ تم کیا ہو کیونکہ تمہارا احساس دلانے والے کو بھی صاحب نظر ہونا چاہیے۔“

”کیا میں اسے اپنے علاج کا ایک حصہ تصور کروں؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے علاج کی شروعات ہو چکی ہیں۔ اس کا اختتام کہاں ہوگا، یہ محض چند دن کی بات ہے۔ میں جو کچھ تمہارے حسیں کا کہہ رہی ہوں، یہ وہ سچ ہے جو تمہاری ذات کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔“

”کیا مجھے میرے علاج کے دوران آشرم سے جانے کی اجازت ہوگی؟“

”نہیں، تم سینکڑوں دنوں کے درمیان علاج کا تسلسل ختم ہو کر رہ جائے گا، مگر تمہارا جگہ کا ہی حکم ہے۔“

”کیا میں سوامی جی کے زیر علاج ہوں؟“

”اس میں کوئی شک نہیں، وہی تمہارا علاج کر رہے ہیں۔“

”میری ایک درخواست ہے۔۔۔“

”وہ کیا؟“

”میرے لیے اگر کوئی خدمت گار مقرر کرنا ہی ہے تو کسی مرد کو کیجئے۔“

”تمہاری خواہش کا احترام کیا جاتا لیکن اس آشرم کے اندر مرد و مہاراج کے علاوہ مرد نہیں ہوتے، سبھی لڑکیاں ہیں۔ مرد خدمت گار آشرم سے باہر موجود ہیں جنہیں امداد نے کی اجازت نہیں۔ اگر تم رکنی کو پسند نہیں کرتے تو اور بات ہے، اس کے علاوہ تم کسی بھی خادمہ کو جنم سکتے ہو۔“

”ابھی تم نے کہا تھا کہ میری ہر خواہش پوری کر دی؟“

”مگر تمہاری یہ خواہش آشرم کے اصول کے خلاف ہے اور شجاع! تمہیں اس سے کیا کہ خدمت گار کوئی مرد ہو یا عورت؟“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا تو وہ کچھ دیر تک ”انسانی من“ کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ میں خاموشی سے منتظر رہا، یہاں تک کہ مجھے زبردست نیند آنے لگی۔ تب بھر شیوہ تیانے مجھے وہاں سے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس کمرے سے باہر آیا تو رکنی باہر مستعد کھڑی تھی، وہ مجھے لے کر میرے کمرے میں آگئی۔ میں جو بیڈ پر پھیلا تو میری آنکھ اٹکے دن کھلی۔ کمرے میں نیم تار کئی تھی۔ میں کتنی ہی دیر تک خانی اللذہن بیڈ پر پڑا رہا، پھر اٹھ کر واش روم چلا گیا۔ میں وہاں آیا تو رکنی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھتے ہی میرے ذہن میں سوال اٹھا کہ کیا وہ مجھے کھس سے

دیکھ رہی تھی کہ میں کب بیدار ہوتا ہوں، کیا وہ کسی خفیہ کمرے سے میرے ایک ایک ہل پر نگاہ رکھے ہوئے ہیں؟ اس سوچ کے آتے ہی میں قدرے پریشان ہو گیا لیکن اس کا اظہار اپنے چہرے پر نہیں اٹھانے دیا۔

”آئیں، چائے پی لیں۔“ رکنی نے کہا تو میری نگاہ میز پر دھری ہوئی ٹرے پر پڑی۔ میں اس کے سامنے جا بیٹھا۔ وہ چائے بنا تے ہوئے بولی۔

”نیند کیسی آئی؟“

”بہت اچھی۔“ میں نے مختصراً کہا اور اس کے ہاتھ سے کپ لے لیا۔ جب تک میں چائے پیتا رہا وہ خاموشی سے بیٹھی رہی۔ میں نے خالی کپ ٹرے میں رکھا تو وہ بولی۔

”آپ تیار ہو جائیں، کچھ دیر بعد کرومہارا ج آپ سے ملاقات چاہیں گے۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ گئی۔ میں اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس لمحے رکنی کے گداز بدن نے مجھے ذرا سا بھی متاثر نہیں کیا۔ میرا ذہن الجھ گیا کہ سوامی ہری داس سے کیا باتیں ہوں گی؟ چند لمحے یونہی بیٹھے رہنے کے بعد میں نے بے وقت کی سوچ کو ذہن سے ہٹا دیا اور اٹھ کر اپنے بیک کی طرف بڑھا۔ اس وقت مجھے سگریٹ کی شدید خواہش ہو رہی تھی۔ میں نے پورا بیک دیکھا لیکن سگریٹ کہیں نہیں تھے۔ تجھی میں نے سوچا کہ میرا سیل فون بھی بیک میں تھا وہ بھی غائب تھا میں نے ایک بار پھر سے پورا بیک چھان مارا مگر وہ دونوں چیزیں غائب تھیں۔

”کیا میں قید کر لیا گیا ہوں؟“ اس وقت میرے ذہن میں یہی سوال گونج رہا تھا۔ سگریٹ کے بارے میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ میرے علاج کے دوران نقصان دہ ہو سکتی ہے لیکن سیل فون کا نہ ہونا اس امر کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ یہ پتہ نہیں کرتے کہ میں فون کے ذریعے باہر کی دنیا سے رابطہ رکھوں۔ اگرچہ یہ ایک منفی سوچ تھی لیکن اس کا پیدا ہونا بعد از قیاس اس لیے نہیں تھا کہ وہ میری اجازت کے بغیر میرے بیک سے لیا گیا تھا۔ ظاہر ہے، انہوں نے میرے بیک کی تلاشی لی تھی اور انہیں میرے بیک سے یہی قابل اعتراض اشیاء ملیں جو انہوں نے میرے پاس نہیں رہنے دیں۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ مجھے ہار کر اتنا چاہتے ہوں کہ میں یہاں ان کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی کئی خیال ایک کے بعد ایک آ کر گزرتے چلے گئے۔ میں نے بیک کی زپ بند کی اور وائٹل صوفے پر آن بیٹھا۔

من میں اٹھنے والی باتوں کا کوئی نہ کوئی رخ ضرور ہوتا ہے۔ یہ اگر مثبت راہ پر چل نکلیں تو ذہن پر سکون ہوتا چلا جاتا ہے لیکن اگر یہی منفی سمت اختیار کر لیں تو پھر الجھاوے ہی الجھاوے ہیں جن میں انسان پھنس کر رہ جاتا ہے۔ میں اس وقت ایسے ہی الجھے ہوئے دائروں میں محو رہا تھا۔ پھر چونک اس خیال کے ساتھ پر سکون ہوتا چلا گیا کہ میں یہاں کس مقصد کے لیے آیا ہوں۔ وہ اگر تھا تو یہ اپنائے ہوئے ہیں تو یہ ان کا حق ہے۔ مجھے اپنے کسی عمل سے انہیں یا احساس نہیں ہونے دینا چاہئے کہ میں علاج کے لیے نہیں کسی اور مقصد کے لیے یہاں موجود ہوں۔ یہی سوچ کر میرا تپتا ہوا داغ ٹھنڈا ہوتا چلا گیا اور پھر ذرا سا دیر میں پر سکون ہو گیا

رکنی مجھے کہہ گئی تھی کہ وہ تھوڑی دیر بعد مجھے ہری داس کے پاس لے جانے کے لیے آئے گی، وہ مجھ سے ملنا چاہتا تھا۔ میں اسی انتظار

میں بیٹھا ہا کہ وہ کب آتی ہے۔ میں اس وقت خالی الذہن ہو بیٹھا تھا کہ نبھانے کیوں مجھے ناکہ یاد آگئی۔ ان دنوں جب میں زخمی ہوا تھا، اس نے میری تنہا ردا رہی کچھ اٹنے جلوس سے کی تھی کہ میں اس کا احسان مند ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اب پاکستان میں تھائی، یقیناً زندگی کی راہ پر وہ خود کو اکیلا محسوس کرتی ہوگی۔ میں اگر پاکستان میں ہوتا تو ضرور اس کے لیے کچھ کرتا۔ مجھے یاد تھا کہ یہ تھائی کہیں اس کے من میں نہ اتر جائے۔

”تم اس کے لیے کیا کر سکتے ہو؟“ اچانک ہی میرے ذہن میں یہ خیال گونجا۔ یہ ایک سنجیدہ سوال بھی تھا جس نے مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا کہ میں اس کے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ کیا تم اسے اپنا سکتے ہو، اپنے جیون ساتھی کے طور پر قبول کر سکتے ہو؟ انہی سوالوں نے مجھے دورا ہے پر لاکھڑا کیا۔ میں ہاں اور ناں کی صلیب پر ٹک کر رہ گیا، میں ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ رکنی آن وارو ہوگی۔

”آئیں، شہناجی! گرو مہاراج آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ میں نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے سے زیادہ نکمری ہوئی تھی، اس کا لباس پہلے سے زیادہ مختصر ہو گیا تھا۔ اس وقت رکنی نے ہلکے کاسنی رنگ کا تنگ سا باؤ اور زور مٹی اسکرٹ قسم کی چوٹی پہن رکھی تھی، جیروں میں اسی رنگ کے ہلکے سلیم اور بالوں میں زور رنگ کے پھول سجائے ہوئے تھے۔ شاید وہ نہا کر آئی تھی کیونکہ اس کے بال کپلے تھے۔ رکنی نے گھسوں کیا کہ میں اسے گہری نظروں سے دیکھ رہا ہوں، وہ پوری آنکھوں سے مسکرا دی اور جی میں نے کہا۔

”رکنی! بیٹھو۔“ میرے کہنے پر وہ کسی روایت کی طرح بالکل میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی، بیٹھنے کا انداز آگ لگا دینے والا تھا مگر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ جہاں برف باری ہو رہی ہو، وہاں آگ کم ہی لگا کرتی ہے۔ ”میرے بیگ میں سگریٹ اور سیل فون نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو اس کا چہرہ یکدم بچھ گیا۔ پھر دھیرے سے بولی۔

”جی، ماتا جی نے کہا تھا کہ میں یہ دونوں چیزیں سنبھال کر رکھ لوں۔ جاتے سے یہ آپ کو لوٹا دی جائیں گی۔“

”لیکن مجھے اس وقت سگریٹ کی شدید طلب ہو رہی ہے اور میں بات بھی کرنا چاہتا ہوں۔ کیا میں یہاں رہتے ہوئے ان چیزوں کا استعمال نہیں کر سکتا؟“

”دیکھیں، مجھے جو حکم دیا گیا، میں نے اس پر عمل کیا۔ اب آپ کی یہ بات میں ماتا جی کو بتا دیتی ہوں مگر ابھی تو آپ گرو مہاراج جی کے پاس چلیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ گئی۔ میں نے مزید کوئی بات نہیں کی اور اس کے ساتھ چل دیا۔ اس بار جب میں کمرے سے باہر نکلا تو پورے حواسوں میں تھا۔ میں کمرے اور درہادریاں اور ان کی سمت ذہن میں رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ چلتا رہا تھوڑی دیر بعد وہ ایک کمرے کے سامنے آن رکی۔

”گرو مہاراج جی اسی کمرے میں ہیں، آپ جائیں۔“ یہ کہہ کر وہ چند قدم پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے دروازے پر ہلکی سی دستک دی اور اندر داخل ہو گیا۔ بڑے سے کمرے میں سوائے شویتا کے اور کوئی نہیں تھا۔ اس وقت وہ سفید چادروں کے لباس میں اور چمکتی ہوئی کالی مالا کے ساتھ تھی، مجھ سے دیکھتے ہی اٹھ گئی۔

”آئیے، شہناج جی! میں آپ کو گرو مہاراج سے ملواؤں۔“ اس نے دائیں طرف ایک دروازے کی سمت اشارہ کیا تو مجھے ان کی یہ پراسراریت عجیب سی لگی۔ بہر حال میں نے اس پر دماغ نہیں کھپایا اور اس دروازے کو کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ بری واں میرے سامنے موجود تھا اور

وہ میری ہی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی سرخ انگارہ آنکھیں مجھ پر جم کر رہ گئی تھیں۔

”آؤ شجاع! بیٹھو۔“ اس نے انگریزی میں کہا تو میں کچھ کہے بغیر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ کمرے کے ماحول نے مجھے بے چین کر کے رکھ دیا تھا۔ گہرے چنٹ کی گئی دیواروں پر کالے پردے تھے۔ جس سبب پر بری داس بیٹھا تھا، وہ بھی سیاہی اور جو دو چادریں اس نے بدن پر لپیٹ رکھی تھیں وہ بھی کالی تھیں۔ درہم روشنی میں یہ ماحول قدرے بھیا تک لگ رہا تھا۔ کمرے میں وہی ناموس کی مہک پھیل ہوئی تھی جس سے نشہ طاری ہوتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ میں اس کے سامنے بیٹھے گیا تو وہ بولا۔

”بالکل سکون سے بیٹھ جاؤ۔ سارے خیال، لگرا اور اندیشے ذہن سے نکال باہر کرو۔ ان میں سے کوئی شے بھی تمہارے ساتھ نہیں ہونی چاہئے۔ ایسا کہہ رہا ہوں کہ تم فقط مجھ پر اعتماد کرو۔ ایسا کر کے تم محسوس کرو گے کہ تم کتنے پرسکون ہو گئے ہو۔ تمہیں پتہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے؟“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کورکا اور سوالیہ انداز سے میری جانب دیکھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا۔ ”دنیا کی سب سے بڑی نعمت ہے پرسکون ذہن ہے، جو دنیا میں بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔“

”یہ تو ممکن نہیں، سوای جی، اگر انسان سوچے ہی نہ، جب وہ زندہ رہنے کے لیے دنیا کے معاملات سے شہر آزا ہوگا تو وہ پرسکون کہاں رہے گا؟“

”نیکی بات تو میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں۔ مسائل ہی کی وجہ سے پیدا ہونے والے پراگندہ خیال، ذہن کو بے سکون کر کے رکھ دیتے ہیں اور مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں جب وسائل دستیاب نہ ہوں۔ دنیا مادے سے تعلق رکھتی ہے اور مادیت ہمیشہ فنا کی سمت اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ ایسی صورت حال سے دو طرح سے بچنا چاہتا ہے یا تو وسائل کی تک و دو چھوڑ دی جائے جیسے لوگی، سنیاس لینے والے سیناسی یا جوگی مہاراج بن باس لینے ہیں۔ یہ ایک مثبت عمل ہے۔ وہ اپنے ذہن سے رابطہ کرتے ہیں اور صلاحیتوں سے مالا مال ہو جاتے ہیں جب وسائل پیدا کرنا ان کے لیے کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ خاموش ہوا اور پھر میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”ایک وہ ہوتے ہیں جو وسائل کی تک و دو میں لگ جاتے ہیں۔ جن کی ہانہوں میں قوت ہوتی ہے اور ان پر قسمت بھی مہربان ہوتی تو وسائل ان کے سامنے ڈھیر کی صورت میں آن موجود ہوتے ہیں۔ جب پھر ذہنی پراگندگی نہیں رہتی اور ذہن پرسکون ہو جاتا ہے۔ اصل میں درمیان والی جو کیفیت ہے، یہی بے سکون کر دیتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ انسان کو اعتنا پسند ہو کر سوچنا چاہئے کہ وہ باوقافی طاقت رکھتا ہو کہ ہاتھ بڑھائے اور وسائل کو اپنی دسترس میں کر لے یا پھر یکسر اس سے بے نیاز ہو جائے۔ یہی اعتنا پسندی اسے اوج کمال پر لے جاتی ہے۔“

”کیا یہاں اعتنا پسندی مزید مشکلات کا باعث نہیں بنتی؟“ میں نے پوچھا۔

”اس وقت، جب انسان کے پاس کسی طاقت کا سہارا نہیں ہوتا۔ جس قدر طاقت و سہارا ہوگا، اسی قدر مشکلات بھی کم ہوں گی اور میں بتاؤں کہ وہ طاقت ہے روحانیت پر یقین کامل، انسان کیوں نہیں سمجھتا کہ ہمارا جسم جو محض مادہ ہے، اس میں جان کہاں سے آتی ہے۔ رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے، کس قوت کے بل بوتے پر؟ وہ ہے روح۔ جب روح نہیں رہتی تو یہ مادہ ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر سوائے اسے جلانے کے اور کوئی

چارہ نہیں رہ جاتا مگر روح باقی رہتی ہے، وہ کسی اور روپ میں ظاہر ہو جاتی ہے۔“

”سوای جی ای تو آپ ایک مخصوص نظریہ کا پرچار کر رہے ہیں۔ دنیا میں زندگی اور اسے پیش آنے والے مسائل ایک طوس حقیقت ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ روح اور مادے کی یکجائی سے زندگی کی مموکی ہے لیکن سارے معاملات محض روحانیت پر انحصار نہیں کرتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ میں روحانیت کا قائل نہیں مگر میں مادے کی طوس حقیقت کو مانتا ہوں۔ بھوک ایک احساس کا نام ہے لیکن کب تک؟ آخر مادی شے سے اس احساس کو ختم کرنا ہی پڑتا ہے۔“

”بات وہیں آ جاتی ہے، بالکل اٹھل ایک مضمیر پر انحصار کر کے انسان مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ وسائل جب دستیاب ہوں تو پھر نہ صرف خود اس سے استفادہ کرے بلکہ اسے دوسروں کو بھی فائدہ پہنچائے۔ میں یہی بات تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں کہ میرے پاس تمہارے علاج کے لیے دونوں طرح کے وسائل ہیں، روحانی بھی اور مادی بھی، میں انہی سے تمہیں صحت مند کروں گا لیکن اس کے لیے تمہاری توجہ اور اعتماد ضروری ہے ورنہ میں جتنی بھی محنت کروں گا، وہ ضائع جائے گی۔“

”یہ آپ پر حاوی ہے سوای جی، کہ میں یہاں پر ہوں ورنہ میں یہاں کیوں آتا؟“

”مجھے اس کا احساس ہے اور میں جانتا ہوں کہ تمہیں میری باتیں یاد ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے میری طرف ہاتھ بڑھایا اور کہا۔ ”آؤ،

میرے قریب آؤ۔“

مجھے سچی قدرانی کا تجربہ ہو چکا تھا اور دوسری بار شویتا نے میری گردن پر اٹھلایا رکھی تھیں تو میرے اندر ہلچل ہوئی تھی۔ ایک لمحہ سے بھی کم وقت میں مجھے احساس ہو گیا کہ جبری داس بھی کوئی اس قسم کا ”پھنکار“ دکھائے گا۔ اگر ایسا ہے تو خطرے والی کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر وہ چنانچہ ناز و غرور کرنے کے چکر میں ہے تو قدرے مشکل ہو سکتی ہے۔ میں نے اپنے اندر کی تمام تر قوتوں کو جمع کیا اور بڑھ کر اس کی دسترس میں آ گیا۔ اس نے اپنا چہرہ اس قسم کا ہاتھ میرے ماتھے پر رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ میں اس کے چہرے کی جانب دیکھتا رہا جہاں کسی قسم کا کوئی جذبہ نہیں تھا، بالکل ساٹ جیسے کسی مردے کا چہرہ ہو۔ کتنے ہی لمحے یونہی بیت گئے۔ وہ میرے ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ پھر میرے ماتھے پر یوں اٹھلایا پھیرنے لگا جیسے ان دیکھے درد کو اپنی اٹھلیوں سے اٹھنا کر رہا ہو، یہاں تک کہ آخر میں اس نے یوں کیا کہ جیسے تمام جمع شدہ درد اس نے اٹھلیوں سے پکڑ لیا ہے اور ماتھے سے اٹھا کر پھینک دیا۔ تبھی اس نے آنکھیں کھول دیں اور مسکراتے ہوئے کہا۔

”تمہارا یہ درد کچھ بھی اہمیت نہیں رکھتا۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی سائنسی توجہات کیا ہیں اور طبی ماہرین اس کی وجہ کیا بیان کرتے ہیں۔“

میرا گیان کہتا ہے کہ یہ محض تمہاری اپنی سوچ کا نتیجہ ہے، اس کا علاج ہو جائے گا۔ پورے یقین سے کہتا ہوں کہ یہ درد پھر کبھی دوبارہ نہیں ہوگا۔“

”شکر یہ، سوای جی!“ میں نے آہستگی سے کہا اور قدرے قاصطے پر آرام دہ حالت میں بیٹھ گیا۔

”نہیں، تم میرے شکر گزار مت، بلکہ دوست ہو۔ دوستوں میں ایسی مصلحت خیزیاں نہیں ہوا کرتیں۔“ اس نے یہ کہا اور پھر دوستی سے بات

اٹھا کر بھاشن دینے لگا۔ اس کی بات کرنے کا انداز، مثالیں اور دلیلیں سب ہندی طرز فکر پر مبنی تھیں۔ میں اس سے بحث نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لیے

خاموشی سے سنتا رہا۔ اس کا لب لباب یہی تھا کہ انسان اس دنیا میں اپنی مرضی سے نہیں آیا اور اب جبکہ وہ یہاں آئی گیا ہے تو مجبور محض ہے۔ اسے یہاں زندہ رہنے کے لیے ایک قوت کی ضرورت ہے۔ یہ قوت کسی بھی قسم کی ہو۔ روحانی، مادی یا دونوں طرح کی۔ قوت حاصل کرنے کے بعد اس سے بھرپور استفادہ ہی دراصل زندگی ہے ورنہ انسان اور جانس کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔ تقریباً دو گھنٹے کی اس طویل ملاقات کے بعد اس نے مجھے جانے کی اجازت دے دی۔ میں اس کے پاس سے اٹھا اور باہر نکل آیا جہاں شویتا کی بجائے رکنی بیٹھی ہوئی تھی جو مجھے دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور چند قدم کے فاصلے پر دروازہ کھول کر کھڑی ہو گئی۔ میں باہر آ گیا تو وہ میرے ساتھ چلنے لگی۔ میں نے رکنی سے کوئی بات نہیں کی بلکہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گیا اور صوفے پر یوں گرا جیسے بہت تھک گیا ہوں۔ وہ میرے دائیں طرف کھڑی رہی۔ جب کتنے ہی لمبے گز دگئے تو میں نے پوچھا۔

”رکنی! کھڑی کیوں ہو؟“

”آپ نے بیٹھنے کے لیے نہیں کہا اور نہ ہی جانے کے لیے، آپ کے کسی حکم۔۔۔“ اس نے کہنا چاہا مگر میں نے بات کاٹ کر کہا

”میں نے تمہیں یہاں آنے کے لیے بھی نہیں کہا، اس صورت میں تم کیا کہو گی، یہ پوزختم کرو۔“

”میں یقیناً پوز نہیں کر رہی۔ آشرم کا حکم ہی یہی ہے میں آپ کی خدمت کروں، جیسی بھی خدمت آپ چاہیں، وہ حکم تو میں نے ماننا ہی ہے

مگر میرا دل کرتا ہے کہ میں آپ کی خدمت کروں۔“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا تو میں چونک گیا۔ شاید یہ ہری واس یا شویتا کا اپنا ”انداز حکم“ ہو۔ جب میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔

”ایسا کیوں ہے، رکنی؟“

”کوئی تو شخص ہے اس دنیا میں جس نے میرے جسم کو نظر انداز کیا اور ایسا شخص جس میں عورت کو جیت لینے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہو، یہی بات متاثر کرنے والی ہے ورنہ جس کے پاس یہ صلاحیت ہی نہیں ہوتی وہ اگر ایسا پوز کریں تو بیان کی بھجودی ہوگی۔“

اس نے کہا تو مجھے لاہور ہی میں موجود ایک بوڑھے کی باتیں یاد آ گئیں جو مجھے اکثر سٹوڈیو میں ملا کر کرتا تھا۔ اسی نے مجھے بتایا تھا کہ یہ فلمی لوگوں کی دنیا اندھیر گھری ہے، یہاں ہر طرف اندھیرا ہے۔ یہ فلم اندھیرے میں بنتی ہے اور اندھیرا کر کے دیکھی جاتی ہے، بالکل اسی طرح جیسے ان کے مقدر میں اندھیرا لکھا ہوا ہوتا ہے۔ اسی بوڑھے شخص نے مجھے ایک بات سمجھائی تھی کہ بیٹا! مجھے تمہارے اطوار اور رویے سے معلوم ہوتا ہے کہ تم اعلیٰ نسب ہو مگر یہ مت بھولنا کہ یہاں قدم قدم پر گڑھے ہیں۔ اگر ان میں گرے تو ساری اعلیٰ نسی گڑھوں میں موجود کچھڑ میں پڑی رہ جائے گی۔ ایک طوائف، کال گرل یا اس قبیل کی دوسری عورتوں کے پاس سرمایہ کیا ہوتا ہے، فقط ایک جسم، اسی سے وہ بھاتی، دلچھاتی اور اپنے دام کھڑے کرتی ہے۔ اس کا جسم ہی اس کا جال ہے جس سے وہ دوسروں کو پھانسی ہے۔ تم جب اس کے جسم ہی کو نظر انداز کرو گے تو اس کے پاس بچے گا کیا سوائے حیرت کے؟ ایسا کرنا جگر والوں کا کام ہوا کرتا ہے۔ اس بوڑھے شخص کے کہے ہوئے لفظوں کی تاثیر میں کئی بار محسوس کر چکا تھا اور ہر بار ایک ایسی لذت سے آشنا ہوا تھا جو بالکل منفرد اور انہونی تھی۔ شاید میں کسی کا جسم حاصل کر کے ایسی لذت نہ پاسکتا۔ رکنی نے کوئی نئی بات نہیں کہی تھی، اس کا حیرت زدہ ہو جانا عین ممکن تھا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا اور اشارے سے صوفے پر بیٹھنے کے لیے کہا۔

”رکنی اچھے پرکشش جسم اور خوشگوار چہرے اچھے لگتے ہیں۔ اب یہی دیکھو تم مختصر لباس میں رہتی ہو جو مجھے اچھا نہیں لگتا مگر میں تمہیں کہتا اس لیے نہیں ہوں کہ مجھے روک ٹوک کا کوئی حق نہیں اور۔۔۔ چھوڑ دو، مجھے تمہیں سمجھانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“ میں نے ایک بڑا سوالیہ نشان چھوڑ کر اسے مزید اپنے ہارے میں سوچنے پر مجبور کر دیا۔ میں کیا کہنا چاہتا تھی، یہی تجسس کافی تھا جو امر تیل کی طرح اس سے لپٹ جاتا۔ وہ میری طرف دیکھتی رہی اور میں خاموشی سے اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا رہا جہاں التجائیں ہلکودے لے رہی تھیں۔ کتنے ہی لمبے یونی گزر گئے۔ تب اس نے اپنی اسکرٹ میں ہاتھ ڈالا اور میرا تیل فون میرے سامنے کر دیا۔

”آپ چاہیں تو بات کر لیں مگر ماتاجی کو مظلوم نہ ہو۔“

”نہیں، رکنی! ایسے نہیں۔ تمہارا شکریہ کہ تم نے میرا احساس کیا مگر میں ایسے لاچار دیوالیوں سے قائلہ نہیں اٹھایا کرتا۔ اسے لے جاؤ اور مجھے تمہارا چھوڑ دو۔“

”کیا میری باتیں بھی آپ کو اچھی نہیں لگتی ہیں؟“ اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔

”تم کیا بات کر رہی، تمہاری باتوں سے تو شویتا کے احکام ادا ہوتے ہیں، تم جاؤ۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ میں صوفے سے اٹھ کر بیڈ پر چلا گیا، لیٹے ہی نیند نے مجھے اپنے حصار میں لے لیا۔ میری نیند اچانک ہی ٹوٹ گئی اور پھر میں جیسے ہی حواس میں آیا تو مجھے نیند ٹوٹ جانے کی وجہ سمجھا آئی۔ میرے بیڈ پر پاؤں جانب رکنی مٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ وہ میری طرف مسلسل دیکھ رہی تھی، تب اچانک ہی غصہ میرے دماغ میں سما گیا اور میرا دل چاہا کہ نیچے بیٹھ دوں مگر اگلے ہی لمحے خیال آیا کہ یہ تو بے چاری ملازمہ ہے، یہ تو وہی کرے گی جو اسے کہا جا رہا ہے۔ اسے احکامات کون دے رہا تھا، شویتا یا ہری داس؟ میں اس بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور پوچھا۔

”غصہ، تم یوں کیسے بیٹھی ہو؟“

”ماتاجی نے کہا ہے کہ کھانا کھا لیں، دوپہر ڈھل رہی ہے، اس نے بے چارگی سے کہا۔“

”انہیں کوہو کہ مجھے بھوک نہیں ہے اور میں سونا چاہتا ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے میں دوبارہ لیٹ گیا۔

”ٹھیک ہے، آپ آرام کریں۔“ یہ کہہ کر وہ بیڈ سے اترتی اور وائس چلی گئی۔ وہ کمرے سے نکلی تو یونی اوٹ پناٹنگ سوئچس ڈھن میں آنا شروع ہو گئیں۔ پھر نیند تو نہ آئی لیکن یونی سوتے جاتے خاصا وقت بیت گیا۔ دوپہرے ڈھلے رکنی پھر آئی۔ اس نے پلیٹ میں ایک گلاس رکھا ہوا تھا، مجھے جاگتا ہوا پا کر بولی۔

”یہ پی لیں تو پھر چلیں۔“

”اب کہاں جانا ہے؟“ میں نے گلاس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میرے لہجے میں حد درجہ نرمی تھی۔

”اشنان کے لیے۔“ اس نے کسی تاثر کے بنا سپاٹ لہجے میں کہا۔ میں نے مشروب کو سونگھا، بڑی خوشگوار جبک تھی۔ ایسا مشروب وہ مجھے پہلے ہی پلا چکی تھی۔ میں نے گلاس خالی کیا اور اٹھ کے اس کے ساتھ چل دیا۔ میں نے راستے میں محسوس کیا کہ اس مشروب کے پی لینے کے باعث

میرا داغ نشے کی کیفیت میں آ گیا ہے۔ وہ مجھے اس کمرے میں لے گئی جہاں چھوٹا سا تالاب تھا اور جس میں گدلا کر خوشبو دار پانی تھا۔ اس کی سطح پر تازہ پھول تیر رہے تھے۔ کمرے میں گلگجاندھیرا تھا، جیسی مجھے وہاں دو اور لڑکیاں نظر آئیں۔ وہ بھی رکنی جیسا مختصر لباس پہنے ہوئے تھیں اور ان کی مسکراہٹ بے تکلف ہو جانے کا عندیہ دے رہی تھی۔ میرے بدن میں سرسراہٹ ہونے لگی۔ صنف مخالف کے لیے کشش اپنا آپ منوانے کے درپے ہو گئی تو مجھے خود پر قابو پانا مشکل ہو گیا۔ میں اس کیفیت سے ابھی سنبھلا بھی نہیں تھا کہ ان میں سے ایک نے میرا ہاتھ تھاما اور بڑی نازکی سے فرش پر چھٹی دوی تک لے آئی۔ اچھے میں رکنی خوشبو دار تیل لے آئی، وہ تینوں میرے بدن پر مساج کرنے لگیں اور میں اپنی اسی کیفیت میں ڈانواں ڈول ہونے لگا۔ میں بہک جانے کی حد کے قریب تھا کہ مساج سے ہونے والی ہلکی ہلکی جلن نے میری توجہ میرے اندر بھگورے لگی ہوئی کیفیت سے ہٹا دی اور میں پرسکون ہونا چلا گیا، یہی وہ لمحہ تھا جب میں خود پر قابو پانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس وقت تک مجھے احساس ہو گیا کہ وہ میرے بدن کا راز پانچکی ہیں۔ کچھ دیر بعد میرا جسم پسینے سے تر ہو گیا تو وہ مجھے اٹھا کر تالاب تک لے گئیں۔ میں پانی میں داخل ہوا تو آگ سکون کا احساس میرے رگ و پے میں سرایت کر گیا، اک سرشاری مجھ پر طاری ہونے لگی۔ جیسی انہوں نے مجھے تالاب سے نکالا اور حمام کی راہ دکھائی۔ میں تباہ چکا تو رکنی دو سفید چادریں لیے کھڑی تھی۔ میں نے انہیں اوزھا اور واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس وقت تک سورج اپنی صاف پیٹ چکا تھا مگر مجھ پر سرشاری والی کیفیت طاری تھی اور میں خود کو بکا بکا چمکا چمکاتا... پتہ نہیں کتنا وقت گزرا ہو گا کہ رکنی آ کر مجھے ساتھ لے گئی۔ وہ مجھے ایک ایسے کمرے میں لے گئی جہاں میں پہلی بار آیا تھا۔ اس کمرے کی آرائش بہت زبردست تھی، گلابی رنگ ہر شے سے لپک رہا تھا۔ فرش پر بچھے قالین پر دسترخوان سجا ہوا تھا۔ میں ابھی بیٹھا بھی نہیں تھا کہ شویتا آ گئی، وہ بیٹھی مسکان سے میری جانب دیکھتے ہوئے بولی۔

”پدھاریے، شجاع ہی ا۔“ میں نے آلتی پالتی ماری تو وہ بھی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ چند لمحوں بعد کھانا جن دیا گیا۔ کھانے کے دوران وہ مجھ سے میرے متعلق یونہی ہلکی ہلکی باتیں کرتی رہی اور میں جواب دیتا رہا۔ یہ سب میرے پروفیشن سے متعلق باتیں تھیں، تب کھانا بھی ختم ہو گیا مگر باتیں چلتی رہی۔ یوں مجھے بھی کافی دن بعد کھل کر باتیں کرنے کا موقع ملا تھا اور دوسرا نفسی کیفیت بھی مجھ پر طاری تھی۔ مجھے وقت کا احساس نہیں تھا، یونہی باتوں کے دوران شویتا نے کہا۔

”آئیں، ڈراما محفل کا رنگ بجا دیں۔“

”محفل اور رنگ؟“ میں نے قدرے کچھ بھگتے ہوئے کہا۔

”یہ جو لڑکیاں یہاں پر ہیں یہ محض خادما نہیں، ہر طرح کا ہندی ناچ بھی ان پر ختم ہے، آئیں۔“ شویتا نے اٹھتے ہوئے کچھ اس اداسے کہا کہ اس میں اور کوٹھے کی نانچکے میں کوئی فرق دکھائی نہ دیا۔ میں اس کے ساتھ اٹھ گیا۔ انہی دروازوں میں گزرتے ہوئے ہم ایک ہال نما کمرے میں آ گئے۔ وہاں پر کئی لڑکیاں ”دعوتِ نظارہ“ دیتے ہوئے لباس میں موجود تھیں۔ وال ٹوال کارپٹ پر فرشی نشست تھی۔ ایک طرف قالینوں سے بنی مندر پر میں اور شویتا جا بیٹھے تو ہلکی ہلکی موسیقی گونجنے لگی، یقیناً دیواروں میں اسپیکر نصب تھے۔ ہلکی موسیقی کا ردھم جیو ہوتا گیا اور سامنے موجود جسم جو لے گئے۔ یہاں تک کہ ان میں جہان آ گیا۔ پھرے ہوئے پیٹ کے ساتھ اگر محفل نشاطا میسر آ جائے

تو انسان کے حواس گم ہو جانا یعنی امر ہوتا ہے۔ میرے حواس بھی میرا ساتھ چھوڑنے لگے۔ جس مخالف، بیجان اور استحان کے درمیان لٹکا ہوا شخص بلاشبہ کرب و اذیت کے مرحلے میں ہوتا ہے، اس وقت میں بھی ایسی ہی کسی حالت میں تھا۔ حواس کس قدر بے وقاف ہوتے ہیں، یہ میں نے ان لمحوں میں جانا۔ عام حالات میں تو انسان بڑے بلند و بانگ دعوے کرتا رہتا ہے مگر ان وجودوں کی حقیقت اس وقت کھلتی ہے جب کوئی استحان درپیش ہو۔ گم ہوتے ہوئے حواسوں کے درمیان میں نے خود کو سرزنش کی اور اس خیال کو ذہن میں جبکہ وہی کہ میرے سامنے کون لوگ ہیں اور وہ کیا چاہتے ہیں، کیا میں قہقہے کران کی خواہشوں کے مطابق نہیں ڈھل رہا۔ میں کیا ہوں اور مجھے یہاں کس طرح رہنا ہے؟ یہی بات اپنے آپ کو یاد دلائی تو شاید میرے حواسوں کو غیرت آگئی، میں اپنے آپ میں آنے لگا۔ پھر وہ میرے اندر بیجان برپا کرنے کے لیے کر رہی تھی تو ان کی ساری محنت رائیگاں گئی تھی۔ رات گئے جب میں وہاں سے اٹھا تو میرے اندر استحان سے کامیاب ہونے کی خوشی تھی اور یہ خوشی عجیب منفرد لذت رکھتی تھی۔

وہ آشرم میں میرا بیجا دل دن تھا۔

میں کمرے میں پڑا ہوا کچھ بے سرو پا خیالوں سے الجھا ہوا تھا۔ انہوں نے وہ سب کچھ کیا جس سے میں اپنی روش چھوڑ کر ان کی راہ پر آ جاؤں لیکن میں نہ ٹوٹ سکا۔ مجھے ان لمحوں کا انتظار تھا جب وہ اس راستے کو چھوڑ کر دوسری طرح اٹھا دے گا میرے سامنے رکھے اور ایسا مجھے دور دور تک کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ طے شدہ انداز سے میرے ساتھ پیش آرہے تھے۔ علی الصبح مجھے اٹھا دیا جاتا، رکشہ مجھے یوگا کی مشقیں کروانے لگتی۔ اس دوران وہ ساحل سمندر پر پہنچنے جانے والے لباس میں ہوتی۔ میں نے ایسی مشقیں کبھی نہیں کیں تھیں مگر جس طرح وہ کہتی، میں کرتا چلا جاتا۔ پھر سوئنگ پول میں نہانے کے بعد ناشتہ کرتا اور مجھے سو جانے کی ہدایت کی جاتی۔ ناشتے میں ایک خاص قسم کا جوس پلایا جاتا جس کا ذائقہ عجیب ہوتا تھا۔ دوپہر سے ذرا پہلے مجھے ہری داس کے پاس جانا پڑتا تھا ایک بھانسن تیار ہوتا۔ پھر کھانے کے بعد مجھے آرام کرنے کے لیے کہہ دیا جاتا۔ میں کچھ دیر ٹہلتا۔ پھر وہی مشروب، سرشاری کی کیفیت، اشنان، نئی چادریں کھانا اور آئے دن نئے بیجان فخر منظر کے حوالے کر دیا جاتا۔ میں بے سکون تو ہوا، میں نے سمجھ لیا کہ یہ ایک معمول اور استحان ہے جس سے بہر حال مجھے کامیاب کرنا ہے میں ان منظروں سے الجھتا، ہری داس کی باتوں کو سمجھتا، شوخا کے اطوار دیکھتا اور رکشہ کی خدمت چاہتے ہوئے محسوس کرنے لگا کہ ان لمحوں تک میں کامیاب ہوں۔ یہ خالصتاً ایک اعصابی جنگ تھی۔ اس میں قوت برداشت اور مہربانی وہ ہتھیار تھے جن سے میں اپنے دشمنوں کے ساتھ نبرد آزما تھا۔ میں ان ہتھیاروں کو کند نہیں ہونے دے رہا تھا۔ یہ حوصلہ مجھے اس یقین سے ملا کہ سوامی ہری داس کے پاس ہو سکتا ہے چند عام قسم کے چھکار ہوں اور وہ بڑا سنیا سی بھی ہو سکتا ہے لیکن ان روحانی صلاحیتوں سے محروم تھا جس سے کسی کے من کا بھید پایا جا سکتا ہے۔ اس کے بارے میں عجیب و غریب قسم کے افسانے گھڑ کے اسے بڑے عم خود بڑے استحان پر بٹھا دیا گیا تھا کہ اس کی دھماکے بیٹھ جائے جبکہ ایسا کچھ نہیں تھا، محض دوکانداری تھی جسے اس کے حواریوں نے چمکایا ہوا تھا۔ میں اسے بھی سمجھ رہا تھا اور اس کے ساتھ آشرم کے اندر اور باہر جتنا سیکورٹی کا نظام تھا، اس سے پوری طرح واقف ہو گیا۔ آشرم طرز پر بنی ہوئی عمارت تھی جسے ہندوانہ سٹائل سے سجایا گیا تھا اور امریکن طرز پر سیکورٹی تھی جسے توڑنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ میں مطمئن تھا اور میں دن بدن حوصلہ مند ہوتا چلا جا رہا تھا۔

سہ پہر ہو چکی تھی اور میں بیڈ پر پڑا شعوری طور پر اس انتظار میں تھا کہ رکنی آئے گی، مشروب پلانے کے بعد اشنان کے لیے تالاب تک لے جائے گی۔ تبھی شو جا آئی، یہ معمول سے ہٹ کر تھا۔ اس کا یوں آنا اور روح ضعیف بھی۔ وہ ہمیشہ سفید چادروں میں رہا کرتی تھی اور اس کے ہاتھ میں کالے موتیوں کی مالارہتی تھی۔ میں نے اسے پہلی چادروں میں سوائے ایک رات کے بھر کبھی نہیں دیکھا تھا مگر اس سہ پہر وہ گہرے کمر کی ساڑھی پہنے، ہلکے میک اپ اور پھولوں کے زیور سے لگی ہوئی آن دار ہوئی۔ اس نے ایسا پرلوم لگا رکھا تھا کہ کمرے میں آتے ہی سحر کن خوشبو پھیل گئی۔ بس ایک لمحہ پر حیرت طاری ہوئی اور بھر میں سمجھ گیا کہ اب یہ نئی طرح کی اتنا دلچسپ پر آن پڑی ہے۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور وہ میرے ساتھ بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انگریزی میں بولی۔

”کیسے ہو؟“ اس کے لبہ میں قدرے طنز تھا جس کی مجھے کچھ نہیں آئی، تبھی میں نے دیر سے سے کہا۔

”ٹھیک ہوں۔“

”ہاں، تمہیں ٹھیک ہی ہونا چاہیے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ پھیل گئی جس میں تھیک تھی۔

”میں سمجھا نہیں، تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟“

”تم اس لیے نہیں سمجھ سکتے، یہ ارے! کہ تم میں سوچنے اور دیکھنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ تم نے وہ سارا وہ سنا ہے، بند کر کیا جانے اور ک کا سوا؟“ اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔ میں اس کے انداز سے کچھ اور سمجھا تھا لیکن وہ کسی اور بیوی پر چل گئی تھی۔ اس کے طنز اور تھیک بھرے لہجے سے میرے اندر طعنا بھرنے لگا۔ وہ میرے متعلق بالکل بے سرو پا باتیں کرنے لگی جس میں میری جھک کرنے کا پہلو تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے میرے نزدیک ہوتے ہوئے اپنا ہاتھ میری گردن پر رکھ دیا۔ مجھے معلوم تھا کہ اس طرح میرے بدن میں جھرمجھری پیدا ہوگی اس لیے میں ذہنی طور پر تیار تھا لیکن پھر بھی ہلکا سا اثر میرے جسم پر ضرور ہوا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے میرے شانوں پر پھیلی چادرا تار نے کئی تو میں نے کوئی مزاحمت نہ کرتے ہوئے سرد لہجے میں کہا۔

”شو جا! تم چاہتی کیا ہو؟“

”ایک بندر کو اور ک کے مزے سے آشنا کرنا چاہتی ہوں۔“ اس نے شمارا لود لہجے میں کہا تو اچانک ہی غصے کی گہری میرے دماغ کو چڑھا

گئی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ آشرم میں کوئی اہمیت رکھتی ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ مجھے اپنا قیدی یا غلام تصور کرتے ہوئے حقارت سے پیش آئے۔

”شو جا! کیا تم میری مرضی کے بغیر اپنی خواہش پوری کر سکتی ہو؟“

”تمہاری اوقات ہی کیا ہے۔ ایک ایسا شخص جسے میں چاہوں، اپنی دسترس میں رکھ سکتی ہوں۔ تمہیں میرے اشاروں پر ناپا چنا ہوگا اور

وہ بھی میوزک کے بغیر۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے چادر کھینچ کر پرے پھینک دی تو میں تن کر بیٹھ گیا اور اٹھائی غصے سے کہا۔

”تم کیا سمجھتی ہو کہ میں تمہارا قیدی ہوں؟“

”الحق لوگوں کی طرح باتیں مت کرو بلکہ کسی اچھے غلام کی طرح خاموشی سے میرے تلوے چالو۔“ اس نے کہا تو میرا دماغ جھک سے اڑ

گیا۔ میں نے بیڈ سے اترتے ہوئے کہا۔

”میں اس آشرم سے جا رہا ہوں، تم اگر روک سکتی ہو تو روک لو۔“

”تم اپنی یہ خواہش بھی پوری کر کے دیکھ لو۔“ اس نے اطمینان سے کہا اور بیڈ پر دراز ہو گئی۔ میں نے سلیپر پہنے اور باہر جانے کے لیے پکا

توڑہ بولی۔

”تم برآمدہ بھی پارٹنر کر سکتے، باہر سیکورٹی۔۔۔“

”کوئی بھی ہو، مزاحمت کرنے پر کوئی مارویں گے تو مارویں۔“

”کون کہتا ہے کہ تمہیں قتل کیا جائے گا؟ بس تمہیں اس صلاحیت سے محروم کر دیا جائے جس پر تم فخر کرتے پھر رہے ہو۔ پھر تمہیں

فکروں کی ٹوٹی کے ساتھ چھوڑ دیا جائے گا۔“ یہ کہہ کر وہ زہریلے لہجے میں قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ”اب بھی تم کون سا مرد ہو، فکروں ہی تو ہو۔“

”میں عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہاری گردن بھی نہ دبا سکوں۔“ میں نے شدت غضب سے کہا تو

اچانک میرے سر میں درد کی شدید لہر اٹھی، یہ اس قدر تیز تھی کہ میں کھوم کر رہ گیا۔ میں اس سے سنبھلا بھی نہیں تھا کہ میری ناک میں سرسراہٹ

ہونے لگی اور یکدم ہی خون بہ نکلا۔ اس وقت میرے گمان میں یہی تھا کہ انتہائی غصے کے عالم میں میرے دماغ کی کوئی شریان پھٹ گئی ہے اور

میں برین ہیمریج کا شکار ہو گیا ہوں۔ میں نے لاشعوری طور پر ناک سے بہنے والے خون کو روکنا چاہا تو شویتا چپختے ہوئے بولی۔

”بہنے دو، اس خون کو بہنے دو۔“ پھر وہ رکنی کو آواز میں دینے لگی، شاید وہ کہیں باہر کھڑی تھی اس لیے لہجوں میں آگئی۔ اتنی دیر تک میرا

سینہ اور چادر خون سے لتھڑ گئے۔ شویتا نے مجھے پکڑا اور ملحقہ ہاتھ روم میں لے گئی اور میرے سر پر پانی ڈالنے لگی۔ دیر سے دیر سے میرے دماغ میں

سنگٹنے والی آگ ٹھنڈی ہونا شروع ہو گئی۔ میں نے غصوں کیا، میرے سر میں درد نہیں تھا۔ کچھ دیر بعد خون بند ہو گیا، اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد

شویتا نے کہا۔

”خوب اچھی طرح نہالو۔“ یہ کہہ کر وہ ہاتھ روم سے نکل گئی، اس کی ساڑھی بھی میرے خون سے تر ہو چکی تھی۔ نہانے کے دوران ہی ایک

سوچ میرے دماغ میں گردش کرتی رہی کہ میں کہیں ان دشمنوں کے درمیان نہ مر جاؤں۔ اگر خدا نخواستہ خون بند نہ ہوتا اور ہسپتال جانے کی نوبت آ

جاتی تو کیا یہ لوگ مجھے ہسپتال لے جاتے؟ نہیں، وہ مجھے قطعاً نہ لے کر جاتے۔ اس طرح ان کا یہ دعویٰ غلط ثابت ہو جاتا کہ وہ مجھے مکمل صحت مند کر

دیں گے۔ وہ جوان کے عقیدت مندوں پر ان کی دھماک ٹیٹھی ہوئی تھی، ختم ہو کر رہ جاتی اور پھر شویتا کا یہ گھٹیا برتاؤ آشرم میں رہنے پر لیکچر پھیر رہا تھا۔

میں نے جلدی کی جو علاج کے چکر میں یہاں آ گیا، مجھے صحت مند ہو کر یہاں آنا چاہئے تھا اور بہانہ کوئی بھی ہو سکتا تھا۔ ایسا ہی سوچتے ہوئے میں نہایا

اور پھر تولیہ لپیٹ کر باہر آ گیا۔ میرے خیال میں تھا کہ رکنی چاوریں لیے کھڑی ہوگی اور میں اسے متح کر کے اپنے کپڑوں پہنوں گا لیکن بیڈ پر بیٹھی چادر

کے اوپر ایک سوٹ رکھا ہوا تھا، شویتا وہاں نہیں تھی

”آپ یہ سوٹ پہن لیں۔“ رکنی نے کہا تو میں نے ان کپڑوں کی طرف دیکھا۔ یہ ان میں سے نہیں تھے جو میں اپنے ساتھ لے کر

آیا تھا۔ میں نے کوئی بات نہیں کی، انہیں قیمت سمجھتے ہوئے پہننے لگا۔ میں ہائی کی گرہ لگا چکا تو رکنی میرے لیے جوتے اور موزے لے آئی جو بالکل نئے تھے۔ میں نے وہ پہنے اور بیگ اٹھانے کی زحمت کیے بغیر باہر کی طرف جانے لگا تو رکنی نے بہت پیار سے کہا۔

”آپ ٹھہریے، ماما جی ابھی آتی ہوں گی۔“

”مجھے یہاں سے جانا ہے، ابھی اور اسی وقت، سیکورٹی والوں سے میں خود نپٹ لوں گا۔“ میں نے کہا اور قدم بڑھا دیئے، تبھی شوپتا دروازے میں آن موجود ہوئی۔ وہ اپنے معمول کے لباس میں تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور پیار بھرے انداز سے کہا۔

”تم جانا چاہتے ہو یہاں سے؟“

”روک سکتی ہو تو روک لو۔“ میں نے کہا تو وہ نرمی سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولی۔

”میں نہیں خود چھوڑ کر آتی ہوں، آؤ، چلیں۔“ یہ کہہ کر وہ انہی قدموں پر پلٹ گئی میں نے ایک لمحہ کو سوچا اور اس کے ساتھ چل پڑا۔ مختلف راہداریوں سے گزرتے ہم پورچ میں آ گئے، جہاں پچھماتی لیمنوزین کھڑی تھی۔ آشرم سے باہر آنے تو میرے ساتھ ٹیٹھی شوپتا نے کہا۔

”ہم پہلے ڈاکٹر کے پاس جائیں گے، اسی ڈاکٹر کے پاس جس نے تمہارے ٹیسٹ لیے تھے وہاں پر ایک بار پھر سارے ٹیسٹ ہوں گے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے کہا۔

”ہمارے خیال میں اب تمہارا وہ ”برین ٹیومر“ نہیں رہا۔“

”یہ کیسے ممکن۔۔۔“ میں کہتے کہتے رک گیا تو وہ بولی۔

”شجاع! گروہماراج کا حکم تھا کہ میں جان بوجھ کر اتنا قصہ دلاؤں کہ تم پھٹ جاؤ۔ ایسا ہی ہوا اور تمہاری ناک سے خون بہہ نکلا۔ انہوں نے جس طرح کہا تھا، ویسے ہی ہوا۔ یہ چھڑ رہے گروہماراج کا۔ تم چاہو تو ٹیسٹ کروا کے اپنا اطمینان کر سکتے ہو۔“ اس نے کہا تو میں خاموش رہا۔

شوپتا کے چہرے پر شجیدگی بھل چکی تھی۔ کافی دیر بعد میں نے کہا۔

”اس ڈاکٹر سے تو پہلے وقت لینا پڑتا ہے۔“

”میں نے اسے فون کر دیا ہے، وہ ہمارے انتظار میں ہے۔“ اس نے اطمینان سے کہا اور میری طرف دیکھ کر ہلکا سا مسکرائی۔ میں ہسپتال آ جانے تک خاموش رہا۔ ڈاکٹر ہمارے انتظار میں تھا۔ اس وقت شام ڈھل چکی تھی جب ٹیسٹ وغیرہ کے بعد ہم وہاں سے اٹھے، پارکنگ میں آ کر شوپتا نے کہا۔

”تمہیں پتہ ہے ہیکل مسج ہی فائل رپورٹ ملے گی، اب بولو، مگر جانا چاہتے ہو یا آشرم؟“ میں نے کوئی لمحہ ضائع کیے بغیر فوراً کہا۔

”آشرم۔“ میں پہلے ہی سوچ چکا تھا کہ مجھے اس کے ساتھ واپس آشرم ہی جانا ہے تاکہ میں انہیں یہ باور کرا سکوں کہ برف ٹوٹ گئی ہے۔ واپس کا سارا راستہ خاموشی سے کٹ گیا۔ پورچ میں گاڑی رکی تو چھ خادماؤں کے ساتھ رکنی وہاں موجود تھی۔ وہ ہمیں لیتی ہوئی اسی کمرے میں چلی گئی جہاں کھانا کھایا جاتا تھا۔ دسترخوان ویسے ہی بچھا ہوا تھا۔ ہمارے پیٹھے ہی کھانا چٹا جانے لگا۔ اس دوران شوپتا باتیں کرتی رہی۔ میرے پاس

کہنے کے لیے اس وقت کچھ بھی نہیں تھا اس لیے بس منتارہا۔ کھانے کے بعد مجھے وہیں ساتھ والا کمرہ دے دیا گیا۔ میں کچھ دیر حالات پر غور کرتا رہا پھر نجانے کب مجھے نیند آگئی۔

اگلی صبح جب میری آنکھ کھلی تو کمرے میں اندھیرا تھا۔ میں کتنی دیر تک یونہی بیٹھا رہا، پھر اٹھ کر کڑکی سے پردے ہٹا دیے۔ باہر صبح روشن ہو چکی تھی، سامنے ہی لان تھا اور اس میں بہت زیادہ تعداد میں خوشنما پھول کھلے ہوئے تھے۔ میں کتنی ہی دیر تک انہیں دیکھتا رہا۔ پھر کسی کی آمد کے احساس کے ساتھ پلٹا، رکنی چائے کی لڑے اٹھائے کڑکی تھی۔ اس وقت وہ پورے لباس میں تھی، وہ مجھے بہت خوبصورت لگی۔

”شجاع جی اچانے پنی لیں۔“ اس نے دیکھی ہی مسکراہٹ کے ساتھ کہا اور میز پر لڑے رکھ دی۔

”میں نہیں پیوں گا۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا۔

”وہ کیوں؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”اس لیے کہ تم صرف ایک کپ لاتی ہو۔ اگر تم میرے ساتھ چند کپ چائے۔ چو تو پھر میں پنی لوں گا۔“

”ایسا ہے کیا۔؟“ اس نے شوقی سے کہا اور بیڈ کے ساتھ رکھے فون سیٹ سے کسی کو ایک کپ مزید لانے کو کہا، پھر میرے سامنے صوفے پر بیٹھ گئی۔ چند منٹ میں ایک خاندانہ خالی کپ دے گئی۔ رکنی نے چائے بنائی، پہلا سپ لے کر اس نے پوچھا۔

”شجاع جی ایسی چند پنی کیوں؟“

”تم پہلی بار پورے کپڑے پہن کر آئی ہو، اس خوشی میں۔“ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر عجیب سی اداسی چھا گئی جیسے میں نے کوئی اچھی بات نہ کہی ہو۔ میں نے اپنا اس کا اثر کا اظہار اس پر کیا تو وہ اداس لہجے میں بولی۔

”ایسا نہیں ہے، شجاع جی! انسان ہوں نا، بعض اوقات بھول جاتی ہوں کہ ہم اپنی مرضی کسی کے ہاں گروی رکھ چکے ہیں، چائے کیسی بنی ہے؟ میں نے خود بنائی ہے۔“ آخری فقرہ کہتے ہوئے وہ ہنس دی۔

”بہت اچھی ہے۔“ میں نے کہا اور پھر یونہی ہانسی کرتے رہے۔ چائے پنی چکے تو اس نے کہا۔

”آپ فریض ہو جائیں۔ میں کچھ دیر میں ناشتہ لاتی ہوں، پھر آپ نے گرو مہاراج جی کے پاس جانا ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا تو وہ برتن اٹھا کر چلے گئی۔

میں سوامی ہری داس کے سامنے جا بیٹھا تو اس نے ایک دیکھی ہی مسکراہٹ کے ساتھ مجھے دیکھا اور سامنے دھری چھوٹی سی فائل میرے آگے کر دی۔

”یہ ہے تمہارے کل والے ٹیسٹوں کی فائل رپورٹ، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اب تمہیں کوئی بیماری لاحق نہیں۔ یہ اسی ڈاکٹری رپورٹ ہے جس نے تمہیں برین ٹیومر کے بارے میں بتایا تھا۔“

”سوامی جی رپورٹ اتنی جلدی آگئی؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

”رات دو بجے یہ میرے پاس پہنچ چکی تھی۔ دولت میں بڑی طاقت ہوتی ہے، مالک! یہ کہہ کر وہ ایک لمحہ کو خاموش ہوا، پھر قدرے مسکراتے ہوئے بولا۔ ”ہو سکتا ہے، اس سے تم یہ سمجھو کہ دولت کے بل بوتے پر خود ساختہ رپورٹ تیار کروائی گئی ہے لیکن میرے خیال میں یہ ایک بچکانہ سوچ ہوگی۔“

”سوامی جی! میں نے بد اعتمادی کا اظہار نہیں کیا، میں تو بس حیران تھا کہ رپورٹ اتنی جلد ہی آگئی۔؟“

”اتنا حیرت زدہ نہیں ہوتے، طاقت اپنے وسائل خود لاتی ہے، جیسے یہ دولت کی طاقت۔۔۔“

”میں دولت کی طاقت کو ماننا ہوں، سوامی جی! اس دور میں اس کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔“ یہ کہہ کر میں نے سوامی کے چہرے کی طرف دیکھا اور وہ بات کہہ دی جس کے لیے میں سوچ چکا تھا۔ ”آپ نے مجھے پر دیا کی ہے، میں آپ کے اس احسان کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا البتہ آپ کی خدمت ضرور کر سکتا ہوں۔ اگرچہ یہ چھوٹا سا اور بڑی بات ہے لیکن پھر بھی مجھے بتائیں کہ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ میں نے کہا تو اس کی آنکھیں یکدم چمک اٹھیں مگر وہ سوچنے والے انداز میں خاموش رہا تب میں نے کہا۔ ”کیا سوچنے لگے، سوامی جی! کیا میں کسی خدمت کے لائق بھی نہیں ہوں؟“

”بات یہ نہیں، بلکہ! تم کس لائق ہو، یہ ہم جانتے ہیں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ ایسی کون سی خدمت ہو سکتی ہے جو تمہارے شانِ شان ہو؟“ یہ کہتے ہوئے وہ مسکرایا اور میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے اس خاص نکتے پر لا رہا ہے جس کے لیے انہوں نے اتنی محنت کی تھی۔

”ایسا بھی کیا، سوامی جی! میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔“

”تم ایک بات متاؤ، ہالک! تمہارے سامنے دولت کا انبار لگا دیا جائے اور ایسا کام کرنے کے لیے کہا جائے جس سے انسانوں کی بھلائی بھی ہو لیکن کچھ لوگوں کی بھرپور دولت کا سامنا ہو، ایسے میں تمہارا فیصلہ کیا ہوگا؟“

”یقیناً میں دولت کے حق میں فیصلہ دوں گا کیونکہ مجھی سب سے بڑی حقیقت ہے اور پھر میں کوئی سوشل ورکر تو ہوں نہیں کہ معاشرے کی خدمت ہی کرتا چلا جاؤں۔“

”لیکن جہاں تک مجھے تمہارے بارے میں معلوم ہے، تم نے ایسی کوئی کوشش نہیں کی؟“

”میں آپ کے سوال کا جواب ضرور دوں گا لیکن آپ مجھے کب سے جانتے ہیں؟“

”جب لاہور میں تم پر قاتلانہ حملے ہوئے۔“ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا تو میں قدرے سمجھ گیا کہ وہ مجھے تب سے جانتا ہوگا پھر بھی میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔

”تب سے سوامی جی۔۔۔“

”میرا خیال ہے کہ میں نے تمہارے سوال کا جواب دے دیا ہے۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا تو میں نے اصرار کرنے کی بجائے کہا۔

”دولت مند ہو جانے کی خواہش میں نے اپنے دل میں ضرور رکھی، اس کا اظہار نہیں کیا لیکن میں محض محنت سے وہ گراف حاصل نہیں کر

سکتا، اس معیار تک نہیں پہنچ سکتا جس کی تمنا میرے اندر روز بروز مضبوط ہوتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے لیے ایسا ضرور کرنا پڑتا ہے جس میں اخلاقیات و فیروہ کی کوئی گنجائش نہ ہو، میرا اپنا معیار ہے، میں سمجھتی ہوں کہ اگر مجھے کتنا ہی ہے تو کم قیمت پر نہ بکوں۔ اپنی قیمت اتھی لگواؤں، ایسی قیمت جو میرے معیار اور میری اپنی شرائط کے مطابق ہو اور کام اس کی مرضی کا جس نے مجھے دولت دینی ہے۔ اگر آپ میرے بارے جانتے ہیں تو آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آج تک مجھے ایسا کوئی موقعہ نہیں ملا سو امی جی، آج تک مجھے میرا خریدار نہیں ملا تو میں ایسی کوشش کیوں کرتا؟“

”بہت خوب، اچھے و چار ہیں۔ ہم قدر کرتے ہیں تمہاری، ہمارے پاس ایسا ایک کام ہے جس میں تمہاری تمنا سے بھی ماورا دولت تمہارے قدموں میں ہوگی لیکن اس کی ضمانت کیا ہے کہ تم جذباتی رو میں نہیں بہ جاؤ گے؟“

”کہاں کی جذباتی رو؟۔ کالے کاموں کا ایک ہی اصول مجھے پتہ ہے کہ اس کام میں بے ایمانی کا کام بھی پوری ایمان داری سے کیا جاتا ہے، دولت کا نشا ایسے جذباتی پن کو قریب نہیں آنے دیتا لیکن اسکا دیکھ بھی کرنا ہوتا ہے مگر ضمانت کون دے گا؟ میں نہیں پوچھوں گا کہ کام کیا ہے لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ میرے معیار اور شرائط کے مطابق ہو، خوابوں کی حقیقت میں بدل کر رکھ دوں گا۔“

”اگر تمہیں اپنے ہی ملک کے خلاف سازش کرنا پڑ جائے؟“

”یہ تو کوئی کام نہ ہو، سو امی جی، یہ تو ایک عام آدمی کر لیتا ہے۔ میری سوچوں میں مرحہ میں حالتیں نہیں ہیں۔“

”چلو، شوقیہ تم سے بات کرے گی، تمہارا معیار اور شرطیں بھی سن لے گی؟“

”اور دولت، سو امی جی؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”وہ تمہیں تمہاری سوچ سے بھی بڑھ کر ملے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے میری جانب اپنا استخوانی ہاتھ بڑھا دیا۔ جسے میں نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ہماری باتیں تقریباً ختم ہو چکی تھیں، اس لیے میں وہاں سے آگیا۔ رکنی مجھے دو بارہ اس کمرے تک چھوڑ گئی۔ میرے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں تھا سو نئے شوٹا کا انتظار کرنے کے، وہ یا تو مجھ سے بات کرنی یا پھر مجھے یہاں سے جانے کی اجازت دے دیتی۔ کتنا سارا وقت گزر گیا اور میں اس دوران حالات کی تبدیلیوں سے خبردار نہ ہونے کے لیے سوچتا رہا۔ میں صوفے میں دھنسا انہی خیالوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ شوٹا آن وار ہوئی، اس کے پیچھے ایک دروازہ قدم گھس تھا جس کے چہرے پر خاصی کڑھکی تھی۔ اس نے بھترین تراش کا ٹیس سوت پہنا ہوا تھا۔ سر پر فوجی کٹھن کے چھوٹے چھوٹے بال، ہڈی کے کئی آنکھیں، بڑے سے چہرے پر بھاری موٹھیں اور مونہے ہونٹوں کے نیچے کسی پرانے رقم کا ایک نشان تھا۔

”یہ ہیں ہمارے دوست، شجاع الدین۔ شوٹا نے تعارف کرایا تو میں نے اٹھ کر اس سے ہاتھ ملایا۔ اس نے بھاری بھرا منہ لہجے میں دہی کلمات کہے۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر اس کا تعارف کرانے لگی۔“ یہ ہیں یثوث، پاٹے، ہمارے بہت اچھے دوست اور پارٹنر، یہاں کے سارے معاملات کی دیکھ بھال سنبھال رہے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیٹھ گئی تو ہم نے بھی نشستیں سنبھال لیں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”ابھی جو تمہاری گرومباراج سے باتیں ہوئی ہیں، وہ خاصی خوش آئند ہیں۔“

”ہونا بھی ایسے ہی چاہئے، شوٹا جی!“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”میں مانتا ہوں کہ ایسے کاموں میں رسک لینا پڑتا ہے مگر شجاع صاحب! آپ بھی یہ سمجھتے ہوں گے کہ فوری طور پر کسی ضمانت کے بغیر اعتماد کر لینا حماقت ہوتی ہے۔“ بیٹھتے بولا۔

”دیکھیں، میں نے یہ نہیں پوچھا کہ کام کیا ہے مگر یہ ضرور کہا ہے کہ وہ کام ہو جو عام بندہ نہ کر سکے اور دولت میرے مطابق ہو۔ میں بھی نہیں کہوں گا کہ کام مجھے دیں اور یہ بھی نہیں پوچھوں گا کہ کام کیا ہے لیکن، مسٹر بیٹھتے اچھے یہ بتائیں کہ کیا ضمانت چاہتے ہیں آپ اور یہ ضمانت کون دے گا؟“

”کیا تم ایسی دستاویزات پر دستخط کر سکتے ہو جس سے یہ ثابت کیا جاسکے کہ تم اپنی ملک سے غداری کر رہے ہو؟“ اس نے ڈرامائی انداز میں کہا تو میں سکھاتے ہوئے بولا۔

”کیا وہ کاغذات آپ اپنے ساتھ لائے ہیں؟ اگر لے آئے تو لایئے، میں دستخط کیے دیتا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ مجھے یہ سب کچھ کر دیں کہ میرے اکاؤنٹ میں کتنے لاکھ درہم پہنچ چکے ہیں۔“ میں نے عام سے لہجے میں کہا تو بیٹھتے کے چہرے پر ایک رنگ آکر گزر گیا۔ لیکن لمحوں میں سنہلے ہوئے بولا۔

”یہ جانے بغیر کہ وہ کام کیا ہے؟“

”ظاہر ہے، وہ کام معمولی نہیں ہوگا اور آپ وہ کام یونہی چھوکتے ہیں تو مجھے بتائیں دیں گے، آپ اپنا اطمینان کر لیں، پھر وہ کام مجھے دے دیں لیکن کام بتانے سے پہلے آپ ضمانت لیں گے اور مجھے دولت دیں گے۔ میں درہم کی تعداد سے کام کی نوعیت کا خود اندازہ کروں گا۔“

”دیکھو، شجاع! یہ ٹھیک ہے کہ تم باصلاحیت ہو لیکن تم خود کو ضرورت سے زیادہ عمل مند ثابت کرنے کی کوشش نہیں کر رہے ہو؟“

”کیسے، مسٹر بیٹھتے؟“

”یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں ایک موزوں بندے کی تلاش تھی۔ حیدر کے بتانے پر ہم نے تمہیں پرکھا، تم ہمارے معیار پر پورے اترتے دکھائی دیتے۔ کام میں رپورٹ ہونے کی وجہ سے تم مارکیٹ کو دیکھتے ہو، شو بیز کو جان گئے ہو اور سب سے بڑی بات کہ لاہور کی انڈر ورلڈ سے تمہاری شناسائی ہے اور تم ان سے کام لے سکتے ہو مگر ہمیں یہ معلوم نہیں تھا کہ تم لاکھوں درہم میں بات کرو گے۔“

”سوچ لیں، بات تو کروڑوں درہم تک جاسکتی ہے بیٹھتے جی! میں اگر آپ کے کام کا ہوں اور آپ مجھے ادا نکلی کر سکتے ہیں تو حاضر ہوں ورنہ آپ کوئی قیمت گھوڑا تلاش کر لیں۔“ میں نے انتہائی سنجیدگی سے حتمی لہجے میں کہا تو شو بیز تہمت لگا کے ہنس دی۔

”گھوڑا۔۔۔ بہت خوب!“ یہ کہہ کر وہ بیٹھتے کی طرف دیکھ کر بولی۔ ”آپ پہلی بار اس سے مل رہے ہیں مگر میں پچھلے ایک ماہ سے اسے اپنی لگا ہوں میں رکھے ہوئے ہوں آپ نے دیکھا، بیٹھتے جی!“

”ہوں، دیکھا۔“ اس کے کرفٹ چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ پھر اس نے اپنی جیب سے چند کاغذات نکال کر میرے سامنے کر دیئے۔

”انہیں نکال کر میرے سامنے کر دیئے۔“ انہیں پڑھا اور پھر دستخط کر دو۔“

”کیا میرے دستخط کرنے تک رقم میرے اکاؤنٹ میں جمع ہو جائے گی؟“

”اکاؤنٹ میں نہیں، اور اتنی نقد ہوگی۔“ شوہت نے کہا اور رکٹی کو آواز دی، لمحوں میں وہ اندر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں میرا بیگ تھا۔ شوہت نے بیگ کی زپ کھولی اور اوپر دھرے کپڑے بٹا کر نوٹوں کی گڈیاں دکھائیں۔ پورے ایک لاکھ روپے ہیں۔ یوں سمجھو، دو لاکھ روپے تمہاری طرف چلے گئے۔ ایک لاکھ روپے تمہارے دوست کو بچانے کے لیے حیدر نے پاکستان بھجوائے تھے۔ اس نے مجھے حساب سمجھاتے ہوئے کہا۔ میں نے وہ کاغذات پڑھے۔ وہ بھارتی خفیہ تنظیم کی طرف سے مختلف احکامات، اعتراضات اور ایسی ہی خرافات تھیں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میں ان کا خاص آدمی ہوں اور پاکستان مخالفت عناصر کے ساتھ مل کر کئی کام کر چکا ہوں۔ ان میں ایسے کاموں کی بھی میری طرف سے رپورٹ تھی جن میں ہم دھماکے اور بلوے کرانے کی ذمہ داری تھی۔ میں نے بلا جھجک دستخط کر دیئے اور سارے کاغذ بیٹھوت کی طرف بڑھادیئے۔ اس نے کاغذات اپنے ہاتھ میں لیے اور اپنی جیب سے ایک مزید کاغذ نکال لیا۔ وہ ایک فوٹو کاپی تھی جس پر میرے دستخطوں کے نمونے تھے، میرے کاغذات حیدر کے پاس تھے اور یقیناً انہوں نے یہ نمونے وہاں سے لیے تھے۔ دفتر میں ہمیش بھی انہیں یہ دستخط مہیا کر سکتا تھا۔ میں نے ایک گہری سانس لی اور صوفے کی پشت سے ٹک گیا۔ میں نے دستخط اصلی کیسے تھے، شکاری اپنے جال میں پھنس چکا تھا۔ شوہت نے جائزہ لیے میں کافی وقت لگاؤ اور پھر مطمئن ہونے کے بعد بولا۔

”شوہتاجی! مبارک ہو، آپ کامیاب تھیں۔“ پھر میرے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”آج تم ہمارے دوست ہو۔ تم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تم کتنی دولت کے حقدار بن گئے ہو۔“ یہ کہہ کر اس نے اپنا جیب سے سگریٹ اور لائٹر نکالا۔ پہلے اس نے سگریٹ جلائی اور پھر لائٹر کے شعلے سے ان کاغذوں کو جلا ڈالا، یہاں تک کہ وہ راکھ ہو گئے۔ میں نے اس پر ذرا سی بھی حیرت ظاہر نہ کی، تجھی شوہتاجی نے پوری سنجیدگی سے کہا۔

”شجاع! یہ ذمہ داری مجھ پر تھی کہ تمہیں پرکھوں، تمہاری کمزوریاں تلاش کروں اور ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کروں لیکن تم میری توقع کے بالکل برعکس نکلے۔ بلیک میٹنگ میں مجبوری ہوتی ہے لیکن جب دوستی کی سطح پر ہاتھ بڑھایا جائے تو کوئی مجبوری نہیں ہوتی، بہر حال تم میری توقع سے زیادہ اہم نکلے ہو۔ تمہیں گردنہارا ج کے بارے میں علم ہو گیا ہوگا کہ وہ کتنے مہمان ہیں اور کتنی زبردست قہقہے کے مالک ہیں۔ وہ انسانیت کے لیے بہت بڑا کام کرنا چاہتے ہیں، ان کے پاس ایسی میڈیسن ہیں جن کی اس دنیا کو اشد ضرورت ہے۔ پاکستان میں بھارتی مصنوعات کے خلاف زبردست مزاحمت پائی جاتی ہے سوائے نفلوں کے ہمیں وہاں اس لیے مضبوط بندہ چاہئے کہ وہ گردنہارا ج کی ویسا سے تیار ہونے والی میڈیسن کو نہ صرف فروخت کر سکے بلکہ ان کے خلاف پروپیگنڈا کا سدباب کر سکے۔ تم مارکیٹ کو سمجھنے کے ساتھ صحافی ہونے کے ناتے اس مسئلے سے پوری طرح نپٹ سکتے ہو۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ پبلسٹی کیسے کرتی ہے، وقت پڑنے پر مزاحمت کے خلاف کس طرح عمل کرنا ہے، یہ بھی تم جانتے ہو۔ تم دولت کی طرف سے لگرمند نہ ہونا۔ تم ایک لاکھ روپے کی بات کرتے ہو، یہاں ڈالر تمہارے قدموں میں ہوں گے۔“

”کام کب شروع کرنا ہے؟“

”تمہارا کام آج ہی سے شروع ہو جائے گا۔ تم پاکستان میں اس کے لیے زمین تیار کرو۔ میڈیسن بھارت میں تیار ہوں گی۔ دنیا بھر کے لیے اور خصوصاً پاکستان کے لیے مارکیٹنگ یہاں سے ہوگی۔“ وہ مجھے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”پاکستان میں ہمارے بہت سارے دوست ہیں، وہ بھی تمہاری عمر پورہ دکر میں گئے لیکن وقت آنے پر۔ فی الحال تمہیں یہ کام اکیلے ہی کرنا ہوگا۔“ نیشونت بولا۔

”اوکے اس سے حقیق کوئی مزید بات؟“ میں نے مسکراتے ہوئے حتیٰ نماز میں کہا۔

”ہوتی رہیں گی۔ ابھی تو تم دوہنی میں ہو، نا!“ شوچا مسکراتے ہوئے بولی۔

”ہاں، میں ابھی نہیں ہوں۔“ میں نے کہا تو نیشونت اٹھ گیا اور میری طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولا۔

”اوکے، جگ میں اب ہمارا رابطہ ہوگا لیکن اس طرح کہ ہم نظر نہ آئیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کھڑا ہوا تب شوچا اٹھتے ہوئے بولی۔

”حیدر اور آرتی تمہیں لینے آئے ہوئے ہیں محتاط رہنا، آرتی اب اہم نہیں رہی۔“ یہ کہہ کر وہ چل دی۔ رکنی نے میرا ہیک اٹھا لیا۔ ہم چلتے ہوئے ایسے کمرے میں آگئے جہاں سوامی برنی داس بیٹھا ہوا تھا، مجھے دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ دیکھ گئی تو میں نے کہا۔

”ابھارت دیکھتے سوامی جی ا!“

”آشرم کے دروازے تم پر ہمیشہ کھلے ہیں۔ جب چاہو آؤ۔“

”مجھے آپ کی ضرورت رہے گی، سوامی جی، میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔“ میں نے کہا تو وہ تعلق کے موضوع پر چند منٹ بولتا رہا۔ ہم سب چپ چاپ سنتے رہے، پھر اس نے اپنے طور پر مجھے دعا کیں دیں اور میں اس سے ہاتھ ملا کر بڑھ گیا۔ نیشونت پاٹھ سے وہیں سے الگ ہو گیا اور ہم ”انتظار گاہ“ میں پہنچے جہاں حیدر اور آرتی موجود تھے۔

”صحت مبارک ہو۔“ حیدر نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا تو آرتی بھی میری جانب بڑھی۔ اس نے بھی مجھے گلے لگا کر ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا۔ جب میں نے شوچا کی طرف دیکھا، اس نے مالا والا ہاتھ اوپر اٹھا کر کہا۔

”بھگوان تمہاری رکھنا کرے، بالک!“ میں نے نور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا جہاں کہیں سے بھی یہ نہیں جھلک رہا تھا کہ وہ تقدس کے پردے میں کچھ اور بھی ہے۔ رکنی نے میرا ہیک، سیل فون اور سکرٹ میرے سامنے کر دیے۔ میں نے مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور بھی چیزیں چکڑ لیں، پھر اسے گلے لگا لیا۔ وہ اس اچانک عمل پر شدید جذبات سے کانپنے لگی، میں نے دھیرے سے اس کان میں کہا۔

”تم اور تمہارا جسم یاد آ رہے گا، رکنی!“ اپنے سے الگ کرنے کے بعد میں شوچا پر آخری نظر ڈالنا ہوا آشرم سے باہر آ گیا۔ آشرم سے باہر آ کر جب کارروڈ پر آئی تو میں نے اپنا سیل فون چیک کیا، صرف ایک حسن نے کال کی تھی اور وہ بھی اس دن جب میں پہلے دن آشرم میں تھا۔ مجھے اطمینان ہو گیا کہ سارے دوست سمجھ گئے ہوں گے۔ میں اسی میں گن تھا کہ حیدر نے پوچھا۔

”کیسے رہے آشرم میں گزرے ہوئے دن؟“

”ظاہر ہے، اچھے رہے ہیں بلکہ کہوں کہ بہت اچھے، ایک خوفناک مرض ختم ہو گیا، اس سے بڑھ کر میرے لیے اور اچھا کیا ہو سکتا ہے؟“ میں نے سیل فون جیب میں ڈالتے ہوئے کہا۔

”تا میں گے نہیں، وقت کیسا گزرا؟“ آرتی نے پوچھا۔

”بس یوں سمجھ لو، آرتی! کچھ ہوش میں اور کچھ مدہوشی میں۔“

”یہ خادمہ جس سے آپ گلے لے لے، اس نے کتنا مدہوش کیا؟“ آخر آرتی سے رہا نہ گیا۔

”اس نے میری بہت خدمت کی ہے، اور باقی تمہیں پتہ ہے آرتی! میرے لیے جسم کس قدر اہمیت رکھتے ہیں۔ تمہارا جسم بھی تو بہت

خوبصورت ہے، نا!“ میں نے اسی کی بات اس پر لونا دی، وہ خاموش ہو گئی۔ چند لمحوں بعد اچانک مجھے یاد آیا۔ ”او، حیدر ازارا نے آنا تھا، کیا وہ آئی۔“

”ارے، اسے تو آئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں۔ آج رات اس کا آخری شو ہے اور کل دوپہر تک وہ فلائی کر جائے گی۔ بہت یاد کر

رہی ہے تمہیں۔“

”تم نے بتایا نہیں تھا اسے؟“ میں نے پوچھا۔

”بتایا تھا لیکن یہ تو مجھے پتہ نہیں تھا کہ تمہاری دلہنی کب ہوگی؟ یہ تو آج صبح ہی ماما جی نے فون کر کے مجھے صورت حال بتائی اور میں تمہیں

لینے کے لیے آ گیا۔ مجھے اتنی خوشی ہوئی، شجاع! کہ میں تب سے آشرم میں آکر بیٹھا ہوا ہوں۔ کسی کو بھی نہیں پتہ، بس آرتی کو بتایا اور یہ میرے ساتھ

آگئی۔“ حیدر نے تفصیل سے بتایا تو میں نے فون سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

”کوئی نمبر ہے جس پر ازارا سے رابطہ کیا جاسکے؟“

”وہ میرج، مہاراج، گھر پہنچو، پھر ملے کرتے ہیں کہ کیا کرتا ہے۔ اسے یہاں بلا لیں یا تم اس کے پاس جاؤ گے۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے کاغذ اچھا چکاتے ہوئے کہا اور حسن کے نمبر پیش کرنے لگا۔ تیسری تہل پر حسن بولا۔

”او، جان تی! کیسے ہو، ٹھیک تھا کہ ہو، نا؟“

”ہاں، اب ٹھیک ہوں۔ بالکل صحت مند۔“

”یہ دوشی جا کر تمہیں کیا روگ لگ گیا، جان تی؟“

”سارے دکھ دور ہو گئے ہیں۔“

”ہاں، یار! مجھے حیدر نے بتایا تھا، اللہ کا شکر ہے کہ تم اب ٹھیک ہو۔ بہت سارے لوگ بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔“

”سب کو خوش کر دوں گا، یار! میں تفصیل سے تمہارے ساتھ بات کروں گا۔ ہو سکتا ہے، اگلے ہفتے مجھے پاکستان آنا پڑے۔“

”خیریت؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”کہانا، تفصیل سے بتاؤں گا۔ ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے، سارے دوست نہال ہو جائیں گے۔ اب فون پر تمہیں کیا بتاؤں؟“

”چلو ٹھیک ہے“ اس نے کہا تو میں دوستوں سے متعلق پوچھنے لگا۔ سب کی خیریت جاننے کے بعد حیدر نے دکی باتیں کیں اور فون آف کر

دیا۔ میں نے جتنی باتیں کی تھیں، حیدر اور آرتی کو سنانے کے لیے کی تھیں تاکہ شوقیہ لوگوں کو معلوم ہو کہ میں نے آشرم سے نکلنے ہی کام شروع کر دیا

ہے۔ دوسری طرف میں حسن کو بھی سمجھانے کی کوشش میں تھا کہ میں آشرم سے کامیاب لوٹا ہوں۔ میں نے اسے اشارے تو دے دیئے تھے۔ اب وہ سمجھتا ہے کہ نہیں؟ بہر حال مجھے اس کی عقل پر بھروسہ تھا۔

گھر پہنچے تو اک سناٹا تھا جس نے ہمارا استقبال کیا۔ سلیک روم میں آئے تو قدرے خوشگوار ریت سی محسوس ہونے لگی۔ اس سے پہلے کوئی بات کرتا، اچانک آرتی نے پوچھا۔

”شجاع! کیا واقعی آپ اگلے نئے پاکستان جا رہے ہیں؟“

”ہو سکتا ہے اور نہیں بھی ہو سکتا لیکن زیادہ چانس جانے کے ہیں۔“

”واپسی کب تک ہوگی؟“ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

”جب جانے کا نہیں پتہ تو میں آنے کے بارے میں حتمی طور پر کیا بتا سکتا ہوں؟“

”مطلب، آپ دو ہی چھوڑ کر جا رہے ہیں؟“ آرتی نے تیزی سے پوچھا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، حیدر نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”یہ تو حاضری مسکن ہے پردیسیوں کے لیے، اب دیکھو تم بھی تو جا رہی ہو۔“

”ہم جا رہے ہیں؟“ آرتی نے شدت حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، تم جا رہی ہو پرسوں شام کی فلائیٹ سے، آج یا کل تمہارا پاسپورٹ اور ٹکٹ آجائیں گے۔“ حیدر نے اطمینان سے کہا۔

”کیا ہم اکیلے ہی یا ساتھ میں؟“

”تم اکیلی، مجھے تو یہی کہا گیا ہے کہ شاپنگ وغیرہ کے لیے تمہیں دو ہم دے دوں اور پرسوں شام آشرم پورٹ پر تمہیں سی آف کروں۔ اب یہ فیصلہ کیوں اور کیسے کیا گیا ہے تم بھی سمجھتی ہو کہ میں نہیں جانتا۔“ اس نے تفصیل بتائی تو آرتی نے تشویش زدہ لہجے میں پوچھا۔

”آپ نے تو کہا تھا کہ ہمیں شام ہی کے ساتھ پاکستان بھجوا دیا جائے گا؟“

”یہی نہیں نے کہا تھا لیکن۔۔۔“ حیدر نے مصنوعی بے چارگی سے کہا تو آرتی یکدم پڑمردہ ہو گئی جیسے سخت دھوپ میں پھول کھلا جائے۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا، وہ سوچوں میں ڈوب چکی تھی۔ ہم میں خاموشی چھا گئی، سچی میں نے کہا۔

”آرتی! یوں افسردہ ہو جانے سے کیا فائدہ، ابھی پرسوں نہیں آئی۔“

”میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔“ اس نے غافل لہجے میں کہا اور پھر اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تو مجھے اس کے نشوونما کی طرح استعمال ہونے پر قدرے افسوس ہوا۔ پھر میں نے اسے ذہن سے جھٹکا اور حیدر سے کہا۔

”اس بیگ میں ایک لاکھ درہم ہیں، اسے سنبھالوان لوگوں نے ایک پراجیکٹ کا ایڈوانس دیا ہے۔“

”کیسا پراجیکٹ؟“ اس نے اطمینان سے پوچھا تو میں نے اسے تفصیل بتادی اور پوچھا۔

”اب تم تاؤ، میرے ساتھ پاکستان چلو گے یا سبکدوشی میں رہو گے؟“

”یہ تو تمہارے پلان پر منحصر ہے کہ تم کیا کرنا چاہو گے؟“

”ویری سیکل،“ عامر میڈیسن اسپورٹ کرنے کی ایک کھٹی بنائے گا، زارا اور ندیم مل کر شو ریز کا کوئی دستا کریں گے، حسن اور میں کوئی اخبار نکالیں گے۔ تین طرف سے کام کو اٹھائیں گے اور دولت کے بل بوتے پر جب یہ چلیں گے تو تعلقات کے دائرے وسیع ہوں گے، میرا خیال کہ ہم اس میں ناکام ہوں گے۔“ میں نے کہا تو وہ تھکھک پوچھنے لگا۔ ”یونہی دیر تک گپ لگانے کے بعد اس نے کہا۔“

”پھر تو مجھے دوشی میں رہنا چاہئے تو تم سمجھ رہے ہو کہ کیوں؟“

”بہر حال اگلے پختے میں کسی بھی دن میرے پاکستان جانے کا بندوبست کر دو، میرا پاسپورٹ تمہارے پاس ہی ہے تا؟“

”بندوبست ہو جائے گا لیکن اس ایک لاکھ روپے کا کیا کروں گا؟“

”اگر تم اپنے پاس سنبھال سکتے ہو تو ٹھیک، ورنہ آج ہی حسن کو بھجوا دو۔ اس کا ہمارے ساتھ رہنا بہت ضروری ہے۔“

”ٹھیک ہے، میں کھانے کے بعد ان کے بھجوانے کا بندوبست کرتا ہوں۔“ یہ کہہ کر اس نے بنگالی باورچی کو آواز دی اور اسے کھانا لگانے کو کہا۔ میں اپنے کمرے سے فریش ہو کر واپس آیا تو کھانا لگ چکا تھا۔ ہاں آرتی موجود نہیں تھی۔ میں نے باورچی سے پوچھا۔

”آرتی کدھر ہے؟“

”میں نے انہیں بتایا تھا جی، کدو دیا کہ بھوک ناسی ہے۔“

”جاؤ، اسے لے کر آؤ۔“ کہو، میں نے بلایا ہے۔“ میں نے کہا تو وہ پلٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ آگئی۔ اس نے کچھ نہیں کہا اور کرسی ٹھیک کر بیٹھ گئی۔ انتہائی خاموشی میں کھانا کھایا گیا، پھر وہاں سے اٹھ کر ہم سٹنگ روم میں آ گئے۔

”یار اتم نے زارا کا نمبر دیا ہی نہیں۔ مان لیا وہ تمہاری دوست ہے، اتنا بھی۔۔۔“ حیدر نے میری بات کاٹتے ہوئے تیزی سے کہا۔

”لو، بھائی! نمبر لو، تم تو یونہی خواہو تو اوہ درمیان میں پھنسے ہوئے ہیں۔“ اس نے اپنا سب فون نکال کر نمبر دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے نمبر لیے اور فیڈ کر کے پیش کر دیئے، کچھ دیر بعد اس کی آواز ابھری۔

”زارا اسٹینگ۔“

”میں شجاع ہوں۔“

”اوے، شجاع اتم خیریت سے تو ہو۔ کیسی طبیعت ہے تمہاری؟“ اس نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا۔

”میں ٹھیک ہوں، صحت مند ہوں اور گھر پہنچ گیا ہوں۔“

”گھر، مطلب پاکستان۔ لیکن نمبر۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ارے نہیں، یہاں حیدر کے گھر۔۔۔“

”تم پھر کسی کو سمجھنا، مجھے لے جائے۔ میں تم سے ملنا چاہتی ہوں، ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں، میں نے یونہی سوچا تھا کہ سارا ہفتہ تمہارے ساتھ رہوں گی لیکن۔۔۔“

”ایسا ہونا قسمت میں نہیں تھا، میں ابھی آیا ہوں، میرا دل بھی چاہ رہا ہے کہ تم سے فوراً ملوں۔ اب وقت ایسا ہے کہ میں تمہیں بلواؤں میں سنا، تمہارے شو کا وقت ہو جائے گا۔ میں آتا ہوں تمہارے پاس، پھر پوری رات ہماری ہوگی۔“

”اوکے، میں انتظار کر رہی ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے الوداعی فقرہ کہتے ہوئے فون بند کر دیا۔ ابھی حیدر نے کہا۔

”میں تو چلا حسن کے کام۔“ وہ اٹھ گیا تو میں نے آرتی سے کہا۔

”تم بھی تھک گئی ہوگی، تھوڑی دیر آرام کر لو۔“

”اوکے۔“ اس نے کاغذ سے اچکائے اور اپنے کمرے کی طرف چل دی میں اپنے کمرے میں آ گیا۔ چھائی میسرآتے ہی میں نے سب سے پہلے ندیم کو فون کیا۔

”شجاع بھائی! آخرت؟“ میری آواز سن کر وہ بولا تو میں نے اسے اپنے پارے میں بتا کر کہا۔

”تفصیلی باتیں تو ہوتی رہیں گی لیکن سب سے پہلے تم الطاف پاشا سے ملاقات کا بندوبست کرو۔“

”آپ کی کوئی خاص مصروفیت تو نہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے زارا کا شو دیکھنا ہے اور پھر وہیں اس کے پاس رہنا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”ٹھیک ہے، میں کچھ دیر بعد آپ کو ملتا ہوں۔“ اس نے کہا تو میں نے خطاطی کرنے کے بارے میں چند باتیں کہیں اور فون بند کر دیا۔ اب مجھے اس کے وہی فون کا انتظار تھا، جب تک میں سکون سے آرام کر سکتا تھا۔ میں آنکھیں موند کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ پچھلے، وقت گزر گیا۔ فون بھل بیٹھے سے میری آنکھ کھلی، ندیم کا فون تھا۔

”ہاں، بولو؟“

”سارا بندوبست ہو جائے گا، آپ صرف ہونٹ بچھنی جائیں، وہاں کنول جیت سب سنبھال لے گی۔“

”بات ہو گئی تھی اس سے؟“

”سب سے ہو گئی، آپ بس بچھنی جائیں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

اس وقت شہر کی روشنیاں جبکہ گائیس تھیں جب میں تیار ہو گیا۔ بیڑھیاں اترتے ہوئے میری نظر آرتی پر پڑی، وہ بھی تیار ہوئی بیٹھی تھی۔ سیاہ پتلون اور بیکے کاسنی رنگ کی شرٹ پہنے وہ خاصی اچھی لگ رہی تھی، کس کر بانڈھے ہوئے بال اور کانوں میں بالے تو غضب ڈھا رہے تھے۔ وہ مجھ سے دیکھتے ہی کھڑی ہو گئی، بلاشبہ وہ میرے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوئی تھی۔

”تم کہیں جا رہی ہو، آرتی؟“ میں نے انجان بننے ہوئے پوچھا۔

”کہیں کیا مطلب؟ آپ کے ساتھ جارہے ہیں ہم۔“

”اور آئی! مجھ سے پوچھ تو لیا ہوتا، کیا تم یہ بات نہیں سمجھتی ہو کہ جب کسی عورت سے بہت دنوں کے بعد ملا جائے تو وہ کسی تیسرے فرد کا وجود برداشت نہیں کرتی؟“

”ہم اتنے ہی برے ہو گئے ہیں، شجاع؟“ اس نے انتہائی حسرت زدہ لہجے میں حسرت سے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے تمہیں، کیوں فلطسوح رہی ہو؟“ یہ کہہ کر میں نے اس کا نمہ حادہ پایا اور نرم سے انداز میں کہا۔ ”وہ پتہ نہیں، مجھ سے کیا کیا باتیں کرنا چاہتی ہو گی اور ہو سکتا ہے، تمہارے ہوتے ہوئے وہ ایسی باتیں نہ کہ پائے۔ تم وہاں جا کر شدید پوریت محسوس کرو گی۔“

”ٹھیک ہے، ہم نہیں جاتے۔ آپ جاؤ۔“ اس نے افسردگی سے کہا۔

”ایسے نہیں، مسکراتے ہوئے کہو، میں کوشش کروں گا کہ رات ہی واپس آ جاؤں۔“

”آپ چاہے ساری رات رہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا تو میں نے زارا کے فیسریش کر دیئے۔ وہ میرے انتظار میں تھی۔ میں نے اسے گھر سے چلنے کی بات بتایا اور فون بند کر کے پورچ میں آ گیا۔ جہاں ڈراما سیرے کا انتظار میں تھا۔ ہوٹل چلنے ہی اسے میں نے واپس چلے جانے کو کہا اور خورد ہوٹل میں چلا گیا۔ استقبال پر کنول جیت میرے انتظار میں کھڑی تھی۔ اس کے پاس ہی وہ بگڑا ہوا تھا جو ہر بار یوں ملتا تھا جیسے پہلی بار مل رہا ہو۔ وہ مجھے دیکھتے ہی مسکرائی، میں قریب پہنچا تو ہاتھ ملاتے ہوئے انتہائی خوشگوار لہجے میں بولی۔

”صحت مبارک ہو۔“

”بہت شکر یہ تمہارے پر خلوص جذبات کا، کیسی ہو؟“

”ایک دم ٹھیک۔“ اس نے کہا تو میں نے بگڑے ہاتھ ملایا۔ اس نے چند ری باتیں کیں اور قدم بڑھا دیئے۔ میں اور کنول باتیں کرتے ہوئے لفٹ تک پہنچے۔ دوسری منزل پر لفٹ سے باہر آئے تو کنول نے کہا۔

”دائیں طرف چو تھا سوئٹ میڈیک کا ہے، الطاف وہیں ہے لیکن میڈیم کوئٹس معلوم کہ ملاقات کی اصل نوعیت کیا ہے۔“

”اسے کیا بتایا ہے؟“

”یہی کہ وہ آپ کا دوست ہے، سانسر کرنا چاہتا ہے میڈیم کوئٹس لیے کسی کو اس ملاقات ہارے پتہ نہیں چلنا چاہئے۔“ اس نے کہا تو میں نے پوچھا۔

”کنول! سیکورٹی کا کوئی خاص بندوبست نظر نہیں آتا؟“

”سب کچھ ہے۔ آپ اگر تہا آتے تو آپ کو روک لیا جاتا۔ میں ہوں، نام ساتھ میں اور اس وقت تو خود میں نے یہ بوجھ ہٹایا ہے یہاں سے۔“

”اوکے۔“ میں نے مطمئن ہوتے ہوئے کہا۔ اسے میں ہم زارا کے دروازے پر جا پہنچے۔ کنول کے بعد میں داخل ہو گیا، سامنے ہی سونے پر زارا بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ الطاف براجمان تھا۔ زارا اوہانہ انداز میں ملی جیسے صدیوں سے چھڑی ہوئی ہو۔ وہ الگ ہوئی تو الطاف

سے ملا، بھی کتول ہوئی۔

”بہت محدود سادقت ہے، شجاع جی! میڈم کے پاس تو آپ ساری رات رہیں گے، اس لیے۔۔۔“ اس نے فخرہ جان بوجھ کر ادھورا

چھوڑ دیا۔ تو زارا جلدی سے ہوئی۔

”سار رات کے عوض اگر تھوڑا وقت دے دیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔“ ہم انہیں وہیں چھوڑ کر بیڈروم میں آگئے۔ میں نے اسے

پوری تفصیلات سے آگاہ کیا جسے سن کر وہ بولا۔

”میرا شک صحیح تھا، بیثوث پاڑے ہی اس نیٹ ورک کو چلا رہا ہے۔ اب مجھے ان کے نیٹ ورک کی بھی سمجھ آگئی ہے۔ اتنی جلدی، اتنی

بڑی کامیابی کا میں بھی تصور بھی نہیں کر سکتا۔ یہ سب آپ کی وجہ سے ہوا، شجاع صاحب!“

”ان کا پلان تو کنفرم ہو گیا اور اب۔۔۔“

”ہری داس والے نہ ہریٹے پلان میں ساری اہمیت ہری داس کی ہے، خیابثت کی جز کو ختم کر دیا تو ہم کامیاب ہیں لیکن میں اس پورے

نیٹ ورک کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔“

”مطلب، ہری داس ان سے الگ حیثیت رکھتا ہے؟“

”ہاں، اصل میں بھارتی خفیہ تنظیم نے ہری داس کو ایک قسم کی پناہ دی۔ اس کی صلاحیتوں سے فائدہ اس لیے اٹھا رہے ہیں کہ وہ ان کے

مقصد کے عین مطابق کام کر سکتا ہے، وہ کوئی تربیت یافتہ ایجنٹ نہیں لیکن اس کے ارد گرد جتنے بھی لوگ ہیں، سب تربیت یافتہ ہیں۔ وہ محض ایک

سہیلی ہے اور سمجھو، ایک اعلیٰ دماغ رکھتا ہے۔ اس کا تجربہ آپ بھی کر چکے ہیں۔ بھارتی خفیہ تنظیم اسے منجی انداز میں استعمال کرنا چاہتی ہے اور میرا

پلان یہی ہوگا کہ جب دماغ ہی نہ رہے گا تو وہ کسے استعمال کریں گے؟“

”تو پھر یہ کام میں کر دوں؟“

”ابھی نہیں، جس طرح آپ نے سیکورٹی کے بارے میں بتایا، میں اس میں الجھنا نہیں چاہتا۔ دوسرا وہ آپ پر اتماد کرتے ہیں۔ میں بہر

حال مشورہ کر کے پلان کرتا ہوں کہ کیا کرنا ہے، آپ اپنا اہتمام دیکھیں۔ ہو سکتا ہے، آپ کو یہاں سے فوراً لکھنا پڑے۔ یہ بھی آپ ذہن میں رکھیں

لیکن ایسا ہنگامی صورت حال میں ہوگا۔ میری کوشش ہوگی کہ وہ آپ پر آخری دم تک شک نہ کریں۔“

”الطاف! حیدر میرا دوست ہے، اس بات کا خیال رکھنا۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ الطاف نے کچھ اور کہا چاہا کہ حسن کا فون آگیا۔

”او، جان جی! یہ تمہارا حیدر ایک لاکھ درہم بھجوانے کی بات کر رہا ہے۔“

”تمہیں پہلے بھی تو بھجوائے تھے نا؟“

”وہ بھی یونہی پڑے ہوئے ہیں، اس میں سے تو کچھ بھی خرچ نہیں ہوا۔“

”اسے بھی سنبھال رکھو اور ہاں، یہ الطاف پاشا میرے پاس ہی ہے۔ اس سے پوچھو، اگر اسے رقم چاہئے ہو تو اسے بگھا دو۔“ یہ کہہ کر میں نے فون الطاف کو دے دیا۔ وہ کچھ دیر ہاتھ کرتا رہا اور ضرورت ہونے پر منگوانے کا کہہ کر فون بند کر دیا۔ ہم مستقل میں پلان کے بارے میں ہاتھ کر رہے تھے کہ کنول آگئی۔

”میڈم کے شو کا وقت ہو گیا ہے۔ اس سے پہلے کہ سیکورٹی والے آجائیں۔“

”میں چلتا ہوں۔“ الطاف نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا، پھر ہاتھ ملاتے ہوئے بولا۔ ”زندگی رہی تو دو بارہ ملاقات ضرور ہوگی۔“

”کیوں نہیں، ضرور ہوگی۔“ میرے یوں کہنے پر وہ میرے گلے لگ گیا۔ پھر چند لمحوں بعد وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

زارا کا دعویٰ میں آخری شو بڑا کامیاب رہا تھا۔ میں جب ہال میں پہنچا تو حیدر کے ساتھ سعد الموطاوی بھی بیٹھا ہوا تھا، میں ان کے پاس بیٹھ گیا۔ اس وقت میرے ذہن میں نہیں آیا کہ آرتی نے بھی آنا تھا۔ شو ختم ہو گیا تو ہم تینوں ہاتھ کرتے رہے۔ اسے میں کنول جیت میرے قریب آئی تو وہ چل دیئے تب اس نے کہا۔

”تو پھر چلیں؟“

”یقیناً۔۔۔“ میں نے کہا اور اس کے ساتھ چل دیا۔ ہم زارا کے پاس پہنچے تو اس کے پاس شیش بیٹھا ہوا تھا، وہ بھارتی فلم انڈسٹری کی باتیں کر رہے تھے۔ ہمارے جانے سے قدرے اچھل ہوئی، پھر شیش نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔

”آپ تو خیر اس وقت پاکستانی فلم انڈسٹری کی معروف اور معروف ہیروئن ہیں لیکن آپ دیکھیں گی کہ کچھ وقت بعد پاکستانی اداکار میں بھارتی فلموں میں کام کرنے کے لیے ترسیں گی۔ ایسا اس لیے ہوگا کہ بھارتی فلم انڈسٹری سے پاکستانی فلم انڈسٹری بالکل ختم ہو کر رہ جائے گی جو پہلے ہی انڈسٹری نہیں ہے، وجہ وہی جو میں نے کہی کہ بالی وڈ اب اپنی تکنیک اور وسائل کے لحاظ سے بہت زیادہ وسعت رکھتی ہے۔ اور یہ دن بدلتا بڑھ رہی ہے۔“ اس نے کہا تو کنول تھبتہ لگاتے ہوئے بولی۔

”مطلب بڑی چمکی، چھوٹی چمکی کو کھل رہی ہے۔“ پھر زارا کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”میڈم! کیا آپ اس سے متعلق ہیں؟“

”دیکھیں، یہ ٹیگسری دیکھا ہے جس سے آنکھیں تو چند یا ہی جاتی ہیں۔ ذہن بھی ماؤف ہو جاتے ہیں۔ ہمارا ایک وقت تھا جواب گزر چکا۔ میں نہیں سمجھتی کہ میں اب اس پوزیشن میں رہ سکوں گی لیکن ایک بات میں کہوں، شیش! بھارتی فلم انڈسٹری جتنی بھی بڑی ہے، پراپیگنڈہ فلمیں تیار کرنے میں جتنا بھی سرمایہ خرچ کر رہی ہے مگر ایک دن آپ کو لگے گا کہ یہ سب فضول گیا۔ جتنی قیمت آپ مجھے بتا رہے ہیں، وہ سب ختم ہو جائے گی۔“

”یہ کس بنا پر کہہ سکتی ہیں آپ؟“

”وہ ایسے کہ جھوٹ اندھیرے کی مانند ہوتا ہے اور آپ یہ تو جانتے ہیں کہ روشنی کی ہلکی سی کرن اندھیرے کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ میں کچھ عرصہ پہلے تک یہی سمجھتی رہی تھی کہ پاکستان فلم انڈسٹری میں اتنی جان نہیں ہے کہ وہ بھارت کے پراپیگنڈہ کاموں کا جواب دے سکے لیکن پھر مجھ میں آیا کہ نظر انداز کر دینا سب سے بڑا انتقام ہوتا ہے۔“

”نہیں، زارا! پاکستان کی فکمی دنیا میں اتنی رسائی رکھنے والے عوام ہی نہیں ہیں جو ان کا جواب دیں۔ وہ تو خال ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں پراپیگنڈہ کی بات کر رہی ہوں، بھارتی جتنا بھی جھوٹ کہہ لیں، حقیقت کو تہدیل نہیں کیا جاسکتا۔“

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے، میڈم! کہ جھوٹ پر ہی سرمایہ خرچ کر دیا جائے اور پھر پراپیگنڈہ۔۔۔“

”میں بتاتی ہوں۔۔۔“ زارا نے کنول کو ٹوکے ہوئے کہا۔ ”بھارت نے فلم ”ہارڈ ر“ بنائی، اس کا بہت چرچا ہوا۔ بڑی محنت کی گئی، بہت

سرمایہ خرچ کیا گیا لیکن اس میں جو کہانی بیان کی گئی وہ بالکل الٹ تھی۔ اس میں بالکل ڈھنڈائی سے جھوٹ بولا گیا۔ فلم کے آخر میں ٹینکوں کی چڑھائی

اور پھر تباہی کا منظر دکھایا جاتا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ وہ حملہ بھارت نے کیا تھا اور جس کی زندہ مثال چوڑھ میں بھارتی ٹینکوں کی تباہی ہے۔ کس کی

نقصانی نے اس حملے کو بایود کیا، کیا تاریخی حقیقتوں کو منسوخ کر کے آپ دوسرے کے ذہنوں پر قبضہ کر سکتے ہیں؟ قطعاً نہیں، ہمیش صاحب!“

”لیکن بھارت کا مقصد تو مل ہو رہا ہے۔“

”کیسے، اپنی بزمیہ کو دوسروں پر ڈال کے آزادی کے دنوں میں اپنی قوم کو وہ فلم دکھا کے خوش ہونا۔ یا پاکستانی فوج پر الزامات والی

فلمیں بنا کے؟ میں تمہیں بتاتی ہوں، سچ کی قوت کیا ہوتی ہے۔ چھوٹی سکرین پر نشانِ حمید کے نام سے محض تین شہدا کی زندگی پر ڈاسہ بنایا گیا اور

چھوٹی سکرین پر ہی دکھایا گیا تو بھارتی حکومت سچ اٹھی، سچ نے اسے گھائل کر کے رکھ دیا۔“

”لیکن سچ تو یہ ہے کہ اسکی فلمیں بھی پاکستان میں دیکھی جا رہی ہیں جن میں پاک فوج اور پاکستانیوں کے خلاف بات ہوتی ہے۔ دراصل

ایک بہت بڑا طبقہ پاکستانی معاشرے میں ایسا بھی ہے جس سے چڑ کر رد عمل کے طور پر بھارتی فلموں کو فروغ مل رہا ہے، ملی کے حملے پر کیو تراسر

آگھیں بند کر لے تو صاف ظاہر ہے کہ کیا ہوگا۔“ ہمیش نے باقاعدہ بحث کرتے ہوئے کہا۔

”بجائے، ہم مانتے ہیں کہ بھارتی کمزوریاں ہیں اور انھی کمزوریوں کے باعث آپ لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں لیکن اس سے تو آپ کی

مناقضت کھل کر سامنے آ رہی ہے۔ ایک طرف روسی کی بات تو دوسری جانب ایسی فلمیں۔۔۔ میں تم سے ایک سوال کرتی ہوں۔ تم لوگ اپنی تہذیب کو

کہاں لے جا رہے ہو؟ جنس یورپ میں مذہب کا حصہ نہیں، ان کی کیا حالت ہے لیکن تمہارے ہاں تو ”کاما“ مذہب کا حصہ ہے۔ تمہارا کیا منتر ہوگا؟

میں انتظار کر رہی ہوں اس وقت کا جب پاکستانی فلم انڈسٹری ختم ہوگی، تب پھر دیکھنا کہ ہمارے معاشرے میں ایک نئی جہت سامنے آئے گی جس میں

ہالی وڈ کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔“

”زارا! یہ کیا بات ہوئی؟“ میں نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پوچھا۔

”دیکھو بھارتی فلموں کا ٹارگٹ تو پاکستانی ذہن ہے نا وہ سمجھتے ہیں کہ وہ انہیں خراب کر لیں گے اور جو نہیں سمجھتے، وہ اگر اثر قبول کر بھی

لیں تو کچھ نہیں ہونے والا۔ ایک ایسا ذہن بھی تو ابھر رہا ہے جو بھارتی پروپیگنڈے کے رد عمل میں بھارت کے مخالف ہو رہا ہے۔“

”میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔۔۔“ ہمیش نے کہا تو اگلے میں دروازے پر دستک ہوئی، کبھی اس طرف متوجہ ہو گئے۔ کنول نے دروازہ

کھولا تو ویڑھے، وہ کھانا لے آئے تھے۔ کنول نے کہا۔

”فی الحال یہ بحث چھوڑیں اور کھانا کھائیں، ابھی بہت سارے کام کرنے والے چڑے ہیں۔“

کھانے کے بعد کنول اور حشیش چلے گئے اور میں زارا کے ساتھ ہاتھیں کرنے لگا۔ اس نے ہاتھ لندن ٹور سے شروع کی اور پھر بھینکتی رات کے ساتھ ہاتھیں بھینکتی گئیں، یہاں تک کہ صبح کے آثار واضح ہونے لگے۔ میری آنکھیں نیند سے پوچھل ہو رہی تھیں۔ اس لیے میں سو گیا۔ بہت سارے کام جب مرضی مطابق ہو جائیں تو بندہ خود کو بہت ہلکا چھلکا محسوس کرتا ہے۔ ان پر سکون حالات میں اگر مستقبل کی پریشانیوں کے بارے میں سوچا جائے تو بے سکونی یونہی اپنے حصار میں لے لیتی ہے، صبح ناشتہ کرتے ہوئے میں یہی محسوس کر رہا تھا۔

”آج آپ کا شیڈول کیا ہے؟“ زارا نے کپ رکھتے ہوئے کہا۔

”یہاں سے آفس جاؤں گا، پھر تہارے ساتھ لٹچ بوجھ جس کا اہتمام حیدر نے گھر پر کیا ہے اور پھر تم لوگوں کو آئیئر پورٹ پر سی آف کریں گے۔“ یہ کہتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟“

”نہیں، میں بس یونہی پوچھ رہی تھی۔“

”بس تم اپنی بیگنگ مکمل کر کے ندیم کو فون کر دینا، وہ تم لوگوں کو نکلے جانے گا۔ ہو سکتا ہے کہ میں تم سے پہلے وہاں پہنچ جاؤں۔“ میں یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا۔ پھر ہوٹل سے باہر آ کر ٹیکسی پکڑی اور دفتر پہنچ گیا۔ آفس میں قدرے سکون تھا۔ کنول جیت کی مصروفیت ختم ہو چکی تھی۔ میں اپنے آفس میں آیا، پھر دیر تک ان کے ساتھ ہاتھیں کرتا رہا۔ زارا کے گھر پہنچ جانے کی اطلاع آئی تو میں اٹھ گیا۔ سٹف روم میں حیدر، آرتی اور زارا بیٹھنے ہوئے تھے۔ میں نے ایک طرف صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

”باقی لوگ نہیں پہنچے؟“

”بس ادھر ادھر شاہک کے چکر میں نکلے ہوئے ہیں میری بیگنگ مکمل ہو گئی تو میں ادھر آ گئی، وہ بھی آتے ہوں گے۔“ زارا نے تفصیل بتائی۔ اتنے میں ندیم بھی وہیں آ گیا، وہ سب زارا کے ٹور کے بارے میں ہاتھیں کرنے لگے۔ تبھی آرتی نے میرے قریب ہوا کر پوچھا۔

”جائے نکلیں گے آپ؟“

”فی الحال تو طلب محسوس نہیں ہو رہی۔“ میں نے کہا تو آرتی کے چہرے پر رنگ آ کے گزر گیا۔ میں اس سے پوچھا، چارہ رہا تھا کہ وہ رات شو میں کیوں نہیں آئی لیکن میں ٹور کی باتوں میں زیادہ مزہ لے رہا تھا۔ تبھی میرا اسل فون بج اٹھا۔ نمبر انجینی تھے، میں نے فون رد کیا تو دوسری جانب شوپا تھی۔ وہ ہنستے ہوئے انگریزی میں بولی۔

”ارے شجاع! تم تو ایک دن میں ہی ہمیں بھول گئے، ایسی بھی کیا مصروفیت؟“

”شوپا! میں کہاں بھولا ہوں اور رہی مصروفیت تو تم حیدر سے پوچھ لو۔ آشرم سے آنے کے بعد سے اب تک ایک منٹ بھی اپنا نہیں رہا۔“

”ہاں، حیدر نے بیٹھونٹ جی سے تمہارا پلان ڈسکس کیا ہے، اچھا ہے، اس میں شوپا کو اہمیت دو گے تو تمہیں وہاں سے اچھا خاصا پاسٹرل

جانے گا۔“

”وہی تو شوہر سے متعلق جو میری ساتھی ہوگی، ابھی اس کی میزبانی کر رہا ہوں۔“

”لیکن تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس میرے لیے کب وقت ہے؟“

”جب چاہو تمہارے لیے وقت ہی وقت ہے۔“

”تو پھر آج ڈنر میرے ساتھ کرو، تھوڑی باتیں بھی کر لیں گے۔“

”کیوں نہیں، مگر کہاں، آشرم؟“

”نہیں، آشرم بہر حال نہیں، میں تمہیں فون کر کے بتا دوں گی، تم بس جتنی طور پر تیار رہنا، اوکے، سی یو۔“ اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ سچی

نجانے کیوں ایک اجنبی سی بے چینی میرے اندر سرایت کر گئی، شوہن کا اندازہ تو رے پر اسرار سا تھا۔

”خیر، شجاع! کیا کہہ دیا ہے شوہن نے جو آپ اس قدر مایوس ہو گئے ہو؟“ آرتی نے پوچھا تو میں مسکرا دیا۔

”کچھ نہیں، میری جان ابس یونٹی ڈنر ساتھ میں کرنا چاہتی ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ بھی ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ ہنس دی۔ آرتی کچھ دیر تو

میرے پاس بیٹھی رہی، پھر وہ نجانے کب اٹھ گئی۔ میں زارا اور حیدر کی طرف متوجہ تھا جو اسے ڈائریکشن کے لیے مشورے دے رہا تھا۔ پھر آہستہ

آہستہ سبکی آتے گئے۔ ایک بھر پور بیچ پرنا سا اہتمام تھا۔ خوشگوار ماحول میں بیچ ختم ہوا تو مقامی چائے کا ایک دور چلا اور پھر قافلہ کی صورت میں

ایئر پورٹ کی طرف چل پڑے۔

”آپ کب آرہے ہیں پاکستان؟“ جانے سے قبل زارا نے پوچھا تو میری بجائے حیدر بولا۔

”ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ آئے گا۔ جو شوہر کے حوالے سے کام کرنے کی بابت کہا ہے، اس کے لیے زمین تیار کرو۔ اب یہ غصوں

وغیرہ کی مصروفیت چھوڑو۔“

”وہ سب ہو جائے گا مگر شجاع ہوتا تو ذرا کام کرنے کا مزہ آتا۔“ اس نے یونٹی چھیننے والے لمحہ انداز میں کہا تو حیدر ہنستے ہوئے بولا۔

”بس بی، اپنی اپنی ڈیماٹ ہے۔ مجھے تم کہیں تو ابھی تمہارے ساتھ چل دیتا۔“

”ڈیماٹ کی نہیں، معیار کی بات کرو جناب!“ زارا نے چوٹ کی تو سبھی ہنس دیئے۔

ایئر پورٹ سے واپسی پر کرائے کی گاڑیاں تو نجانے کہاں تھیں۔ حیدر کے ساتھ کتول، ندیم اور حشیش چلے گئے، میں آرتی اور ڈرائیور

دوسری گاڑی میں تھے۔ سبھی نے مگر جانا تھا، واپسی میں آرتی نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

”شجاع! کل ہم بھی چلے جائیں گے۔ کیا آپ آؤ گے ہمیں سی آف کرنے؟“

”یہ تو وقت بتائے گا۔“ میں نے یونٹی گول مول سا جواب دے کر لطف اندوز ہونا چاہا۔

”کیا مطلب؟“ اس نے وضاحت چاہی۔

”آنے والے وقت کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے، وہ کیسا ہو؟“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

”ہاں، کسی کو کیا پتہ کہ آنے والا وقت اس کے لیے کیا لا رہا ہے؟ خیر چھوڑیں ان باتوں کو ہمیں کچھ شاپنگ کرنا ہے، آپ ہمارے ساتھ چلیں گے۔“ اس نے کسی بچے کی طرح کہا۔

”کیوں نہیں ڈیڑھرا چلوں گا لیکن یہی بات تم مجھے گھر میں بتاتیں تو کم از کم میرا والٹ ورنہم سے بھرا ہوتا لیکن خیر، چھوٹا مونا تھا تو اب بھی لے دوں گا۔“

”ورنہم ہمارے پاس بہت ہیں۔ جتنے چاہیں، لے لیں۔“ اس نے چمکتی آنکھوں کے ساتھ کہا تو میں نے ہولے سے اسے اپنا ساتھ لگا لیا تب اس نے ڈرائیور سے پوچھا۔

”جس میں پتہ ہے، گولڈن سوئی کدھر ہے؟“

”جی، ابھی جو کاک ناؤر چوک آئے گا اس سے سیدھا روڈ جاتا ہے۔“ اس نے موڈب لہجے میں کہا۔

”چلو ٹھیک ہے، ادھر ہی چلو۔“ اس نے کہا اور میرے کاندھے پر اپنا سر رکھ دیا۔ ڈرائیور گاڑی بھگانا رہا۔ تقریباً آدھے گھنٹے سے بھی کم وقت میں وہ ہمیں ایک پارکنگ میں لے گیا۔ یہاں سے بیڈل جانا تھا۔ سونا بازار کافی کھلا اور سہا تھا، درمیانی راستے لکڑی کی خوبصورت چھتوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہاں زیادہ تر میں نے ہندوؤں کی دوکانیں دیکھیں۔ آرتی ایک دوکان میں داخل ہوئی۔ وہاں کا ہندو جیوہر بڑے تپاک سے ملا، شاید وہ اسے پہلے ہی سے جانتا تھا۔ آرتی نے وہاں سے ریفلکس خریدی اور میں نے اسے ایک ہارڈک سا برنس لیٹ لے دیا۔ ہم وہاں سے نکلے تو آرتی نے ڈرائیور سے کہا۔

”اب ٹی سینٹر جانا ہے۔“

”تی بہتر۔۔۔“ ڈرائیور نے کہا اور چل دیا۔ پھر یہ نہیں، کہاں سے گھومتے گھماتے وہ ہمیں ٹی سینٹر لے آیا۔

”شجاع! اسے ہم بچہ نہیں کھڑا رکھیں گے؟ یہ جانے نہیں یہاں شام تک رہتا ہے۔“ اس نے ڈرائیور کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس سے پہلے کہ میں کوئی ردیوار کس دیتا اس نے ڈرائیور سے کہا۔ ”تم گھر جاؤ، ہم ٹی سے آجائیں گے۔“

”جیسے آپ کہیں۔۔۔“ ڈرائیور نے یہ کہا اور چل دیا۔ مجھے آرتی کی سمجھ نہیں آئی لیکن میں ان آخری لمحوں میں اسے کچھ کہنا نہیں چاہتا تھا۔ بس یہی ایک درمیان میں رات تھی، اس لیے خاموش رہا۔ ٹی سینٹر ایک بہت بڑا شاپنگ سینٹر تھا، ہر طرح کی اشیاء سے بھرا ہوا۔ وہاں فوڈ کورس بھی تھے، ایسے ہی ایک انڈین فوڈ کورٹ کے سامنے جا کر آرتی نے کہا۔

”پہلے کچھ کھانی لیں، پھر خریداری کرتے ہیں۔“ اس نے کہا تو میں ہنس دیا۔

”نہیے کیوں؟“ اس نے صومیت بھری حیرت سے پوچھا۔

”تم بالکل اس دیہاتی عورت کی طرح کر رہی ہو جو شہر میں خریداری بعد میں کرتی ہے، پہلے کھانے پینے کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔“

”چلیں، ہمیں دیہاتی عورت سمجھ لیں۔“ اس نے اٹھلاتے ہوئے نخرے سے کہا اور انڈین چٹ پنی ڈشیں لے آئی۔ ہم دو کھاتے رہے،

آرتی باتیں کرتی رہی اور میں مختار ہا۔ کھاپی کر ہم یونہی ٹپٹے گئے، کافی وقت گزر جانے کے بعد آرتی نے کچھ نہ خرید اتو مجھے حیرت ہوئی۔
 ”آرتی اکیا تمہیں یاد ہے کہ تم یہاں خریداری کے لیے آئی ہو؟“

”ہاں، یاد ہے۔ وہ ڈو شاپنگ ہی تو کر رہے ہیں ہم۔“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا پھر ایک لمحہ توقف کے بعد بولی۔ ”دوہم تو سارے ٹیکس خریدنے میں خرچ ہو گئے۔ یہاں تو آپ کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارا جا رہا ہے۔“
 ”وہ مگر میں بھی گزارا جا سکتا تھا، میں نے آج کی رات تمہاری لیے بچا کر رکھی ہے، آؤ، چلیں۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھلا کر بولی۔
 ”اور وہ شوٹا، اس کا وزن؟“

”وہ بھی سمجھو، تمہارے لیے ہی ہے، وزن کے بعد میں نے وہیں تو نہیں رہ جانا، واپس گھر آنا ہے۔“ میں نے باہر کی سمت قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ ٹٹی سینٹر سے باہر آتے ہی سامنے ایک ٹیکسی نظر آئی، ہم اس میں بیٹھے تو میں نے گھر کا پتہ بتایا۔ مجھے آرتی پر فضا آ رہا تھا، یہ کیا احساس بن گیا تھا مگر میں نے اظہار نہیں کیا۔ پھر کافی سارا وقت گزر جانے کے باوجود گھر نہیں آیا تو میں قدرے پریشان ہو گیا۔ اس سے پہلے کہ میں کہہ سکتا، وہ ایک رہائشی علاقے میں داخل ہو گیا۔ میں نے یہی سمجھا کہ وہ کسی اور طرف سے ہمارے گھر کی طرف جا رہا ہے مگر اجنبی علاقہ ہونے کی وجہ سے پریشان ضرور تھا۔ پھر اس وقت مجھے ہوش آیا جب ٹیکسی ایک بڑے سے گھر کے گیٹ میں داخل ہوئی اور پورچ میں جا کر ایسا ایسا ہنسی ہمارے آنے کی پہلے ہی سے خیر تھی۔

”اے مسٹر! کہاں لے آئے ہو میں؟“ میں نے کڑک کر پوچھا تو اس نے برآمدے کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہاں سے دو شخص ہاتھوں میں گن لئے برآمد ہوئے۔ وہ آٹا ٹاٹا ہماری طرف بڑھے، میں نے آرتی کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر اطمینان دیکھ کر میں قدرے اس کھیل کو سمجھ گیا۔ ایک گن تین مہری طرف کا دروازہ کھول کر باہر آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ میں سکون سے اتر کر باہر آ گیا تو دوسری طرف سے آرتی اتر گئی۔ وہ ہمیں لیتے ہوئے اندر چلے گئے۔ پھر چند لمحوں بعد انہوں نے ہمیں ایک سچے ہوئے بیڈروم میں دکھلایا۔ میں نے پلٹ کر آرتی کی طرف دیکھا، وہ جوتے اتار کر اطمینان سے بیڈ پر دروازہ ہونگی تھی۔ میرے یوں دیکھنے پر وہ بولی۔

”آ جا، میرے راجہ! یہاں ہمیں ڈسٹرب کرنے والا کوئی نہیں۔۔۔“ میں اس کا لہجہ سن کر حیران رہ گیا، کہاں آپ جناب اور کہاں تھرڈ کلاس عورتوں کی زبان، اس نے اصلیت ظاہر کر کے رکھ دی تھی، میں نے اطمینان سے ایک کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔
 ”آرتی! یہ سب تم نے کیوں کیا؟“

”دو روز سے ہی سوال کرتے رہو گے مہری ہانہوں میں نہیں آؤ گے؟ آؤ، میرے سینے سے لگ جاؤ۔ پھر جتنے سوال چاہے کرتے رہتا۔“ آرتی نے ذہری مٹی مسکراہٹ سے مصنوعی خماریا اور لہجے میں کہا اور پھر میرا ہاتھ پکڑ کر بیڈ پر کھینچ لیا۔ میں نے ان لمحوں میں طے کر لیا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔
 ”آرتی! مجھے انہو کر کے کیا ملے گا تمہیں؟“ میں نے اچھائی سنجیدگی سے کہا۔

”دیکھو، راجہ! میں کوئی چھوٹی موٹی طرح کی دیہاتی لڑکی ہوں نہیں اور نہ ہی لاوارث ہوں، تم سونے کی چڑیا ہو، ہم اس موقع کو ضائع نہیں

کرنا چاہتے۔"

"تم نے یہ کیسے جان لیا کہ میں سونے کی چڑیا ہوں؟" میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"بے وقوف سمجھتے ہو مجھے؟ حیدر تمہارے دوست کے لیے لکھوں میں لاکھ درہم وار سکتا ہے، تم پر تو دس لاکھ درہم سے گا اور اب تو؟ شرم والے بھی تمہاری چاہ کر رہے ہیں، وہ بھی تو کچھ دیں گے۔ پھر چاہے نہ دیں مگر ہمیں شوق تھا کہ کبھی تو نقصان پہنچانا ہے، بڑے بڑے کرتی ہے تیرے ساتھ۔۔۔"

"دیکھو تم اپنے لیے بہت ساری مشکل بڑھا رہی ہو، تمہیں دولت چاہئے نا! بتاؤ کتنی رقم چاہئے؟"

"ارے اس کا فیصلہ تو ہم نہیں کرنے والے، ہمیں تو تمہارا غرور توڑنا ہے۔ ہمیں تو تمہاری چاہ ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مطلب؟" میں نے کہا تو وہ بڑھ کر میری شرت اتارنے لگی۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا، تب وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"نہ، ایسا مت کرو اب تو میری مرضی چلے گی۔۔۔"

"اور اگر میں ایسا نہ کروں تو؟" میں نے سرد لہجے میں کہا۔

"دیکھو، شجاع اتم ہمیں پسند ہو۔ ہم نے اپنے اوپر والوں سے کہا تھا کہ ہماری دونوں کی مراد پوری ہو جائے، مطلب انہیں درہم اور مجھے تھل مل جاوے تو شجاع اتمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا لیکن اگر تم نے میری بات نہیں مانی تو پھر ایک اذیت ناک موت تمہاری قسمت میں لکھ دی جائے گی، تم نے ابھی تک میرا پیار دیکھا ہے، میرا انتقام نہیں دیکھا۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا اور ایک ہی جھٹکے میں میری شرت پھاڑ دی، غصے کی تیز لہر ابھری اور میں نے ایک زمانے دار چھپڑ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ اس کے گال پر میری اٹھیوں کے نشان ثبت ہو گئے۔ "چٹاخ" کی زوردار آواز سے وہی گن مین اندر آگئے تو آرتی نے کہا۔

"تم جاؤ، یہ ابھی فخرے کرے گا، میں سنبھال لوں گی اسے۔۔۔" اس نے نخوت سے کہا تو وہ لوگ چلے گئے۔ جب آرتی ایک دم مجھ پر

سوار ہو گئی۔ میں انہیں لکھوں میں بھاگا کرتی لڑکے کے فن سے بھی آشنا ہے، اس نے میری دونوں کلائیوں کو اپنی گرفت میں لے کر کہا۔

"تم نے مجھے ہمیشہ دھکا راہنڈ ہاتی باتیں کر کے اور کبھی نظر انداز کر کے، تمہیں شاید پتہ نہیں کہ جسے میں چاہوں، اسے حاصل کر کے رہتی ہوں اس لیے مزاحمت نہ کرو۔ ان لکھوں کو خوشگوار موڈ میں یادگار بنا دو۔ تمہارے عوض دولت ملے گی اور میرا وعدہ ہے کہ تمہیں زندہ چھوڑ دیا جائے گا۔ بس اتنی ہی بات ہے۔ ورنہ۔۔۔" اس نے فراتے ہوئے کہا تو میں ہنس دیا۔

"آرتی اتم غصے میں بہت بری دکھائی دیتی ہو۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ میں تمہاری خواہش پوری کروں گا؟ قطعاً نہیں، ہاں تمہیں دولت چاہئے تو وہ میں تمہیں دینے کے لیے تیار ہوں۔ اور میری طرف سے ضمانت ہے کہ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔" اس سے پہلے کہ آرتی کچھ کہتی، میرا سیل فون بج اٹھا۔ میں نے جب تک فون کے لیے ہتھوں کی کھچلی جیب میں ہاتھ ڈالا، آرتی نے چشم زدوں میں ایک پتلی دھارا والا منجر نکال کر میری گردن پر رکھ دیا۔

میرا سیل فون مسلسل بج رہا تھا۔ میں نے فون پر نمبر دیکھنا چاہے تو آرتی نے وہ فون چھین لیا، پھر نمبر دیکھ کر بولی۔

”یہ تو حیدر کا فون ہے۔“

”تم سن لو۔۔۔“ میں نے بے پرواہی سے کہا تو اس نے فون رسوا کر لیا۔

”ہاں، ہم شاپنگ سنٹر میں ہیں، بس ابھی آجائیں گے، وہ ہمارے پاس ہی ہیں، لیس بات کریں۔“ یہ کہہ کر اس نے فون میری طرف بڑھاتے ہوئے منجر کا ہاؤ بھی بڑھا دیا۔

”بول کیوں نہیں رہے؟“ میرے ”ہیلو“ کہنے پر وہ تقریباً چیخ اٹھا۔

”جب آرتی نے کہہ دیا کہ ہم آ رہے ہیں تو پریشانی کی کیا بات ہے؟“

”دیکھو، شجاع اکہیں کوئی گزرتا تو نہیں ہے؟ صرف ہاں یا ناں میں جواب دے دو۔“

”کوئی ایسی بات نہیں یا اربس تھوڑی دیر مزید سوچ سہیلہ کر کے گھر آ رہے ہیں۔ تم پریشان نہیں ہونا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں فون جیب میں ڈالنا چاہتا تھا کہ آرتی نے پکڑ لیا اور ایک طرف دکھ دیا۔

”ہاں، تو میرے لہجہ کیا خیال ہے تمہارا؟“ وہ تقریباً مجھ پر حاوی ہوتے ہوئے بولی۔

”تم نے جو سوچا ہے، وہی کرو، میری طرف سے انکار ہے۔“

”شجاع! سیدھی طرح لائن پر آ جاؤ، میں نہیں چاہتی کہ تم دیکھتے ہوئے وجود کے ساتھ میرا حکم ماننے پر مجبور ہو جاؤ۔“

”میں فقط تمہیں دولت دے سکتا ہوں۔ فون لاؤ، میں حیدر سے کہہ دیتا ہوں کہ وہ تمہاری مطلوبہ رقم کا بندوبست کر دے۔ میرے جیتے جی یہ فائدہ حاصل کرو، پھر شاید میرے سر جانے کے بعد تمہیں ایک کوزی بھی نہ ملے۔“

”میں پوچھ سکتی ہوں کہ تم یا احسان مجھ پر کیوں کر رہے ہو؟“

”تم بہت کم طرف ہو، اس لیے تم اسے سمجھ نہیں سکتیں۔“ میں نے کہا تو وہ شدت حیرت سے بولی۔

”میں کم طرف، شجاع! میں کم طرف؟ فلدا کہہ رہے ہو تم، میرے شباب کو ٹھکرا دینے والا شخص مجھے ہی کم طرف کہہ رہا ہے۔“

”ہاں، آرتی!“ میں نے یکدم اسے خود سے الگ کر دیا اور انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ ”میں نے تمہارے لیے پتہ نہیں کیا کیا سوچا تھا، اتنا بہت کچھ کہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ کاش! تم میرے خیالوں کو دیکھ سکتیں یا کم از کم محسوس ہی کر سکتیں تو اتنی گھٹیا حرکت کے بارے میں کبھی نہ سوچتیں۔ تم نے بہت تھوڑا سوچا ہے اپنے لیے۔۔۔“ میں نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا۔ وہ جواپا کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ سیل فون بج اٹھا۔ آرتی نے اپنے لیے ہی فون اٹھایا، نمبر دیکھے جو اجنبی تھے۔ وہ میرے قریب ہی لٹھی ہوئی تھی، اتنی نزدیک کہ جب اس نے فون آن کر کے ”ہیلو“ کہا تو جواپا شوچتا کی آواز سنائی دی۔

”شجاع کہاں ہے، اس سے بات کرنا۔“ شوچتا نے رعب دار آواز میں کہا۔

”میں آرتی بات کر رہی ہوں۔ جو بات کرنی ہے، مجھ سے کرو۔“ وہ مرد سے لہجہ میں بولی۔

”آرتی! تم تم اس لہجہ میں بات کرو گی؟“ شویتا نے قدرے حیرت سے کہا۔

”میں بات ہی نہیں، اور کچھ بھی کروں گی۔ تم کہو، کیا کہنا چاہتی ہو۔“ آرتی نے ساری حدیں چھلانگ دیں۔

”شجاع سے بات کراؤ۔“ شویتا کے لہجے میں غصہ تھا۔

”تمیز سے بات کرو، مائی ڈیر ماما جی! اور سنو، میں چاہوں تو اس سے بات کرا دوں یا نہیں۔ بالکل اسی طرح میں پل بھر میں اسے قتل بھی کر سکتی ہوں۔“ وہ اپنی رو میں کہہ رہی تھی۔ اس دوران وہ ٹخمر کی طرف سے دھیان ہٹا بیٹھی تھی۔ میں چاہتا تو اسی وقت اسے قابو میں کر لیتا مگر باہر نکلتے ہی پوچھیں کیسے اسلحہ بردار لوگوں سے واسطہ پڑ جاتا۔ میں نے یہ موقع ضائع کر دینا ہی مناسب سمجھا۔

”یہ کیا بھوکاں کر رہی ہو، تم ہوش میں تو ہو؟“ شوچا جیننے ہوئے بولی۔

”میں نے کہا نا تمیز سے بات کرو ماما تہری! لیکن لگتا ہے، تمہیں ابھی عقل نہیں ہے۔ جب تمیز سے بات کرنا آ جائے تو دوبارہ فون کر لینا۔“ اس نے کہا اور فون آف کر کے بیڈ پر ہی پھینک دیا۔ پھر میری طرف گھائل نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ”راجہ! اتنا اچھا ماحول ہے، تنجائی ہے اور وقت ہی وقت ہے، چھوڑو سب سوچوں کو اور آؤ ان لمحوں کو خوشگوار موڈ کے ساتھ یادگار بنا دو۔“

”سوری، آرتی! تمہیں دولت چاہئے، وہ میں دینے کے لیے تیار ہوں اور یہ ضمانت بھی کہ بعد میں بھی کوئی تمہیں کچھ نہیں کہے گا۔“ میں نے انجھالی اطمینان سے کہا۔

”اتنی مہربانی مجھ پر کیوں.....؟“ وہ طنز بہتے ہوئے بولی۔

”ہاں، آرتی! تم اسے مہربانی ہی تصور کر سکتی ہو، اس لیے کہ تم واقعی کم ظرف ہو۔ اگر تم نے ذرا سا بھی کھلے ذہن کے ساتھ سوچا ہوتا تو تمہیں سب سمجھ میں آ جاتا۔“

”مثلاً، کیا سمجھ میں آ جاتا؟“ اس کا لہجہ ہنوز طنزیہ تھا۔

”آرتی! میں تمہیں پاکستان لے جانا چاہتا تھا اپنے ساتھ ہمیشہ کے لیے، میں نے حیدر سے بات کی، اس کی اتنی رسائی نہیں تھی لیکن میری خاطر اس نے اپنے نیٹ ورک سے بات کی۔ وہ لوگ تمہیں کھونا نہیں چاہتے تھے لیکن انہوں نے ایک شرط پر تمہیں جانے کی اجازت دے دی کہ میں ان کے لیے پاکستان میں ایک غیر اخلاقی کام سرانجام دوں جو یہ نہیں کر سکتے، بہت ہماری قیمت لگائی تھی انہوں نے لیکن میں نے فقط تمہاری خاطر یہ قبول کر لیا۔ میں نے عندیہ دے دیا کہ میں پاکستان چلا جاؤں گا۔ انہوں نے اب تک مجھے کام نہیں بتایا تھا، آج رات شویتا اسی سلسلے میں مجھ سے بات کرنے والی تھی جس کے ساتھ تم نے اتنی بد تمیزی کی۔“

”تم نے تم نے، شجاع! ایک بار بھی مجھے اشارہ نہیں دیا؟“ آرتی حیرت زدہ رہ گئی۔

”کیا بات کرتا میں، ابھی تو ڈیل چل رہی تھی، بات کسی کنارے لگتی تو میں کہتا۔ میری ساری توجہ اسی مسئلہ کو حل کرنے کی طرف تھی۔“

”تم ایسا کیوں چاہتے تھے؟“ اس نے پوچھا۔

”تم تم سے محبت کرتا ہوں، آرتی تم نے مجھے پہلی ملاقات ہی میں گھائل کر دیا تھا۔“ میں نے انتہائی جذباتی لہجے میں کہا تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس دی۔

”پاگل بناتے ہو تم اگر مجھ سے محبت کرتے ہوتے تو میں تمہارے سامنے قریب رہی لیکن تم نے مجھے ایک گھٹیا۔۔۔“

”یہ تمہاری سوچ ہے، آرتی اس وقت تم اپنی خواہش کے لیے پاگل ہو رہی ہو، میری باتیں سمجھ نہیں آ رہی ہیں اور اسی لیے میں تمہیں کم طرف کہتا ہوں۔ میرا مقصد تمہارا جسم حاصل کرنا نہیں تھا، میں تمہیں اپنانا چاہتا تھا۔ اپنی دلہن بنا کے اور اس کا احساس تم بھی کر سکتی ہو کہ اگر میں تم سے یہاں شادی کرنے کی بات بھی منہ سے نکالتا تو کیا ایسا ممکن ہو سکتا تھا۔ وہ لوگ کرنے دیتے؟ میں نے بہت بڑی قیمت دے کر تمہیں حاصل کرنا چاہا تھا مگر۔۔۔“ میں نے جان بوجھ کر قہر اور حورا چھوڑ دیا۔ تبھی اس کا فخر والا لہجہ ہاتھ ڈھیل پڑ گیا، میرا تیر ٹھیک نشانے پر لگا تھا۔

”اس کا ثبوت؟“ اس نے اپنی آواز میں اعتماد پیدا کرتے ہوئے کہا۔

”کوئی ثبوت نہیں ہے میرے پاس اور نہ ہی میں کوئی ثبوت دے سکتا ہوں۔ ہاں، اگر میں شویتا سے بات کر سکتا اور اس میں طے ہو جاتا تو شاید میں اس کی گواہی دلا سکتا۔“

”حیدر؟“

”ایسی صورت حال میں وہ کیا بتا سکتا ہے، تم خود سوچو۔ تم اپنا کام کرو۔ چاہو تو مجھے قتل کرو۔“ میں نے یہ کہتے ہوئے اس کے فخر والے ہاتھ کو ایک طرف جھکایا اور اطمینان سے پھل کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ تبھی وہ بولی۔

”تم اتنی ہی بات کی خاطر مر جاتی کیوں پسند کر رہے ہو؟“ اس کے لہجے میں احتجاج تھا۔

”اسلئے کہ میں تمہیں چاہتا ہوں۔ تم چاہے کچھ بھی ہو لیکن کم از کم میں تمہیں آلودہ نہ کروں، پوری پاکیزگی کے ساتھ اپنانا چاہتا تھا میں۔۔۔“

”کیا تم مجھے مسلمان کرنا چاہتے تھے؟“

”اگر تمہاری مرضی ہوتی، جب ورنہ میری دلہن، تم چاہو تو مجھے قتل کرو۔“ میں نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔ تو وہ کتنی ہی دیر تک مجھے دیکھتی رہی، پھر میرے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

”تم کیا واقعی مجھ سے محبت کرتے ہو، مجھے پاکستان لے جانا چاہتے ہو؟“

”میری تو یہی خواہش تھی۔۔۔“ میں نے شانے اچکاتے ہوئے کہا۔

”تھی، مطلب، اب نہیں؟“ اس نے قدرے حیرانگی سے پوچھا۔

”میں تو اب بھی تم پر اعتماد کر سکتا ہوں مگر ان حالات میں کیا تم میرا اعتبار کرو گی؟ قطعاً نہیں، کیونکہ اب تم خود بھنس چکی ہو۔“ میں نے کہا تو میری بات نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔

”کیا ایسا ممکن نہیں کہ ہم نہ پاکستان جائیں اور نہ اٹھریا، کسی تیسرے ملک چلے جائیں مثلاً تھائی لینڈ؟“

”تم کیا سمجھتی ہو، ان لوگوں کی پہنچ وہاں تک نہیں ہوگی۔ کیا بھارتی عقیدہ تنظیم وہاں تک رسائی حاصل نہیں کر سکتی؟“

”کرتی ہے تو کرے لیکن چھوٹا ارجنن کے پاس پہنچ جانے پر ہمیں کوئی ٹھک نہیں کر سکے گا۔ یہ لوگ ہمیں یہاں سے بحفاظت نکال کر لے

جائیں گے۔“ اس نے صدقے داری جاتے ہوئے مجھے سمجھایا۔

”تو کیا وہ ہمیں جرائم کی دنیا میں نہیں دھکیل دیں گے؟ وہاں مہری کوئی جزیں نہیں ہیں لیکن پاکستان میں تو ہیں۔ میں نے ان کے کام کے

لیے آماڈگی اسی صورت میں ظاہر کرنا تھی جب وہ تمہیں میرے ساتھ بھیج دینے کو تیار ہو جاتے۔ میں یہی شرط رکھتا۔“ میں بات کو گھما کر پھر دہرایا۔

”تم واقعی ٹھیک کہتے ہو۔“ اس نے تشویش سے کہا۔ ”اب۔۔۔ اب میں نے شوشا کو بھی ناراض کر لیا ہے اور یہ لوگ۔۔۔ یہ لوگ بھی تو

ہمیں نہیں جانے دیں گے ہو سکتا ہے، اب تک یثونت یا حیدر سے رابطہ بھی کر چکے ہوں۔“

”دیکھو، میں شوشا کو سنبھال لیتا ہوں۔ میں اس سے کوئی بھی بہانہ کر دوں گا لیکن اصل مسئلہ تو یہاں سے نکلنے کا ہے، وہ وہاں تم خود ہی

مسدود کر چکی ہو۔“

”یہاں ممکن ہے صرف یہی دو گن من اور ایک چوکیدار۔۔۔ ہو سکتا ہے مزید ہوں لیکن مجھے نہیں علم۔۔۔ انہوں نے مجھے صرف دو گن

دیئے ہیں، پھر میں تمہیں ان کے حوالے کر کے چلے جانے پر مجبور ہوں گی اور اس میں سے خاصا وقت گزر چکا ہے۔“ اس نے دکھ سے کہا اور خاموش

ہو گئی، تمہی صبر کا فون آ گیا۔

”تم اب تک پہنچے نہیں؟“

”بس، یار! نکلنے ہیں۔ تھوڑا موج میلہ کر لیں۔“

”آرتی کہاں ہے؟“

”میرے پاس ہے۔“

”تم مجھے صحیح کیوں نہیں بتاتے کہ تم انہوا ہو چکے ہو؟“

”تمہیں کیسے پتہ چلا؟“

”وہ تمہارے عوض پانچ لاکھ درہم مانگ رہے ہیں۔“

”تو پھر؟“

”میں بندوبست کر رہا ہوں، ہو جائے گا۔ مجھے ڈر یہی ہے کہ وہ تمہیں گزندہ پہنچائیں۔ بہر حال تم پوری محنت کے ساتھ وقت گزارنے

والی بات کرو۔“

”اوکے۔“ میں نے کہا تو آرتی نے فون پکڑ کر بند کر دیا اور تقریباً بیٹھنے ہوئے بولی۔

”ختم کرو یہ سب اور جو میں کہہ رہی ہوں، وہ کرو۔“

”آرتی! چلو، باہر چلیں۔“ میں نے اس کا منہ پکڑ کر کہا۔

”کیا کہہ رہے ہو تم؟“ میرا لہجہ تبدیل ہو جانے پر وہ چونک گئی۔

”آرتی! میں کچھ گیا ہوں کہ حیدر پانچ لاکھ روپے نہیں دے سکتا، ان لوگوں نے اس سے رقم ہی اتنی مانگی ہے اور یہ ثبوت وغیرہ کو مجھ پر اتنی رقم لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ لہذا یا تو تم مجھے قتل کر دو یا پھر انہیں سمجھاؤ کہ وہ ہمیں پاکستان جانے دیں۔“

”یہ ٹھیک ہے کہ وہ مجھ پر اصرار کر لیں گے لیکن۔۔۔“

”اس کا ثبوت میں ابھی دے دوں گا۔ یہاں ابھی جا ہوتو کسی مولانا کو بلاؤ اور میرے ساتھ نکاح کر لو یا کسی پنڈت کو بلاؤ جو ان کے گرد پھیرے لگوا دے اور میں تمہارے گلے میں منگل سوتر ڈال کر تمہاری ماٹک میں سندور بھر دوں۔ یہیں سہاگ رات ہوگی۔ پھر جو ہو، سو ہو۔۔۔“ میں نے یہ بات اس قدر جذبہ بانی لہجہ میں کہی کہ آرتی کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔

”شجاع! یہ تمہارا فیصلہ ہے؟“

”ہاں، آرتی! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اسے اپنے گے لگا لیا، ابھی وہ جھکیوں سے رو پڑی۔ میں نے اس کے آنسو صاف کیے پھر آرتی میرے ساتھ کمرے سے باہر جانے کو تیار ہو گئی۔ میں ان جذباتی لمحوں سے قائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ وہ اگلے پل میں کیا فیصلہ صادر کر دے، اس بارے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن میں کمرے سے باہر کی فضا کا جائزہ لے کر ہی کوئی لائحہ عمل سوچ سکتا تھا۔ پھر میں نے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیا اور اسے ساتھ لے کر کمرے سے باہر آنے کے لیے اٹھ گیا۔ دروازہ کھلتے ہی ہماری نظر ان گن برداروں پر پڑی جو سامنے ہی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں دیکھتے ہی چوکننا انداز میں اٹھ کھڑے ہوئے، سبھی آرتی نے ان میں سے ایک صوفے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

”دل! پاس آ چکا ہے یا؟“ اس نے سوالیہ انداز میں نغز ادا حورا چھوڑ دیا۔

”اسے یہاں آنے کی کیا ضرورت ہے؟“ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”مطلب؟“ آرتی کے لہجے میں قدرے حیرت تھی۔

”مطلب یہ کہ اسے یہاں نہیں آنا ہمیں اس شخص کو لے کر پاس کے پاس جانا ہے جہاں یہ بہت محفوظ رہے گا، تم نے اگر اپنا کام ختم کر لیا ہے تو واپس کمرے میں چلی جاؤ، اب کچھ لوگ تمہارے ساتھ وقت گزارتا جا رہے ہیں۔“ اس نے مسکراتے ہوئے طنز یہ لہجہ میں کہا۔

”واٹ نان سنس، کیا بک رہے ہو تم؟“ آرتی نے انتہائی غصے میں کہا اور چند قدم کے فاصلے پر پڑے ٹیلی فون بیٹ کی طرف بڑھی تو دوسرا شخص اس کا راستہ روک کر بولا۔

”فضول کو شش کرو گی، میری جان! میری بات مان لو اور چپ چاپ کمرے میں چلی جاؤ۔ ہمیں اپنا کام کرنے دو۔“

”منوج! میرے ساتھ ایسے لہجے میں بات مت کرو ورنہ تمہیں پتہ ہے کہ تم کتنا بچھتاؤ گے۔“ آرتی نے فراتے ہوئے کہا تو منوج مسکراتا ہوا ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ فون تک پہنچی اور نمبر ملانے کے بعد دراصل ہو جانے کا انتظار کرتی رہی۔ کچھ لمحوں بعد دراصل ہوتے ہی چند تمہیدی باتوں کے

بعد وہ بولی۔

”میں اس کے ساتھ پاکستان جانا چاہتی ہوں۔۔۔ نہیں، رقم ملے گی۔ اس کا دوست بندوبست کر رہا ہے۔۔۔ مجھے کوئی مجبوری نہیں۔۔۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اور اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہوں۔۔۔ نہیں، پاکستان جا کر نہیں۔ ابھی اور اسی وقت ہاں، کسی پنڈت کو بلوانا ہوگا۔۔۔ میں مسلمان نہیں ہو رہی اور نہ ہم دونوں میں کوئی ایسی شرط ہے۔۔۔ یہ میرا حتمی فیصلہ ہے۔۔۔ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔۔۔ ایسا نہیں ہو سکتا، تم مجھے دھوکہ دے رہے ہو۔۔۔ یہ غلط ہے۔۔۔ سنو، میں اپنی جان دے دوں گی۔“ اس نے ہمیں تک کہا تھا، پھر وہ ریسور کو گھورنے لگی۔ یقیناً دوسری طرف سے رابطہ کٹ گیا تھا۔ وہ کتنے ہی لمحوں تک کھڑی ریسور کو بونجی گھورتی رہی جیسے کچھ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ وہ بت، بنی کھڑی تھی مگر پھر اچانک دھماکتی ہوئی کسی ڈھمی شیرنی کی طرح دل پر بھینچی۔ یہی وہ موقع تھا جب مجھے کچھ کرنا تھا۔ میں نے منہ پر چھلانگ لگا دی جو حیرت سے آرتی کو دیکھ رہا تھا۔ میں نے ایک ہی منٹ کے میں گن اس سے چین لیں لیکن قادر کرنے سے خود کو مشکل روکا۔ پتہ نہیں، باہر کتنے لوگ تھے۔ ایسے میں قادر کی آواز موت کی دعوت دینے کے مترادف تھے۔ دل، آرتی سے الگ ہوا تھا۔ میں نے پوری قوت سے گن کا دست اس کے سر پر دے مارا، وہ لمحوں میں چمکا انا ہوا زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پھر میں نے منہ پر گن تانتے ہوئے آرتی سے کہا۔

”دل کو باقاعدہ دو، پھر اسے دیکھتے ہیں۔“

”شٹ کر دو اس کو مگر جلدی۔ وہ باس کا بچہ ادھر ہی آنے کو ہے۔“ آرتی نے پورے جوش سے کہا تو اس کے لہجے میں مٹی کا رنگ آ ہی گیا۔ یہ لاشعور بھی بڑے عجیب تھا شے دکھاتا ہے اور جیسے لاشعوری انداز میں آرتی کے سارے پرت لمحوں میں اتر گئے۔ جب میں دھیرے سے بولا۔

”میں نے جو کہا ہے، وہی کرو۔“ میرے کہنے پر آرتی مجھ سے کہاں سے بستر کی چادر اٹھالائی اور اس نے دل کو باقاعدہ دیا جو اتنی دیر میں آہستہ آہستہ ہوش میں آ رہا تھا۔

”منہ کو دیکھو، تم موت سے بچ سکتے ہو؟ لیکن اگر ہمارے ساتھ تمہارا ن کرو گے تو؟“ میں نے سر دے لہجے میں کہا تو اس نے مجھے گھور کر دیکھا۔ تبھی میں نے گن سیدھی کر لی۔ تو وہ بولا۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“

”تمیز سے بات کرو، منہ کو دیکھو اور یہ بتاؤ، باہر کتنے آدمی ہیں؟“

”ایک چمکیدار گیٹ پر ہے اور دو چھت پر ہیں۔“ اس نے قدرے اکڑ لہجے میں کہا۔

”بکواس کرتے ہو؟“

”میں ٹھیک کہہ رہا ہوں اور اگر تم سمجھو کہ یہاں سے نکل جاؤ گے تو یہ تمہاری بھول ہے۔ ابھی۔۔۔“ اس نے فخرہ مکمل بھی نہیں کیا تھا کہ میں نے گن کھما کر اس کے منہ پر دے ماری، وہ ”اؤخ“ کی آواز کے ساتھ چمکا گیا۔ تب میں نے اسے لاتوں اور گھونٹوں پر رکھ لیا، چند منٹوں میں وہ زمین پر تھا۔

”آرتی! تمہارا نمبر کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے پتلی سے لگا ہوا نمبر نکال لیا اور میری طرف سوا لہٹکا ہوں سے دیکھنے لگی۔

”اسے دنیا سے مکتی دے دو، مہارانی!“ میں نے زہریلے لہجے میں کہا۔ آرتی تیزی سے آگے بڑھی، خون کی ایک دھار نکل۔ وہ تڑپا اور پھر

ساکت ہوتا چلا گیا۔ دل یہ سب دیکھ رہا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

”کتھے آدمی ہیں باہر؟“

”منونج کچ کہہ رہا تھا۔“ اس نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”تمہارا بھی مکتی حاصل کرنے کا ارادہ ہے کیا؟“

”میں کچ کہہ رہا ہوں۔“

”چلو مان لیتا ہوں لیکن اب تم جھوٹ بولو گے کہ اس گاڑی کی چابی تمہارے پاس نہیں ہے جو باہر پورچ میں کھڑی ہے؟“

”منونج کے پاس ہے۔“ وہ بولا تو آرتی نے تیزی سے اس کی تلاشی لے ڈالی۔ اس کی جیب سے چابیاں مل گئیں۔ اب صرف گاڑی تک

پہنچنا تھا۔ میں نے سیل فون نکالا اور تیزی سے الحاف پاشا کے نمبر پیش کر دیے۔ پہلی ہی منٹ پر اس نے فون رسوا کر لیا۔

”کہاں ہو تم؟“ اس نے پوچھا تو مجھے اس کے لہجے سے اندازہ ہو گیا کہ اسے میرے انخوا کے بارے میں معلوم ہو گیا ہے۔

”مجھے جگہ کا کوئی پتہ نہیں لیکن کیا تمہیں پتہ ہے، مجھے انخوا۔۔۔“

”مجھے پتہ ہے اور میں اس جگہ کے آس پاس ہوں جہاں تمہیں رکھا گیا ہے۔ کوئی نشانی دے سکتے ہو؟“ وہ انتہائی تیزی سے پوچھ رہا تھا۔

میرے ذہن میں ایسا کچھ نہیں آیا جس سے میں اس کی رہنمائی کر سکتا، سچی میں نے کہا۔

”کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا لیکن ہو سکتا ہے، چند منٹ کے بعد تمہیں فائرنگ کی آواز سنائی دے۔ میں نکل رہا ہوں یہاں سے۔“

”تم نکل رہے ہو؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں، لیکن انتہائی خطرہ ہے۔ میں یہاں سے نکل کر تمہیں کال کرتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر کے جیب میں رکھ لیا۔ اب میں نے

دل کی طرف دیکھا اور آرتی کو اسے کھول دینے کے لیے کہا، چند لمحوں بعد وہ آزاد ہو گیا۔

”چلو، مہاراج! ڈرا گاڑی تک رہنمائی کرو۔“ میں نے کہا تو وہ جلدی سے اٹھ گیا۔ آرتی نے دوسری من گن اٹھالی۔ پورچ میں آ کر میں

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا اور آرتی اسے لے کر کھلی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ میں نے کار اشارت کی اور ایک دم سے بھاگادی۔ ہم پورچ سے گیت تک تقریباً

آدھے منٹ میں ہی پہنچ گئے۔

اتنی تیزی سے آتی ہوئی کار دیکھ کر چونکے اور اپنے کہیں سے نکل آیا، وہ اپنا پتہ تول بھی سیدھا نہیں کر پایا تھا کہ میں نے اس پر فائرنگ کر دی۔

وہ چیخا ہوا واہس پلٹا۔ اتنے میں چھت سے گولیاں برسنا شروع ہو گئیں۔ سامنے گیت بند تھا، میں نے دل سے کہا۔

”چلو، مہاراج! گیت کھولو۔“

”اوپر سے فائرنگ ہو رہی ہے۔“ اس نے دہشت سے کہا۔

”گیت تو کھولنا ہے ورنہ ہمیں اندر سے فائرنگ ہو جائے گی۔ یہاں تمہارے بچے کے چانس نہیں ہیں لیکن گیت کھولتے ہوئے شاید نچا جاؤ۔“

”اب چلو۔“ آرتی نے کہا تو دل بادل خواستہ چھے اتر گیا۔ پھر کار کی اوٹ لے کر گیت کی طرف بڑھا۔ اوپر سے برقی گولیاں شدت

اختیار کر چکی تھیں۔ دل نے گیت کھول دیا تو میں نے زن سے گاڑی نکال لی، جیسی میں نے دل کی چیخ سنی لیکن میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ میں ایک طرف چل پڑا۔ مجھے راستے کا کوئی اندازہ نہیں تھا، میں نے اگلے لمبے سیل فون پر ری ڈائل کر دیا۔

”کہو، شجاع؟“ الطاف کی پر جوش آواز سنائی دی۔

”تم اس وقت کہاں پر ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”جہاں تم قید ہو، میرا خیال ہے وہاں سے تھوڑی دور، میں فائرنگ کی آواز سن رہا ہوں۔“

”میں وہاں سے نکل آیا ہوں۔“

”اوتے دل خوش کر دیا۔“ یہ کہہ کر اس نے مجھ سے لوکیشن پوچھی۔ میں نے اسے سمجھایا تو اگلے پانچ منٹوں میں ہم مل گئے۔ وہ دو

کاروں تھے۔ میں نے اپنی کار تھوڑی اور الطاف کے ساتھ جا بیٹھا۔ آرتی جب کار میں بیٹھی تو الطاف نے کار بھٹکادی جب میں نے پوچھا۔

”تم لوگ یہاں کیسے؟“

”جیسے ہم دوست بنا لیتے ہیں، اسے اکیلا نہیں چھوڑتے، مائیر پورٹ تک جانے والی کرائے کی کاریں ہمارے دوست ہی لے کر گئے تھے۔

ایک کار تمہاری نگرانی پر تھی۔ تمہاری کار طے شدہ راستہ چھوڑ کر کسی اور طرف نکلی تو مجھے اطلاع ملی۔ ہمارا دوست تمہاری نگرانی کرتا رہا۔ سونا بازار سے

سنی سینٹر تک اور پھر آرتی نے جب کار واپس بھجوائی تو مجھے شک ہو گیا۔ میں نے نگرانی جاری رکھنے کو کہا اور پھر میرا شک صحیح نکلا، وہ تمہیں اجنبی جگہ لے

گئے۔ کچھ پر بعد مدیم کافون آ گیا کہ تمہیں انوار کرایا گیا ہے تو میں پوری تیاری سے یہاں پہنچ گیا مگر مصیبت یہ ہوئی کہ جس نے نگرانی کر کے یہاں کا

پتہ معلوم کیا تھا، وہ تھوڑا الجھن کا ڈنکار ہو گیا۔“

”الطاف! باتوں کا بالکل وقت نہیں ہے۔ اب میرے لیے اتنا خطرہ نہیں رہا لیکن آرتی کی زندگی شدید خطرے میں ہے، اس نے اپنی

جان پر کھیل کر مجھے وہاں سے نکالا ہے۔ اب کسی بہت بھی محفوظ مقام پر چلو۔۔۔“ پھر ہم میں کوئی بات نہ ہوئی اور تقریباً آدھے گھنٹے بعد ہم جمیرہ سٹیج

ہی کے علاقے میں کہیں ایک گھر میں پہنچ گئے جو بہت خوبصورت تھا۔ میں نے جاتے ہی پھٹی ہوئی شرٹ بدل لی، منہ ہاتھ دھو کر فریش ہوا اور جب

ڈرائنگ روم میں واپس آیا تو الطاف مشکر چہرہ لیے بیٹھا تھا، وہ اس وقت تھا تھا۔

”کیا بات ہے، یوں کیسے بیٹھے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”آرتی دوسرے کمرے میں فریش ہونے کے لیے گئی ہے۔“

”مطلب۔۔۔“

”بالکل جگید ہے۔“

”میں بھی یہی چاہتا تھا، یہ آرتی کسی چھوٹا بچہ نہیں تھی، اسے تعلق رکھتی ہے لیکن بیٹھتے اور غیرہ کے بارے میں پوری معلومات رکھتی ہے۔ اس سے تم سب کچھ معلوم کر سکتے ہو لیکن تھوڑی عقل اور قدرے پیار سے، تشدد سے نہیں۔ میں اب تمہارے پاس چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ تم اپنا مطلب نکالو، پھر بعد میں اس کے متعلق فیصلہ کر لیں گے۔“

”میں بیٹھتے کے نیٹ ورک کے متعلق تھوڑا بہت جانتا ہوں، اور اگر یہ تفصیل بتا دے گی تو۔۔۔“

”یہ تمہارا کام ہے۔“

”کام تو میرا ہی ہے لیکن تم حیدر کو بتائے بغیر یہاں سے نکل جانا، انکٹ وغیرہ کا بندوبست رکھنا اور ہو سکے تو تمہیں کو بھی۔۔۔ وہ بہت اچھا ہے، کہیں۔۔۔“

”الطاف! میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ تم اپنا کام کرو، میں باقی سنبھال لوں گا۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔ ”آؤ، چائے پیجئے ہیں۔“ ہم ایک دوسرے کمرے میں پہنچے تو آرتی ایک لڑکی سے باتیں کر رہی تھی۔ ان کے درمیان میز پر چائے کے ساتھ دیگر لوازمات دھرے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی وہ لڑکی اٹھ گئی اور آرتی چائے بنانے لگی تب میں نے کہا۔

”دیکھو، الطاف! ہم وہاں سے زندہ سلامت آ گئے، یہی غنیمت ہے لیکن میں جو کہنے جا رہا ہوں، اسے سن کر بھڑک مت جانا۔“

”کہو؟“ وہ میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”تم میرے دوست ہو، میرے لیے فخر کی بات ہے مگر تم شاید نہیں جانتے کہ میں آرتی سے بڑا احترام کرتا ہوں، اتنی کہ جس کا تم اندازہ نہیں کر سکتے۔“

”یہ تم نے پہلے کبھی نہیں بتایا؟“ اس نے آرتی سے کہہ لیتے ہوئے کہا۔

”اس کا موقع ہی نہیں ملا اور میں نے خود بھی کسی کو نہیں بتایا، یہاں تک کہ آرتی کو بھی آج ہی معلوم ہوا ہے۔“

”ایسا ہے کیا؟“ الطاف مسکراتے ہوئے بولا اور آرتی کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

”مجھے نہیں پتا، الطاف! یہ مجھے کتنا چاہئے ہیں لیکن میں ان سے بہت پیار کرتی ہوں۔“

”میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آرتی کے ساتھ شادی کر لوں، اس کے لیے تمہیں دو کام کرنے ہوں گے۔“

”وہ کیا؟“ الطاف نے حیرت سے پوچھا اور بلاشبہ یہ حیرت مصنوعی تھی۔

”ایک تو کسی نہ کسی پنڈت کا بندوبست کرنا ہوگا جو ہمارے تعلق کو مذہبی رنگ دے دے اور دوسرے فوری طور پر اس کے لیے پاسپورٹ کا بندوبست کر دے گا کہ ہم یہاں سے نکل کر پاکستان چلے جائیں۔“ میں نے تفصیل سے سمجھایا۔

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن اس کے لیے کل تک کا وقت چاہئے ہوگا۔“

”ڈونٹ وری، ہم انتظار کر لیں گے۔“ آرتی نے جلدی سے کہا۔

”لیکن اچھائی خلیہ ہمارے دشمن نہ ہم تک پہنچ جائیں۔“

”اوکے، سب ہو جائے گا۔“ ہمارے درمیان چند لمحوں کی خاموشی چھائی رہی تو الطاف نے پوچھا۔ ”تم لوگوں کے دشمن کون ہو سکتے

ہیں؟“

”بہت ہیں، آرتی تمہیں پوری تفصیل سے بتا دے گی اور تم اس پر اصرار کر سکتے ہو۔“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا شاید بات چلتی مگر حیدر کا

فون آگیا۔

”کہاں ہو تم؟“

”مجھے خود نہیں پتہ، کہاں ہوں۔“

”تم اس وقت محفوظ تو ہو؟“

”ہاں، لیکن میں اب یہاں سے نکل رہا ہوں۔“

”تم وہیں ٹھہرو، ہمارے آدمی تمہیں پک کر لیتے ہیں۔ وہ سب تمہارے پاس کہیں ہوں گے۔“

”انہیں کیسے؟“

”آرتی نے ڈرامہ کرکھو اور واپس جانے کے لیے کہا تو اسے یہ رویہ عجیب لگا، وہ واپس سڑ گیا لیکن مجھے فون کر دیا۔ میں نے اسے گھرانی کرنے کو

کہا۔ میرا شک صحیح نکلا اور میں نے اپنے بندے وہاں بھجوائے تو وہاں پولیس اور لاشیں تھیں۔ تمہارا اور آرتی کا نام نشان تک نہیں تھا، آرتی کو دھر ہے؟“

”میں آرتی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، میں خود پتہ نہیں وہاں سے کیسے نکلا ہوں، بہر حال گھر آ کے بتاؤں گا، تم مطمئن رہو، میں پہنچ

جاؤں گا۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ مزید بات کرے۔

”شہا! آپ نے حیدر سے بھی پھوٹ بولا؟“ آرتی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”مجھے تمہاری حفاظت چاہئے، جب ہم پاکستان پہنچ جائیں گے تو سب ٹھیک کر لوں گا میں۔“ یہ کہہ کر میں نے جانے کا لہجہ لیا، پھر آرتی

سے کہا۔ ”یہ میرا بہت پیارا دوست ہے، جان بھی دے سکتا ہے میرے لیے۔ تم بغیر کسی خوف کے یہاں رہنا، میں رات کسی وقت واپس آ جاؤں گا۔“

”اپنا خیال رکھنا۔“ الطاف نے قدرے جذباتی انداز میں کہا تو میں نے اس کا ہاتھ تھپتھا دیا۔ میں وہاں سے نکلا اور کچھ دیر بعد مجھے ٹیکسی

مل گئی۔ میں نے اپنا جائزہ لیا اور مطمئن ہو جانے کے بعد میں نے شوپا کو فون کیا، میری آواز سننے ہی وہ انگریزی میں بولی۔

”ہائے سویت! اسنا ہے کہ تم دشمنوں کے چنگل سے نکل آئے ہو؟“ اس کے لہجہ میں خوشی پھوٹ رہی تھی۔

”ہاں، اب تمہارے پاس آنا چاہ رہا ہوں۔“ میں نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

”خوش کر دیا، پیارے! آؤ، میں تمہیں بھی خوش کر دوں گی۔“ اس نے نکلتے ہوئے لہجہ میں کہا۔

”کیا تم ڈنر لے چکی ہو؟“

”ارے کہاں، تمہاری ٹکرنے ساری بھوک اڑادی۔ اب جی بھر کے کھاؤں گے۔“

”میں آرہا ہوں لیکن کہاں آؤں۔؟“ میں نے پوچھا تو اس نے ہونٹوں کا نام بتایا۔ وہ دودھی کا مہنگا ترین ہونٹ تھا اور مجھے وہاں لابی میں پہنچ کر شوقینا کوفن کرنا تھا۔ کافی دیر بعد میں اس ہونٹ کی لابی میں موجود تھا۔ میرے فون کے جواب میں کچھ دیر بعد وہ لڑکیاں میرے قریب آکھڑی ہوئیں۔

”خوش آمدید، شجاع صاحب! آئیے، ماما جی آپ کا انتظار کر رہی ہیں۔“ میں نے ان کی طرف غور سے دیکھا، وہ بلاشبہ آشرف کی لڑکیاں تھیں جو میری طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھیں۔ میں بھی مسکرایا تو انہوں نے قدم بڑھا دیئے۔ میں ان کے ساتھ چلتا چلا گیا، یہاں تک کہ ہم لفٹ میں داخل ہو گئے۔ جب تک ہم لفٹ سے باہر آئے، وہ بڑے فنکارانہ انداز میں میری تلاش لے چکی تھیں۔ میں نے اسے محسوس تو کیا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ مجھے مختلف راہداریوں سے گزارتی ہوئیں ایک کمرے کے سامنے جا رکیں۔ ہلکی سی دستک کے جواب میں ایک لڑکی نے دروازہ کھولا، میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ میں کمرے کے اندر آیا تو وہ بولی۔

”پلیز اپنا سیل فون دے دیں، ماما جی کو اچھا نہیں لگے گا جب یہ ڈسٹرب کرے گا۔“ میں نے بحث نہیں کی اور فون سیٹ اسے دے دیا، تبھی وہ دونوں لڑکیاں مجھے لیے ہوئے ایک بیڈروم میں چلی گئیں جہاں شوقینا ایک جہازی بیڈ پر بڑے کروٹ سے لیٹی ہوئی تھی، وہی دوسری بیڈ چادروں میں لیٹی ہوئی لیکن اس وقت انہی چادروں سے اس کا بدن چمک رہا تھا، ہلکا ہلکا میک اپ مگر گہری نپ اسٹک، وہ کسی طور پر بھی اوجھڑ کر دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے میری طرف دیکھا اور آنکھوں سمیت پورے وجود سے مسکرا دی، پھر بڑے جذب سے بولی۔

”تمہیں اندازہ نہیں کہ میں تمہیں دیکھ کر کس قدر خوشی محسوس کر رہی ہوں۔۔۔ خوش آمدید آؤ، میرے پاس بیٹھو۔“ اس نے انگریزی میں کہا اور بیڈ کی دوسری جانب بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں اطمینان سے بیٹھ چکا تو وہ بولی۔ ”آرتی اتنی بہت دکھانے گی، میرے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ لڑکی اتنی با اعتماد دیکھی نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے بارے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا کہ وہ تمہیں انہوا کر لے گی مگر یہ ایک طرح سے اچھا ہوا۔“ اس نے ایسے لہجے میں کہا جس سے مجھے لگا کہ وہ نشے میں ہے۔

”کیسے؟“ میں نے بیڈ پر پھیلتے ہوئے پوچھا۔

”تمہارے بارے میں میرا ہی نہیں، بیٹھونٹ کا بھی اعتماد بڑھ گیا ہے۔ تمہاری صلاحیتیں تو سامنے آئی ہی ہیں لیکن میں یہ احساس ہوا ہے کہ یہاں کے پورٹ سیٹ ورک کو دوبارہ دیکھیں اور وہ بھی پوری ذمہ داری کے ساتھ۔ کون کس کا آدمی ہمارے درمیان میں ہے، اس کی چھان بین کرنا ہوگی۔“ وہ سرور کی کیفیت میں کہتی چلی گئی۔

”کیا پہلے اس طرف دھیان نہیں دیا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہ بیٹھونٹ کی ذمہ داری ہے، ہماری نہیں۔ وہ ناکام رہا یا کامیاب، ہمیں اس سے بھی غرض نہیں۔ ہم نے پوری ذمہ داری سے اپنا کام کیا

اور ہم کامیاب ہیں۔“

”یعنی میڈیسن پراڈکٹ؟“

”یقیناً یہ ہری داس بھی تو میری ہی تلاش کا نتیجہ ہے اور اب تم۔۔۔ اگر لیٹنٹ ناکام بھی رہا ہے تو ہمیں فرق نہیں پڑنے والا، نیاسیٹ اپ بنا لیں گے۔“ یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی پھر سائیز بھیل پر دھرا ہوا سگریٹ کس اور لائٹنر میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ”لو سگریٹ چلو۔“

”آشرم سے آنے کے بعد میں نے سگریٹ نہیں پی، خواہش ہی نہیں ہوتی۔“ میں نے وہ دونوں چیزیں ایک طرف رکھتے ہوئے کہا تو وہ ہنس دی۔ پھر خود ایک سگریٹ سٹاک کر بولی۔

”خواہش کیے کا لفظ ہے، انسان کی زندگی سے کس قدر جڑا ہوا۔“ اس نے یہ کہا اور بھر پور ریش لے کر دھواں میری طرف پھینک دیا۔ میں نے برا متانے بغیر حجاب دیا۔

”انسانی وجود کی بنیاد خواہش پر ہی ہوتی ہے مگر انسان اپنی خواہشوں کے تعاقب میں خود اپنی خواہشوں کا غلام بن کر رہ جاتا ہے، جبکہ ہم فطری طور پر وقت کے تابع ہیں۔“

”ہم ٹھیک کہتے ہو، شجاع! ہم اس دنیا میں آتے ہیں تو ہمیں زندگی کا یہ سز بھی ملے کرنا ہے۔ یہ ہماری مجبوری ہی نہیں، بے بسی بھی ہے۔ بس انسان لاپٹی ہو جاتا ہے تاکہ اس بے بسی کے ستر میں آسائیاں پیدا ہو جائیں۔“

”یہ تو طبیعت ہے، شویتا! ہم بے بسی کو تو محسوس کرتے ہیں لیکن لفظ زندگی پر غور کیوں نہیں کرتے حالانکہ کتنا بھر پور لفظ ہے، مثبت قوتوں سے معمور و خوبصورت لفظ! مگر ہوتا ہے کہ ہم اسے اپنی خواہشوں سے اس قدر آلودہ کر دیتے ہیں کہ زندگی کے معنی تک گم ہو کر رہ جاتے ہیں۔“

”ہمارے اندر ایک اچھا انسان موجود ہے، وہ ہمیں زندگی کے حقیقی معنوں کا احساس دلاتا رہتا ہے لیکن ہم انہماک میں ایسے راستوں پر نکل پڑتے ہیں کہ جن کی تڑو کوئی منزل ہوتی ہے اور نہ ہی ہمارا اصل راستہ ہمیں دکھائی دیتا ہے۔ ہم حال کب، بھوک زیادہ تو نہیں لگی؟“

”نہیں، شویتا! ابھی کچھ دیر بعد سکون سے ڈنر لیں گے۔“ میں نے کہا تو وہ ہنس دی۔ سمجھی اس نے سائیز بھیل پر دھری پتیل کی چھوٹی سی گھنٹی اٹھا کر ہلائی۔ جس کے جواب میں ایک لڑکی آن وارد ہوئی، شیوہ جی نے اسے اشارہ کیا تو وہ پلٹ گئی۔ چند منٹوں بعد وہ لڑکی بیڈ پر ہی جام و بنا سجانے لگی۔

”خجّو گے؟“ وہ اپنے لیے جام ہلاتے ہوئے بولی۔

”نہیں، تمہیں پینے ہے کہ میں نہیں پیتا۔“ میں نے سکون سے کہا اور بیڈ کے ساتھ ٹیک لگالی۔

”تمہارا گلاس خالی پڑا ہے۔ اگر تمی چاہے تو بتا دینا، میں خود اپنے ہاتھوں سے تمہارے لیے جام بناؤں گی۔“

”شکر یہ لیکن اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ میں نے کہا تو وہ ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر گئی پھر اپنے ہونٹ صاف کرتے ہوئے بولی۔

”شجاع! لگتا نہیں کہ تم سا دھو، منہ یا کوئی درویش ہو سکتے ہو۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تم ابھی جرائم کی دنیا میں نہیں اترے مگر اس دنیا میں

دہشت کی علامت بن جانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہو۔ ایک بات سمجھ میں نہیں آتی؟“

”وہ کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”برقی ہوئی بارش میں جب بندہ نکلتا ہے، چاہے اس کے پاس چھتری بھی ہو مگر بھیگتا ضرور ہے۔ جرائم کی دنیا میں آکر شراب اور شباب سے کیسے بچ سکتے ہو، کب تک بچو گے؟“ وہ اپنے لیے دو مراپیگ بناتے ہوئے بولی۔

”اس کا سیدھا سا جواب تو یہی ہے کہ جب تک بیچ-کا۔ جرم کی دنیا میں مٹنی ہوش مندی سے رہا جائے، اتنا ہی بہتر ہے۔ میں اس لیے بھی نہیں بیچتا۔“

”مان لیا، شجاع! اگر نہ بھی بیچ تو کوئی بات نہیں لیکن یہ شباب، یہ جوان مہیکتے ہوئے بدن، اتنا مدہوش کر دینے والا حسن، یہ تو ایک فطرتی شے ہے۔ کیوں بھاگتے ہو اس سے؟“

”میں کب بھاگتا ہوں اس سے لیکن اس سے حلق میری اپنی ایک سوچ ہے۔“

”تاؤ، پلیز، تاؤ۔ میں جانتا چاہتی ہوں؟“

”کیوں؟“ میں نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”میری زندگی میں تمہارے جیسے مضبوط اعصاب کا بندہ نہیں آیا۔ میں جانتا چاہتی ہوں کہ وہ کیا قوت ہے جس کے تلے بوتے پر تم خود پر قابو رکھتے ہو ورنہ اوپر سے جتنا مرضی خول چڑھا لیا جائے، حسن کے آگے مرد کی فطری خواہش بناوٹ کر کے سارے خول توڑ دیتی ہے۔ بے بس ہو جاتا ہے انسان، تاؤ، وہ پر اسرار قوت کیا ہے؟“ اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو میں دھیرے سے ہنس دیا۔ وہ پوری طرح میری طرف متوجہ تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے جام پکڑ لیا۔ اس نے حیرانگی سے میری طرف دیکھا تو میں نے اس آدمی سے زیادہ شراب سے بھرے ہوئے گلاس میں تموک دیا، پھر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا۔

”لو بیو۔“ میرے ہاں کہنے پر اس نے نفرت سے منہ پھیر لیا اور اگلے ہی لمحے اس کے منہ سے یوں آواز نکلی جیسے ابھی تے کر دے گی۔

”یہ کیا حرکت کی ہے تم نے، شجاع؟“ وہ کراہت سے بولی تو میں نے پھر گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

”لو بیو، نا، شو بیو!“

”نہیں، میں نہیں پی سکتی۔“ یہ کہہ کر اس نے قبیل کی وہ کھٹی بجائی، فوراً ہی وہ لڑکی اندر آگئی۔ شو بیو نے میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے گلاس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے لے جانے کو کہا۔ پھر نیاپیگ بنا کر دو تین سپ لیے اور بولی۔

”یہ کیا کیا تم نے؟“

”میں تمہیں سمجھانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک مدہوش کر دینے والی شے میں محض تموکا ہے جس سے تمہیں اتنی نفرت ہوئی کہ گلاس تک خود سے دور کر دیا، بالکل ایسے ہی میرے لیے یہ سارے مدہوش کر دینے والے بدن تموکے ہوئے جسم ہیں۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں پھر چند لمحوں بعد فیس میں بولی۔

”میں مانتی ہوں کہ تم وہ جیہد ہو، خواہ سورت ہو لیکن میں نہیں جانتی تھی کہ تم اتنے خود پسند بھی ہو سکتے ہو۔“

”مجھے نہیں پتہ کہ میں خود پرست ہوں یا نہیں مگر میرا اپنا معیار ہے اور اپنی ترجیح، جب مجھے وہ مل جائے گی تو میں خود بڑھ کر اسے حاصل کر لوں گا۔“

”مطلب کہ آرتی، رکتی جیسی لڑکیاں جو ایک جہان کو مدہوش کر رہی ہیں، تمہارے معیار کی نہیں تو وہ کون سی ایسا نہیں ہیں جو۔۔۔“ وہ

جذبات کی زد میں اونچا بولنے لگی تھی۔ میں نے اس کی بات کا نئے ہوئے کہا۔

”شویتا! وہ کوئی بھی ہو، اپنے جسم کی بنیاد پر دوسرے کو حاصل کرنے والی نہ ہو۔ وہ کچھ بھی کر لیں، تھوک ان کا مقدر ہوتا ہے۔“

”تم کال گرل یا طوائف کو انسان ہی نہیں مان رہے، وہ بھی اسی بدن میں جذبات رکھتی ہیں جس کو تم مرد لوگ تو چتے ہو۔ اسے بھی بھوک

گفتی ہے اور معاشرہ اسے مفت روٹی نہیں دیتا۔ یہ تھوک کس پر ہوتی، تم پر تمہارے معاشرے پر یا بدن کی بنیاد پر دوسروں کو حاصل کرنے والی پر؟“

”مجھے تمہاری بات سے اختلاف نہیں ہے۔“ میں نے کہا تو جیسے اس نے سنا ہی نہیں، بولی۔

”طوائف بھی اسی معاشرے کا حصہ ہے جہاں سے تم اپنا معیار تلاش کر رہے ہو۔ طوائف بھی اپنے بدن کی بنیاد پر کسی کو حاصل کرنے کی

کوشش نہیں کرتی، یہ تمہارا معاشرہ اسے سب سکھاتا ہے، طوائف کا نام بھی اسی نے دیا ہے۔ یہ کہیں اور سے نہیں نکلی، تمہارے معاشرے نے اسے جنم

دیا ہے جس سے تم نفرت کر رہے ہو۔“

”تمہاری ساری باتیں سچ ہیں۔ مجھے ان سے قطعاً انکار نہیں لیکن معاشرہ اگر طوائف کو جنم دے رہا ہے تو دیتا رہے۔ مجھے اگر نفرت کرنے

کا حق نہیں تو محبت پر مجبور بھی نہیں کر سکتی ہو۔ میں تو بس پہلو بچا کے نکل جانا چاہتا ہوں اور تم مجھے اس کی بھی اجازت نہیں دے رہی ہو بلکہ اسی گندگی

میں اتر جانے کو کہہ رہی ہو۔“

”یہ گندگی بھی تو تمہارے معاشرے کی ہے۔“

”تو کیا ضروری ہے کہ خود کو اس سے آلودہ کر لیا جائے؟ جو آلودہ ہونا چاہتے ہیں، وہ ہوتے رہیں میں کم از کم ایسا نہیں چاہوں گا لیکن یاد

رکھو کہ تم اس گندگی پر جتنے بھی دوق چڑھاؤ، جتنے بھی مچکے انداز میں پیش کرو، یہ گندگی رہے گی۔“

”تمہارے معاشرے کی ڈیما نڈ ہے یہ اسے مجبور کرو یا جاتا ہے۔“

”میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ یہ معاشرے کا مقلوم ترین طبقہ ہے لیکن کیا اس نے خود کو شش کی کہ اس مظلومیت سے نکل آئے۔ تمہارے

بقول، معاشرہ اسے جنم دے رہا ہے تو پھر جنم دینے والا اسے کیسے ختم کر سکتا ہے؟ اسے خود کو شش کرنا ہوگی۔“

”وہ کیا خاک کوشش کرے گی، تم طوائف کی بات چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ اس اندر گھری میں کیا تم کہہ سکتے کہ تمہیں تمہارا معیار مل جائے گا۔

اس کے بدن پر بھی کوئی تھوک گیا ہوگا تو کیا تم اسے چاٹ لو گے؟“

”نہیں، شوہن! تم فلڈ ریش پر سوچ رہی ہو۔ سوچ یہ ہونی چاہئے کہ اگر میں نے کسی کے بدن پر نہیں تھوکا تو مجھے بنا تھوک کے مجھے میرا

ساتھی ملے گا۔“ میں نے کہا تو وہ نخوت سے بولی۔

”کیا ثبوت ہوگا تمہارے پاس؟“

”میرا یقین، اور مجھے اپنے یقین پر پورا بھروسہ ہے۔ یہاں اتنے اچھے لوگ ہیں کہ تم تصور بھی نہیں کر سکتیں۔ آؤ تو اندھیرا چاہے گا، اس کے لیے اندھیرا روشن ہوتا ہے۔ پورے چمکتے ہوئے دن کی روشنی میں وہ ہانگلا اندھا ہوتا ہے۔ آؤ نہیں بلکہ انسان کی نظروں سے دیکھو، سب نظر آئے گا۔“

”تمہاری باتوں سے تو یوں لگتا ہے کہ تم طوائف کو عورت ہی نہیں سمجھتے بلکہ اگلدان۔۔۔“

”نہیں، عورت مقدس ہے، اتنی مقدس کہ شاید تم اس کا تصور بھی نہ کر سکو۔ سونا جہاں بھی پڑا ہو۔ گندگی میں، مٹی میں، جوہری کی دوکان پر یا کسی بدن کا حصہ ہو، وہ سونا ہی رہتا ہے۔ مقام بدلنے سے اس کی حیثیت میں فرق نہیں آجاتا۔ وہ ناک کا لوہا بھی بنتا ہے، ماتھے کا جھومر اور پاؤں کی پائل بھی لیکن وہ اگر گندگی میں پڑا ہو تو کتنا دکھ ہوگا۔ اس کے دکھ کا اندازہ تم کر سکتی ہو جو اس شے کی اصل حقیقت سے واقف ہو۔ ماں بھی عورت ہے لیکن اس کا اصلی مقام یہ ہے کہ وہ اپنی اولاد کو اصلی تربیت دے۔ جہاں وہ اپنے مقام سے ادھر ادھر ہوئی، اس نے اپنی اہمیت گنالی، اس دنیا پر عورت تخلیق کا شمع ہے، شوقیہ ریوی اور سحاشردا گرامی کوکھ کا بیو پار کرنا شروع کر دے تو کیا اس کو جائز مان لیا جائے گا؟ کم از کم میں ایسا نہیں کر سکتا۔“ میں نے جھل سے کہا، ہاتھ میں پکڑا ہوا گلاس ایک طرف رکھ کر سوچ میں گم ہو گئی۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور وہ بچھکے ہوئے لہجے میں بولی۔

”تم مہمان ہو، شجاع امیں نے تمہارے بارے میں کتنا اچھا اندازہ لگایا تھا، مجھے معاف کر دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اپنے دونوں ہاتھ میرے پیروں پر رکھ دیئے۔ تو میں نے جلدی سے اپنے پاؤں ایک طرف کرتے ہوئے کہا۔

”یہ کیا کر رہی ہو تم۔۔۔“

”میرے اندر کی عورت مجھے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں ایسی کسی راہ پر چلوں گی جہاں میری کوکھ ہی میرا راستہ روک کر مجھ سے سوال کرے گی۔ بس، شجاع امیں کچھ اور نہیں سن پاؤں گی۔“ اس نے انتہائی دھکی لہجے میں کہا۔

”شانت ہو جاؤ، شوہتا!“ میں نے اسے اپنے قریب کر کے تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ وہ کتنی ہی دیر تک میرے قریب آ کر روتی رہی، پھر آہستہ آہستہ پرسکون ہو گئی تو میں نے کہا۔

”شوہتا! بھوک لگی ہے، آؤ، کھانا کھائیں۔۔۔“ میں نے کہا تو وہ اٹھ گئی۔ ڈنر کے دوران ہم آرتی، میرے انخوا اور پاکستان میں کام کا پلان کیا ہوگا، اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس نے کچھ قدرے چھوٹا راجن گروپ کے بارے میں بھی بتایا اور کچھ اپنے بارے میں بھی باتیں کرتی رہی۔ پھر یونہی باتیں کرتی چلی گئی، اتنی کہ مجھے لگا جیسے وہ خود پر لدے ہوئے بوجھ اتار کر پھینک رہی ہے۔ تب میں نے وہاں سے اٹھ جانا چاہا۔ اودھائی باتوں کے بعد جب میں جانے لگا تو وہ بولی۔

”ٹھیک ہے، شجاع! پھر ملاقات ہوگی۔ بلاشبہ تم ایک منفرد شخصیت کے مالک ہو مجھے تمہارے ساتھ پرفخر ہوگا۔“

”شوہتا امیں کوئی منفرد بندہ نہیں ہوں۔ میں تو بس ہر شے، رشتے اور تعلق کی حقیقت پہنچانے کی کوشش کرتا ہوں جیسے ہم پہلی بار ملے تھے، تب اگر تمہاری آنکھوں میں ہوس کی بجائے ممتا ہوتی تو حالات کچھ اور ہوتے۔ تعلق بھی تو حالات میں تبدیلی کا باعث بنتے ہیں۔“ میں نے کہا تو وہ افسردہ ہو گئی اور میں اس کے پیلروم سے نکل آیا۔ اس لڑکی نے میرا سیل فون واپس کر دیا اور پھر میں ہوٹل سے نکل آیا۔ رات خاصی بھیک چکی تھی۔ میں

جب گھر پہنچا تو حیدر اپنے بیڈروم میں سو رہا تھا۔ میں اپنے کمرے میں چلا گیا، اجڑی ہو کر بیڈ پر لیٹا تو نیند قابو تھی۔ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ صبح حیدر کو کس طرح مطمئن کرنا ہے؟ یہی سوچتے ہوئے تجانے کب میری آنکھ لگ گئی۔ اگلی صبح ناشتہ کی میز پر حیدر تجھایا تھا۔ میں جب کرسی گھسیٹ کر اس کے سامنے بیٹھا تو اس نے پوچھا۔

”وہاں سے کیسے نکلے اور پھر کہاں رہے؟“ یہ کہتے ہوئے اس نے جوں بھر کمری طرف بڑھایا۔

”ان کا آپس میں جھگڑا ہو گیا تھا آرتی کو پہلے حاصل کرنے پر، اسی جھگڑ میں مجھے وہاں سے نکلنے کا موقع مل گیا۔ مجھے راستوں کا علم نہیں تھا، یونہی چلتا رہا ایک بازار میں آ گیا اور کافی دیر تک ایک کافی ہاؤس میں بیٹھا رہا۔ پھر وہاں سے ایک سنور میں گیا، کپڑے تبدیل کیے اور شوٹنگ کے پاس چلا گیا۔ اس کے ساتھ ڈانکر کے گھر آ گیا۔“ یہ کہہ کر میں نے گلاس منہ کو نکالا لیا۔ وہ میرے سامنے سے جواب پر مطمئن نہیں ہوا تھا۔ سو کر یہ کر پوچھتا رہا۔ میں اسے بتاتا رہا، ناشتہ کر چکے تو میں نے کہا۔

”ایک مشورہ کرنا ہے تم سے۔“

”یوں؟“ اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”پاکستان میں ناکلے تجھابے اور ان دونوں بہت افسردہ ہے۔ ہم سب اسے نظر انداز کر رہے ہیں۔ میں اس کی شادی کے متعلق سوچ رہا ہوں، کیا خیال ہے تمہارا؟“

”کیا تم اس سے شادی کرنا چاہتے ہو؟“

”نہیں، میں اس کے لیے لڑکا دیکھنا چاہتا ہوں اور یہ بھی چاہتا ہوں کہ ناکلہ کو اس کے لیے یہی طور پر تیار کروں۔“

”خیال تو ٹھیک ہے مگر ایسا لڑکا کون ہو سکتا ہے۔“

”ندیم، اپنا ندیم۔“

”کیا وہ اس سے شادی کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ اسے معلوم ہے کہ وہ ماسکری رکھیل۔۔۔“

”ہات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“

”لیکن مجھے نہیں یقین کہ وہ مانے گا۔ پہلے کی بات اور تھی، اب نہیں۔۔۔“

”اب کیا ہو گیا ہے۔۔۔؟“

”اس کے پاس دولت آ رہی ہے، اسے وہ راستہ نظر آ گیا ہے جہاں سے دولت آتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ہم بات کر کے دیکھ لو۔“

”وہ تو میں آج ہی دفتر میں کروں گا۔ اگر اس نے ہاں کر دی تو پھر ناکلہ کو سمجھانا کوئی مشکل نہیں ہوگا۔“

”ہاں، ایسا تو ہے۔“

”بہر حال، یہ میری سرور دی ہے لیکن تمہیں ایک کام کرنا ہوگا۔ اگر اس نے انکار کر دیا تو دو ہفتے کے لیے اکیلا پاکستان جانا چاہوں گا اور اگر

ہاں کر دی تو اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ تم ہماری نکت اوکے کروانے کا بندوبست کرو۔" میں نے کہا تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"کیا بات ہے، حیدر اتم سوچ میں پڑ گئے ہو؟"

"نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، تم چلے جاؤ گے، اسے میں نے تھوڑا محسوس کیا ہے۔ تم مجھے فون کرو، میں پاسپورٹ لے کر جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ گیا تو میں بھی دفتر چل دیا۔

دفتر میں وہ تینوں مجھے خوشگوار چہرے کے ساتھ ملے۔ میں اپنے آفس آیا تو وہ تینوں آگے۔ کچھ دیر باتیں کرتے رہنے کے بعد کنول نے

پوچھا۔

"جائے نہیں گے یا کافی؟"

"ابھی کچھ دیر ٹھہرو۔ مجھے نمیم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے، اس کے بعد۔۔۔"

"آپ کریں بات، ہم تھوڑی دیر میں آجاتے ہیں۔" عیش نے اٹھتے ہوئے کہا تو کنول بھی اٹھ گئی۔ میں نے انہیں روکا، وہ چلے گئے تو میں نے کہا۔

"نانا تمہیں کیسی لگتی ہے؟"

"ابھی بلکہ بہت اچھی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ عامر کے ساتھ نہ رہتی تو۔۔۔"

"وہ بہت بلند اقبال ہوتی، کسی بہت اچھے گھرانے میں اس کا رشتہ ہو جاتا۔ اسے عزت ملتی، وہ معاشرے میں سر اٹھا کر جی سکتی لیکن اب

کچھ نہیں ہو سکتا، اب شاید وہ انسان نہیں رہی؟"

"ایسا نہیں ہے۔" نمیم نے قدرے جوش سے کہا۔

"اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔ اگر اس سے عامر کی رکھیل ہونے کا نیشنل اتار دیا جائے تو؟"

"تو وہ معاشرے میں عزت سے رہ سکتی ہے۔"

"کون دے گا عزت؟"

"کوئی کسی کو عزت نہیں دیتا، خود حاصل کرنا پڑتی ہے اور نائیک نے تو کوشش بھی شروع کر دی ہے اپنا کاروبار شروع کر کے وہ اس راہ پر چل

رہی ہے۔"

"تم شادی کرو گے اس سے؟" میں نے یکدم کہہ دیا۔

"اگر آپ فقط میری رائے معلوم کرنا چاہتے ہیں تو میرا جواب ہاں میں ہے لیکن اگر آپ بڑا بھائی ہونے کے ناطے سیدھے سیدھے حکم

دیں کہ میں نائیک سے شادی کر لوں تو مجھے خوشی ہوگی، ایسا اس لیے کہ مجھے احساس ہوگا کہ آپ کو مجھ پر مان ہے۔"

"اوہ نمیم! خوش کر دیا ہے تم نے۔" میں نے جوش جذبات سے کہا اور اسے گلے لگا لیا۔ "مجھے تم پر مان ہے، میرے بھائی! میں نے

اسے خود سے الگ کر کے بیٹھے کو کہا، وہ بیٹھ گیا تو بولا۔

”اس کی فطرت میری نہیں ہے۔ جب آپ دشمنی ہوئے تھے، تب اس نے کسی ماں کی طرح خدمت کی۔ میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، میرے لیے کسی پریشانی کا نہیں بلکہ سکون کا باعث بنی۔ میں ایسی عورت کی قدر رکھوں نہ کروں گا۔ مجھے اس سے غرض نہیں کہ اسے کیسی ہونا چاہئے بلکہ اس سے غرض ہے کہ وہ کیا ہے؟“ ندیم نے غصہ سے ہونے لگے میں کہا۔ تمہی میں نے کنول جیت اور تمہیں کو بلوایا، وہ آئے تو میں نے کہا۔

”کنول! فوراً منضائی منگواؤ۔“

”کس خوشی میں۔“ وہ خوشگوار حیرت سے بولی۔

”اپنا ندیم شادی کے لیے راضی ہو گیا ہے۔“

”ارے واہ، ابھی لیس پھر تو۔۔۔“

وہ انہی قدموں پر مزی تو حیش نے کہا۔

”ساتھ میں کڑک سی چائے بھی۔۔۔“ پھر وہ ندیم کو مہار کھا دے لگا۔ وہ باتیں کرنے لگے تو میں نے حیدر کو سورت حال سے آگاہ کیا۔

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے، یار! اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

”میں نہیں کہتا تھا کہ وہ مان جائے گا۔“

”ابھی بات ہے، میں نے ٹریول ایجنٹ سے کہہ دیا ہے۔ وہ دوپہر سے پہلے کنفرم کر دے گا، میں تمہیں بتا دوں گا۔“ دوسری طرف سے

رابطہ کٹ گیا تو میں نے حسن کے نمبر پر کال کی، دوسری تیل پر اس نے فون رسوا کر لیا۔

”کیسے ہو، جان بی؟“ اس نے خوشگوار لہجے میں پوچھا۔

”میں ٹھیک ہوں، تم سناؤ، نائیکہ کیسی ہے؟“

”یہ چائیک اور وہ بھی صبح تمہیں نائیکہ کا خیال کیسے آ گیا؟“

”یار! اگر تم مل کر اس کی شادی کا بندوبست کرو تو؟“ میں نے اس کی بات نظر انداز کر دی۔

”جہاں تک روپے پیسے کی بات ہے، اسے تو میں نے اکیلا بھی افورڈ کر لوں گا مگر کسی بھی لڑکی کی شادی کسی لڑکے سے ہوتی ہے۔ مطلب،

اس سے کون کرے گا شادی۔۔۔ لڑکا دیکھا ہے کوئی، اگر۔۔۔“

”یار! اپنے گھر کا لڑکا ہے، ندیم۔۔۔“

”ہائیں، کیا وہ مان جائے گا؟“

”مان جائے گا نہیں، مان گیا ہے۔ تمہارے ذمے یہ ہے کہ تم آج ہی نائیکہ کا عندیہ لے کر مجھے بتاؤ، یہ بہت ضروری ہے؟“

”اتنی جلدی، یار؟“

”ایسا اس لیے ہے کہ میں گل یا پر سوں پاکستان آ رہا ہوں۔ اگر تاکہ ہاں کر دیتی ہے تو میں ندیم کو بھی ساتھ لے آؤں اور اگر انکار ہو تو پھر میں اکیلا آؤں۔“

”ٹھیک ہے، میں آج ہی بات کرتا ہوں بلکہ ابھی اس کے دفتر جاتا ہوں۔“

”لو، ندیم سے بات کرو۔“ میں نے کہا اور فون ندیم کو دے دیا۔ وہ تھوڑی دیر ہاتھیں کرتا رہا، پھر فون بند کر دیا۔ مضامنی کھانے کے دوران ہم کئی ساری باتیں کر چکے۔ کنول کی خواہش تھی کہ وہ بھی ندیم کی شادی میں شامل ہو جائے۔ وہ تینوں چلے گئے تو میں نے الطاف کو فون کیا۔

”کیا خبریں ہیں؟“

”وہی جن کی مجھے توقع تھی۔“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو تم؟“

”سچی کہہ رہی ہوں سب کو دھوکا دے رہی ہے۔ اس نے جو بھی معلومات دی ہیں، سب غلط ہیں کیونکہ میں نے تمام ہوم ورک خود کیا ہے اور اب تو مجھے یہ بھی لگتا ہے کہ تمہارے اغوا والا واقعہ محض ایک ڈرامہ تھا۔“

”ایسا کیوں محسوس کیا تم نے؟“

”میں رات بھر سوچا نہیں ہوں بلکہ آرتی کو کھینے کی کوشش میں ہوں۔ قیمت یہ ہے کہ وہ میاں سے باہر کسی سے رابطہ نہیں کر سکتی ورنہ اب تک کچھ نہ کچھ ہو چکا ہوتا۔“

”مثلاً کیا ہو گیا ہوتا؟“

”شرعاً تم سے ہونیس کہ تم ان کے درمیان میں ہو۔ اس بار تمہارے ساتھ ڈرامہ نہیں ہوگا۔ آرتی کہاں ہے، یہ سوال تم سے کر رہے ہوتے۔ تم بہت زیادہ ہتھاطر بنا، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے۔“

”یہ معاملہ تو خاصا الجھ گیا ہے۔“

”میں نے کہا ہے نا، کہ تم بس ہتھاطر بنا، باقی میں سنبھال لوں گا۔ میرے پاس ابھی بہت سارے راستے ہیں۔“

”اوکے، رابطہ رکھنا۔“ میں نے کہا تو اس نے فون بند کر دیا۔ الطاف نے مجھے پریشان کن صورت حال بتائی تھی۔ میں وہیں بیٹھا حالات پر غور کرتا رہا۔ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا ہے؟ میں خیالوں کے سفر پر بہت دور تک گیا لیکن کسی بھی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ حالات مجھے وہاں تک لے آئے تھے کہ کسی بھی پل میری زندگی کا فیصلہ ہو سکتا تھا۔ میں ان کے درمیان میں تھا اور مجھے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ تیر کدھر سے آ سکتا ہے۔

میں فون کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکا دیا وہ حیدر کا فون تھا۔

”آج رات تقریباً گیارہ بجے یا کل شام چار بجے، کب جانا چاہو گے؟“

”آج رات گیارہ بجے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں ٹکٹ لے کر گھر آ رہا ہوں، تم گھر پہنچو اور وہاں، ندیم سے کہو کہ اگر شاپنگ وغیرہ کرنی ہے تو کر لے۔ ہم نوبے ایئر پورٹ کے لیے نکل جائیں گے۔“

”میں کہہ دیتا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں ہال سے نکلا تو وہ تینوں ہال میں بیٹھے کسی نئے پراجیکٹ پر بات کر رہے تھے، مجھے دیکھتے ہی میری طرف متوجہ ہو گئے تو میں نے کہا۔

”ندیم! ہم گیارہ بجے کی فلائیٹ سے پاکستان جا رہے ہیں۔ تم نے اگر کوئی شاپنگ وغیرہ کرنی ہو تو کر لو۔“

”نہیں، مجھے کچھ نہیں خریدنا۔ اتنی جلدی کیا ہو سکتا ہے، ٹیکٹ بھی بہت مشکل ہوگی۔“ اس نے وہی جواب دیا جو میں سوچ چکا تھا۔

”آپ جا رہے ہیں، یوں اچانک؟“ کنول نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

”ہاں، کنول! اچانا تو ہے لیکن دو منٹے بعد واپس آنے کے لیے۔ ہو سکتا ہے تم لوگوں کو ندیم کی شادی میں آنا پڑے۔“

”اگر وہ دل کیا تو؟“ حمیش نے کہا تو کنول بولی۔

”میں نے پتہ کیا سوچا تھا، آپ لوگوں کے جانے سے پہلے ایک بار پھر اپنے ہاتھوں سے چٹنی اور پرائیوٹ کے کھلاقی لیکن۔۔۔“

”تو اس میں اتنا پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ تم بناؤ، بہت شوق سے بناؤ۔ میں تیار ہو کر تمہارے پاس آ جاؤں گا، پھر بیٹھیں سے ایئر پورٹ چلیں جائیں گے، اب مسکرا دو۔“ میں نے کہا تو اس کے چہرے پر بہار آ گئی۔ وہ سب اٹھ کر اپنے کمروں میں گئے، ندیم میرے پاس کھڑا ہوا تو میں نے کہا۔

”بہت محتاط رہنا ہے تمہیں، بس ان لوگوں کے درمیان سے لگنا ہے اور یہاں سے ہمیں ایئر پورٹ نہیں جانا، باقی باتیں میں تمہیں تفصیل سے بعد میں سمجھا دوں گا۔“

میں گھر پہنچا تو حیدر نہیں آیا تھا۔ میں کلاک پر نظر ڈالتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا، دو سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور میرے ملائی کر جانے میں صرف آٹھ گھنٹے تھے۔ بنگالی باورچی پانی دے گیا تو میں نے خوب سیر ہو کر کیا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ میں اس وقت سکون محسوس کر رہا تھا۔ انہی لمحوں میں، میں نے سوچا کہ مجھے پھر سے اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر لینی چاہیے۔ محض آٹھ گھنٹوں بعد میں سکون سے پاکستان کے لیے نکلائی کر سکتا ہوں، مجھے چلے جانا چاہیے یا پھر اطلاق کی مدد کے لیے بیٹھیں رکنا ہوگا اور وہ کام جو ابھی ادھورا ہے، اسے پورا کرنا چاہیے؟ مجھے اس پر زیادہ نہیں سوچنا پڑا۔ میرے ضمیر نے مجھے اجازت ہی نہ دی کہ میں یوں چپکے سے چلا جاؤں، سچی میں نے اطلاق یا شا کو فون کیا۔ چند باتوں کے بعد میں نے اسے اپنے جانے کے بار میں تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

”حیدر میرے لیے ٹکٹ لے کر آ رہا ہے۔“

”ٹھیک ہے تم جاؤ۔ میں دیکھ رہا ہوں نا سب۔“

”لیکن میں جانیں رہا۔ میں کوشش کروں گا کہ حیدر میرے ساتھ ایئر پورٹ تک نہ جائے مگر یہ ممکن نہیں ہوگا۔ میں اس کے مطابق یہاں

سے لٹائی کر جاؤں گا لیکن مجھے ابھی یہاں سے جانا نہیں ہے بلکہ تمہارے پاس آنا ہے، میں کام ادھر اچھوڑ کر نہیں جاسکتا۔"

"اوہ۔۔!" اس کے منہ سے حیرت زدہ لفظ نکلا، پھر اگلے ہی لمحے اس نے کہا۔ "شجاع! جو کچھ آپ نے کیا ہے، شاید ہی کوئی اور کر پاتا۔ میں سمجھتا ہوں، قدرت نے آپ کو میرے لیے یہاں بھیجا تھا جو سب کچھ اتنی آسانی سے ہو گیا۔ میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ آپ نے اپنے حصے کا کام کر لیا، اب میرا کام ہے۔" اس نے انتہائی جذباتی انداز میں کہا تو مجھے ہنسی آگئی۔ وہ بے خیالی میں تم سے آپ پر آگیا تھا۔ میں نے اس جانب اس کی توجہ دلائی تو وہ بولا۔

"ٹھیک ہے، ہم بے تکلف تو ہو گئے لیکن میں آپ کا جتنا بھی احترام کروں، کم ہے البتہ۔۔۔"

"کیا؟" میں نے پوچھا۔

"میں اس وقت کچھ ایسی صورت حال میں گھرا ہوں کہ حتیٰ طور پر کچھ بھی نہیں مٹا سکتا۔ ہو سکتا ہے، کچھ دیر بعد یہ صورت حال واضح ہو جائے۔ آپ دونوں آپشن کے لیے تیار رہنا، میرے پاس آنے کے لیے بھی اور لٹائی کر جانے کے لیے بھی۔"

"ایسا کیوں ہے، مجھے کچھ بتاؤ؟"

"پلیز، شجاع! میں آپ سے کوئی بات مخفی نہیں رکھ رہا، اب جب بات ہے ہی نہیں تو۔۔۔" اس نے بے ہنسی سے کہا۔

"اوہ، جیسا تم بہتر خیال کرو۔ میں بہر حال آخری وقت تک تمہارے فون کا انتظار کروں گا۔" اس کے بعد چندا لودامی باتیں ہوئیں اور میں نے فون بند کر دیا، میں کچھ دیر تک یونٹی خالی الذہن بیٹھا رہا۔ اس وقت میرے پاس سوائے پینکٹ کے اور کوئی کام نہیں تھا لہذا میں یونٹی بیٹھا رہا۔ میرے خیالات کی دو یہاں کے حالات کے ساتھ بہت جلدی تھی، میں پچھلے اس وقت جب حیدر آگیا۔ اس نے کھڑے کھڑے نکت اور پاسپورٹ میری طرف بڑھائے اور بولا۔

"چیک کرو، ٹھیک گیارہ بجے لائینٹ ہے۔ اس لیے ہمیں تقریباً دس بجے سے پہلے ایئر پورٹ پہنچ جانا چاہئے۔" میں نے وہ نکت اور پاسپورٹ پکڑے اور انہیں ایک نظر دیکھنے کے بعد اپنے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ اسے میں وہ باورچی کو کھانا لگانے کے بارے میں کہہ چکا تھا۔ ہم دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے، جی وہ بولا۔

"آؤ، کھانا کھاتے ہیں۔" میں اس کے ساتھ اٹھا اور کھانے کی میز تک چل دیا۔ وہیں کھانے کے دوران ہم ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے اسے بتایا کہ کنول جیت کے ہاں سے ہوتے ہوئے ایئر پورٹ لگتا ہے۔ وہ میرے آئینہ پر دو گرام کے بارے میں پوچھتا رہا، یہاں تک کہ باورچی جائے رکھ گیا اور اس نے برتن سمیٹ لیے۔ جی جائے کاسپ لیتے ہوئے اچانک حیدر نے پوچھا۔

"شجاع، میرے دوست! آج بتاؤ، آرتی کہاں ہے؟" اس سوال سے مجھے شدید قسم کے شک کی بو آئی، میں نے قدرے عاجز ہوئے کہا۔

"کیا تمہیں میری بات فلفلگ رہی ہے اور تم مجھ پر شک کر رہے ہو؟"

"بات شک کی نہیں، میری جان اوہ عاقب کہاں ہو سکتی ہے؟"

”تم تو یوں کہہ رہے ہو کہ جیسے اسے قاصب ہونا تھا اور میرا انوا ایک ڈرامہ تھا جس کی ہدایات تم دے رہے تھے، کیا ایسا ہی ہے؟“ میں نے غصے میں کہا تو وہ اچھائی شکل سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”میرا مطلب یہ بھی نہیں ہے۔“

”تو پھر کیا مطلب ہے؟“ میں نے سوالیہ انداز میں پوچھا۔

”وہ اگر چھوٹا رجن گروپ کے حصے چڑھی ہے یا وہ ان کے گروپ سے تعلق رکھتی ہے تو وہ انہیں ہمارے بارے میں بتا سکتی ہے۔“

”یار! میں نہیں سمجھتا کہ تم اتنے احمق بھی ہو سکتے ہو۔ وہ جب ان کے گروپ کی قسمی تو انہیں ہمارے بارے میں پتہ ہوگا۔“ میں نے کہا اور

پھر چند لمحوں کے بعد اس کے چہرے پر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”حیدر اکمل کر کیو، آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟“

”کوئی بات نہیں، بس الجھن ہی ہے، آرتی کا اگر پتہ چل جاتا تو سکون ہو جاتا۔“

”اب تم جانو اور تمہارا کام مجھے آرتی سے کوئی مطلب نہیں ہے۔ میری توجہ اب پاکستان میں طے شدہ پلان پر ہوگی۔“ میں نے بڑے نرم

لہجے میں بات کا رخ بدلنا چاہا۔

”مطلب، تم شہتیا کے پلان پر عمل کرو گے؟“ وہ دہلی دہلی حیرت سے بولا۔

”تو کیا نہیں کرنا چاہتے؟ یار، حیدر! تم کہیں نئے میں تو نہیں ہو۔ میں اگر ایسا نہیں کروں گا تو کیا وہ تمہیں نقصان نہیں پہنچائیں گے، کیا

پاکستان میں ان کی گولی میرے بدن میں سوراخ نہیں کر سکتی؟ میں نے ان کے ساتھ ذیل کی ہے، ان سے رقم لی ہے اور میں مزید دولت کمانا چاہتا

ہوں جس میں تم بھی حصہ دار ہو۔“

”اوکے، اوکے۔۔۔“ اس نے جلدی سے کہا اور پھر چہرے لمبے خاموشی کے بعد بولا۔ ”تم تیار کر لو، پھر تھوڑے آرام کرنے کے بعد کتول

جیت کے ہاں جائیں گے اور پھر ایئر پورٹ۔“ اس نے کہا اور چائے کا ایک لمبا گھونٹ لے کر اٹھتا جا رہا تھا اور وہ انکی میرے پاس ہی تھا کہ حسن کا فون آ گیا۔

”ہاں، حسن جی! بلو، ناکلہ سے بات ہوئی؟“

”اس کے پاس ہی ہوں، اس کے دفتر میں۔“ وہ چپکا۔

”کیا فیصلہ ہوا؟“ میں نے تیزی سے پوچھا۔

”یہ تم خود ہی پوچھ لو۔“ اس نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد فون پر ناکلہ کی مدد آواز گونجی۔ حال احوال کے بعد اس نے کہا۔

”شہار! کیا میں خوش قسمت نہیں ہوں کہ آپ میرے بارے میں سوچتے ہیں؟ حسن نے مجھ سے تفصیل کے ساتھ بات کی ہے کہ آپ

ایسا کیوں چاہتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ آپ ایسا چاہتے ہیں تو میں آپ کی بات مان لیتی ہوں۔ ایسا نہیں ہے، شہار! مجھے واقعتاً ایک نام اور

سہارے کی ضرورت ہے۔ میں آپ کی احسان مند ہوں کہ آپ میرے لیے فکرمند ہیں، بس ایک سوال کا جواب چاہوں گی۔“

”بولو؟“ میں نے کہا۔

”ندیم کا یہ فیصلہ زور زور سے ہوتی یا۔۔۔“

”میں ایسا چاہوں گا بھی نہیں۔ میں نے اپنا ایک خیال اس کے سامنے رکھا، اس نے مجھ سے اتفاق کیا کیونکہ وہ پہلے ہی سے وہی طور پر تیار تھا۔ اس کا عندیہ یہ پا کر ہی میں نے حسن کو تمہارے پاس بھیجا تھا۔“

”میری طرف سے ہاں ہے، شجاع۔“ اس نے کہا اور پھر خود ہی فون حسن کو تھا دیا۔

”شکر یہ اتم لوگوں نے میرا مان رکھا لیا اور ہاں میں گیا رہے جیسے کی فلائیٹ سے آرہا ہوں۔“

”کیا ندیم نہیں آ رہا؟“ اس نے پوچھا۔

”وہ بھی آ رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے، میں نے یہی کہا ہے یا تمہارے کان کچھ اور سننا چاہتے ہیں؟“ میں نے قدرے زور سے کہا تو وہ تہہ لگا کر فون دیا۔

”میں آ جاؤں گا انٹر پورٹ۔“

”بس تو پھر باقی باتیں وہیں پر ہوں گی۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا، ابھی پاس کمرے حیدر نے کہا۔

”تم تو نائلہ کے بارے میں واقعی ہی مجیدہ ہو گئے ہو، اپنا کیا جاتا ہے۔“ اس نے کندھے اچکائے۔

”آؤ گے نہیں پاکستان؟“ میں نے پوچھا۔

”وقت ملا تو ضرور آؤں گا، بس تم تاریخ بتا دینا۔“ اس نے کہا اور اپنے کمرے کی طرف چل دیا، نہ جانے کیوں اس وقت حیدر شیخ مجھے بدلا

بدلا سا لگ رہا تھا۔

اس وقت سورج ڈھل چکا تھا جب میں نے اپنی بیکنگ وغیرہ مکمل کر کے سامان نیچے بگوا دیا، صرف ایک یوزی بسٹل کے ساتھ میگزین رہ

گئے تھے۔ وہ مجھے کسی آڑے وقت کے لیے الحاف نے دیا تھا۔ میں فوری طور پر اس سے حشاق حیدر کو نہیں مانتا تھا، وہ نہ جانے کیا خیال کرے۔ میں

نے انہیں الماری ہی میں رہنے دیا اور تیار ہو کر نیچے آ گیا۔ حیدر ابھی تک کمرے سے نہیں لٹکا تھا، میں اس کے انتظار میں صوفے پر بیٹھ گیا اور ٹی وی

آن کر دیا۔ میں مختلف چینل پر طبع آزمائی کر رہا تھا کہ الحاف کا فون آ گیا۔

”کیا پروگرام ہے آپ کا؟“ اس کا لہجہ خوشگوار تھا۔

”یہ تو تمہی نے بتانا ہے۔“ میں نے بھی اسی انداز میں کہا۔

”تو سنو، نیشنل پائٹ سے اور ہری داس اس وقت ہمارے پاس ہیں اور بڑی حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہیں کہ یہ کیسے ہو گیا؟“

”اس نے دبے دبے جوش سے بتایا تو میں نے تیزی سے پوچھا۔

”کیا کہہ رہے ہو، کیسے ہو گیا یہ سب؟“

”یہاں کی حکومت سوئی ہوئی نہیں، اگر انہوں نے ذمیل دی ہوئی ہے تو وہ نگرانی کرنا بھی جانتے ہیں۔ یہ سب معاملہ خفیہ چل رہا تھا مگر جری داس ایجنٹ کھنی کے ہارے میں کوئی واضح ثبوت نہیں تھا سوائے اس کے کہ وہ گمراہ کن خیالات کی تبلیغ کرتا ہے اس لیے یہاں کی فورس ان کے خلاف کوئی ایکشن نہیں لے پاری تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ بیٹھوت کا نیٹ ورک بہت مضبوط تھا لیکن وہ نشیات اور اسلحہ کی ذمیل میں ملوث تھے، یہ مجھے پتہ تھا سو میں نے یہاں کے ذمہ دار افراد سے بات کی۔ ان سے میرا پہلے ہی رابطہ تھا اور وہ میری مدد کر رہے تھے۔ ان دونوں کو میں نے اٹھایا ہے اور باقی اہم لوگوں کو وہ اٹھا رہے ہیں، میں اس لیے کوئی حتمی بات نہیں کہہ پا رہا تھا۔“

”آپ صورت حال کیا ہے؟“

”پوری طرح قابو میں ہے، میں نے تمہیں اس لیے فون کیا ہے کہ اگر تم آسانی سے آج رات نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ ورنہ یہاں کے قانونی چکروں میں پھنس کر رہ جاؤ گے۔ اگر چہ ہوگا کچھ نہیں لیکن تمہارے کئی دن یونہی ضائع ہو جائیں گے، باقی میں سب سنبھال لوں گا۔“

”اور وہ شیڈیو تیار، ہائل شے تو وہی ہے؟“

”اس کے بارے میں ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کدھر گئی لیکن پتہ چل جائے گا۔“ اس نے اطمینان سے کہا تو میں اپنی روانگی سے متعلق بتا دیا۔ وہ ہلکا۔

”ابھی بات ہے، خواہ مخواہ قانونی جھیلیوں میں مت پڑیں۔“

”آرتی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ بھی نہیں ہے، کچھ دیر بعد بات کراؤں گا، زندگی رہی تو بہت جلد پاکستان میں ملاقات ہوگی۔“ اس نے جلدی سے کہا، مجھے لگا کہ وہ بات سمیٹ لینا چاہتا ہے۔ میں نے الوداعی بات کی اور رابطہ منقطع کر دیا، مجھے خوشی ہو رہی تھی کہ الطاف اپنے مشن میں کامیاب رہا تھا۔ ان بے خمیروں کی تباہی سے کنول جیت کس قدر خوش ہوگی، میں اس کا اعزازہ کر سکتا تھا۔ میں اسے سامنے ٹھاکر یہ خبر سنانا چاہتا تھا تاکہ اس کا رد عمل دیکھ سکوں۔ جب میری ذہنی روشنی کی طرف مڑ گئی۔ وہ غائب ہو گئی تھی، میں یہی سوچ رہا تھا کہ کنول کا فون آ گیا۔ میرے ”ہیلو“ کے جواب میں کنول کی تیز مگر سرگوشی میں آواز ابھری۔

”شہارجی! غضب ہو گیا، شو تیا یہاں ندیم پر تشدد کروا رہی ہے اور آرتی کے ہارے میں پوچھ رہی ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو تم؟“

”میں زیادہ بات نہیں کر سکتی، بہت مشکل سے یہ فون میں نے قابو میں کیا ہے اور واش روم میں کھڑی آپ سے بات کر رہی ہوں۔“

”کتنے لوگ ہیں اس کے ساتھ؟“

”چار ہیں، ہمیشہ بھی ان کے ساتھ ہے۔“

”میں آ رہا ہوں۔“

”لیکن بڑی احتیاط سے، وہ آپ کی گھات میں ہیں، انہیں پتہ ہے کہ آپ ہمیں آئیں گے۔“ جمعی فوراً میرے ذہن میں خیال آیا، میں نے کہا۔

”تم فون کو آن ہی رکھنا، اسے چھپا لو اور کوشش کرو کہ شویتا کے آس پاس رہو۔“
 ”اوکے۔“ اس نے کہا اور پھر فون پر جیسے سناٹا چھا گیا۔ کچھ دیر بعد فون پر شویتا کی آواز گونجی۔
 ”عیش اتم اتنے کمزور ہو اس سے یہ نہیں اگوا پارہے کہ آرتی کدھر ہے؟“
 ”میرا خیال ہے کہ اسے پتہ نہیں ہے، وہ شجاع ہی کو معلوم ہے۔“

”اسے بھی آ لینے دو۔ میں دیکھتی ہوں وہ کیا شے ہیں، تڑپا تڑپا کے ماروں گی، بہت سیانا بنتا ہے۔ اے کتول! اسے فون لگاؤ کہ جلدی آئے۔“ اس آواز کے ساتھ ہی وہ بولی۔ ”اے عیش! اسے ہوش میں لاؤ اور استری سے اس کا جسم داغو، پتہ ہوگا تو کہے گا۔“ وہ ہڈیانی انداز میں جیج رہی تھی۔ فون پر سناٹا بھرے آیا اور میں تڑپ کر رہ گیا۔ کیا اندیم پر تھوڑی انتہا ہو رہی ہے؟ اس وقت اپنا فون بند کرنا میری مجبوری بن گیا۔ میں نے تیزی سے الطاف کے نمبر پر کال کی، پہلی کال پر اس نے فون رسپونڈ کر لیا۔

”شویتا، اس اپارٹمنٹ میں ہے جہاں کتول رہتی ہے اور وہ لوگ اندیم پر تھوڑ کر کے آرتی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔“

”اوہ! اس کے منہ سے انہوں نے آہ نکلی، پھر تیزی سے بولا۔“ فکر مت کریں، میں زیادہ سے زیادہ پتہ دوں، میں منٹ بعد وہاں پہنچ جاؤں گا۔“

”میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے کوئی نو مشائخ نہیں کیا اور فوراً اپنے کمرے کی طرف لپکا۔ میں نے ہاسٹل اٹھایا جہاں اس وقت مجھے کسی نعمت سے کم نہیں معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے میگزین جیب میں رکھے اور وہاں بیٹھے آ گیا، حیدر باہر آچکا تھا اور ملازم میرا سامان گاڑی میں رکھ رہے تھے۔ جلد ہی حیدر چل پڑا، وہ انتہائی تیز رفتار سے جا رہا تھا۔ میں نے اسے صورت حال کے بارے میں بتا دینا چاہا لیکن یہی سوچ کر خاموش رہ گیا کہ بعد میں ہو سکتا ہے، کتول زیرِ قلاب آجائے چند منٹوں بعد اسے خود ہی معلوم ہو جانا تھا مگر پتہ نہیں، کیا صورت حال بنتی ہے؟ میں اپنے طور پر فیصلہ کر چکا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ میری آنکھوں کے سامنے اندیم تھا جس کا جسم داغا جا رہا تھا، اس کی جھپٹیں میرے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ تقریباً دس منٹ بعد ہم اس اپارٹمنٹ کے سامنے پہنچ گئے تو حیدر نے کہا۔

”تم چلو، میں گاڑی پارکنگ میں لگا کر آتا ہوں۔“ میں نے اس کی مزید کوئی بات نہیں سنی اور تیزی سے لٹ کے پاس پہنچا۔ پھر چند منٹوں بعد میں اس اپارٹمنٹ کے سامنے تھا۔ دستک دینے سے پہلے میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا، راہداری سنسان تھی۔ میں نے ہاسٹل ہاتھ میں لیا، اس کا لاک ہٹایا اور دروازے پر دستک دے دی۔ دروازہ کھلا اور میں نے لمبے کے ہزاروں حصے میں اندر کا جائزہ لے لیا۔ شویتا صوفے پر بیٹھی تھی، وہ چاروں گارڈ پوری طرح تیار زمین دروازے کے سامنے تھے اور دروازے کے چوکھٹے میں کتول جیت کھڑی تھی۔ میں نے کوئی نو مشائخ کیے بغیر ان پر تازنگ کرتا ہوا شویتا کے سر پر جا پہنچا۔ سائیکلسر کی وجہ سے قطعاً شور نہیں ہوا مگر دو تین لمحوں میں وہ گارڈ خون میں لت پت فرش پر تڑپ رہے تھے۔

جس سے قالین گندا ہوا تھا۔ میں نے انہیں یہ سوچنے کا موقع ہی نہیں دیا تھا کہ وہ اپنی گن سیدھی کر لیں۔ میں نے ہاسٹل شوپا کی کنٹی پر رکھ دیا اور اس کے پہلو میں جا بیٹھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے میری طرف دیکھ رہی تھی جیسے خوف سے سن ہو چکی ہو۔ میں نے اس کی گردن میں ہانڈا ڈالتے ہوئے کہا۔

”ہیلو، ڈیئر شوپا امیں آ گیا۔“ یہ کہہ کر میں نے اونچی آواز میں ہانک لگائی۔ ”حمیش ڈیئر ہا ہر آؤ، کہاں ہو تم؟“ وہ صونے کے پیچھے چھپا ہوا تھا، ہا ہر نکلا تو اس کے ہاتھ خالی تھے۔ میں حیدر کے آنے سے پہلے پہلے تمام کارروائی مکمل کر لینا چاہتا تھا۔ میں نے حمیش سے کہا۔

”تمہیں ان لوگوں نے گولی چلانا نہیں سکھائی؟“

”شجاع، بھائی امیں بے تصور ہوں۔ یہ تو۔۔۔ یہ تو۔۔۔ پلیز، مجھے مت مارنا۔“

”میں تمہیں کیوں ماروں گا۔۔۔ ندیم کدھر ہے؟“ میں نے کہا۔

”وہ۔۔۔ وہ کمرے میں۔۔۔“ اس نے ہکلاتے ہوئے کہا تو میں ان دونوں کو اس کے کمرے میں لے گیا۔ وہ فرش پر بے ہوش پڑا تھا۔ یکدم ہی غصہ میری کنٹی پر ٹھوکر میں مارنے لگا۔ میں نے پوری قوت سے ہاسٹل کا دستہ حمیش کے سر پر دے مارا، وہ ایک لمحہ کو چٹکرایا اور فرش پر لڑھک گیا۔ میں نے پلٹ کر شوپا کو دیکھا، وہ ہونٹ سی بنی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسی کی چادروں سے اس کو باندھ دیا، تبھی وہ بولی۔

”میں مان گئی ہوں کہ میرا احتساب ختم نہیں تھا لیکن اب کبھی ہوں کہ میں نے تمہارے بارے میں اندازے غلط لگائے تھے لیکن اس وقت۔۔۔ اس وقت مجھ سے کہاں غلطی ہوئی۔“ وہ خودکھامی میں بڑبڑانے لگی۔

”شوپا! مجھے مکالمے بولنے کی عادت نہیں، سیدھے سجاؤ عمل کرتا ہوں۔ تم مکالمے زیادہ بولتی ہو۔۔۔“ میں نے کہا اور ندیم کو ہوش میں لانے لگا۔ جلد ہی وہ ہوش میں آ گیا۔ مجھ پر نظر پڑی تو وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا، ساتھ ہی اس کی کراہ نکل گئی۔ اس کا جسم جگہ جگہ سے داغ ہوا تھا اور تشدد کے کئی نشان موجود تھے۔ اس نے باحول کا جائزہ لیا تو خاصا حوصلہ مند ہو گیا تب میں نے کہا۔

”فکر نہ کرو۔ میں نے سارے ڈھیر کر دیئے ہیں۔ تم اس حمیش کو ہوش میں لاؤ اور اپنا حساب برابر کرو۔“ ندیم اٹھا اور اسے ہوش میں لانے لگا۔ میں شوپا کے پہلو میں پھر سے جا بیٹھا۔ میں نے وہاں سے دور الے پر بھی نگاہ رکھی کہ حیدر کب آتا ہے جبکہ کنول دردناک بند کر چکی تھی۔ حمیش ہوش میں آیا تو ندیم اس پر ہل پڑا۔ وہ ڈرا بھی مزاحمت نہیں کر پا رہا تھا، کچھ ہی منٹوں بعد وہ گر گیا۔ میں اس کے پاس چلا گیا۔ استری ابھی گرم تھی۔ میں نے سیدھی اس کی پیٹھ پر رکھ کر ہانڈا دیا، وہ تڑپ کر رہ گیا۔

”اتنا ہی درد ہوتا ہے، میری جان۔“ یہ کہہ کر میں نے دوسری ہار استری اس کی پیٹھ پر رکھ دی۔ وہ برداشت نہ کر سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ میں نے ہاسٹل اس کی کھوپڑی پر رکھا اور گولی داغ دی۔ وہ بس ایک دلف سے وجود سے جلا تھا، پھر بے حس ہو گیا۔ میں نے ندیم کو کپڑے پہن لینے کے لیے کہا اور شوپا کے سامنے جا کر کہا۔

”دل تو کرتا ہے کہ تمہارے جسم کا تار تار الگ کر دوں مگر شکر کرو، میں عورت پر ہاتھ نہیں اٹھاتا اور پھر تم نے مجھ پر ایک احسان کیا ہے۔ میں تمہیں اس احسان کے بدلے معاف کرتا ہوں۔“ میں نے کہا تو اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اسے مجھ پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”لیکن میں اسے معاف نہیں کر سکتی۔۔۔“ اچانک ہی کنول جیت چلی آئی۔ جب شویتا پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، یقیناً وہ اسے اپنا ہا اعتماد ساقی خیال کر رہی تھی۔

”کنول! تم۔۔۔“ اس نے بے چارگی سے کہا۔

”ہاں، میں جسور سنگھ کی رکھیل اور تمہارے لیے وہ جا جس پر تجربے کیے جاتے ہیں۔“ اس نے کہا اور پوری قوت سے اس کے منہ پر چھڑ مار دیا۔ ”شجاع! آپ نے اسے معاف کر دیا لیکن میں اس کا گدہا کر سیکھیں شتم کر دوں گی۔“ وہ پھر نکلی تھی۔ تبھی بل فون بجنے کی آواز آئی جو ڈرائنگ روم میں پڑا تھا۔ میں نے بڑھ کر اٹھایا تو اسکرین پر حیدر کے نمبر تھے۔ میں ساکت ہو گیا۔ فون شویتا کا تھا اور حیدر اسے کال کر رہا تھا۔ جبکہ فون تو اسے مجھے کرنا چاہئے تھا۔ وہ آیا کیوں نہیں، فون کیوں کر رہا ہے اور پھر شویتا ہی کو کیوں، شک کا ناگ پورا پھین پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ پھر جب تنگ میں نے فون شویتا کے کان سے لگایا، تیسری بیل بج چکی تھی۔ اس وقت میں بھی فون سن سکتا تھا۔ شویتا بولی تو حیدر کی آواز آئی۔

”کیا شجاع کا بوسہ آپ کا ہے؟“ اس کے لفظ میرے دل کے آ پار ہو گئے۔ وہ دوست تھا اس لیے ایک لمحہ کو میرے بدن سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی لیکن یہ یونیا تھی۔ اس میں تو اپنے سگے قتل کر دینے سے باز نہیں آتے، میں تو فقط دوست تھا جسے وہ شوشہ کی طرح استعمال کرنا چاہتا تھا۔ میرے اشارے پر شویتا نے کہا۔

”ہاں، مگر تم ابھی تک اوپر کیوں نہیں آئے؟“

”میں یہی کفرم کرنا چاہتا تھا، کیا اس نے آرتی کے بارے میں بتا دیا؟“

”ہاں، ہمارا شک صحیح نکلام آ جاؤ۔“ اس نے کہا اور میں نے فون بند کر دیا۔ اس وقت شویتا میری طرف طنز یہ لگا ہوں سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اس کی پروا نہیں کی، وہ بولی۔

”رات جب تم ہوٹل میں ملے تھے، میں نے اسی وقت یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ تمہارے جیسے وچار رکھنے والا بندہ ہمارے لیے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ مجھے چاہئے تھا کہ میں اسی وقت تمہیں شتم کر دیتی لیکن بیٹھنت نہیں مانا، وہ آرتی کے بارے میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔“

”شویتا! میرا یقین اس پر بہت پختہ ہے کہ زندگی اور موت میرے رب کے ہاتھ میں ہے اور پھر قسمت کے یہ کھیل بلائے نرالے ہیں، بیٹھنت اور ہری داس تمہاری طرح ہی کہیں بندھے پڑے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہ ہی جو تم سمجھ سکتی ہو تم لوگوں کا کھیل شتم ہو گیا۔ تم نے اندھیرا پھیلا کر اس میں برائی کو روشن کرنا چاہا مگر ہوا کیا، ذرا سے اجالے نے تمہارا سب کچھ شتم کر کے رکھ دیا اس جاو کی طرح جو ٹکا ہوں کو کیا عقل تک کو خیرہ کر کے رکھ دیتا ہے۔“

یہ لفظ ابھی میرے منہ ہی میں تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے کنول کو اشارہ کیا، اس نے دروازہ کھول دیا۔ حیدر کے ساتھ ہی الطاف کا چہرہ نمودار ہوا۔ پھر کئی لوگ ادھر ادھر پھیل گئے۔ انہوں نے کنول کو اپنی گرفت میں لینا چاہا مگر میں نے منع کر دیا۔

”خطرے کی کوئی بات نہیں، بس حیدر کو ہاندھ لو۔“ میں نے کہا تو حیدر کی آنکھیں حیرت سے کھیل گئیں، وہ ہلکے ہو کر رہ گیا۔ الطاف کے اشارے پر انہوں نے حیدر کو ہاندھ دیا۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو، شہار میں تمہارا دوست ہوں اور یہ لوگ کون ہیں؟“ حیدر نے کہا تو میں نے پوری قوت سے ٹھوکر اس کے منہ پر دے ماری اور کہا۔

”وہی لوگ، چھوڑا رجن گروپ جنہوں نے آرتی کو اغوا کیا تھا۔“ میرے لہجے میں طنز پرا کر وہ سب کچھ سمجھ گیا اس لیے لگا ہیں جھکاویں۔ الطاف نے اپارٹمنٹ کا جائزہ لیا اور پھر آکر بولا۔

”آپ نے بہت بڑا کام کر دیا۔ شویٹا کے نڈلے سے جو مصیبت ہوتی تھی، آپ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اب سمجھو مشن مکمل ہو گیا، میرا خیال ہے، اب آپ ایئر پورٹ نکل جائیں اور باقی وہیں گزار لیں۔ انہیں اب یہاں سے لے جانا ہوگا۔“ اس نے کہا تو میں نے جیب سے ٹکٹ نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”یہ ٹکٹ مجھے حیدر نے دیئے ہیں۔ انہیں کنفرم کراؤ، میں یونٹی ایئر پورٹ پر تھم سکتا ہوں۔“

”یہ ابھی کنفرم ہو جائے گا۔“ اس نے اپنے ایک ساتھی کو وہ ٹکٹ تھما دیے۔ وہ فون پر کسی سے بات کرنے لگا، جمی الطاف نے مسکراتے ہوئے حیدر کی طرف دیکھا اور کہا۔

”اب بتائیں، اس کا کیا کرنا ہے۔ آپ نے تو اس کو بچا لینے کی بہت سفارشیں کی تھیں؟“

”نڈار کو محاف نہیں کیا جاسکتا، تم جو چاہو، اس کے ساتھ کرو۔“ میں نے کہا اور مدد حال سا صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایسا کہتے ہوئے مجھے بہت تکلیف ہوئی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے وصیان ہناتے ہوئے کنول سے کہا۔ ”شویٹا تمہاری جرم ہے، چاہو تو اس سے اپنا انتظام لے سکتی ہو۔“

الطاف اسے روکتے ہوئے بولا۔ ”میں اس کے جذبات سمجھتا ہوں لیکن یقین رکھو، شویٹا کو کنول ہی ختم کرے گی لیکن ابھی کچھ دیر بعد۔۔۔“ میں اس کی مجبوری سمجھ گیا، جمی اس کے ساتھی نے کہا۔

”ٹکٹ صحیح ہیں، یہ سفر کر سکتے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، میں نکل رہا ہوں لیکن پہلے عدیم کی ڈریسنگ ضروری ہے۔“

”اس اپارٹمنٹ میں تو کچھ نہیں ہو سکتا۔ یہ عید تمہارے ساتھ جائے گا، ڈریسنگ سے لے کر ایئر پورٹ چھوڑنے تک ذمہ داری ہوگی اس پر، آپ بس ٹکٹیں یہاں سے۔“ میں نے اس کا پھل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ میرے بہت کام آیا، اپنی امانت واپس لے لو۔“ میں نے حیدر کی جیب سے گاڑی کی چابی لی اور عدیم کے ساتھ باہر نکل آیا۔ عید میرے آگے آگے تھا۔ میں نے پچھتائی کر کار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چابی اسے دے دی۔ عدیم نے اپنا مختصر سامان رکھا۔ عید انتہائی حیرت فاری سے ہمیں ایک ٹھی بیک میں لے گیا۔ ڈاکٹر نے ڈم دیکھے، ڈریسنگ سے پہلے اس نے انکیشن لگائے۔ دو انیاں دیں۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد ہمیں اس نے فارغ کر دیا۔ کینک سے نکلے تو نو بج چکے تھے۔ پھر ایئر پورٹ تک ہمیں دس بج

گئے۔ میں نے کار چھوڑی اور عبید کو خدا حافظ کیا۔ وہ چلا گیا تو ہم سامان لے کر آگے بڑھے۔ انٹر پورٹ پر خاصی گہما گہمی تھی۔ کچھ کھاتے پیتے اور لوگوں کو دیکھتے وقت گزر گیا۔ یہاں تک کہ لاؤنج میں آگئے۔ اطمینان سے بیٹھنے کے بعد میں نے عدم سے پوچھا۔

”اب کیا محسوس کر رہے ہو؟“

”دواؤں کے اثر سے درد نہیں ہو رہا، بس احساس سا ہے۔“

”ڈاکٹر نے کہا تھا، یہ اثر تین چار گھنٹے تک رہے گا۔“ میں نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا تو اس نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ہم ہاتس کر رہے تھے کہ اظاف کا فون آ گیا۔

”یار! ایک بات بھول گیا تھا میں۔۔۔“

”کیا؟“

”یہ آرتی سے تمہاری بات کروا تھی، لو بات کرو۔“ اس نے کہا اور پھر چند لمحوں بعد آرتی کی آواز گونجی۔

”شجاع اتم یاد ہو گئے۔ میں نے تم سے بری طرح گفتگوتی کھائی۔“

”یہ تمہاری قسمت ہے، آرتی تمہارے بڑوں کو یہ سمجھ لینا چاہئے کہ سارے پاکستانی تمہارے جیسی عورتوں کے بدن پر پاگل نہیں ہوتے۔“

”مجھے پورا یقین تھا کہ تم مجھے محبت کا یقین دلا کر جھوٹ بول رہے ہو لیکن مجھے اچھا لگا۔ میں اگر اپنے مشن پر نہ ہوتی تو تم سے محبت کرنے کا

حزہ آج۔“

”میں نے کہا نا، یہ تمہاری قسمت۔“ کتنے لمبے خاموشی میں گزر گئے، تبھی اظاف کی آواز سنائی دی۔

”اس وقت آپ کہاں ہیں؟“

”لاؤنج میں۔“

”اور تم اس وقت کسے سمندر میں ہیں۔ بہت دور روہنی کی روشنیاں ٹمٹماتے ستاروں کی مانند نظر آ رہی ہیں اور اسی شہر پر چند لاشوں کے

ساتھ ہری داس اور آرتی موجود ہیں جبکہ شوہر بے چاری بے جان جسم کے ساتھ موجود ہے۔ آرتی تمہیں اپنی یادوں میں محفوظ رکھنے کی بات کر رہی ہے لیکن اسے نہیں پتہ کہ ابھی تھوڑی دیر بعد یہ سمندری مچھلیوں کی خوراک بن جانے والے ہیں یعنی ٹس کم جہاں پاک۔“

”اور وہ حیدر اور نیٹونٹ۔۔۔“

”وہ لوگ یہاں کی فورسز کے حوالے کر دیئے ہیں، ہشیاات اور اسلمہ کے کاروبار میں ملوث تھے۔ سزائے موت ہو جائے گی۔ خیر، اللہ کرے

کہ آپ کا سفر خوشگوار گزرے۔“

”وہ، یار! کنول کا خیال رکھنا۔ اس نے ہماری بہت مدد کی ہے۔“

”وہ دلیپ سنگھ کے ساتھ ہے، وہ اسے اپنے ساتھ کینیڈا لے جائے گا۔ میرے دبا بیٹے میں ہیں وہ دونوں۔“

”او کے زندگی رہی تو ملیں گے“ میں نے کہا اور رابطہ ختم کر دیا کیونکہ لٹا بیٹ تھا تو تھی۔ ہم پاکستان کے لئے لڑائی کر گئے۔

مجھے بہت نزدیک روشنیاں نظر آئیں تو لاہور پہنچ جانے کا احساس ہوا۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ دوپٹی سے چلتے ہوئے سوچوں کا اک لائناتی سلسلہ میرے ساتھ جڑ گیا تھا، اسی مدوجز میں ڈوٹا ابھرتا یہاں تک پہنچا تھا۔ میں نے وہ ساری سوچیں ایک طرف جھٹک کر رکھ دیں۔ ایک سرشاری کی کیفیت مجھ پر طاری ہو چکی تھی۔ ائیر پورٹ کے مراحل سے گزرنے کے بعد جب میں ہال میں آیا تو حسن اور نائلہ سامنے کھڑے تھے۔ ان دونوں کے چہروں پر خوشخواریت تھی، اسنے میں ندیم پورٹر کے ساتھ سامان لے کر آ گیا تھا۔

”آؤ، جان جی۔!“ حسن نے خالص لاہوری لہجے میں کہا اور مجھ سے بظنکیر ہو گیا۔ وہ الگ ہوا تو نائلہ میرے گلے لگ گئی۔ تجھی ندیم کو اونچی کراہ گونج اٹھی۔ میں نے وحشت سے مڑ کر دیکھا۔ حسن حواس باختہ سا ندیم کو دیکھ رہا تھا۔ حسن کو کیا خبر تھی کہ ندیم کا نہ صرف انجینئر ڈیپلا ہے بلکہ اسے ”ڈینٹ“ بھی پڑے ہوئے تھے۔ میں نے جب وضاحت کی تو ایک قبضہ فضا میں بکھر گیا۔ میں نے نائلہ کو دیکھا، وہ ندیم کے قریب ہو چکی تھی۔

”اپنا ندیم سمارٹ ہو گیا ہے، یار۔!“ حسن نے اسے دیکھتے ہوئے کہا، پھر سامان اٹھانے لگا۔ جب کار میں بیٹھنے لگے تو میں جان بوجھ کر حسن کے ساتھ بیٹھ گیا اور اس سے پوچھا۔

”یار اوہ تو ساری باتیں ہوتی رہیں گے۔ تم یہ بتاؤ، ہم شادی کی تاریخ لینے کب آئیں؟“

”مطلب، جان جی؟“ حسن نے حیرت سے پوچھا۔

”تم لڑکی والے ہو اور میں لڑکے والا، جان جی!“ میں نے کہا تو ہمارا قبضہ ایک ساتھ پلٹنے ہوا اور نائلہ شوخ ہوتے ہوئے چہرے کے ساتھ سٹ گئی۔ اس وقت مجھے اس پر بہت پیار آیا۔ میری نگاہیں سڑک پر جم کر رہ گئیں، تجھی ایک شہر میری یاد میں ابھرا۔

روشنی تھک کے رونے لگتی ہے

جب اندھیرا سزا جہ جانی



پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

امجد جاوید کی دیگر کتب

نمبر شمار	نام کتاب	قیمت
1	جب عشق سمندر اوڑھ لیا	200/-
2	چہرہ	150/-
3	عشق کا شین (حصہ دوم)	400/-
4	عشق کا شین (حصہ سوم)	400/-
5	عشق کا قاف	300/-
6	عشق سیرمی کاغذ کی	400/-
7	تاج محل	250/-
8	لکھاری کیسے بنتا ہے	120/-
9	انتخابی شاعری (انتخاب)	150/-
10	تمہیں چاہوں گا شدت سے (نیا شعری مجموعہ)	120/-
11	کامیابی 30 دنوں میں (ترجمہ)	150/-
12	روشن اندھیرے	400/-